محرومی اکثر حالات میں اس کا نتیجہ ہوتی ہے کہ آدمی نے وہ چیز حاصل کرنے کی کوشش کی جو اس کو ملنے والی نہیں تھی

جنوری ۱۹۸۴ء □ قیمت فی پرچہ تین روپے □ شمارہ ۸۶

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

جنوری ۱۹۸۴
شمارہ ۸۶

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاءاللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

ایک پکار

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دعوت حق کی ذمہ داری سونپی گئی تو آپ نے مکہ کے باشندوں کو صفا پہاڑی کے پاس جمع کیا اور فرمایا کہ اے لوگو، جس طرح تم سوتے ہو اسی طرح تم مرو گے۔ اور جس طرح تم جاگتے ہو اسی طرح تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ اس کے بعد یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم یہ سن کر ابولہب نے کہا، تمہارا برا ہو، کیا تم نے ہم کو اسی لئے بلایا تھا (تبا لك، اما جمعتنا الا لهذا)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ کے سردار بن کر مدینہ میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی آپ نے اسی قسم کی تقریر فرمائی۔ اس وقت بھی آپ کے پاس کہنے کی جو سب سے بڑی بات تھی وہ یہ تھی کہ اے لوگو اپنے آپ کو آگ کے عذاب سے بچاؤ، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو (اتقوا النار ولو بشق تمرة)

اسلامی مرکز کا مقصد اسی پیغمبرانہ دعوت کو زندہ کرنا ہے۔ لوگ مسائل زندگی کے لئے اٹھتے ہیں۔ ہم مسائل موت کے لئے اٹھے ہیں۔ کیا کوئی ہے جو اس مشن میں ہمارا ساتھ دے۔ لوگوں کو جنگ اور فساد کے شعلے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا کوئی ہے جس کو جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلے دکھائی دیتے ہوں تاکہ وہ ہمارا ساتھ دے کر دنیا والوں کو جہنم کے شعلوں سے ڈرائے۔

لوگوں کو شہروں کی رونقیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہم ان انسانوں کی تلاش میں نکلے ہیں جن کو قبرستان کے ویرانے دکھائی دیں۔ ایسے انسانوں سے دنیا پٹی ہوئی ہے جن کو یہ محرومی بیتاب کئے ہوئے ہے کہ ان کو کسی ادارہ میں داخلہ نہیں ملا۔ ہم کو وہ انسان درکار ہیں جن کو یہ غم بدحواس کر دے کہ کہیں وہ جنت کے داخلہ سے محروم نہ ہو جائیں۔ لوگ دنیا کی بربادی کا ماتم کر رہے ہیں۔ ہم ان انسانوں کو ڈھونڈ رہے ہیں جو آخرت کی بربادی کے اندیشے میں دیوانے ہو چکے ہوں۔

خدا کی دنیا میں آج سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر وہی ایک کام نہیں ہو رہا ہے جو خدا کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ یعنی آنے والے ہولناک دن سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔ اگر انسان اس پکار کے لئے نہ اٹھیں تو اسرافیل کا صور اسے پکارے گا۔ مگر آہ، وہ وقت جاگنے کا نہیں ہوگا۔ وہ ہلاکت کا اعلان ہوگا نہ کہ آگاہی کا الارم۔

آغازِ عمل

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مکہ سے نکلے تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

ما اطیبک من بلد و احبک الیّ۔ ولولا ان قومی اخرجونی منک ما سکنت غیرک (اے مکہ تو میرے نزدیک کتنا اچھا شہر ہے اور کتنا محبوب ہے۔ اور اگر تیری قوم مجھ کو تیرے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا کہیں نہ رہتا، ترمذی)

پیغمبر نے اپنے محبوب وطن سے محرومی کو گوارا کیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مدینہ میں اسلام کا زبردست مرکز قائم ہوگیا۔ اگر وہ مکہ سے ہجرت کرنے کے بجائے مکہ والوں سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرتے تو اسلام کی تاریخ بننے سے قبل پہلے ہی قدم پر ختم ہو جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑی عقلمندی محرومی پر راضی ہونا ہے اور سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ آدمی اپنی محرومی پر راضی نہ ہو ——— یہی ایک لفظ میں دنیا کی کامیابی اور ناکامی کا راز ہے اور یہی آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا راز بھی۔

محرومی پر راضی ہونا دوسرے لفظوں میں حقیقت واقعہ کا اعتراف کرنا ہے۔ جب آدمی حقیقت واقعہ کا اعتراف کرتا ہے تو وہ اپنی جدوجہد کے آغاز کو پالیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ حقیقت واقعہ کا اعتراف نہ کرے تو وہ ایسی چیزوں کے حصول کے لئے دوڑتا رہے گا جو اس کو ملنے والی نہیں۔

اس بات کو سن کر نادان لوگ ہمیشہ بول اٹھتے ہیں ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یا قوم آج محروم ہے وہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو محروم بنالے۔ اس قسم کا خیال زندگی سے سراسر ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ زندگی ایک نمو پذیر حقیقت ہے۔ زندگی میں ٹھہراؤ ممکن نہیں۔ جب آپ اپنے کو اس واقعی مقام پر رکھنے پر راضی ہوتے ہیں جہاں باعتبار حالات آپ کو ہونا چاہئے تو گویا آپ اپنے کو وہاں رکھتے ہیں جہاں آپ کی زندگی نمو پذیری کی صلاحیت کو بروئے کار لاسکتی ہے۔ جہاں سے آپ اپنی اگلی منزل کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ محرومی پر راضی ہونے والا اپنے آغاز کو پالیتا ہے، اور اپنے آغاز عمل کو پالینا ہی منزل پر پہنچنے کا سب سے بڑا راز ہے۔

کسی مفکر کا قول ہے "سیاست ممکنات کا کھیل ہے"، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آج ممکن ہے اس سے آغاز کر کے آپ وہاں پہنچ سکتے ہیں جو آج آپ کے لئے ممکن نہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ آج ہی سے ناممکن سے آغاز کریں تو سفر کا آغاز ہی نہ ہوگا۔ آپ ممکن سے بھی محروم رہیں گے اور ناممکن سے بھی۔

سب سے زیادہ ، سب سے کم

سردی کے موسم میں سانپ ٹھٹھرا پڑا ہوا ہے۔ بظاہر وہ ایک کالی رسی کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب آپ اس کو چھوتے ہیں تو اچانک وہ پھن نکال کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہی ہر آدمی کا حال ہے۔ ہر آدمی بظاہر اچھا آدمی ہے۔ مگر جب اس کو چھیڑیئے تو اچانک وہ ایسا بن جائے گا جیسے اس کے اندر برائی کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔

ایک شخص دیکھنے میں بالکل ٹھیک معلوم ہوگا۔ عام تعلقات میں وہ دیندار اور با اخلاق نظر آئے گا۔ لیکن اگر اس کو آپ سے کوئی شکایت ہو جائے، آپ سے اس کو کوئی ٹھیس پہنچ جائے تو وہ اگلے ہی لمحہ آپ کے لئے دوسرا انسان بن جائے گا۔ اب ایسا معلوم گویا اس کو دین اور اخلاق سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

ایک شخص اچھی اچھی باتیں کرے گا۔ وہ سچائی کا طالب دکھائی دے گا۔ لیکن اگر آپ اس پر تنقید کر دیجیے۔ آپ ایسی بات کہہ دیجئے جس کی زد اس کی ذات پر پڑتی ہو تو وہ فوراً بپھر اٹھے گا۔ ایسا نظر آئے گا گویا اس کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں کہ سنجیدگی کے ساتھ کسی مسئلہ کو سمجھ سکے۔

ایک شخص ہے جس کی نظر میں آپ طاقتور ہیں۔ آپ کے اندر وہ دنیوی اہمیت کی چیز دیکھتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ آپ کا زبردست قدرداں ہوگا۔ آپ اس کو عظیم انسان نظر آئیں گے۔ اور اگر آپ اس کی نگاہ میں کمزور ہوں آپ سے اس کو کوئی فائدہ نہ ہو تو اس کی نظر میں آپ بے قیمت ہوں گے۔ آپ کا اخلاص اس کو بے وقوفی دکھائی دے گا۔ آپ کی اچھی بات بھی اس کو بے وقعت معلوم ہونے لگے گی۔

ایک شخص ہے جس سے ابھی آپ کا کوئی معاملہ نہیں پڑا۔ اس سے آپ کے دور دور کے تعلقات ہیں ایسی حالت میں وہ بالکل صحیح بنا رہے گا۔ لیکن اگر اس سے کوئی معاملہ پیش آجائے۔ آپ کے کسی عمل سے اس کا مفاد مجروح ہو جائے تو اس کے بعد وہ ایسا بن جائے گا جیسے وہ بظاہر انسان مگر باطن حیوان تھا۔ اب وہ آپ کے سامنے ایک بالکل مختلف انسان کے روپ میں ظاہر ہوگا۔ وہ ایک ایسا شخص بن جائے گا جو ضد اور غصہ اور انتقام کے سوا کچھ اور جانتا ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خود پرست انسان دنیا میں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں، اور خدا پرست انسان دنیا میں سب سے زیادہ کم۔

محنت کے ذریعہ

جوزف کانریڈ (Joseph Conrad) پولینڈ کے ایک شہر بردِک زیو (Berdiczew) میں ۱۸۵۷ میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن ہی میں یتیم ہوگیا۔ اپنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں اس کو ملاحی کے ذریعہ اپنی معاش فراہم کرنی پڑی۔ اس کی باقاعدہ تعلیم بھی نہ ہو سکی۔ مختلف ملکوں میں سفر کرتا ہوا بالآخر وہ انگلستان پہنچا۔ اور ۱۸۸۶ میں اس نے برطانوی شہریت حاصل کر لی۔

برطانیہ کے زمانۂ قیام میں اس نے انگریزی سیکھنے کے لئے غیر معمولی محنت کی۔ یہاں تک وہ انگریزی زبان کا مستند ادیب بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے زمانہ میں انگلستان کے زندہ مصنفین میں اس کی شہرت ہارڈی (Hardy) کے بعد صرف نمبر ۲ پر تھی۔

اس کی کتاب لارڈ جم (Lord Jim) میں اس کے جو حالات چھپے ہیں اس میں اس کے بارے میں یہ جملہ درج ہے "اس نے انگریزی زبان میں صاحب طرز ادیب کا نام حاصل کیا اگرچہ ۱۹ سال کی عمر تک اس کا یہ حال تھا کہ وہ انگریزی کا ایک لفظ نہ بول سکتا تھا:

He made his name as a stylist in English
although he was unable to speak a word
of the language before he was nineteen.

جوزف کانریڈ کی دو درجن سے اوپر کتابیں ہیں جو زیادہ تر ناول یا کہانی کے پیرایہ میں ہیں۔ انگریزی اگرچہ اس کی مادری زبان نہ تھی مگر اس کی انگریزی کتابیں یونی ورسٹیوں کے تعلیمی نصاب میں شامل ہیں۔ اس نے ۱۹۲۴ میں انگلستان میں وفات پائی۔

انگلستان کے ایک باشندہ نے مجھ سے بتایا کہ کالج میں اس کے انگریز استاد نے ایک بار اس سے کہا کہ تم جوزف کانریڈ کو پڑھو۔ وہ بہت خوب صورت انگریزی لکھتا ہے:

Read Joseph Conrad. He writes beutiful English

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محنت ہر چیز کا بدل ہے۔ آپ غریب گھر میں پیدا ہو کر بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ بن سکتے ہیں۔ آپ غیر اہل زبان ہو کر اہل زبان جیسے ادیب بن سکتے ہیں۔ آپ لوگوں کی نظر میں غیر اہم ہوتے ہوئے ایسی چیز لکھ سکتے ہیں جس کو پڑھنے کے لئے تمام دنیا والے مجبور ہوں۔

جب حقیقت کھلے گی

دنیا میں کچھ لوگ وہ ہیں جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ دکھاوے کے لئے خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حال آخرت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہاں جب کہا جائے گا کہ اپنے رب کو سجدہ کرو تو وہ وہاں سجدہ نہ کر سکیں گے (قرآن ۴۲ - ۶۸)

سجدہ محض ایک وقتی اور رسمی نوعیت کا جسمانی فعل نہیں۔ وہ اپنے آپ کو حقیقت اعلیٰ کے آگے جھکانا ہے، وہ اپنی پوری زندگی کو حق و صداقت کے تابع بنا دینا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں محدود معنوں میں صرف "سجدہ" کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہ آیت پوری زندگی کے بارہ میں ایک اہم حقیقت کو بتا رہی ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر شخص اور ہر قوم کا یہ حال ہے کہ ان کے دل سچائی کے آگے جھکے ہوئے نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو حق کے تابع نہیں بنایا ہے۔ مگر ظاہری رویہ میں ہر ایک یہ دکھا رہا ہے کہ وہ حق پر قائم ہے۔ ہر ایک اپنی زبان سے ایسے الفاظ بول رہا ہے گویا کہ اس کا کیس انصاف کا کیس ہے نہ کہ ظلم اور استغلال کا کیس۔

مگر اس قسم کی دھاندلی صرف موجودہ امتحانی دنیا میں ممکن ہے۔ آخرت کے آتے ہی پوری صورت حال بالکل بدل جائے گی۔ بازار میں کھوٹے سکے چل سکتے ہیں مگر بنک میں کھوٹے سکے نہیں چلتے۔ اسی طرح آخرت میں اس کا امکان ختم ہو جائے گا کہ کوئی جھوٹی بات کو سچے الفاظ میں بیان کرے۔ کوئی بے انصافی کے عمل کو انصاف کا عمل ثابت کرے۔

آخرت میں یہ ہوگا کہ الفاظ جھوٹے معانی کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ کسی کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ ظلم کو انصاف بتائے اور باطل کو حق کے لباس میں پیش کرے۔ اس وقت ظاہر اور باطن کا فرق ختم ہو جائے گا۔ آدمی کی زبان وہی بول سکے گی جو اس کے دل میں ہے۔ اس دن ہر آدمی عین اس روپ میں دکھائی دے گا جو باعتبار حقیقت تھا نہ کہ اس روپ میں جو وہ مصنوعی طور پر دوسروں کے سامنے ظاہر کر رہا تھا۔

لوگ انسان کے سامنے اپنے آپ کو حق بجانب دکھا کر مطمئن ہیں کہ وہ حق بجانب ثابت ہو گئے۔ حالانکہ حق بجانب وہ ہے جو خدا کے سامنے حق بجانب ثابت ہو۔ اور وہاں کا حال یہ ہے کہ وہاں صرف حق حق ثابت ہوگا اور جو باطل ہے وہ وہاں صرف باطل ہو کر رہ جائے گا۔

ہمارا المیہ

نیوٹن ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ وہ پورے معنوں میں ایک مذہبی آدمی تھا۔ حتی کہ وہ چرچ بھی جاتا تھا۔ مگر دنیا کے سامنے وہ ایک سائنس داں کی حیثیت سے آیا نہ کہ ایک مذہبی انسان کی حیثیت سے شمسی نظام کے بارہ میں اس نے جو تحقیقات کیں انھیں کو مدون کرنے میں اس نے اپنی ساری عمر لگا دی اور اسی حیثیت سے وہ دنیا کے سامنے متعارف ہوا۔

یہی اکثر سائنس دانوں کا حال ہے۔ موجودہ زمانہ میں مغربی ملکوں میں جو بڑے بڑے علمائے سائنس اٹھے ان کی اکثریت اپنی ذاتی زندگی میں مذہبی تھی۔ وہ زیادہ تر عیسائی یا یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے حالات بتاتے ہیں کہ اپنے پیدائشی مذہب سے ان کا تعلق آخر وقت تک کسی نہ کسی طرح باقی تھا۔

مگر یہ سائنس داں دنیا کے سامنے جو چیز لے کر ابھرے وہ ان کا آبائی مذہب نہ تھا بلکہ سائنس تھی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی سائنسی تحقیقات میں گذار دی اور انھیں تحقیقات کو دنیا کے سامنے لانے کے لئے پرجوش طور پر کام کرتے رہے۔

اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مذہب ان کے لئے ایک آبائی وراثت تھی جب کہ سائنس ان کے لئے ایک دریافت کی حیثیت رکھتی تھی۔ آبائی وراثت کے معاملہ میں آدمی کبھی پرجوش نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس جو چیز اسے بطور دریافت ملتی ہے وہ اس کی سب سے بڑی چیز ہوتی ہے وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا کہ دنیا کے سامنے اسے پیش کرے۔

یہ ایک خارجی مثال ہے جس میں خود ملت اسلام کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر کثرت سے بڑے بڑے لیڈر پیدا ہوئے۔ انھوں نے بڑے بڑے کام بھی کئے۔ مگر ان میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے اقوام عالم کے سامنے اسلام کا پیغام پہنچانے کو کام سمجھا ہو اور اسی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہو۔

اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام ان کو بطور وراثت ملا تھا نہ کہ بطور دریافت۔ اگر اسلام ان کی "دریافت،، ہوتا تو انھیں اس کے بغیر چین نہ آتا کہ وہ اس کو سارے عالم تک پہنچا دیں۔ وہ اسی کے لئے جیتے اور اسی کے لئے مرتے۔ دنیا والوں سے کہنے کے لئے ان کے پاس سب سے بڑی بات یہی ہوتی۔ مگر جو اسلام بطور قومی وراثت ملا ہو وہ کبھی آدمی کے اندر اس قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔

اسراف کا نتیجہ

مصر کا حکمراں خدیو اسماعیل پاشا (۱۸۹۵ - ۱۸۳۰) اعلیٰ صلاحیت کا مالک تھا۔ اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ مصر کو عملی طور پر ترکی کی عثمانی خلافت سے آزاد کرلیا۔ بحر احمر اور بحر روم کو ملانے کے لئے نہر سوئز نکالنے کا منصوبہ (۱۸۶۶) اسی کے زمانہ میں بنا۔ اسماعیل پاشا نے اس منصوبہ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کو فوراً منظوری دے دی۔

خدیو اسماعیل پاشا عوام کو خوش کرنا بھی جانتا تھا۔ چنانچہ وہ مصر کا پہلا حکمراں ہے جس نے ملک میں ۱۸۶۷ میں منتخب اسمبلی کے طریقہ کو رائج کیا۔ اس کی زندگی میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو اس کی اعلیٰ صلاحیت کو ثابت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود خدیو اسماعیل پاشا کا آخری انجام یہ ہوا کہ وہ نالائق حکمراں قرار پایا۔ اور اپنے بیٹے توفیق پاشا کے حق میں اس کو تخت و تاج چھوڑنا پڑا۔

اس ناکامی کی وجہ خدیو اسماعیل پاشا کی ایک غلطی تھی۔ اور وہ اس کا حد سے بڑھا ہوا اسراف تھا۔ مصر میں وہ ایک فضول خرچ حکمراں کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ مصر سے باہر (ترکی فرانس وغیرہ) جاتا تو وہاں وہ اور بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ دولت خرچ کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانہ میں مصر کے قرضہ کی مقدار ۱۰۰ ملین پونڈ تک پہنچ گئی تھی۔

خدیو اسماعیل پاشا کی فضول خرچیوں کو پورا کرنے کے لئے مصر کا خزانہ ناکافی تھا۔ چنانچہ اس نے ملک کے بیت المال، خیراتی اوقاف اور یتیموں اور بیواؤں کے فنڈ سے بھی قرض لے رکھا تھا جو تقریباً ۵۳۷٫۰۰۰ پونڈ کے برابر تھا۔

ان قرضوں کی ادائیگی کے لئے اس نے مصری عوام کے اوپر ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کے زمانہ میں تقریباً چالیس قسم کے ٹیکس ملک میں نافذ تھے۔ عبد الرحمن الرافعی کی کتاب "اسماعیل" اور یوسف نحاس کی کتاب "الفلاح" میں اس کے ٹیکسوں کی جو تفصیل درج ہے وہ انتہائی دہشت ناک ہے۔ مثلاً قدیم مصری کسان ایک لباس پہنتے تھے جس کو زعبوط کہا جاتا تھا۔ اسماعیل پاشا کی حکومت نے اس کپڑے پر بھی ٹیکس لگا دیا۔

ایک زعبوط پر ایک ریال ٹیکس تھا۔ ادائیگی کے وقت زعبوط کی آستین پر ایک خاص قسم کی مہر لگا دی جاتی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ اس کا ٹیکس ادا ہو چکا ہے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ یہ مہر پانی لگنے سے

چھوٹ جاتی تھی۔ اس لئے کسان اپنے زعبو کو دھوتے ہوئے اس کے مہر کے حصہ کو چھوڑ دیتا۔ کیوں کہ معلوم تھا کہ ٹیکس وصول کرنے والے جو ہر وقت بازاروں میں گھومتے رہتے تھے مہر کا نشان مٹتے ہی اس کے اوپر دوسرا ریال لگا دیں گے۔ ٹیکسوں کی اس کثرت کے باوجود یہ حال تھا کہ دو سال تک سرکاری ملازموں اور فوجیوں کی تنخواہیں نہ دی جاسکیں۔

مگر قرض کی ادائیگی کے لئے یہ سارے ٹیکس بھی ناکافی ثابت ہوئے۔ کیوں کہ اسماعیل پاشا کا اسراف بھی اسی کے ساتھ برابر جاری تھا۔ آخر وہ اندوہناک واقعہ ہوا جس نے مصر کی تاریخ بدل ڈالی۔

اسماعیل پاشا نے قرضوں کی ادائگی کے لئے نہر سوئز میں حکومت مصر کے حصہ کو ۱۸۷۶ میں انگلستان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جب اس سے بھی قرضوں کا بوجھ ختم نہ ہوا تو اس نے فرانس کے قرضوں کے معاوضہ میں فرانس کو انگلستان کے ساتھ سوئز میں شریک قرار دے دیا۔ اور سوئز کے اوپر جہاں پہلے انگلستان اور مصر کا کنٹرول تھا، اب فرانس اور انگلستان کا کنٹرول قائم ہوگیا۔ اور اسی کے ساتھ مصر میں ان کی سیاست کے داخلہ کا دروازہ بھی کھل گیا۔

جمال عبدالناصر کا ۱۹۵۶ میں سوئز کو نیشنلائز کرنا گویا اسماعیل پاشا کی اسی غلطی کی اصلاح تھا۔ مگر صدر ناصر نے یہ دوسری غلطی کی کہ اسراف کی اصلاح ناعاقبت اندیشانہ اقدام سے کرنی چاہی جو مصر کے حق میں پہلے سے بھی زیادہ مہنگی ثابت ہوئی۔

زندگی خواہ افراد کی ہو یا قوموں کی، نہایت نازک امتحان ہے۔ یہاں ہر ایک کے حوصلہ اور ہوش مندی کی جانچ ہو رہی ہے۔ ہمیں ہر وقت چوکنا رہنا ہے۔ کیونکہ کوئی ایک غلطی بھی اتنی فیصلہ کن ہوسکتی ہے کہ ہماری ساری امیدوں پر پانی پھیر دے اور ہمارے لئے بالآخر حسرت کے سوا اور کچھ نہ چھوڑے۔

اعلان

روحانی کثافت

مشینی صنعت نے موجودہ زمانہ میں انسان کے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا کیا ہے جس کو کثافت (Pollution) کہا جاتا ہے۔ مشینوں اور کارخانوں کی وجہ سے شور میں اضافہ ہوا ہے جس کو (Noise Pollution) کہتے ہیں۔ اسی طرح پانی اور ہوا میں گندگی شامل ہو رہی ہے جس کو (Water Pollution) اور (Air Pollution) کہا جاتا ہے۔

کیونسٹ ملکوں میں اب ایک نئی اصطلاح وضع ہوئی ہے جس کو روحانی کثافت (Spiritul Pollution) کا نام دیا گیا ہے۔ اس اصطلاح کا آغاز کیمونسٹ چین سے ہوا ہے، سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن کے زمانہ میں امریکہ اور چین کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کے تحت چین اور مغربی دنیا کے درمیان آمد و رفت بڑھ گئی۔ اب مختلف قسم کے مذہبی اور ثقافتی وفد چین جانے لگے۔ چین کے رسائل میں مغربی دنیا کے مضامین چھپنے لگے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی دنیا کے افکار چین کے اندر پہنچنے لگے جو کیمونسٹ انقلاب کے بعد بالکل بند تھے ——— انفرادیت پسندی، فکری آزادی اور مذہبی خیالات جو چین میں اب تک ممنوع تھے وہ مغرب کے واسطے سے چین میں درآمد ہونے لگے۔ یہ کیمونسٹ نظریہ کے خلاف زبردست چیلنج تھا۔ یہ اس نظام فکر کو منہدم کرنے کے ہم معنی تھا جس پر کیمونسٹ چین کا سیاسی ڈھانچہ قائم ہے۔ چنانچہ چین میں اس "روحانی کثافت" کے خلاف سرکاری سطح پر زبردست مہم شروع ہوگئی ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ اس نئی کثافت سے اپنے ملک کو بکسر پاک کر دے (ٹائمس آف انڈیا ۹ نومبر ۱۹۸۳)

کیمونسٹ حضرات کا دعویٰ ہے کہ ان کا نظریہ تمام نظریات میں سب سے زیادہ صحیح نظریہ ہے۔ انسان کی فکری تلاش اپنے لمبے تجربہ کے بعد جس آخری سچائی پر پہنچی ہے وہ وہی ہے جس کو کیمونزم کہتے ہیں۔ جب ایسا ہے تو کیمونسٹ نظام غیر کیمونسٹ نظریہ سے خائف کیوں ہے۔ حق کو ناحق سے خطرہ کیوں درپیش ہے۔ اعلیٰ نظریہ کمتر نظریہ کے مقابلہ میں اپنے کو دفاعی پوزیشن میں کیوں محسوس کرتا ہے۔

کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس چیز کو کیمونسٹ مفکرین نے آخری سچائی سمجھا تھا وہ محض ایک احمقانہ فریب تھا۔ ان کا اجالا درحقیقت اندھیرا تھا جس کو انھوں نے غلطی سے اجالا سمجھ لیا۔

نازک سوال

آرتھر کونسلر موت کی طرف سفر کو نامعلوم ملک (Unknown Country) کی طرف سفر کہتا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ موت ہماری زندگی کا سب سے عجیب اور پر اسرار واقعہ ہے۔ ہر آدمی متجسس ہوتا ہے کہ یہ معلوم کرے کہ مر کر وہ کہاں پہنچنے والا ہے۔

امریکہ کے مشہور مشنری ڈاکٹر بلی گراہم کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے مسرت کا راز (The Secret of Happiness) اس کتاب میں بلی گراہم نے لکھا ہے کہ ایک بار مجھے دنیا کے ایک بہت بڑے لیڈر کا ارجنٹ پیغام ملا۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ فوراً مجھ سے ملاقات کرو۔

میں روانہ ہو کر مذکورہ لیڈر کے یہاں پہنچا۔ جب میں لیڈر سے اس کے دفتر میں ملا تو وہ فوراً مجھے الگ کمرہ میں لے گیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑے موثر لہجہ میں کہا :

I am an old man Life has lost all meaning I am ready to take a fateful leap into the Unknown Young man, can you give me a ray of hope

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ زندگی نے اپنی تمام معنویت کھو دی ہے۔ عنقریب میں نامعلوم دنیا کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان شخص، کیا تم مجھے امید کی کوئی کرن دے سکتے ہو۔

موت ہر آدمی کا پیچھا کر رہی ہے۔ بچپن اور جوانی کی عمر میں آدمی اسے بھولا رہتا ہے۔ مگر بالآخر تقدیر کا فیصلہ غالب آتا ہے۔ بڑھاپے میں جب اس کی طاقتیں گھٹ جاتی ہیں۔ تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب میں بہرحال جلد ہی مر جاؤں گا۔ اس وقت وہ مجبور ہوتا ہے کہ سوچے کہ "موت کے بعد کیا ہونے والا ہے"، اسے تلاش ہوتی ہے کہ وہ کوئی امید کی کرن پائے جو موت کے بعد آنے والے حالات میں اس کی زندگی کو تابناک کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے پیغمبر اسی امید کی روشنی کو دینے کے لئے آئے۔ پیغمبروں نے انسان کو بتایا کہ موت کے بعد ایک اور دنیا ہے جو ابدی بھی ہے اور معیاری بھی۔ موت کے بعد کی اس کامل دنیا میں اس کو داخلہ ملے گا جو موت سے پہلے کی دنیا میں صالح اعمال سے اس کا استحقاق ثابت کرے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے :

...and God calls to the home of peace.

اور خدا امن کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ (واللہ یدعوا الیٰ دارالسلام، یونس ۲۵)

مذہب پر سائنسی استدلال

قدیم زمانہ میں پانی کو صرف پانی سمجھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی میں خوردبین ایجاد ہوئی۔ خوردبین سے جب پانی کو دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ پانی صرف پانی نہیں ہے۔ اس میں بے شمار زندہ بیکٹیریا بھی موجود ہیں۔ اسی طرح آسمان پر جو ستارے نظر آتے ہیں، آدمی نے سمجھا کہ وہ تعداد میں اتنے ہی ہیں جتنا کہ بظاہر ننگی آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں جب آسمان کا مشاہدہ دوربین سے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ستارے اس سے بہت زیادہ تعداد میں ہیں جو بظاہر خالی آنکھ سے نظر آتے ہیں۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے قدیم زمانہ اور جدید زمانہ کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جدید زمانہ کے یہ مشاہدات یقینی طور پر بتا رہے تھے کہ حقائق اس سے بہت زیادہ ہیں جو انسان نے اپنے سادہ مشاہدہ کے دائرے میں اس سے پہلے سمجھ رکھا تھا۔ مگر جو لوگ ان نئے مشاہدات کو سامنے لا رہے تھے وہ اپنی دریافتوں کی بنا پر اتنے زیادہ جوش میں تھے کہ انھوں نے ایک اور دعویٰ کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ حقیقت وہی ہے جو براہ راست ہمارے مشاہدے میں آئے۔ جو چیز ہمارے براہ راست مشاہدے اور تجربہ میں نہ آئے وہ محض مفروضہ ہے، اس کا کوئی وجود نہیں۔

انیسویں صدی میں یہ دعویٰ بہت زور شور کے ساتھ کیا گیا۔ اس دعویٰ کی زد سب سے زیادہ مذہب پر پڑتی تھی۔ مذہب جن اعتقادات کا مبلغ ہے وہ سب غیبی اعتقادات ہیں۔ یعنی وہ براہ راست ہمارے تجربہ اور مشاہدہ میں نہیں آتے۔ اس بنا پر بہت سے لوگوں نے سمجھ لیا کہ مذہب ایک فرضی چیز ہے، اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔

مگر بیسویں صدی کی تحقیقات نے اس صورت حال کو بالکل بدل دیا ہے۔ مزید مطالعہ کے بعد انسان کو یہ معلوم ہوا کہ حقائق صرف اتنے ہی نہیں ہیں جو براہ راست ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں بلکہ ان مشاہدات کے ماورا بھی بہت سی حقیقتیں ہیں۔ بلکہ تمام بڑی بڑی حقیقتیں مشاہدات کے ماورا ہی پائی جاتی ہیں۔

برٹرینڈرسل کے الفاظ میں علم کی دو قسمیں ہیں، چیزوں کا علم (Knowledge of things) اور صداقتوں کا علم (Knowledge of Truths) ہم براہ راست طور پر صرف "چیزوں" کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد جو "صداقتیں" ہیں، وہ صرف بالواسطہ مشاہدہ، بالفاظ دیگر صرف استنباط (Inference) کے ذریعہ جانی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر روشنی (Light) کشش (Gravity) مقناطیسیت

(Magnetism) جوہری طاقت (Nuclear Energy) وغیرہ۔ یہ سب بلاشبہ کائنات کی مسلّمہ حقیقتیں ہیں، مگر انسان ان کو براہ راست طور پر نہیں دیکھتا۔ وہ صرف ان کے اثرات (Effects) کے ذریعہ ان کو جانتا ہے۔ انسان کے تجربہ میں کچھ "چیزیں" آتی ہیں جن سے وہ مستنبط کرتا ہے کہ فلاں فلاں "صداقتیں" یہاں پائی جا رہی ہیں۔

بیسویں صدی میں علم کی اس تبدیلی نے بنیادی طور پر سارے معاملہ کو بدل دیا۔ انسان مجبور ہو گیا کہ وہ ایسی چیزوں کے وجود کا اعتراف کرے جن کو وہ براہ راست نہیں دیکھتا۔ البتہ بالواسطہ تجربات بتاتے ہیں فلاں قسم کی حقیقت یہاں موجود ہونی چاہئے۔ علم کی اس تبدیلی نے تاریخ میں پہلی بار یہ کیا کہ مشاہداتی حقیقت اور غیبی حقیقت کے فرق کو ختم کر دیا۔ اب نہ دیکھی جانے والی چیز بھی اتنی ہی اہم بن گئی جتنی کہ دیکھی جانے والی چیز۔ انسان مجبور ہو گیا کہ یہ مانے کہ بالواسطہ استدلال یا استنباطی استدلال (Inferential Argument) بھی علمی طور پر اتنا ہی معقول (Valid) ہے جتنا کہ براہ راست استدلال (Direct Argument)

علم میں اس تبدیلی نے موجودہ زمانہ میں الہیاتی استدلال کو عین سائنٹفک استدلال بنا دیا ہے۔ مثلاً خدا کے وجود پر علمائے الہیات کا سب سے بڑا استدلال وہ ہے جس کو فلاسفہ نظم سے استدلال (Argument from Design) کہتے ہیں۔ یہ استدلال انیسویں صدی کے پرجوش علماء نے نہیں مانا۔ انھوں نے کہا کہ یہ استنباطی استدلال ہے اور استنباطی استدلال علمی طور پر معقول نہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس اعتراض کی بنیاد ختم ہو چکی ہے۔ آج کا انسان مجبور ہے کہ وہ نظم کائنات سے ناظم کائنات پر استدلال کو اتنا ہی علمی اور معقول مانے جتنا کہ وہ مشین کے پہیہ کی حرکت سے Flow of electron کے نظریہ کو معقول سمجھتا ہے۔

اعلان

ماہنامہ الرسالہ کے پچھلے شمارے برائے فروخت دفتر الرسالہ میں موجود ہیں۔ شائقین طلب فرمائیں۔ مکمل فائل کی قیمت ۲۶ روپیہ فی سال (بغیر کمیشن) ہوگی۔ جلد کی قیمت علیحدہ چارج کی جائے گی۔ متفرق شماروں پر کمیشن ۲۵ فی صد۔

نیجر الرسالہ

ناقص تجزیہ

ایک مشہور عالم اور قائد نے اپنی خود نوشت سوانح عمری شائع کی ہے۔ اس میں وہ "الغار خلافت کا منحوس اقدام" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

"خلافت ایک دینی منصب اور اس کا قائم رکھنا مسلمانوں کا دینی فریضہ تھا۔ قرون اولیٰ کے مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی مختصر سے مختصر وقفہ بھی خلیفۃ المسلمین کی موجودگی کے بغیر گذر سکتا تھا ...... لیکن بالآخر جو منصب جلیل وفات رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد سے کسی نہ کسی شکل میں اس وقت تک چلا آرہا تھا، اور عثمانیوں نے (اپنی ساری کمزوریوں اور بہت سی قابل گرفت باتوں کے باوجود) اس کی شان و شوکت قائم رکھی تھی اور یورپ کے دل پر اس کی دھاک بٹھا رکھی تھی اور جو حرمین شریفین کی پاسبان و محافظ تھی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۲۴ میں اس کا کمال اتاترک کے (جس کا ہندستانی مسلمان اپنی ناواقفیت کی بنا پر عرصہ تک کلمہ پڑھتے رہے تھے) ہاتھوں بیک گردش قلم و جنبش لب خاتمہ ہو گیا۔ اگر پوچھا جائے کہ عالم اسلام کے لئے آخری صدیوں کی طویل تاریخ میں منحوس ترین دن کون تھا؟ تو ایک باخبر اور حقیقت پسند مورخ اس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکتا کہ ۳۰ مارچ ۱۹۲۴ کی تاریخ تھی جب ٹرکی کی مجلس وطنی (پارلیمنٹ) نے الغار خلافت کا فیصلہ کیا اور مقامات مقدسہ ہی نہیں مسلمانوں کی عزت و آبرو کا وہ مضبوط حصار ٹوٹ گیا جس کو ترکوں نے اپنی قربانیوں، فوجی طاقت اور خلافت کے مقدس نام سے تعبیر کیا تھا۔" (کاروان حیات صفحہ ۷۴-۷۵)

یہ تاریخ کا بے حد ناقص مطالعہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ ایک شخص نے مسلمانان عالم کے سیاسی ادارہ (خلافت) کو ختم کر دیا یا ایک شخص اس کو ختم کر سکتا تھا۔ اس قسم کے واقعات وسیع تر تاریخی عوامل کے تحت ہوتے ہیں نہ کہ کسی فرد واحد کی کارروائی کے تحت۔

مذکورہ عالم اور قائد ایک بہت بڑی اسلامی درس گاہ کے ناظم ہیں۔ اگر وہ کسی دن اعلان کر دیں کہ آج سے یہ درس گاہ ختم کی جاتی ہے تو کیا وہ ختم ہو جائے گی۔ یا وہ اعلان کریں کہ اب یہ اسلامی تعلیم کی درس گاہ نہیں ہوگی بلکہ یہاں ہندو ازم اور بدھ ازم کی تعلیم دی جائے گی تو ان کے اعلان کی بنا پر کیا یہ اسلامی درس گاہ ہندو درس گاہ بن جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی "اتاترک" خلافت اسلامی کے عالمی ادارہ کو محض اپنے فیصلہ سے ختم کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت اسلامی کا ادارہ اس لئے ختم ہوا کہ تاریخی حالات نے اس کو ختم

کر دیا تھا۔ اتاترک نے صرف ایک ہونے والے واقعہ کا اعلان کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۴ تک عثمانی خلافت کے ماتحت مسلم ممالک میں قومی تحریکیں زبردست قوت کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ تحریکیں شدت کے اس درجہ تک پہنچ چکی تھیں کہ ترکی میں بیٹھ کر ان ممالک پر حکومت کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ گویا تقریباً وہی صورت حال تھی جو موجودہ صدی کے وسط میں برطانیہ کے لئے ہندستان میں پیدا ہوچکی تھی۔ برطانی وزیر اعظم لارڈ اٹیلی نے ہندستان کو برطانی غلامی سے آزاد نہیں کیا بلکہ ایک ہونے والے واقعہ کا سیاسی اعتراف کرلیا۔ اسی طرح کمال اتاترک نے حقیقۃً خلافت کو ختم نہیں کیا بلکہ وہ خلافت جس کو اس کے ماتحت مسلم ممالک اپنے قومی جوش کے تحت قبول کرنے سے انکار کرچکے تھے اس کو مان لیا اور ان ملکوں کی خواہش کے مطابق انھیں قومی آزادی دے دی۔

اس زمانہ میں عرب ممالک قومی جذبات سے اس قدر سرشار تھے کہ ان کے درمیان اگر کوئی سمجھ دار آدمی خلافت کو باقی رکھنے کی بات کرتا تو وہ اس کو قومی غدار سمجھ لیتے۔ ایک بڑے عرب عالم جو خلافت کی ماتحتی کو باقی رکھنا چاہتے تھے جب ان کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنا پڑا تو انھوں نے کہا:

سیعلم قومی انی لا اغشهم
ومهما استطال الليل فالصبح واصل

جلد ہی میری قوم جان لے گی کہ میں نے اس کو دھوکا نہیں دیا ہے اور رات کتنی ہی لمبی ہو بہر حال اس کے بعد صبح آتی ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے جو لیڈر اٹھے انھوں نے حالات کا تجزیہ کرنے میں کتنی زبردست غلطیاں کیں۔ اور جب تجزیہ غلط ہو تو لازمی طور پر عملی پروگرام بھی غلط اور بے نتیجہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اکثر مسلم لیڈر کسی نہ کسی فرد کو مسلم مصائب کا ذمہ دار قرار دے کر اس کے خلاف طوفان مچاتے رہتے ہیں۔ مگر جب وہ اس فرد کو ختم کرلیتے ہیں یا اس کو سولی پر چڑھا دیتے ہیں تو اس کے بعد بھی مسائل بدستور باقی رہتے ہیں۔ جن لوگوں کے بس میں قتل کرنا ہے وہ قتل کر رہے ہیں۔ جن کے پاس قتل کرنے کی طاقت نہیں وہ مفروضہ ذمہ دار شخص کے خلاف الفاظ کا طوفان مچائے ہوئے ہیں۔

ہمارے مسائل کسی فرد کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ وہ وسیع تر تاریخی اسباب کے پیدا کردہ ہیں۔ اور جب تک ان تاریخی اسباب کو دور نہ کیا جائے ہمارے مسائل حل نہیں ہوسکتے۔

حق کی پہچان

شری رام رتن کپلا دہلی میں ریفریجریٹر کے تاجر ہیں اور شری موتی رام صراف دہلی میں سونے چاندی کا کاروبار کرتے ہیں۔ دونوں میں بہت دوستی ہے۔ اکثر صبح کو دونوں ایک ساتھ ٹہلنے کے لئے نکلتے ہیں اور ایک ساتھ واپس آتے ہیں۔

ایک روز دونوں ایک مقام پر ٹہل رہے تھے۔ شری رام رتن کپلا کو ایک جگہ راستے کے کنارے ایک چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی۔ انھوں نے اس کو شیشہ کا ٹکڑا سمجھا اور تفریح کے طور پر ہاتھ میں اٹھا لیا۔

ٹہلنے کے بعد دونوں گھر واپس آئے۔ شری رام رتن کپلا نے واشن بیسن پر ہاتھ دھویا اور مذکورہ ٹکڑے کو بے خیالی کے ساتھ ایک کنارے ڈال دیا۔

اس کے بعد شری موتی رام صراف اپنا ہاتھ دھونے کے لئے واشن بیسن پر آئے۔ ان کی نگاہ مذکورہ ٹکڑے پر پڑی۔ اس کی چمک دیکھتے ہی فوراً انھوں نے پہچان لیا کہ یہ ہیرا ہے۔ انھوں نے اس کو اٹھالیا اور اس کو دھو کر شری رام رتن کپلا کے پاس لے گئے۔ جب انھوں نے بتایا کہ یہ ہیرا ہے تو شری رام رتن کپلا کو بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تو اسے معمولی شیشہ کا ٹکڑا سمجھا تھا۔ خیریت ہوئی کہ میں نے اسے پھینک نہیں دیا۔

شری رام رتن کپلا ہیرے سے بے خبر نہ تھے۔ ان کے گھر میں ہیرے کا نیکلس موجود تھا جس کو وہ نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی مخصوص الماری میں رکھے ہوئے تھے۔ مگر راستہ میں پڑے ہوئے ہیرے کو وہ پہچان نہ سکے۔

شری موتی رام صراف بھی ہیرے سے واقف تھے اور شری رام رتن کپلا بھی۔ فرق یہ ہے کہ شری موتی رام جوہری تھے۔ وہ ہیرے کو اس کے جوہر کی بنیاد پر پہچان سکتے تھے خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ مگر شری رام رتن کپلا صرف اس ہیرے سے واقف تھے جو ان کے معلوم نیکلس میں لگا ہوا ہو۔ معلوم نیکلس کے باہر کسی ہیرے کے ٹکڑے کو پہچاننا انھیں نہیں آتا تھا۔

وہ شخص جوہری نہیں جو ہیرے کو صرف اس وقت پہچانے جب کہ وہ اس کے اپنے ہار میں لگا ہوا ہو۔ جوہری وہ ہے جو ہیرے کو اپنے ہار میں بھی پہچانے اور دوسرے کے ہار میں بھی۔ اسی طرح حق شناس وہ ہے جو حق کو ہر حال میں پہچان لے، خواہ وہ اس کے اپنے حلقہ کے اندر ہو یا اس کے اپنے حلقہ کے باہر۔

دعوتی مشن

ایک غیر مسلم ایک مولوی صاحب کے یہاں آیا اور یہ سوال کیا کہ اسلام کیا ہے۔ مولوی صاحب نے بہت اچھے انداز میں اس کے سامنے توحید اور آخرت اور مساوات بنی آدم کی تشریح کی۔ غیر مسلم جب چلا گیا تو کچھ مسلمان جو وہاں بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے، انھوں نے مولوی صاحب سے کہا: حضرت، ہم آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ ہم کو وسیلہ اور زیارت قبر جیسے مسائل کی تفصیل بتاتے ہیں۔ اور غیر مسلم نے آپ سے اسلام کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے اس کو دوسری باتیں بتائیں۔ کیا ہمارا اسلام اور ہے اور ان کا اسلام اور۔ اس کے جواب میں مولوی صاحب نے کہا: "اجی، یہ غیر مسلم ہمارے ان جھگڑوں کو کیا سمجھیں گے۔ ان کو تو اسلام کی بنیادی باتیں ہی بتائی جا سکتی ہیں"۔

مسلمانوں کو آج جہاں دیکھئے، آپس کے جھگڑوں میں مبتلا ہیں۔ شیعہ اور سنی کا جھگڑا، دیوبندی اور بریلوی کا جھگڑا، حنفی اور اہل حدیث کا جھگڑا، ایک جماعت اور دوسری جماعت کا جھگڑا۔ اور یہ سب کچھ عین اسلام کے نام پر ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اسلام ان کے نزدیک صرف آپس کے بحث اور جھگڑے کا نام ہے۔

مگر یہی مسلمان جو آپس میں معمولی مسائل اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے جھگڑتے ہیں، انھیں کو اگر غیر مسلموں کے سامنے اسلام پیش کرنا ہو تو وہ سنجیدہ اور حقیقت پسند بن جاتے ہیں۔ وہ جھگڑے والی باتوں کو حذف کر کے ان کے سامنے وہ اسلام پیش کرتے ہیں جو بنیادی ہے اور جس میں ایک فرقہ اور دوسرے فرقہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام موجودہ خرابیوں کا سبب یہ ہے کہ وہ دعوت اسلام اور شہادت علی الناس کے کام سے ہٹ گئے ہیں۔ دوبارہ ان کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کو دعوت اسلام اور شہادت علی الناس کے کام پر لگایا جائے۔

دعوت عام کا کام عین اپنی فطرت کے اعتبار سے آدمی کو اسلام کی بنیادی باتوں کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس کے جدوہ فروعی چیزیں اپنے آپ حذف ہو جاتی ہیں جو اختلافات کا اصل سبب ہیں۔ غیر مسلموں میں خدا کے دین کو پہنچانے کا کام بیک وقت دعوتی ذمہ داری کی ادائیگی بھی ہے اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی موثر ترین تدبیر بھی۔

قیادت کا المیہ

دہلی میں قانون کے ایک طالب علم سے پوچھا گیا کہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تم کیا کرو گے۔ اس نے جواب دیا۔

"چل گئی تو موتی لال، نہیں چلی تو جواہر لال"

ہندستان کی سیاست میں جو لوگ "جواہر لال" بنے وہ وہی تھے جن کی "نہیں چلی تھی"، پریکٹس یا کاروبار میں ناکام ہونے والے لوگ سیاست کے میدان میں داخل ہو گئے۔ یہاں عمل کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ تقریریں اور بیانات کافی تھے۔ چنانچہ بہت جلد وہ کامیاب لیڈر بن گئے۔

یہ بات مسلم قیادت کے لئے اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم قیادت سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔ اس کی غالباً سب سے بڑی وجہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ حقیقی زندگی میں ناکام رہنے والے لوگ قیادت کے میدان میں داخل ہو گئے۔ حقیقی زندگی میں حقیقی لیاقت درکار تھی مگر قیادت کے میدان میں صرف تقریریں اور تحریریں کافی تھیں۔ اور یہ دوسرا سرمایہ ان لوگوں کے پاس کافی تعداد میں موجود تھا۔ عمل کے میدان میں ناکام رہنے والے لوگ الفاظ کے میدان میں آفتاب اور ماہتاب بن کر چمک اٹھے۔

ان لوگوں کے پاس ملت کو دینے کے لئے کوئی حقیقی عمل نہ تھا۔ ان کے پاس صرف الفاظ تھے جن کے سہارے وہ اپنا مقام پیدا کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ انھوں نے رومانی شاعری، جذباتی تقریریں مبالغہ آمیز بیانات اور وقتی نعروں اور ہنگاموں پر اپنی قیادت کی عمارت کھڑی کی۔ اس طرح انھیں ذاتی عظمت تو حاصل ہو گئی مگر ملت کو عظمت کی منزل تک پہنچانے میں وہ سراسر ناکام رہے۔

ایک مثال لیجئے۔ ہندستان کی مسلم قیادت کا ایک اہم اشو انگریزی اخبار رہا ہے۔ "ہندستان کے انگریزی اخبارات مسلم خبروں کی صحیح رپورٹنگ نہیں کرتے"۔ یہ بات تقریباً ہمارے ہر لیڈر کی زبان ہے۔ اس عنوان پر ہمارے لیڈروں نے مسلمانوں کے جذبات اس قدر زیادہ بھڑکائے ہیں کہ حال میں ایک صاحب نے ماہنامہ الرسالہ کے بارے میں کہا کہ الرسالہ میں ٹائمس آف انڈیا کے اقتباسات ہوتے ہیں، جب کہ ٹائمس آف انڈیا مسلمانوں کا دشمن نمبر ایک ہے۔ ان کے نزدیک چوں کہ الرسالہ میں دشمن اخبار کے اقتباسات چھپتے ہیں اس لئے الرسالہ مسلمانوں کو پڑھنا نہیں چاہئے۔

اس قسم کی لایعنی باتوں کی ذمہ داری تمام تر ہماری مسلم قیادت پر ہے۔ وہ ہندستان کے موجودہ

انگریزی اخبارات کے خلاف جو شیلے بیانات دیتے ہیں۔ وہ "مسلمانوں کے انگریزی اخبار" کے نام پر بڑے بڑے چندے وصول کرتے ہیں مگر یہ سب کچھ محض لفظی پہلوانی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج تک مسلمانوں کا انگریزی اخبار وجود میں نہ آسکا۔ نہ یہی ممکن ہوا کہ موجودہ انگریزی اخبارات میں مسلمانوں کی کوئی قابل ذکر نمائندگی ہوسکے۔

دوسری طرف اس معاملہ میں ہمسایہ قوموں کا حال دیکھئے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہندستان کی آزادی سے پہلے ہندستان کی انگریزی صحافت انگریزوں یا انگریزوں کے تربیت یافتہ افراد کے ہاتھ میں تھی۔ یہی لوگ اس وقت ملک کی انگریزی صحافت پر چھائے ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد یہ سوال تھا کہ اب اس ملک میں انگریزی صحافت پر کس کا قبضہ ہو۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ سارے ہندستان میں صرف ممبئی یونی ورسٹی میں جرنلزم کا ڈپلوما کورس تھا۔ ڈگری کے درجہ کی تعلیم کے لئے آدمی کو انگلینڈ جانا پڑتا تھا۔ اس وقت ایک سردار پروفیسر نے پنجاب یونی ورسٹی (چنڈی گڑھ) میں جرنلزم کا ڈگری کورس شروع کیا۔ تاہم ابتداءً اس شعبہ کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوسکی۔ بہت کم طلبہ اس میں داخلہ لینا پسند کرتے تھے۔ جب طلبہ کا پہلا دستہ نظری تعلیم مکمل کر چکا تو اس کی عملی تربیت کی ضرورت پیش آئی۔ مذکورہ پروفیسر ان کو لے کر دہلی آئے تاکہ یہاں کے بڑے بڑے اخبارات اور نیوز ایجنسیوں میں ان کو عملی تربیت کے لئے رکھ سکیں۔ مگر بمشکل کچھ لوگ ان کو اپنے یہاں لینے کے لئے تیار ہوئے۔ تاہم پروفیسر نے اپنی کوشش جاری رکھی یہاں تک کہ ان کے پڑھائے ہوئے طلبہ عملی تربیت پاکر اخباری اداروں میں داخل ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے یہ تناسب بڑھتا رہا۔ بالآخر یہ حال ہوا کہ یہ طلبہ اکثر اخباری اداروں میں نظر آنے لگے۔ پروفیسر موصوف نے اپنی روداد بیان کرتے ہوئے ایک بار کہا ——— پہلی بار جب میں دہلی آیا تھا تو یہاں کسی نے مجھ کو لفٹ نہ دی۔ مگر اب یہ حال ہے کہ میں انھیں اخباری دفتروں میں آتا ہوں تو آدھے آدمی میرے استقبال کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ میرے شاگرد ہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں کام کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ یہ ہے کسان کی طرح خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو نتیجہ خیز کام میں لگانا۔ مذکورہ واقعہ میں ایک شخص نے اپنے آپ کو ملک کی سو یونیورسٹیوں میں سے ایک یونیورسٹی کے ایک شعبہ میں وقف کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی انگریزی صحافت پر اس کی قوم کا غلبہ ہوگیا۔ اس کے برعکس جو لوگ احتجاج اور مطالبہ کر رہے ہیں وہ اسی مدت میں کوئی بھی صحافتی مقام پیدا نہ کرسکے۔

ایٹمی ہلاکت

امریکہ میں ایک فلم تیار ہوئی ہے جس کا نام ہے ــــــ اگلے دن :

The Day After

اس فلم میں دکھایا گیا ہے کہ اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو اس کے اگلے دن کیا ہوگا۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جنگ کے بعد زمین کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوگا۔ اور زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہوگا۔ حکومت امریکہ کا ردعمل اس فلم پر بہت سخت ہوا۔ کیونکہ امریکی حکومت ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری پر جو بے پناہ دولت خرچ کر رہی ہے وہ سب اس کی روشنی میں غلط ثابت ہوتا ہے۔ یہ بحث اتنی بڑھی کہ امریکی صدر رونالڈ ریگن کو ریڈیو پر ایک تقریر نشر کرنی پڑی۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ایٹمی جنگ میں اگر امریکہ کو نقصان پہنچے گا تو روس کو اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچے گا، اور آزادی محفوظ رہ جائے گی۔

While the U.S. is being hurt, the Russians are being hurt more, and the freedom and liberty will survive

ان لوگوں کی قسمت بھی کیسی عجیب ہوگی جو ایٹمی جنگ کے بعد آزادی پائیں گے۔ روس کے سابق وزیر اعظم نکیتا خروشچیف اگرچہ خود بھی ایٹمی جنگ کی آگ بھڑکانے میں شریک تھے۔ تاہم انھوں نے اس قسم کے عذر کے لئے بجا طور پر کہا تھا :

It is a case of the living envying the dead

یعنی یہ ایک ایسی زندگی ہوگی جب کہ زندہ رہنے والوں کو مُردوں پر رشک آئے (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ نومبر ۱۹۸۳)

۲۰ نومبر ۱۹۸۳ کو دو نوبل انعام یافتہ سائنس دانوں نے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل (Javier Perez de Cuellar) سے مل کر ایک یادداشت ان کے حوالے کی (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ نومبر ۱۹۸۳) اس یادداشت پر بارہ ہزار سائنس دانوں کے دستخط ہیں جو کہ چالیس سے زیادہ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذکورہ نوبل انعام یافتہ سائنس دانوں کے نام یہ ہیں :

1. Mr. Philip Anderson (Princeton University)
2. Mr. James Cronin (Chicago University)

اس یادداشت میں اقوام متحدہ کی معرفت ایٹمی طاقتوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں پر

مکمل پابندی عائد کریں۔ اس کے الفاظ میں، ہیروشیما اور ناگاساکی کے ۳۸ سال بعد بھی دنیا مستقل طور پر اپنے آپ کو اس خطرہ میں پا رہی ہے کہ ایٹمی جنگ کے ذریعہ اس کا خاتمہ ہو جائے:

Thirty eight years after Hiroshima and Nagasaki the world finds itself under a constant threat of annihilation by nuclear war.

اسی زمانہ میں اس سلسلے کا ایک اور واقعہ پیش آیا ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو مصنوعی سیارے خلا میں بھیجے گئے ہیں۔ ان کے ذریعہ بہت سی نئی باتیں انسان کے علم میں آئی ہیں۔ ان معلوماتی سیاروں پر مخصوص قسم کے کیمرے اور طرح طرح کے آلات نصب ہوتے ہیں جو خلا کے بارے میں مسلسل معلومات زمین پر بھیجتے رہتے ہیں۔

اس طرح جو چیزیں معلوم ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ سیارہ مریخ (Mars) کے چاروں طرف زبردست مقدار میں گرد کا طوفان چھایا ہوا ہے۔ چنانچہ سورج کی شعاعیں مریخ کی سطح پر نہیں پہنچ پاتیں اور اس بنا پر مریخ کا ٹمپریچر خطرناک حد تک کم ہو گیا ہے۔

اس دریافت نے دو سائنس دانوں کو متاثر کیا۔ ان کو معلوم تھا کہ ایٹمی انفجار سے بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ بہت بڑی مقدار میں زمینی ذرات اڑ کر فضا میں چلے جاتے ہیں (ایک میگاٹن بم کے پھٹنے سے ایک لاکھ ٹن سے زیادہ ذرات) اب ان کے سامنے یہ سوال آگیا کہ اگر ایٹمی جنگ ہو تو ایٹم بم کے پھٹنے سے جو ذرات اڑ کر فضا میں پہنچیں گے ان کے اثرات زمین پر کیا ہوں گے۔

اس ابتدائی سوال سے آغاز کر کے انھوں نے تحقیق شروع کی تو ان کے مطالعہ کے نتائج ایک پوری کتاب کی صورت اختیار کر گئے۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل نام سے شائع ہوئی ہے —— ایٹمی جنگ کے طویل المدت حیاتیاتی نتائج:

The Long-Term Biological consequences of Nuclear War

اس کتاب کے مصنف اسٹینفورڈ کے پال اہرلچ (Paul Ehrlich) اور کارنیل کے کارل ساگن (Carl Sagan) ہیں۔ اس کے علاوہ مزید ۸ سائنس دانوں نے کتاب پر تصدیقی دستخط کئے ہیں۔ اس کتاب میں فنی تجزیہ کر کے بتایا گیا ہے کہ ایٹمی جنگ کا مطلب ہے زمین سے انسانی نسل کا خاتمہ:

Nuclear warfare means the extinction of the human race. when the missiles fly, the end is nigh.

ایٹمی جنگ ہوئی تو دفعۃً اربوں انسان مر جائیں گے۔ اور جو لوگ اپاہج اور زخمی ہو کر بچیں گے وہ بھی

جلد ہی موت کا شکار ہو جائیں گے۔ کیوں کہ زمین پر ان کے سانس لینے کے لئے زہریلی گیس ہوگی۔ نیز غیر معمولی ٹھنڈ، اندھیرا اور ریڈیائی تابکاری۔ ایٹمی جنگ اگرچہ مدت کے اعتبار سے تاریخ کی مختصر ترین جنگ ہوگی مگر اپنے بعد وہ ایسی دنیا چھوڑے گی جس میں انسان جیسی مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی۔

انسانیت کی بچی ہوئی نسل زمین پر سخت ٹھنڈک کی وجہ سے مفلوج ہو جائے گی اور تاریکی کی بنا پر تمام موجودہ سرگرمیاں ختم ہو جائیں گی۔ فضا میں دھوئیں اور گرد کی وجہ سے سورج کی شعاعیں سطح زمین پر نہیں پہنچیں گی۔ ٹمپریچر خطرناک حد تک کم ہو جائے گا اور زمین ایٹمی سردی (Nuclear winter) کے حوالے ہو جائے گی۔

امریکہ اور روس کے پاس جو دور مار میزائل ہیں ان کی مجموعی مقدار تقریباً پانچ ہزار میگاٹن ہے۔ اگر ایٹمی جنگ میں یہ سب کے سب استعمال ہو جائیں تو زمین کے تقریباً نصف حصہ پر کم از کم عارضی طور برفانی دور (Ice age) جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے۔ ایٹمی جنگ کے بعد زمین پر جو حالات پیدا ہوں گے وہ مذکورہ تحقیق کے مطابق مختصر طور پر یہ ہیں:

۲۲۵ ملین ٹن دھواں فضا میں داخل ہوگا۔ یہ دھواں اتنا زیادہ ہے کہ وہ زمین کے بڑے حصہ کو ڈھانک لینے کے لئے کافی ہے، اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ زمین تک پہنچنے والی سورج کی شعاعیں تقریباً ۹۰ فی صد تک آنے سے رک جائیں گی۔

زمین کا تقریباً نصف حصہ بالکل رات کی طرح تاریک ہو جائے گا۔ ٹمپریچر نقطۂ انجماد سے نیچے آجائے گا اور یہ حالت تقریباً تین مہینے تک باقی رہے گی۔

سورج کی شعاعوں کے زمین تک نہ پہنچنے سے فوٹو سنتھے سس (Photo-synthesis) کا عمل رک جائے گا جس کی وجہ سے پودے اس قابل ہوتے ہیں کہ وہ سن لائٹ کو انرجی میں تبدیل کر سکیں۔ یہ وہ کلیدی عمل ہے جو زندگی کے لئے مددگار ہے۔ اس کے نتیجہ میں زمین پر پودے ختم ہو جائیں گے اور اسی کے ساتھ وہ جاندار بھی جو پودوں پر پرورشں پاتے ہیں۔

جب تاریکی اور ٹھنڈ ختم ہوگی تو ایک اور شدید خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ ایٹمی دھماکوں سے پیدا ہونے والے کیمیائی ردعمل کا یہ نتیجہ ہوگا کہ فضا میں اوزون کی تہ Ozone layer موجودہ شکل میں باقی نہ رہے گی۔ اوزون گیس کی یہ تہ سورج کی نقصان دہ الٹرا وائلٹ شعاعوں کو زمین پر آنے سے روکتی ہے۔ چنانچہ الٹرا وائلٹ شعاعوں کی آمد کی وجہ سے حیاتیاتی اجسام شدید طور پر متاثر ہوں گے۔ جو انسان ایٹمی عذاب سے بچیں گے وہ بعد کو ان مہلک شعاعوں کی وجہ سے اندھے ہو جائیں گے۔

اس ہولناک ایٹمی جنگ سے بچنے کی تدبیر کیا ہے، یہ سوال مذکورہ دونوں سائنس دانوں سے ایک نیوز کانفرنس میں پوچھا گیا۔ انھوں نے کہا کہ سائنسی صداقت فیصلہ کرنے والوں کو رکنے پر مجبور کر دینے والی ثابت ہوگی :

Scientific truth will prove compeling to decision-makers

اخبار گارجین (۱۳ نومبر ۱۹۸۳) کے کالم نگار نے بجا طور پر اس کو سادگی کا نظریہ (Naive theory) کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی واقفیت اگر روکنے والی ہوتی تو فیصلہ کرنے والوں کو پہلے ہی روک چکی ہوتی۔ مہلک ایٹمی ہتھیار اس واقفیت کے باوجود بنائے گئے ہیں۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ قومی دولت کے بے پناہ ضیاع کے بعد اسی لئے بنائے گئے ہیں کہ ان میں اتنی غیر معمولی ہلاکت کا سامان ہے۔ پھر جب ہلاکت خیزی کا علم ان ہتھیاروں کو بنانے میں مانع نہیں ہوا تو وہ ان کے استعمال میں کیوں مانع ہو جائے گا۔

ایٹمی جنگ سے بچنے کا حل صرف ایک ہے۔ اور وہ خدا کا خوف ہے۔ " فیصلہ کرنے والوں " کو عظیم اور برتر خدا کے خوف کے سوا کوئی اور چیز روکنے والی ثابت نہیں ہوسکتی۔ تمام مفسدانہ سرگرمیاں جو زمین پر جاری ہیں وہ اسی لئے جاری ہیں کہ انسان اس غلط فہمی کا شکار ہوگیا ہے کہ اس کے اوپر کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں۔ کوئی اس کے اعمال پر اس کو پکڑنے والا نہیں۔ یہ صرف خدا سے بے خوفی کا نتیجہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو خوف اور دہشت میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔

اگر انسان یہ جان لے کہ حقیقت واقعہ اس کے برعکس ہے۔ انسان خود مختار نہیں بلکہ مسئول ہے، تو وہ اس قسم کی تمام کارروائیوں سے یک لخت رک جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اوپر ایک خدا ہے وہ ہر ایک کے اوپر کامل اختیار رکھتا ہے۔ وہ انسان کی تمام کارروائیوں سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ آخر میں ہر ایک کو پکڑے گا اور فساد کرنے والوں کو سخت ترین سزا دے گا، ایسی سزا جس کا سلسلہ ابدی طور پر جاری رہے گا۔ یہی علم انسان کو فساد سے روک سکتا ہے۔

آج جو لوگ مہلک ہتھیاروں کے بنانے میں مشغول ہیں وہ اسی لئے مشغول ہیں کہ انھیں یقین ہے کہ یہ مہلک ہتھیار صرف دوسروں کے خلاف استعمال ہوں گے۔ اگر وہ جان لیں کہ ان کے اوپر ایک اور زبردست ہستی ہے۔ وہ اتنی طاقت ور ہے کہ ان کے تمام ہتھیاروں کو اکھٹا کر کے خود انھیں کے سروں پر پٹک دے تو وہ فوراً سہم اٹھیں گے اور ایسی تمام سرگرمیوں سے اچانک دست کش ہو جائیں گے۔ خدا کے سامنے جواب دہی کا عقیدہ " ہلاکت " کے مسئلہ کو آدمی کا ذاتی مسئلہ بنا دیتا ہے اور ذاتی مسئلہ سے بڑی کوئی چیز نہیں جو انسان کو کسی عمل سے روکنے والی ثابت ہو۔

فیصلہ کے دن

انڈین اکسپریس (بنگلور) کی اشاعت مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۸۳ کی ایک خبر کا عنوان ہے چمک دار چیز سونا نہیں ! Glitter is not gold

خبر میں بتایا گیا ہے کہ مس سبل ڈی سلوا (Miss Sybil D'Silva) جو بنگلور میں آرٹیلری روڈ پر رہتی ہیں، وہ اپنے گھر پر تھیں کہ تقریباً ۴۵ سال کی ایک عورت ان کے پاس آئی۔ اس کی گود میں چھ مہینہ کا ایک بچہ تھا۔ عورت نے مس ڈی سلوا سے کہا کہ اس کا شوہر بہت زیادہ بیمار ہے اور اس کے علاج کے لئے فوری طور پر ۵ ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ عورت نے سونے کا ایک ہار اپنی جیب سے نکالا اور کہا کہ میں آپ سے بھیک نہیں مانگ رہی ہوں۔ میں صرف اس سونے کے ہار کو بیچنا چاہتی ہوں۔ اگرچہ یہ ہار مجھے بہت عزیز ہے مگر شوہر کی صحت اس سے زیادہ عزیز ہے۔ اس ہار کی قیمت بازار میں دس ہزار روپے سے کم نہیں ہے۔ میں اپنی ضرورت کی بنا پر آپ کو صرف ۵ ہزار میں دے دوں گی۔

مس ڈی سلوا نے ہار لینے سے انکار کیا لیکن عورت اپنی مجبوری بیان کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس نے مس ڈی سلوا کو متاثر کر لیا۔ انھوں نے روپیہ دے کر ہار خرید لیا۔

اگلے دن مس ڈی سلوا بنگلور کی کمرشل اسٹریٹ پر گئیں اور وہاں ایک سنار کو انھوں نے وہ ہار دکھایا۔ سنار نے وہ ہار لے کر اپنی کسوٹی پر جانچا۔ کسوٹی پر جانچنے کے بعد ہار کی حقیقت کھل گئی۔ مس ڈی سلوا نے بنگلور پولیس کو یہ کہانی سناتے ہوئے کہا کہ سنار نے مجھے بتایا کہ یہ تو پیتل ہے۔

He told me it was brass

یہی آخرت کا معاملہ بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی اپنے کئے پر مگن ہے۔ ہر آدمی اپنے کام کو سونا سمجھتا ہے۔ مگر کوئی سونا اسی وقت سونا ہے جب کہ وہ سنار کی کسوٹی پر بھی سونا ثابت ہو۔ آخرت میں خدا ہر آدمی کے عمل کو اپنی کسوٹی پہ جانچے گا۔ جس کا عمل وہاں کی جانچ میں سونا ثابت ہو اسی کے عمل کی قیمت ہے، اور جس کے عمل کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے کہ یہ تو پیتل تھا، اس کا سونا اس کے لئے صرف رسوائی اور بربادی کی علامت ہوگا۔ جس چیز کو آدمی آج اتنا قیمتی سمجھے ہوئے ہے کہ وہ اس کو کسی طرح چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اس دن وہ اس سے اتنا بیزار ہوگا کہ وہ چاہے گا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ اس کے اور اس کے عمل کے درمیان جدائی ہو جائے مگر اس دن جدائی نہ ہو سکے گی۔ جس چیز کو وہ فخر کی چیز سمجھے ہوئے تھا، اس دن وہ اس کے لئے صرف ذلت اور رسوائی کی چیز بن جائے گی۔

قرآن کا ترجمہ

۵ جنوری ۱۹۸۳ کا واقعہ ہے۔ میں افریقہ کے ایک سفر سے دہلی واپس آرہا تھا۔ روم میں ایک مستشرق ہمارے جہاز میں سوار ہوئے اور میری سیٹ کی بغل والی سیٹ پر بیٹھے۔ ان کا ذکر میں نے اپنے سفر نامہ مطبوعہ الرسالہ نومبر ۱۹۸۳ میں کیا ہے۔ اس مستشرق کا نام و پتہ حسب ذیل ہے۔

Dr. J. Oacek, Oriental Department,
Charles University, Prague, Czechoslovakia.

چیکوسلاواکیہ کے اس مستشرق نے گفتگو کے دوران بتایا کہ چیکوسلواکیہ کے ایک مستشرق نے قرآن کا ترجمہ چیک زبان میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ ترجمہ بہت اچھا ہے۔ وہ جب چھپ کر بازار میں آیا تو چند ہفتے کے اندر اس کے تمام نسخے فروخت ہو گئے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں دعوت اسلام کے کتنے زیادہ مواقع ہیں۔ آج ساری دنیا میں بے شمار لوگ ہیں جو اسلام کا مطالعہ اس کے اصل اور براہ راست ذرائع سے کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی مطلوبہ کتابیں ابھی ان کو بہت کم فراہم کی جا سکی ہیں۔ خاص طور پر ضرورت ہے کہ قرآن کا ترجمہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی زبان میں کیا جائے اور اس کو چھاپ کر بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں پھیلا دیا جائے۔

مگر مسلمانوں کو ابھی اس کام سے بہت کم رغبت ہو سکی ہے۔ جنوبی ہند کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے مجھ سے کہا کہ میرے ایک عیسائی دوست نے قرآن کا ایک ترجمہ خریدا۔ اس کے بعد جب اس عیسائی دوست سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ آپ لوگ عیسائیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجھے قرآن کے ترجمہ کی ضرورت تھی تو وہ مشکل سے مجھے اتنی قیمت پر ملا۔ اس کے برعکس عیسائیوں کا یہ حال ہے کہ اگر میں ٹیلی فون کردوں کہ مجھے مفت تقسیم کے لئے انجیل کی ضرورت ہے تو چند گھنٹہ کے اندر پانچ ہزار نسخے میرے دفتر میں آجائیں گے۔

سعودی عرب اور بعض دوسرے مسلم ممالک نے موجودہ زمانہ میں یہ اہتمام کیا ہے کہ وہ قرآن کے ترجمے چھاپ کر پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ کوششیں اصل ضرورت کے مقابلہ میں ابھی بہت کم ہیں۔ اور ان کا ترجمہ بھی پوری طرح قابل اعتماد نہیں۔

مسلمان سچے دین کے حامل ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ خدا کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچائیں۔ مگر یہی وہ کام ہے جس سے آج مسلمان سب سے زیادہ دور ہو رہے ہیں۔

چھوڑنے کے لئے

برطانی دورحکومت میں ہندستان کا دار السلطنت کلکتہ تھا۔ ۱۹۱۱ میں برطانیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ دار السلطنت کو کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا جائے۔ انگریز ماہر تعمیرات سرایڈ ون لیوٹنس (۱۹۴۴-۱۸۶۹) نے نئے دار السلطنت کا نقشہ بنایا۔ ۱۹۱۳ میں پرانی دہلی کے جنوب میں رائے سینا پہاڑیوں کے علاقہ میں تعمیرات شروع ہوئیں۔ بالآخر وہ عالی شان آبادی وجود میں آئی جس کو نئی دہلی کہا جاتا ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کہ ساری دنیا میں ایک نئی سیاسی لہر آچکی تھی۔ یہ قومی تحریکوں کی لہر تھی۔ سیاسی افکار کی دنیا میں نئے انقلابات نے نوآبادیاتی نظام کا جواز ختم کر دیا تھا۔ ہندستان میں آزادی کی تحریک تیزی سے جڑ پکڑ رہی تھی۔ بظاہر یہ بات کھل چکی تھی کہ ہندستان میں برطانیہ کی حکومت اب زیادہ دیر تک باقی رہنے والی نہیں۔

نئی دہلی کی تعمیر کے بعد اسی زمانہ میں فرانس کے ایک لیڈر نے ہندستان کا دورہ کیا۔ جب وہ نئی دہلی آئے اور یہاں نیا تعمیر شدہ عظیم دار السلطنت دیکھا تو انھوں نے اس پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہا: ——— انھوں نے کیسی شاندار دنیا بنائی ہے، صرف اس لئے کہ وہ اسے چھوڑ دیں:

What a magnificent world they built to leave

یہ کہانی صرف برطانیہ کی کہانی نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ یہاں ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کو لئے ہوئے دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ اپنی تمام قوتوں کا استعمال کرکے وہ اپنا ایک "شاندار گھر" بناتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب کہ اس کی آرزوؤں کا گھر بن کر مکمل ہوتا ہے، اچانک موت کا فرشتہ آجاتا ہے اور اس کو اس کی محنتوں سے بنائی ہوئی دنیا سے جدا کرکے وہاں پہنچا دیتا ہے جس کو آرتھر کوئسلر نے نامعلوم ملک Unknown Country کا نام دیا ہے۔

زندگی کی کہانی اگر اتنی ہی ہو تو وہ کیسی عجیب دردناک کہانی ہے۔ مگر جس طرح دنیا کی ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا کا بھی ایک تکمیلی جوڑا ہے۔ اور وہ جوڑا آخرت ہے۔ جو شخص آخرت کو بھولا ہوا ہے اس کی زندگی یقیناً صرف ایک المیہ ہے۔ مگر جو شخص امکان آخرت سے فائدہ اٹھائے اور موجودہ دنیا کے مواقع کو اگلی دنیا کی تعمیر میں صرف کرے۔ اس کے لئے موجودہ دنیا ایک نئی زیادہ کامیاب زندگی کا قیمتی زینہ بن جائے گی۔

آخرت کے بغیر انسان کی زندگی صرف ایک المیہ ہے مگر آخرت کو ملانے کے بعد وہ ایک طربیہ میں بدل جاتی ہے۔

نزولی تکمیل نہ کہ ارتقائی تکمیل

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں کہا گیا ہے کہ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو پورا کر دیا۔ اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی۔ اور تمہارے لئے میں دین اسلام پر راضی ہو گیا۔

اس آیت میں اکمال دین سے مراد علی الاطلاق دین خداوندی کی تکمیل نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے لئے ان کے دین کی تکمیل ہے۔ یہاں اکمال کا مفہوم وہی ہے جس کے لئے انگریزی میں to conclude کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یعنی قرآن کے نام سے خدا کی جو عربی کتاب جزء جزء کر کے اتر رہی تھی اور ۲۳ سال تک اترتی رہی، اب اس کا آخری جزء آگیا اور قرآن کے نزول کی تکمیل ہو گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسانیت کے ابتدائی زمانہ سے جو دین اترنا شروع ہوا، وہ ارتقائی سفر کرتے کرتے اب اپنی آخری تکمیلی صورت میں نازل کر دیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں قرآن عربی کی نزولی تکمیل مراد ہے نہ کہ علی الاطلاق دین خداوندی کی ارتقائی تکمیل۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کی آیت (المائدہ ۳) میں الیوم اکملت لکم دینکم (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا) کے الفاظ ہیں نہ کہ الیوم اکملت الدین (آج میں نے دین کو کامل کر دیا) کے الفاظ۔ آیت کے یہ الفاظ انکار کرتے ہیں کہ اس سے مطلق معنوں میں دین کا مکمل کیا جانا مراد لیا جائے۔

اللہ کی کتاب ہدایت اصلاً ایک ہی ہے جس کو قرآن میں ام الکتاب کہا گیا ہے۔ مختلف انبیاء پر جو کتابیں اتریں وہ اسی ام الکتاب کے اڈیشن تھے۔ ایک کتاب اور دوسری کتاب میں جو فرق ہے وہ زبان اور اسٹائل کا ہے نہ کہ ناقص اور کامل کا۔

تاہم پیغمبر آخر الزماں کے بعد اب نجات کا ذریعہ صرف قرآن اور اسلام ہے۔ پچھلی کتابیں یا پچھلا مذہب اب کسی کے لئے نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے محفوظ اور غیر محفوظ کا فرق۔ قرآن اپنی اصل ابتدائی حالت میں مکمل طور پر محفوظ ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کی دوسری کتابیں اپنی اصل حالت پر محفوظ نہیں۔ قرآن اور دوسری کتابوں کا یہ فرق تاریخی طور پر ثابت شدہ ہے۔ اس میں علمی طور پر کسی قسم کے شبہہ کی گنجائش نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ خدا کی کتاب کا جو اڈیشن محفوظ حالت میں موجود ہو وہی لوگوں کے لئے ہدایت اور نجات کا ذریعہ بنے گا نہ کہ وہ کتابیں جن میں انسانوں نے تحریف کر ڈالی ہے۔ جو اپنی اب اصل حالت پر محفوظ ہی نہیں جس پر خدا نے انھیں اتارا تھا۔

استقلال کی اہمیت

ایک بڑے تاجر کا قول ہے "کاروبار کو بار بار بدلنا کاروبار میں خود اپنے ہاتھ سے آگ لگانا ہے" جب کوئی شخص اپنے کاروبار کو بدلتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اپنی سابقہ تاریخ سے کاٹ دیتا ہے۔ پھر جو شخص خود ہی اپنی تاریخ سے اپنے آپ کو کاٹتا رہے اس کے پاس کیا چیز باقی رہے گی جو اس کا سرمایہ بن سکے۔

کاروبار ملازمت کی طرح نہیں کہ ایک مہینہ کام کیا تو پہلی تاریخ کو اس کی تنخواہ مل گئی۔ کاروبار ایک درخت کی مانند ہے جو سالوں کے بعد اپنے پھل دیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ ایک درخت لگائے اور سال بھر کے بعد اس کو کاٹ کر دوسرا درخت لگائے اور اگلے سال تیسرا درخت۔ اسی طرح وہ پچیس سال تک کرتا رہے تو پچیس سال کی لمبی مدت گزارنے کے باوجود ایسا آدمی پھل دار درخت کا مالک نہ بن سکے گا۔ ایسے شخص کے لئے اس دنیا میں ہرا بھرا باغ مقدر نہیں۔

کسی شخص کے لئے پھل دار درخت حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ وہ ایک درخت لگائے۔ اور اسی ایک درخت کو برابر بڑھاتا رہے۔ وہ ایک ہی درخت پر اپنی ساری توجہ لگا دے۔ اس کے بعد جب مدت پوری ہوگی تو اس کا درخت بڑھ کر ایک پورا پھل دار درخت بن جائے گا۔ اسی طرح کاروبار میں بھی آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر ایک کاروبار شروع کرے اور پھر پوری طرح اس میں لگ جائے۔ وہ کسی حال میں نہ اپنے کاروبار کو چھوڑے اور نہ اس کو بدلے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ ایک نہ ایک وقت کامیاب ہو کر رہے گا۔ گوئٹے نے سچ کہا ہے

"جس شخص کے اندر اٹل اور مستحکم ارادہ ہے وہ دنیا کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔"

آپ اپنے آس پاس کے لوگوں کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ کام کرنے والے تو بہت ہیں مگر کامیاب ہونے والے بہت کم۔ اس کی وجہ اکثر حالات میں عدم استقلال ہوتا ہے۔ جو لوگ استقلال کا ثبوت دیتے ہیں وہ کامیاب رہتے ہیں اور جو لوگ استقلال کا ثبوت نہیں دے پاتے وہ ناکام ہو جاتے ہیں۔ استقلال کا نہ ہونا کسی کو پیچھے ڈھکیل دیتا ہے اور استقلال کا ہونا کسی کو زندگی میں اعلےٰ درجات تک لے جاتا ہے۔

کسی مفکر نے سچ کہا ہے کہ "لوگوں میں طاقت کی اتنی کمی نہیں جتنی مستقل ارادے کی۔" طاقت اور صلاحیت اکثر لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ اور سب لوگ اپنی طاقت اور صلاحیت کو استعمال

بھی کرتے ہیں۔ مگر بڑی کامیابی بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بڑی کامیابی مستقل ارادہ مانگتی ہے۔ اور یہی وہ امتحان ہے جس میں اکثر لوگ ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ شروع کرنے کو تو ہر آدمی کوئی نہ کوئی کام شروع کر دیتا ہے۔ مگر اکثر لوگ زیادہ دیر تک اپنے کام کو جاری نہیں رکھ پاتے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو ان کو زندگی میں ناکام بنا دیتی ہے۔

ترقی اور خوش حالی مسلسل آگے بڑھتے رہنے کا دوسرا نام ہے۔ زندگی ایک ایسا مقابلہ ہے جس میں ٹھہرنا بھی گویا پیچھے ہٹنا ہے۔ اور جو شخص ایک بار پیچھے ہو گیا اس کو دوبارہ آگے بڑھنے کے لئے کئی گنا زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ آگے بڑھنا چلنا ہے۔ اور آگے نہ بڑھنا تھک کر بیٹھ جانا۔ رگ وید میں کہا گیا ہے کہ "قدم پیچھے نہ ہٹانے والا ہی خوش حالی کو فتح کرتا ہے"۔

اس دنیا میں نتیجہ ہمیشہ اس شخص کے حصے میں آتا ہے جو نتیجہ کی پروا کئے بغیر اپنا عمل برابر جاری رکھے۔ جس کی نظر ہر وقت نتیجہ پر ہو وہ بہت جلد مایوس ہو کر بیٹھ جائے گا۔ وہ استقلال کے ساتھ اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتا۔ جس شخص کا یہ حال ہو کہ عمل ہی اس کے لئے لذت بن جائے۔ دیانت داری اور اخلاص کے ساتھ اپنے عمل میں لگا رہنا جس کو کافی نظر آئے وہ مستقل عمل پر قائم رہے گا۔ اور وہی حقیقی معنوں میں کامیاب ہوگا۔ یہی بات ہے جو مہابھارت کے ایک کردار کی زبان سے ان لفظوں میں ادا ہوئی ہے۔ "پھل کی خواہش کئے بغیر اپنا عمل کر"

برداشت کیجئے

شیلر نے کہا ہے "نفسانی خواہشات کا جنون تھوڑی دیر رہتا ہے مگر اس کا پچھتاوا بہت دیر تک"۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر بڑی بڑی حماقتیں وقتی جذبہ کے تحت ہوتی ہیں۔ جب وقتی جذبہ ختم ہو جاتا ہے تو زندگی بھر آدمی افسوس کرتا رہتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اعتدال کی حالت میں آدمی خود ہی یہ مان لیتا ہے کہ بے اعتدالی کی حالت میں اس نے جو کچھ کیا وہ غلط تھا۔

میری ملاقات ایک وکیل صاحب سے ہوئی۔ وہ فوج داری کے مقدمات کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اپنی قانونی پریکٹس کے دوران میرا تعلق بہت سے قاتلوں سے ہوا۔ میں نے پایا کہ ہر قاتل اپنے قاتلانہ فعل پر شرمندہ تھا۔ وکیل صاحب نے کہا کہ قتل ہمیشہ وقتی جذبہ کے تحت ہوتا ہے۔ وقتی جوش میں آکر ایک آدمی دوسرے آدمی کو مار ڈالتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کو ہوش آتا ہے تو ساری زندگی وہ پچھتاتا رہتا ہے۔ اس کا ضمیر ہمیشہ اس سے یہ کہتا ہے کہ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ قاتل کی بعد کی زندگی ایک ایسی سزا ہوتی ہے جو اس کے ضمیر کی عدالت نے خود اس کے اوپر

نافذ کیا ہو۔

جب بھی آپ پر اس قسم کا جذبہ سوار ہو تو فوری کارروائی سے رک جائیے۔ آپ کا رکنا ہی آپ کی اصلاح بن جائے گا۔ شام کے وقت اگر آپ پر جذبہ طاری ہوا اور آپ کسی طرح اقدام سے بچ کر اپنے کو بستر پر پہنچا دیں تو اگلے دن جب آپ سو کر اٹھیں گے تو آپ کا جذبہ ٹھنڈا پڑ چکا ہوگا۔ آپ کو خود یہ سوچ کر تعجب ہوگا کہ کل آپ کا کیا حال ہو گیا تھا۔

انگریزی زبان میں ایک کہاوت ہے "انتقام کی پلیٹ ٹھنڈی کر کے کھا"، آپ کے سامنے کھانا آئے اور وہ زیادہ گرم ہو۔ ایسی حالت میں اگر آپ فوراً اس کو کھانے لگیں تو کیا ہوگا۔ خود آپ کا منھ جل جائے گا۔ ہر عقلمند آدمی ایسے گرم کھانے کو ٹھنڈا کر کے کھانا پسند کرے گا۔ یہی طریقہ ہم کو روزمرہ کی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ انتقام کی آگ بجھا کر ہم کو لوگوں سے معاملہ کرنا ہے۔ اگر کسی کے اوپر آپ کو غصہ آجائے تو پہلے اپنے غصہ کو ٹھنڈا کیجئے۔ اس کے بعد سوچئے کہ آپ کو اپنے فریق کے ساتھ کیا کرنا چاہیے منفی ذہنیت کے ساتھ کوئی شخص نہ صحیح طور پر سوچ سکتا اور نہ صحیح طور پر یہ فیصلہ کر سکتا کہ اسے فی الحقیقت کیا کرنا چاہیئے۔

اسی بات کو شکسپیئر نے ان لفظوں میں کہا ہے "اپنے دشمن کے لئے اپنی بھٹی کو اتنا گرم نہ کر کہ وہ خود تجھ کو بھون ڈالے"۔ ظاہر ہے کہ جنون کی آگ سب سے پہلے آدمی کے اپنے اندر بھڑکتی ہے۔ اگر آدمی اپنے اندر تیز آگ بھڑکا لے تو دوسرے تک اس کا اثر بعد کو پہنچے گا۔ آدمی اس سے پہلے اپنے آپ کو جلالے گا۔ پھر آپ ایسی حرکت کیوں کریں جس کا نقصان دوسرے تک پہنچنا مشتبہ ہو مگر خود اپنی ذات کو یقینی طور پر اس کا نقصان پہنچنے والا ہو۔ اگر آپ کو اپنے آپ سے محبت ہے تو یہی کافی ہے کہ آپ دوسرے سے نفرت کرنا چھوڑ دیں۔

اس دنیا میں اپنے آپ سے محبت کا راز بھی یہی ہے کہ آدمی دوسروں سے محبت کرے۔ جو شخص دوسروں سے نفرت میں مبتلا ہو جائے وہ خود اپنے لئے ہر طرف نفرت کے کانٹے بکھیرے گا۔ لوگوں کے درمیان خود اپنے لئے سکون کے ساتھ رہنے کو ناممکن بنا دے گا۔ نفرت پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ آدمی معتدل حالت میں نہیں ہے۔ بائرن نے صحیح کہا ہے "نفرت دل کا پاگل پن ہے"، دماغی پاگل پن یہ ہے کہ آدمی ہوش کھو دے۔ دل کا پاگل پن یہ ہے کہ آدمی سنجیدگی اور اعتدال کھو دے ــــ کوئی شخص دماغی پاگل پن کو پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح دل کا پاگل پن بھی اس قابل ہے کہ آدمی اس سے دور رہے۔ (آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۴-۱۳ دسمبر ۱۹۸۲ء کو نشر کیا گیا)

آج بونا کل کاٹنا

گھنشیام داس برلا (۱۹۸۳-۱۸۹۴) راجستھان کے ایک گاؤں پلانی میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ ایک معمولی آدمی تھے اور کلکتہ میں جوٹ کے دلال کے طور پر کام کرتے تھے۔ چودہ سال کی عمر میں مسٹر برلا بھی کلکتہ چلے گئے اور وہاں اپنے باپ کے کام میں مدد کرنے لگے۔

مسٹر برلا کو ایک روز کلکتہ کے کسی تجارتی دفتر کی عمارت میں اوپر کی منزل پر جانا تھا۔ وہ جب لفٹ میں سوار ہونے لگے تو انھیں روک دیا گیا۔ کیوں کہ یہ لفٹ صرف انگریز افسروں کے استعمال کے لئے تھی۔ جب وہ سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر پہنچے تو وہاں بھی ان کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔ ان کو ایک بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا جو چپراسیوں کے لئے مخصوص تھی۔ تاہم نوجوان برلا اس بنچ پر نہیں بیٹھے اور کام ہونے تک برابر کھڑے رہے۔

انگریزی دور میں مذکورہ بالا قسم کے تجربات نے مسٹر برلا کے اندر قومی آزادی کے خیالات پیدا کر دئے۔ وہ تحریک آزادی میں مہاتما گاندھی کے ساتھی بن گئے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ سرمایہ دار طبقہ کانگرس کے قریب آنے سے گھبراتا تھا۔ مگر مسٹر برلا نہایت دوربین اور حوصلہ مند آدمی تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے کی کانگرس میں ۱۹۴۷ کے بعد کی کانگرس کی جھلک دیکھ لی۔ انھوں نے قومی تحریک کے دور کے ہندستان میں آزادی کے دور کے ہندستان کا مشاہدہ کر لیا۔ انھوں نے اس راز کو پا لیا کہ آج کے "لیڈر"، کل کے "وزیر" ہوں گے۔ آج اگر وہ ان لیڈروں کی مدد کریں تو کل وہ ان سے زبردست فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آزادی کی تحریک کی باقاعدہ مالی مدد شروع کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ تک وہ اس سلسلے میں گاندھی جی کو اور کانگرس پارٹی کو تقریباً ۲۰ کروڑ روپے دے چکے تھے۔

آزادی کے بعد مسٹر برلا کو اس کا زبردست فائدہ حاصل ہوا۔ نئی حکومت کی طرف سے ان کو ہر قسم کی غیر معمولی سہولتیں ملنا شروع ہو گئیں۔ انھوں نے اتنی تیزی سے ترقی کی کہ آزاد ہندستان کے سب سے بڑے صنعت کار بن گئے۔ آج برلا کا خاندان ہندستان کا سب سے زیادہ دولتمند خاندان سمجھا جاتا ہے۔

جو آدمی آج بوتا ہے وہی آدمی کل کاٹتا ہے۔ یہ بات آج کی دنیا کے لئے بھی صحیح ہے اور یہی کل کی دنیا کے لئے بھی۔

قرآنی استدلال

سورہ الرعد (آیت ۱۰-۸) میں مادہ کے حمل سے خدا کے علم غیب اور فرشتوں کے وجود پر استدلال کیا گیا ہے جس کی تشریح حسب ذیل ہے۔

حاملہ کا پیٹ انسان کی پیدائش کا کارخانہ ہے۔ اس کارخانہ سے جو "پیداوار" بن کر نکلتی ہے وہ حیرت انگیز طور پر باہر کی ضروریات کے عین مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ باہر کی دنیا میں عورت اور مرد کی تعداد کے درمیان جو تناسب درکار ہے وہ ہزاروں برس سے مسلسل قائم ہے۔ دونوں صنفیں اتنی تعداد میں تیار کی جاتی ہیں کہ تقریباً ۵۰ فیصد مرد اور تقریباً ۵۰ فیصد عورت کا تناسب برقرار رہے۔ اسی طرح تمدن کا نظام چلانے کے لئے مختلف صلاحیتوں کے افراد درکار ہیں۔ مزدور اور ذہین، ادیب اور انجنیئر، لیڈر اور عوام۔ چنانچہ ماں کی فیکٹری ہر صلاحیت کے انسان اتنی تعداد میں تیار کر کے باہر بھیج رہی ہے کہ خارجی دنیا میں ان کا تناسب بگڑنے نہ پائے۔ اسی طرح پہچان کے لئے ضروری ہے کہ ہر آدمی کی صورت الگ الگ ہو۔ چنانچہ ہر مرد اور عورت الگ الگ صورت کے ساتھ پیدا کئے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیٹ کی فیکٹری کو مسلسل نئے نئے ماڈل فراہم کئے جا رہے ہیں اور ان کے مطابق وہ کروروں افراد اس طرح تیار کر رہی ہے کہ ہر ایک کا نقشہ دوسرے سے مختلف ہو۔

یہ ایک مشاہدہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کوئی ایسا ناظم ہے جس کی نظر بیک وقت پیٹ کے باہر بھی ہے اور پیٹ کے اندر بھی۔ وہ باہر کی دنیا کو دیکھ کر ضروریات کی تفصیل مرتب کرتا ہے اور پھر نہایت صحیح اندازہ کے مطابق پیٹ کے اندر پیداوار تیار کر رہا ہے۔ دنیا میں اس قسم کا نظام ہونا یہ ثابت کرتا کہ اس کے پیچھے ایک ایسی ہستی ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے۔ اگر ایک ایسی ہستی یہاں موجود نہ ہو تو اندر اور باہر کے درمیان یہ توازن کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔

کائنات میں غیر مرئی نگرانی کا نظام ثابت ہونے کے بعد یہ بات ناقابل فہم نہیں رہتی کہ یہ نظام دو سطح پر ہو۔ ایک خدا کی سطح پر دوسرے فرشتوں کی سطح پر جو خدا کے کارندے ہیں۔

یہ اصلاً صرف خدا کی صفت ہے کہ وہ حاضر اور غائب دونوں سے کامل طور پر واقف ہے۔ البتہ دنیا کے انتظام کے لئے اس نے کچھ درمیانی کارندے (فرشتے) بنائے ہیں۔ اور ان کو اپنی طرف سے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ مخفی طور پر آدمی کے آگے اور پیچھے رہیں۔ اور خدا کے حکم کے مطابق خدا کی طرف سے آدمی کی نگرانی کرتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں (نگرانی) کے نظام کو ماننے کے بعد فرشتوں کو ماننا اتنا ہی ممکن ہو جاتا ہے جتنا وائرلیس کی ٹکنالوجی کے ماننے کے بعد یہ ماننا کہ پڑوسی کے مکان میں ایک "واکی ٹاکی" موجود ہے۔

ذرہ برابر نیکی

عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال، یخرج من النار من قال لا الٰہ الا اللہ وفی قلبہ شعیرۃ من خیر ویخرج من النار من قال لا الٰہ الا اللہ وفی قلبہ وزن برۃ من خیر ویخرج من النار من قال لا الٰہ الا اللہ وفی قلبہ وزن ذرۃ من خیر (بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آگ سے نکل آئے گا وہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں جو کے برابر خیر ہو۔ اور آگ سے نکل آئے گا وہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں گیہوں کے برابر خیر ہو۔ اور آگ سے نکل آئے گا وہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں ذرہ کے برابر خیر ہو۔

لا الٰہ الا اللہ کوئی لفظی منتر نہیں ہے جس کے مجرد تلفظ سے معجزاتی واقعات برآمد ہوتے ہوں۔ یہ اس حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے کہ کائنات کی ساری طاقتیں صرف ایک خدا کے پاس ہیں، انسان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اسی ایک خدا سے تمام امیدیں وابستہ کرے اور اسی کو اپنا سب کچھ سمجھے۔

یہ سب سے بڑا واقعہ ہے۔ اس حقیقت واقعہ کا اعتراف جب آدمی کے دل ودماغ میں شامل ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ خدا کے سامنے جھک جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دیتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ بندوں کے ساتھ تعلقات میں اس کے اندر گھمنڈ اور سرکشی کا انداز ختم ہو جاتا ہے۔ خدا کے سامنے اس کا جھکنا بندوں کے معاملہ میں تواضع کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کے اقرار کے نتیجہ میں پیدا شدہ اسی صالحیت کا نام خیر ہے۔ آدمی کا اقرار واعتراف جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی زیادہ بڑے پیمانہ پر اس کے اندر اس "خیر" کا ظہور ہوگا۔

انسانوں کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جنہوں نے نہ تو خدا کے معاملہ میں حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کیا اور نہ ان کی زندگی میں خیر اور صالحیت کا ظہور ہوا۔ ایسے لوگ خدا کی رحمتوں سے محروم ہو کر ابدی طور پر جہنم میں ڈال دئے جائیں گے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کے معاملہ میں پوری طرح حقیقت واقعہ کا اعتراف کیا اور اس اعتراف کے نتیجہ میں ان کی زندگی میں پوری طرح خیر کا ظہور ہوا۔ ایسے لوگوں

کے کم اچھے اعمال کو ان کے زیادہ اچھے اعمال کے تابع کر دیا جائے گا اور ان کا جو بہتر سے بہتر عمل ہوگا اس کے مطابق ان کو انعام دیا جائے گا۔ (نحل ۹۷) دوسرے لوگ وہ ہیں جنہوں نے خدا کے معاملہ میں حقیقت واقعہ کا اعتراف تو کیا مگر ان کا اعتراف اتنا گہرا نہ تھا جو ان کی عملی زندگی پر چھا جاتا۔

انہوں نے کچھ اچھے عمل کئے اور اسی کے ساتھ بہت سے برے عمل بھی ان سے سرزد ہوئے۔ ایسے لوگوں کے اچھے عمل میں اگر اللہ تعالیٰ واقعی "خیر" دیکھے گا تو امید ہے کہ ان کے برے اعمال کو ان کے اچھے اعمال کے تابع کر دے۔ وہ ان کے برے اعمال کو نظرانداز کر دے۔ اور ان کو وہ بدلہ دیدے جس کے وہ اپنے بعض اچھے اعمال کے اعتبار سے مستحق تھے (توبہ ۱۰۲)

اللہ کے معاملہ میں کسی شخص کے اندر خیر کا ذرہ پایا جانا یہ ہے کہ وہ چیز اس کے اندر کم مقدار میں پائی جارہی ہو جس کی زیادہ مقدار کسی کو حقیقی معنوں میں صالح العمل بناتی ہے۔

وہ ذرہ یہ ہے کہ خدا کی عظمت کو سوچ کر کبھی اس کا دل تڑپ اٹھا ہو۔ خدا کی کبریائی کے تصور سے کبھی اس کے اوپر کپکپی طاری ہوئی ہو۔ اس پر کوئی ایسا لمحہ گزرا ہو جب کہ خدا کی بڑائی کے خیال نے اس سے اپنی بڑائی کے تمام احساسات چھین لئے ہوں۔ زندگی کے کسی موڑ پر اس نے اس ربانی کیفیت کا تجربہ کیا ہو جو خدا کو اپنا خدا بنا کر اور اپنے آپ کو عبد کا مقام دے کر آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے

اسی طرح بندوں کے معاملہ میں خیر کا ذرہ وہ ہے جس کو حدیث میں عمل کا آخری درجہ کہا گیا ہے۔ یعنی دوسروں کو اپنے شر سے محفوظ رکھنا۔ آدمی اگر دوسروں کو فائدہ نہ پہنچائے تو کم سے کم درجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان اس طرح رہے کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف یا نقصان نہ پہنچے۔ اگر آدمی نے دوسروں کو اپنے شر سے بچایا ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں خیر کا ذرہ شمار ہوگا اور وہ اس کو جہنم کی آگ سے بچانے کا ذریعہ بن جائے گا۔

اسلام کا تعارف

کائنات کا ایک خدا ہے جو اس کا خالق اور مالک ہے ۔ خدا نے ایک خاص سکیم کے تحت ہم کو پیدا کیا ہے جس کا علم وہ اپنے مخصوص اور منتخب بندوں کے ذریعہ ہم تک بھیجتا ہے جن کو ہم رسول کہتے ہیں ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے کے آخری رسول ہیں اور اب تمام دنیا کو آپ کی پیروی کرنی ہے ۔ جو شخص آپ کی دعوت کو پاتے اور پھر اس کو قبول نہ کرے ۔ وہ صرف آپ ہی کا انکار نہیں کرتا بلکہ درحقیقت خدا کے تمام نبیوں کا انکار کر دیتا ہے ۔ ایسا شخص خدا کا وفادار نہیں ۔ بلکہ اس کا باغی ہے ۔ اور خدا کی رحمتوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے ——— یہ ہے مختصر طور پر دین اسلام کا تعارف جس کی مجھے اس مضمون میں تشریح کرنی ہے ۔

خدا کا وجود

سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے ۔ بعض لوگ اس بات کو نہیں مانتے ۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سارا کارخانہ محض ایک اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگیا ہے ۔ اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے ۔ ہکسلے کے الفاظ میں ——— چھ بندر ایک ایک ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جائیں ۔ اور اربوں کھربوں سال تک الل ٹپ طریقے سے ان کو پیٹتے رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں کسی صفحے پر شکسپیر کی ایک نظم نکل آئے ۔ اسی طرح اربوں اور کھربوں سال تک مادے کے اندھے عمل کے دوران میں بالکل اتفاق سے یہ دنیا بن گئی ہے ۔

یہ جواب جس نے صدیوں سے بہت سے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر رکھا ہے ، یہ دراصل کوئی جواب نہیں ہے ۔ بلکہ محض چند الفاظ کا مجموعہ ہے ۔ کیونکہ اتفاق یا حادثہ بذات خود کوئی چیز نہیں ہے ۔ پھر جو چیز خود ہی اپنا وجود نہ رکھتی ہو وہ کسی دوسری چیز کو وجود میں لانے کا سبب کس طرح بن سکتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی یہ تشریح کائنات کے اوپر بالکل چسپاں نہیں ہوتی ۔ یہ محض ایک بے بنیاد دعویٰ ہے ۔ جو ذہنوں میں گھڑ لیا گیا ہے ۔ اور کائنات کی حقیقی ساخت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ اس کے برعکس خدا کا تصور کائنات کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہو جاتا ہے ۔ وہ خود کائنات کے اندر سے بول رہا ہے ۔

کائنات اتنی پرحکمت اور اتنی منظم ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگئی ہو۔ زمین پر جاندار چیزوں کی بقا کے لئے جو حالات ضروری ہیں وہ نہایت مکمل طور پر یہاں موجود ہیں۔ کیا محض اتفاق کے نتیجے میں اتنے عمدہ حالات پیدا ہوسکتے ہیں۔

کائنات میں نشانیاں

زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لٹو کی مانند گھومتی ہے۔ اگر زمین کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو ہمارے دن اور رات اب کے دن اور رات سے دس گنا زیادہ لمبے ہوتے۔ زمین کی تمام ہریالی اور ہماری بہترین فصلیں سو گھنٹے کی مسلسل دھوپ میں جھلس جاتیں اور جو بچ رہتیں وہ لمبی رات میں پالے کی نذر ہوجاتیں۔

سورج جو ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے، اپنی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ سے دہک رہا ہے۔ یہ حرارت اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑ بھی اس کے سامنے جل کر راکھ ہوجائیں گے۔ مگر وہ ہماری زمین سے اتنے مناسب فاصلے پر ہے کہ یہ "کائناتی انگیٹھی" ہمیں ہماری ضرورت سے ذرہ بھر زیادہ گرمی نہ دے سکے۔ اگر سورج دگنے فاصلہ پر چلا جائے تو زمین پر اتنی سردی پیدا ہوگی کہ ہم سب لوگ جم کر برف ہوجائیں گے۔ اور اگر وہ آدھے فاصلے پر آجائے تو زمین پر اتنی حرارت پیدا ہوگی کہ تمام جاندار اور تمام پودے جل بھن کر خاک ہوجائیں گے۔

زمین کا کرہ فضا میں سیدھا کھڑا نہیں ہے بلکہ ۲۳ درجے کا زاویہ بناتا ہوا ایک طرف جھکا ہوا ہے یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قابل ہوجاتا ہے اور مختلف قسم کی نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں۔ اگر یہ جھکاؤ نہ ہوتا تو سمندر سے اٹھتے ہوئے بخارات سیدھے شمال یا جنوب کو چلے جاتے اور ہمارے براعظم برف سے ڈھکے رہتے۔

چاند ہم سے تقریباً ڈھائی لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ صرف پچاس ہزار میل دور ہوتا تو سمندروں میں مدوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوتیں کہ تمام کرۂ ارض دن میں دو بار پانی میں ڈوب جاتا اور بڑے بڑے پہاڑ موجوں کے ٹکرانے سے گھس کر ختم ہوجاتے۔

یہ ہماری کائنات کے چند نہایت معمولی اور بالکل سادہ واقعات ہیں۔ ان کے سوا بے شمار ایسے واقعات ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری زمین پر ان کا اجتماع محض اتفاقی طور پر نہیں ہوسکتا۔ اور نہ محض اتفاق انہیں باقی رکھ سکتا ہے۔ یقیناً کوئی ہے جو ان واقعات کو وجود میں بے اور ان کو اس قدر منظم طریقہ پر مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے۔ کائنات اتنی مربوط اور منظم۔

ہ جب بھی ہم اس کے کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو درحقیقت ہم اس کو محدود کر دیتے ہیں۔ کائنات کے ایک ایک جزء کے اندر اتنی حکمتیں ہیں کہ جب بھی ہم اس کی کسی حکمت کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم اس کو ایک کمتر درجے کی چیز بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ ایسی ایک کائنات کو خدا کی مخلوق ماننا اگر کسی کو خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے تو اس سے زیادہ خلاف عقل بات یہ ہے کہ اس کائنات کو بے خدا فرض کر لیا جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر خدا نے سب چیزیں پیدا کی ہیں تو خود خدا کو کس نے پیدا کیا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر حال میں پیدا ہوتا ہے۔ خواہ ہم خدا کو مانیں یا نہ مانیں۔ ہم دو میں سے کسی ایک چیز کو بلا سبب ماننے پر مجبور ہیں۔ یا خدا کو بے سبب مانیں یا کائنات کو۔ ہمارے سامنے ایک عظیم کائنات ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں، جس کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ اس کائنات کے وجود کو تسلیم کریں۔ ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ پھر ہم یا تو یہ کہیں کہ کائنات خود سے وجود میں آگئی ہے یا یہ کہیں کہ کوئی اور ہستی ہے جس نے اس کو بنایا ہے۔ دونوں صورتوں میں ہم کسی نہ کسی کو بلا سبب تسلیم کریں گے۔ پھر کیوں نہ ہم خدا کو بلا سبب مان لیں جس کو ماننے کی صورت میں ہمارے تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے۔ جبکہ کائنات کو بلا سبب ماننے کی شکل میں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ وہ تمام سوالات جو اس مسئلہ کے ارد گرد پیدا ہوتے ہیں وہ سب کے سب بدستور باقی رہتے ہیں۔

بعض لوگوں نے فلسفیانہ موشگافی کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کوئی چیز ہی نہیں ہے ـــ سب کچھ صرف ہمارا وہم ہے۔ مگر ایک شخص جب یہ بات کہتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ کائنات کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے۔ آخر یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا کہ کائنات کوئی چیز ہے یا نہیں۔ سوال کا پیدا ہونا خود ظاہر کرتا ہے کہ کوئی چیز ہے جس کے بارے میں سوال درپیش ہے۔ اور کوئی ہے جس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے۔ اس طرح فلسفۂ تشکیک بیک وقت انسان اور کائنات دونوں کو تسلیم کر لیتا ہے۔

خدا کے ساتھ ہمارا تعلق

خدا کو ماننے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ہمارا تعلق کیا ہے۔ پچاس سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر خدا کا کوئی وجود ہے بھی تو اس سے ہمارا تعلق نہیں ہو سکتا۔ مگر جدید کوانٹم نظریہ کے ذریعہ خود سائنس نے اس کی تردید کر دی ہے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات

ایک مشین ہے جو ایک مرتبہ حرکت دینے کے بعد مسلسل چلی جارہی ہے۔ اس نظریہ پر سائنس دانوں کو اس قدر یقین تھا کہ انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر ماکس پلانک (Max Planck) نے جب روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے مشین ہونے کو غلط ثابت کر رہی تھیں تو اس پر سخت تنقیدیں ہونے لگیں اور اس کا مذاق اڑا گیا۔ مگر اس نظرئے کو زبردست کامیابی ہوئی اور بالآخر وہ ترقی کرکے نظریۂ مقادیر برقیات Quantum Theory کی صورت میں آج علم طبیعیات کے اہم اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔[1]

پلانک کا نظریہ اپنی ابتدائی شکل میں یہ تھا کہ قدرت چھلانگوں کے ذریعہ حرکت کرتی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں آئن سٹائن نے اس بات کی وضاحت کی کہ پلانک کا نظریہ صرف عدم تسلسل Discontinuity کو ثابت نہیں کرتا بلکہ زیادہ انقلاب انگیز نتائج کا حامل ہے۔ یہ اصولِ تعلیل کو اس کے بلند مقام سے معزول کر رہا ہے۔ جو اس سے پہلے عالم فطرت کے تمام واقعات کا واحد رہنما سمجھا جاتا تھا قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کرسکتی ہے جو سبب اور نتیجے کی مسلسل کڑیوں کے مطابق اس کے آغاز سے لے کر انجام تک معیّن ہوچکا ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض ناقص مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ خدا کو اگر ماننا ہی ہے تو سبب اول کی حد تک اسے مان لو ورنہ آج کائنات کو خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کائنات صرف حرکت اول ہی کے لئے کسی محرک کی محتاج نہیں تھی بلکہ وہ ہر آن حرکت دیئے جانے کی محتاج ہے۔ کوانٹم نظریہ دوسرے لفظوں میں یہ بتاتا ہے کہ کائنات ایک خود چالو مشین نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی مشین ہے جس کو ہر آن چلایا جارہا ہے گویا ایک حیی وقیوم ہستی کا مسلسل فیضان ہے جو اس کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر ایک لمحے کے لئے بھی وہ اپنا فیضان واپس لے لے تو ساری کائنات اس طرح ختم ہوجائے گی جیسے سینما گھر میں بجلی کا سلسلہ ٹوٹنے سے پردۂ سیمین کے سارے واقعات غائب ہوجاتے ہیں اور ناظرین کے سامنے ایک سفید کپڑے کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس دنیا کا ہر ذرہ اپنے وجود اور حرکت کے لئے ہر آن قادرِ مطلق سے اجازت طلب کرتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنی ہستی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔

کائنات کے ساتھ خدا کا یہ تعلق خود بتاتا ہے کہ انسان کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہونا چاہیے۔

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحات ۱۲ — ۲۰

ظاہر ہے کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے، جو ہمارے لئے تمام موزوں ترین حالات کو مسلسل باقی رکھے ہوتے ہے اور ان کو ہمارے حق میں ہموار کرتا رہتا ہے۔ جو ہر آن ہماری پرورش کر رہا ہے۔ اس کا ہمارے اوپر یہ لازمی حق ہے کہ ہم اپنے مقابلے میں اس کی برتر حیثیت کو تسلیم کریں۔ اور بالکل اس کے بندے بن جائیں۔ انسان جن قدروں سے واقف ہے ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین قدر یہ ہے کہ احسان کرنے والے کا احسان مانا جائے۔ محسن خواہ اپنی طرف سے نہ دبائے مگر جو احسان مند ہے وہ خود اس کے سامنے دب جاتا ہے، محسن کے آگے اس کو نظر اٹھانے کی ہمّت نہیں ہوتی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا خدا ہونا خود ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کی خدائی کو تسلیم کریں اور اس کی مرضی پوری کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔ بندے کی طرف سے خدا کی اطاعت کے لئے اس کے سوا کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ یہ صرف حق شناسی کا تقاضا نہیں ہے کہ ہم خدا کی خدائی اور اس کے مقابلے میں اپنی بندگی کو تسلیم کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی راہ بھی نہیں ہے۔ ہماری زندگی کے سارے مسائل خدا سے متعلق ہیں۔ ہم کو جو کچھ ملے گا اسی سے ملے گا۔ اس کے سوا کوئی اور ہمیں کچھ نہیں دے سکتا۔ ہم اس کائنات میں اس قدر عاجز اور مجبور ہیں کہ خدا کی مدد کے بغیر ایک لمحہ کے لئے اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتے۔ پھر خدا کو چھوڑ کر آخر ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔

ذرا غور کیجئے، یہ ہندوستان کی شمالی سرحد پر ہمالیہ پہاڑ کا ڈھائی ہزار میل لمبا سلسلہ کس نے قائم کیا ہے۔ ہم نے یا خدا نے۔ اگر ہمالیہ پہاڑ نہ ہوتا تو خلیج بنگال سے اٹھنے والی جنوب مشرقی ہوائیں جو ہر سال ہمارے لئے بارش لاتی ہیں۔ بالکل پانی نہ برساتیں۔ وہ سیدھی روس کی طرف نکل جاتیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام شمالی ہندوستان منگولیا کی طرح ریگستان ہوتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ سورج اپنی غیر معمولی کشش سے ہماری زمین کو کھینچ رہا ہے، اور زمین ایک مرکز گریز قوت (Centrifugal Force) کے ذریعہ اس کی طرف کھنچ جانے سے اپنے آپ کو روکتی ہے۔ اس طرح وہ سورج سے دور رہ کر فضا کے اندر اپنا وجود باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر کسی دن زمین کی یہ قوت ختم ہو جائے تو وہ تقریباً چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے گی، اور چند ہفتوں میں سورج کے اندر اس طرح جا گرے گی جیسے کسی بہت بڑے

الاؤ کے اندر کوئی تنکا گر جاتے۔ ظاہر ہے کہ زمین کو یہ طاقت ہم نے نہیں دی ہے بلکہ اس خدا نے دی ہے جس نے زمین کو پیدا کیا ہے۔

کائنات کے جس حصے میں ہم رہتے ہیں اس کا نام نظام شمسی ہے، اگر آپ کسی دور دراز مقام پر بیٹھ کر اس نظام کا مشاہدہ کر سکیں تو آپ دیکھیں گے کہ اتھاہ خلا کے اندر ایک آگ کا گولا بھڑک رہا ہے جو ہماری زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ جس سے اتنے بڑے بڑے شعلے نکلتے ہیں جو کئی کئی لاکھ میل تک فضا میں اڑتے چلے جاتے ہیں، اسی کا نام سورج ہے۔ پھر آپ ان سیاروں کو دیکھیں گے جو سورج کے چاروں طرف اربوں میل کے دائرے میں پروانوں کی طرح چکر لگا رہے ہیں۔ ان دوڑتی ہوئی دنیاؤں میں ہماری زمین نسبتاً ایک چھوٹی دنیا ہے جس کی گولائی تقریباً پچیس ہزار میل ہے۔ یہ ہمارا نظام شمسی ہے جو بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کائنات کی وسعت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

کائنات میں اتنے بڑے بڑے ستارے ہیں جن کے اوپر ہمارا پورا نظام شمسی رکھا جا سکتا ہے۔ اس بے انتہا وسیع اور عظیم کائنات میں ہماری زمین فضا میں اڑنے والے ایک ذرے سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے کیڑے کی مانند اس ذرے سے چمٹے ہوئے ہیں اور خلا میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں مصروف ہیں۔

یہ کائنات کے اندر ہماری حیثیت ہے۔ غور کیجیے انسان کس درجہ حقیر ہے۔ وہ خارجی طاقتوں کے مقابلے میں کس قدر عاجز ہے۔ پھر جب ہماری حیثیت یہ ہے تو ہم خالق کائنات سے مدد طلب کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ جس طرح ایک چھوٹے بچے کی ساری کائنات اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی، اس کی ضرورتوں کی تکمیل اور اس کے مستقبل کا انحصار بالکل اس کے والدین کے اوپر ہوتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ انسان اپنے رب کا محتاج ہے۔ ہم خدا کی مدد اور اس کی رہنمائی کے بغیر اپنے لئے کسی چیز کا تصور نہیں کر سکتے۔ وہی ہمارا سہارا ہے اور اسی کی طرف ہمیں دوڑنا چاہیے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان خدا کی رہنمائی اور اس کی مدد کا محتاج ہے۔ خدا کے مقابلہ میں انسان کی یہی حیثیت قرار پاتی ہے اور خود انسان کے لئے بھی اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ وہ خدا سے اپنے لئے مدد اور رہنمائی کی درخواست کرے۔ یہ حقیقت پسندی ہے اور حقیقت پسندی بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

یہ حقیقت پسندی ہے اور حقیقت پسندی بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔

معرفت کا حصول

یہاں پہنچ کر جب ہم اپنے گردوپیش کی دنیا پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق کی طرف سے اپنی مخلوقات کے لئے مدد اور رہنمائی کا ایک مستقل عمل جاری ہے۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہے اس کو وہ چیز پہنچائی جارہی ہے۔

ایک معولی بھڑ (انجنا) کی مثال لیجئے: بھڑ کا طریقہ ہے کہ وہ انڈے دینے سے پہلے زمین میں ایک گڑھا کھودتی ہے اور ایک ٹڈے کو قابو میں کرکے اس کو گڑھے میں رکھ دیتی ہے۔ ایسا کرتے وقت وہ نہایت صحت کے ساتھ ٹڈے کے اس خاص عصبی مقام پر ڈنک مارتی ہے جس سے ٹڈا مرتا نہیں صرف بے ہوش رہتا ہے اور تازہ گوشت کا ذخیرہ بن جاتا ہے۔ بھڑ اب اس بے ہوش ٹڈے کے اردگرد انڈے دیتی ہے تاکہ انڈوں سے نکل کر بچے اس زندہ ٹڈے کو دھیرے دھیرے کھاتے رہیں۔ کیونکہ مردہ گوشت ان بچوں کے لئے مہلک ہے۔ اتنا انتظام کرلینے کے بعد بھڑ وہاں سے اڑجاتی ہے اور پھر کبھی اگر بچوں کو نہیں دیکھتی۔ مگر اس کے باوجود بھڑ کا یہ بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو وہ بھی ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے ساری بھڑیں اس کام کو زندگی میں ایک بار اور پہلی بار بالکل ٹھیک ٹھیک انجام دیتی ہیں۔ غور کیجئے کہ وہ کون ہے جو اس بھڑ کے بچے کو سکھاتا ہے کہ اپنی نسل کو جاری رکھنے کے لئے وہ بھی آئندہ وہی عمل کرے جو اس کے ساتھ اس کے ماں باپ نے کیا تھا۔ حالانکہ اپنے ماں باپ کے عمل کو اس نے کبھی نہیں دیکھا۔

اسی حیرت ناک عمل کو دیکھ کر فلسفی برگساں نے کہا تھا: کیا بھڑ نے کسی اسکول میں ماہر عضویات کی تعلیم حاصل کی ہے۔

اسی طرح ایک لمبی مچھلی کو لیجئے جسے انگریزی میں (Eal) کہتے ہیں۔ ڈنمارک کے ماہر حیوانات ڈاکٹر شمٹ (Johannes Schmidt) نے کئی سال کی تحقیق کے بعد معلوم کیا ہے کہ یہ عجیب وغریب جاندار اپنی زندگی کی جوانی میں ہر جگہ کے آبی مرکزوں اور ندیوں سے نکل نکل جزیرۂ برموڈا کے پاس جمع ہوتے ہیں جہاں بحر اٹلانٹک سب سے زیادہ گہرا ہوجاتا ہے۔ یورپ کی ایلین سمندر میں تین ہزار میل کا راستہ طے کرکے یہاں پہنچتی ہیں۔ وہیں یہ سب مچھلیاں بچے دیکر مرجاتی ہیں۔ یہ بچے جب آنکھ کھولتے ہیں تو اپنے آپ کو ایک سنسان آبی مرکز میں پڑا ہوا پاتے ہیں۔ ان کے پاس بظاہر معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ وہاں سے لوٹ کر دوبارہ انھیں کناروں پر آلگتے ہیں جہاں سے ان کے والدین چلے گئے تھے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے ماں باپ

والی ندیوں، جھیلوں اور آبی مرکزوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی آبی مرکز سے ایلیں ہمیشہ کے لئے غائب نہیں ہو جاتیں۔ اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ امریکہ کی کوئی ایل یورپ میں نہیں ملتی اور نہ یورپ کی کوئی ایل امریکہ کے سمندروں میں پائی جاتی ہے۔ پھر آمد و رفت کی یہ معلومات انہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔

یہ کام" وحی "کے ذریعہ ہوتا ہے۔ وحی، پیغام رسانی کے اس مخفی سلسلے کو کہتے ہیں جو خدا اور اس کی مخلوقات کے درمیان جاری ہے۔ کوئی مخلوق زندگی گذارنے کے لئے کیا کرے اور خالقِ کائنات نے اپنی مجموعی اسکیم کے اندر اس کے ذمے جو فرض عائد کیا ہے اس کو کس طرح انجام دے، اسی کو بتانے کا نام وحی ہے۔ اس وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق انسان کے سوا دوسری مخلوقات سے ہے، اور دوسری وہ جس کا تعلق انسان سے ہے۔

انسان کے سوا جتنی زندہ مخلوقات اس زمین پر پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب ارادے سے خالی ہیں۔ ان کا کام کسی سوچے سمجھے فیصلے اور ارادے کے تحت نہیں ہوتا بلکہ ایک غیر شعوری قسم کے طبعی میلان کے تحت ہوتا ہے جس کو ہم جبلت (Instinct) کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک طرح کی زندہ مشینیں ہیں جو محدود دائرے میں اپنا متعین عمل کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے جانداروں کے لئے ترک واختیار کا کوئی سوال نہیں۔ اس لئے ان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں نہیں آتی بلکہ جبلت یا عادتِ فطری کی شکل میں آتی ہے۔ ان کی ساخت اس طرز کی بنا دی جاتی ہے کہ وہ ایک مخصوص کام کو بار بار دہراتے رہیں۔ مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو فیصلے کی قوت رکھتا ہے۔

وہ اپنے ارادے سے کسی کام کو کرتا ہے اور کسی کو نہیں کرتا۔ وہ ایک کام کرنا شروع کرتا ہے، پھر اسے بالقصد چھوڑ دیتا ہے اور ایک کام کو نہیں کرتا اور بعد کو اسے کرنے لگتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ انسان بھی اگرچہ اسی طرح خدا کا بندہ ہے جس طرح اس کی دوسری مخلوقات، مگر اس کو حالتِ امتحان میں رکھا گیا ہے۔ جو کام دوسری مخلوقات سے عادتِ فطرت کے تحت لیا جا رہا ہے انسان کو وہی کام اپنے فیصلے اور ارادے سے کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں عام حیوانات کی وحی ان کی فطرت میں پیوست کر دی گئی ہے۔ اور انسان کی وحی خارج سے اسے سنائی جاتی ہے۔ عام حیوانات کو کیا کرنا ہے اس کا علم وہ پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں۔ اس کے برعکس انسان

جب عقل اور ہوش کی عمر کو پہنچتا ہے تو خدا کی طرف سے پکار کر اسے بتایا جاتا ہے کہ تم کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔

اس پیغام رسانی کا ذریعہ رسالت ہے۔ جو شخص یہ پیغام لے کر آتا ہے اس کو ہم رسول کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے ایک نیک بندے کو چن لیتا ہے اور اس کے قلب پر اپنا پیغام اتارتا ہے۔ اس طرح وہ شخص براہ راست خدا سے اس کی مرضی کا علم حاصل کرکے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ رسول گویا وہ درمیانی کڑی ہے جو بندے کو اس کے خدا سے جوڑتی ہے۔

وحی کا مسئلہ

اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ کسی بندۂ خاص پر خدا کی وحی کس طرح آتی ہے اور یہ کہ موجودہ زمانے میں وہ کون سی وحی ہے جس سے ہمیں خدا کی مرضی کا علم حاصل ہوگا۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے، انسان نے جو مشینیں اور جو آلات بنائے ہیں وہ تقریباً سب کے سب لوہے کے ہیں۔ اگر لوہے کی تاریخ سامنے رکھی جائے تو یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوگی کہ انسان نے کس طرح اس کو دریافت کیا، جبکہ انسان کو لوہے کے متعلق پہلے سے کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے کس طرح اس کے ذرات کو یکجا کیا جو مختلف مرکبات کی شکل میں زمین کی مختلف چٹانوں کے ساتھ مخلوط ہو کر منتشر پڑے تھے۔ اور پھر انہیں خالص لوہے کی ٹھوس شکل میں تبدیل کیا۔

یہی حال دوسری ایجادات کا بھی ہے۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ ان ایجادات کی طرف انسانی ذہن کی رہنمائی کس طرح ہوئی۔ وہ کون سی قوت ہے جو تجربہ اور مشاہدہ کے دوران ایک سائنس داں کو اس مخصوص نکتے تک پہنچا دیتی ہے جہاں پہنچ کر اسے ایک مفید اور کارآمد نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ جو بات ہم کو معلوم نہیں تھی وہ کیسے معلوم ہو گئی۔ اس علم کا ذریعہ وہی خدائی فیضان ہے جس کو ہم وحی کہتے ہیں۔ سب کچھ جاننے والا اپنے علم میں سے تھوڑا سا حصہ اس کو عطا کر دیتا ہے جو کچھ نہیں جانتا۔

یہ فیضان وحی کا ابتدائی درجہ ہے جو غیر محسوس طور پر آتا ہے اور ہر شخص کو اس میں سے حصہ ملتا ہے۔ وحی کی دوسری قسم زیادہ ترقی یافتہ ہے، جو شعوری طور پر آتی ہے اور صرف ان لوگوں کے پاس آتی ہے جن کو رسالت کے لئے منتخب کر لیا گیا ہو۔ انسان کے پاس

حقیقت کا علم اور دنیا میں زندگی گذارنے کا طریقہ جو خدا کی طرف سے آیا ہے وہ اسی دوسری قسم کی وحی کے ذریعہ بھیجا جاتا ہے۔

وحی کی حقیقت کو ہم بس اسی قدر سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا دراصل ایک ایسا مطالبہ کرنا ہے جو انسان کے بس سے باہر ہے۔ ایک اڑتے ہوئے جہاز کو زمین سے لاسلکی پیغام بھیجا جاتا ہے جس کو ہوائی جہاز پر بیٹھا ہوا آدمی پورے یقین کے ساتھ صاف الفاظ میں سن لیتا ہے۔ یہ ہماری قریبی زندگی کا ایک واقعہ ہے۔ مگر آج تک اس کی مکمل توجیہ نہیں ہو سکی کہ یہ واقعہ کس طرح وجود میں آتا ہے۔ یہی حال ان تمام واقعات کا ہے جن سے ہم اس زمین پر واقف ہیں۔ ہم تمام حقیقتوں کو صرف مجمل طور پر جانتے ہیں۔ جیسے ہی ہم کسی حقیقت کو آخری حد تک سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ہماری قوتیں جواب دینے لگتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی کلی واقفیت ہمارے بس سے باہر ہے ایسی صورت میں وحی کی حقیقت کو مکمل طور پر سمجھنے کا مطالبہ کرنا کسی ایسے ہی آدمی کا کام ہو سکتا ہے جو خود اپنی حقیقت سے بے خبر ہو۔

سائنس نے اب یہ تسلیم کر لیا ہے کہ حقیقت مطلق کا علم حاصل کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ اس سلسلے میں میں پروفیسر ہائزن برگ (Heisen Berg) کی دریافت کا حوالہ دوں گا جس کو وہ اصول عدم تعین (Principle of Indeterminacy) کا نام دیتا ہے۔ جیمز جینز نے اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"قدیم سائنس کا خیال تھا کہ کسی ذرے مثلاً ایک الکٹران کا مقام مکمل طور پر بتایا جا سکتا ہے جبکہ ہم یہ جان لیں کہ کسی خاص وقت میں فضا کے اندر اس کا مقام اور اس کی رفتار کیا ہے۔ اگر ان معلومات کے ساتھ بیرونی اثرانداز طاقتوں کا بھی علم ہو جائے تو الکٹران کے تمام مستقبل کو معین کیا جا سکتا تھا۔ اور اگر کائنات کے تمام ذروں کے متعلق ان باتوں کا علم ہو جاتا تو ساری کائنات کے مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔

مگر ہائزن برگ کی تشریح کے مطابق جدید سائنس اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ان مقدمات کی دریافت میں قوانینِ قدرت حائل ہیں۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ ایک الکٹران فضا میں کس خاص مقام پر ہے جب بھی ہم ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ وہ کس رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ قدرت کسی حد تک گنجائشِ سہو (Margin of Error) کی اجازت دیتی ہے، لیکن اگر ہم اس گنجائش میں گھسنا چاہیں تو قدرت ہماری کوئی مدد نہیں کرتی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت بالکل صحیح پیمائشوں سے قطعاً ناآشنا ہے۔

اسی طرح اگر ہمیں کسی الکٹران کی حرکت کی ٹھیک ٹھیک رفتار معلوم ہو تو قدرت ہمیں فضا کے اندر اس کا صحیح مقام دریافت کرنے نہیں دیتی، گویا کہ الکٹران کا مقام اور اس کی حرکت کسی لالٹین کی سلائڈ کی دو مختلف سمتوں پر نقش ہیں۔ اگر ہم سلائڈ کو کسی خراب لالٹین میں رکھیں تو ہم دو رخوں کے درمیان نصف کو روشنی میں لا سکتے ہیں۔ اور الکٹران کے مقام اور اس کی حرکت دونوں کو کچھ نہ کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ اچھی لالٹین کے ذریعہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم ایک پر جتنی زیادہ روشنی ڈالیں گے، دوسرا اتنا ہی دھندلا ہوتا چلا جائے گا۔ خراب لالٹین، قدیم سائنس ہے جس نے ہمیں اس فریب میں مبتلا کر دیا کہ اگر ہمارے پاس بالکل مکمل لالٹین ہو تو ہم کسی خاص وقت پر ذرے کے مقام اور اس کی رفتار کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکتے ہیں۔ یہی دھوکہ تھا جس نے سائنس میں جبریت (Determinism) کو داخل کر دیا، مگر اب جبکہ جدید سائنس کے پاس زیادہ بہتر لالٹین ہے اس نے ہم کو صرف یہ بتایا ہے کہ حالت اور حرکت کی تعیین حقیقت کے دو مختلف پہلو ہیں جنھیں ہم بیک وقت روشنی میں نہیں لا سکتے (ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحہ ۱۷-۱۸)

اس سلسلہ میں آخری سوال یہ ہے کہ خدا کی وحی جو مختلف زمانوں میں انسانوں کے پاس آتی رہی ہے ان میں سے کون سی وحی ہے جس کی آج کے انسانوں کو پیروی کرنا ہے۔ اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ بعد کے لوگوں کے لئے وہی وحی قابل اتباع ہو سکتی ہے جو سب کے بعد آئی ہو۔ حکومت ایک ملک میں کسی شخص کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کی سفارت اسی وقت تک کے لئے ہے جب تک وہ اس عہدے پر باقی ہو، جب اس کی مدت کارکردگی ختم ہو جائے اور دوسرے شخص کو اس عہدے پر مامور کر دیا جائے تو اس کے بعد وہی شخص حکومت کا نمائندہ ہو گا جس کو سب سے آخر میں نمائندگی کا موقع دیا گیا ہے۔

اس اعتبار سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ آخری رسول ہیں، جو آج اور آئندہ قیامت تک کے لئے انسانیت کے رہنما ہیں، جو ساتویں صدی عیسوی میں عرب سے اٹھے تھے۔ جن کے بعد نہ کوئی نبی ہوا اور نہ آئندہ کوئی نبی ہو گا۔ آپ کا تمام نبیوں کے بعد تشریف لانا اس بات کی کافی وجہ ہے کہ آپ ہی کو حال اور مستقبل کے لئے خدا کا نمائندہ قرار دیا جائے۔ کیونکہ بعد کو آنے والا اپنے سے پہلے آنے والوں کو منسوخ کر سکتا ہے مگر پہلے آنے والا اپنے بعد آنے والے کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ ہم ان تمام نبیوں کو مانتے ہیں جو خدا کی طرف سے آئے، ان میں سے کسی کا بھی ہم انکار نہیں کرتے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے رسولوں میں تفریق نہ کرو۔ (بقرہ - آخر) مگر یہ ظاہر ہے کہ اطاعت

پیروی صرف وقت کے نبی ہی کی ممکن ہے اور اسی کی ہونی چاہئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
نبی کا نہ آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ہی وقت کے نبی ہیں۔ اور اب تمام انسانوں کو آپ ہی کی
ی کرنی ہے۔ جب کوئی نبی آتا ہے تو وہ دراصل اپنے وقت کے لئے خدا کا حکم ہوتا ہے۔ وقت
نبی کو چھوڑ کر اس سے پہلے کے کسی نبی کی اطاعت کا دعویٰ کرنا خدا پرستی نہیں بلکہ خود پرستی ہے۔
شخص خدا کے یہاں اس کے وفاداروں میں شمار نہیں ہوگا بلکہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا
ئے گا اور خود تاریخ کے وہ رسول اس سے برأت کریں گے جن کی پیروی کا آج وہ دعویٰ
رہا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ انسانی تاریخ کی سب سے پرانی اور ابتدائی مذہبی کتاب رگ وید ہو جو خدا
ہدایت کے تحت مرتب کی گئی ہو جیسا کہ انجیل نسبتاً درمیانی زمانے کی الہامی کتاب ہے۔ مگر اب یہ
مام کتابیں آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ان کے مضامین کی صحت مشکوک
ہے۔ اور اس سے قطع نظر کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی اپنے کو آخری اور دائمی کتاب کی
حیثیت سے پیش نہیں کرتی، صرف یہ واقعہ کہ وہ خدا کے آخری ہدایت نامے سے پہلے نازل کی گئی
تھیں، ان کو آج کے لئے منسوخ قرار دے دیتا ہے۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کا رسول ہی کیوں تسلیم
کریں، میرا جواب یہ ہے کہ جن وجوہ سے آپ دوسرے رسولوں کو رسول مانتے ہیں انھیں وجوہ سے
آخری رسول کو بھی رسول ماننا پڑیگا۔ آپ کسی دوسرے رسول کے بارہ میں یہ ثابت کرنے کے لئے
کہ وہ خدا کی طرف سے آئے تھے، جو بھی اصول بنائیں گے اور جو مقدمات قائم کریں گے، ٹھیک ٹھیک
انھیں دلائل اور انھیں مقدمات کی بنا پر آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خدا کا رسول ماننا ہوگا۔ اگر
آپ آخری رسول کا انکار کرتے ہیں تو آپ کو سارے رسولوں کا انکار کر دینا پڑے گا۔ اور اگر دوسرے
رسولوں کو مانتے ہیں تو آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آخری رسول کو بھی تسلیم کریں اور
جوں ہی آپ آخری رسول کو تسلیم کرتے ہیں، آپ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسی کو آخری سند
قرار دیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننا اور آپ کو آخری سند تسلیم نہ کرنا دونوں بالکل متضاد
چیزیں ہیں، جو ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔ خدا کے آخری حکم کی موجودگی میں اس کے سابقہ
حکموں کا حوالہ دینا خدا کی اطاعت کا ایک ایسا طریقہ ہے جس سے خدا کبھی راضی نہیں ہوسکتا یہ خود
اپنے نفس کی اطاعت ہے نہ کہ خدا کی اطاعت۔

THE INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

The INTRODUCTION TO ISLAM SERIES is the rendering into English of the Urdu Ta'arufi Set by Maulana Wahiduddin Khan. It provides the general public with an understanding of the basic teachings of divinely revealed religion.

The titles in this series:

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

Maktaba Al-Risala

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi 110 006

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd R N No 28822/76
Regd D(DN) No 532

January 1984
Issue No. 86

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

کتاب	قیمت
تذکیر القرآن جلد اول ہدیہ	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	20/-
ظہور اسلام	20/-
احیاء اسلام	12/-
پیغمبر انقلاب	20/-
دین کیا ہے	[illegible]
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	1/-
تعارف اسلام	2/50
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-

کتاب	قیمت
اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلہ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	2/-
منزل کی طرف	6/-
حقیقت حج	1/-
اسلامی دعوت	3/-

تعارفی سٹ

کتاب	قیمت
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-

ENGLISH PUBLICATIONS

Title	Price
The Way to find God	3/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	4/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad : The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ ▢ جمعیۃ بلڈنگ ▢ قاسم جان اسٹریٹ ▢ دہلی ۶

اتحاد کیا ہے ——

اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا

فروری ۱۹۸۴ء قیمت فی پرچہ — تین روپے شمارہ ۸۷

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

فروری ۱۹۸۴
شمارہ ۸۷

سی۔ ۲۹۔ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی ۱۳۰۰۱۱

اعلان

ادارۂ الرسالہ اور اسلامی مرکز کے لئے ہمارا نیا پتہ نوٹ فرمائیں:

سی۔ ۲۹۔ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی ۱۳۰۰۱۱

C-29, Nizamuddin West,
New Delhi 110 013
Telephone : 611128

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

خود جاننا پڑتا ہے

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جولائی ۱۹۸۲) میں ایک دلچسپ قصہ شائع ہوا ہے۔ ہندستان کے ایک لیڈر جن کا نام درج نہیں) ۱۹۷۰ میں فرانس گئے۔ پیرس میں ان کی ملاقات ایک فرانسیسی لیڈر سے ہوئی جو حکمراں گالسٹ پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ اخبار کی رپورٹ کے مطابق ہندستانی لیڈر اور فرانسیسی لیڈر کے درمیان گفتگو کا ایک حصہ حسب ذیل تھا:

"Is there anything in particular you would like to do in Paris." Asked the Gaulist.
"I am a great admirer of de Gaulle." replied the Indian visitor. "I should like to make a courtesy call on him."
"But he is dead, sir."
"What? Nabody told me in India during the briefing."
"They must have presumed you were aware of it. He died four years ago."

فرانسیسی لیڈر نے پوچھا "کیا آپ پیرس میں کوئی خاص چیز پسند کریں گے"۔ ہندستانی لیڈر نے جواب دیا "میں جنرل ڈیگال سے بہت متاثر ہوں اور میری خواہش ہے کہ ان سے ملاقات کروں"۔ کہنے والے نے کہا "مگر جناب ان کا تو انتقال ہو گیا"۔ ہندستانی لیڈر نے کہا "کیا، ہندستان میں فرانس کے حالات بتاتے ہوئے تو کسی نے مجھ سے یہ بات نہیں کہی"۔ کہنے والے نے دوبارہ کہا "انھوں نے فرض کیا ہوگا کہ آپ ان کو جانتے ہیں۔ جنرل ڈیگال چار سال پہلے مر چکے ہیں"۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر بات بتائی نہیں جا سکتی۔ ضروری ہے کہ آدمی خود کچھ باتوں کو جانے۔ سننے والا اگر پچاس فیصد بات جانتا ہو تو اس کو بقیہ پچاس فی صد بات بتائی جا سکتی ہے۔ اگر وہ نصف بات پہلے سے نہ جان چکا ہو تو بقیہ نصف بھی وہ نہ جان سکے گا۔ خواہ وہ بات کتنی ہی معقول ہو اور کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ اس کو پیش کر دی جائے۔

آج کسی سے کہئے کہ "فلاں کھلاڑی نے سنچری بنائی" تو وہ فوراً سمجھ لے گا کہ اس سے مراد کرکیٹ کے ایک سو رن ہیں۔ مگر یہ کہئے کہ "قوم کی ترقی کے لئے ایک سنچری کی جدوجہد درکار ہے" تو اس کو کوئی نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ تعمیر قوم کے معاملہ میں سو سالہ جدوجہد سے کوئی واقف نہیں۔

بے خبر انسان

آئیوری کوسٹ مغربی افریقہ کا ایک ساحلی ملک ہے۔ یہاں بجلی افراط کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ گھروں اور دکانوں کی جگمگاہٹ کی وجہ سے اس کو افریقہ کا شو کیس کہا جاتا تھا (ٹائمس آف انڈیا ۴ جنوری ۱۹۸۴)

دسمبر ۱۹۸۳ میں اچانک وہ ایسا ملک بن گیا جہاں لوگ عالی شان ہوٹلوں میں موم بتی کی روشنی میں کھانا کھائیں اور گھروں اور دفتروں کو بھی موم بتی سے روشن کریں۔ آئیوری کوسٹ میں ۹۲ فی صد پن بجلی کا رواج تھا۔ مگر بارش رک جانے کی بنا پر ڈیم سوکھ گئے اور اکثر ٹربائن کا چلنا بند ہوگیا۔ چنانچہ بجلی کی کٹوتی کا یہ عالم ہوا کہ بعض اوقات مسلسل ۱۸ گھنٹے تک بجلی غائب رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعتی پیداوار گھٹ کر ۲۵ فی صد رہ گئی۔ کمپوٹر، الکٹرک ٹائپ رائٹر، ریفریجریٹر، اور اکثر بجلی سے چلنے والی چیزیں بند رہنے لگیں۔

بہت سے بڑے بڑے تاجروں نے اس اندیشہ سے دفتر جانا چھوڑ دیا کہ کہیں وہ لفٹ میں اٹک کر نہ رہ جائیں۔ ایک تاجر نے اپنا حال بتاتے ہوئے نیویارک ٹائمز کے نمائندہ سے کہا کہ سالہا سال سے میرا یہ حال تھا کہ میں اپنے ایرکنڈیشنڈ مکان سے ایرکنڈیشنڈ کار میں اور پھر ایرکنڈیشنڈ دفتر میں جاتا تھا۔ میں نے کبھی یہ جانا ہی نہیں کہ حقیقۃً آئیوری کوسٹ کتنا زیادہ گرم ہے:

> For years, I had gone from my air-conditioned villa to my air-conditioned car to my air-conditioned office. I never realised just how hot it really is here.

افریقہ جیسے گرم ملک میں ایرکنڈیشنڈ ماحول میں رہنے والا تاجر گویا ایک مصنوعی دنیا میں رہ رہا تھا۔ جب بجلی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اس وقت اس کو معلوم ہوا کہ اصل صورت حال اس کے برعکس تھی جس کو وہ اپنے ذہن میں بطور خود فرض کئے ہوئے تھا۔

یہی حال زیادہ بڑے پیمانے پر تمام انسانوں کا ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو آزاد پاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ جب انسان کی موت آئے گی اس وقت اچانک اس کو معلوم ہوگا کہ یہ محض فریب تھا ـــــ اس نے امتحان کی آزادی کو استحقاق کی آزادی سمجھ لیا تھا۔ اس نے خدا کے اثاثہ کو اپنا اثاثہ فرض کر لیا تھا۔ وہ اپنے اعمال کے لئے خدا کے یہاں جواب دہ تھا مگر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا کہ وہ خواہ کچھ بھی کرے کوئی اس سے پوچھ گچھ کرنے والا نہیں۔

خدا سے نسبت

ایک بزرگ فجر کی نماز کے وقت اپنے گھر سے نکلے اور تیزی سے مسجد کے لئے روانہ ہو گئے مگر جب وہ مسجد کے اندر داخل ہوئے تو ان کے قدموں کی رفتار سست ہو گئی۔ اس وقت اگرچہ پہلی صف میں کافی جگہ تھی۔ مگر وہ پیچھے کی صف میں رک گئے اور مسجد کے ایک کنارے بیٹھ کر جماعت کا انتظار کرنے لگے۔ نماز کے بعد ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت۔ یہ کیا بات ہے کہ آپ مسجد کی طرف تیزی سے روانہ ہوئے مگر جب مسجد کے اندر پہنچے تو بڑھ کر اگلی صف میں جگہ لینے کے بجائے پچھلی صف میں ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔

بزرگ نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ جب میں گھر سے مسجد جانے کے لئے نکلا تو مجھ کو ایسا لگا کہ میں ایک ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں خدا کی رحمت و مغفرت تقسیم ہو رہی ہے۔ اس وقت شوق ہوا کہ میں لپک کر جلدی سے وہاں پہنچوں۔ مگر جب اندر داخل ہوا تو خدا کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس مجھ پر غالب آگیا اور میرے قدموں کی رفتار اچانک سست پڑ گئی۔

"آپ سست قدموں سے بھی تو اگلی صف میں جا سکتے تھے"، آدمی نے دوبارہ پوچھا۔ بزرگ نے کہا کہ تمھارا یہ کہنا صحیح ہے۔ مگر اس وقت مجھ پر یہ احساس طاری ہوا کہ خدا کی رحمت و مغفرت کا خزانہ تو ختم ہونے والا نہیں۔ اگر میں پیچھے بیٹھ جاؤں تب بھی اس کی تقسیم کا سلسلہ ضرور یہاں تک پہنچ جائے گا۔

اس کے بعد بزرگ نے کہا کہ بندے کی نجات کا دار و مدار اس پر ہے کہ وہ خدا کی صفات کا ادراک کرے۔ بندے اور خدا کے درمیان اس کی صفات ہی کے ذریعہ اتصال قائم ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص خدا کی صفتوں میں سے کسی صفت کا ادراک کرتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو خدا کی زد میں لاتا ہے۔ جس طرح سورج کسی کو اس وقت روشن کرتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو اس کی کرنوں کی زد میں لائے۔ اسی طرح ایک بندہ اس وقت اپنے رب کی زد میں آتا ہے جب کہ وہ خدا کی صفات کی معرفت حاصل کرے۔

بزرگ جب مسجد کی طرف جا رہے تھے تو انھوں نے خدا کی یہ حیثیت دریافت کی کہ خدا دینے والا ہے، اس کے سوا کوئی دینے والا نہیں۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو انھوں نے خدا کے بڑے ہونے کو پہچانا اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کو دریافت کیا۔ پہلے مرحلہ میں انھوں نے معطی ہونے کی حیثیت سے خدا سے نسبت قائم کی اور دوسرے مرحلہ میں خدا کے علی و کبیر ہونے کی حیثیت سے۔

خدا کی تلاش

ایک بے حد ذہین شخص تھا۔ وہ مستقل طور پر اس احساس میں مبتلا رہتا تھا کہ میں زندگی میں اپنے واقعی مقام کو نہ پا سکا۔ بالآخر اس نے خودکشی کر لی۔ اس نے اپنی خودکشی کی تحریر میں لکھا تھا:

میں اپنی زندگی کو ختم کر رہا ہوں۔ کیوں کہ میں شاید ایسی دنیا میں بھٹک آیا جس کے لئے میں پیدا نہیں کیا گیا تھا۔

کمی کا یہ احساس اکثر ان لوگوں کا پیچھا کئے رہتا ہے جو فطرت سے غیر معمولی ذہن لے کر پیدا ہوئے ہوں۔ وہ یا تو مایوسی اور ناکامی کی زندگی گذار کر طبعی موت مرتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ کم تر ذہن رکھنے والوں میں ایسے لوگ کافی مل جائیں گے جو بظاہر مطمئن زندگی گذارتے ہوں۔ مگر برتر ذہن رکھنے والوں میں مشکل ہی سے کوئی شخص ملے گا جو مطمئن زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔

اس کی وجہ انسان کی معیار پسندی ہے۔ ہر انسان فطری طور پر آئیڈیل کی تلاش میں ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں آئیڈیل کو پانا اتنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثل بن گئی ہے کہ معیار کبھی حاصل نہیں کیا جا سکتا:

(Ideal cannot be achieved)

اب ہوتا یہ ہے کہ کم تر درجہ کا ذہن رکھنے والوں میں چونکہ شعور بہت زیادہ بیدار نہیں ہوتا۔ وہ آئیڈیل اور غیر آئیڈیل کے درمیان بہت زیادہ فرق نہیں کر پاتے۔ وہ اپنے موٹے ذوق کی وجہ سے غیر آئیڈیل میں بھی اس طرح مشغول ہو جاتے ہیں جیسے کہ وہ ان کا آئیڈیل ہو۔ مگر جو لوگ زیادہ ذہین ہیں وہ آئیڈیل اور غیر آئیڈیل کے فرق کو فوراً محسوس کر لیتے ہیں اور اس بنا پر آئیڈیل سے کم کسی چیز پر اپنے کو راضی نہیں کر پاتے۔

انسان کا آئیڈیل ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ اس کا خالق اور رب ہے۔ اعلیٰ ذہن کے لوگ جس چیز کی تلاش میں ہیں وہ ربانی مشن کے سوا اور کچھ نہیں۔ خدا کا وجود ہی آئیڈیل وجود ہے۔ اور خدا کے مشن میں اپنے کو مشغول کر کے ہی ہم اس چیز کو پا سکتے ہیں جو ہماری پوری ہستی کو تسکین دے اور آئیڈیل کے بارہ میں ہمارے ذہنی معیار پر مکمل طور پر پورا اترے۔

انسان کا آئیڈیل اس کا خدا ہے، مگر وہ اپنے اس آئیڈیل کو تمام طور پر غیر خدا میں تلاش کر رہا ہے۔

پیغمبر کو ماننا

لوئی بونیل (Luise Bumule) فرانس کا مشہور فلم پروڈیوسر ہے۔ وہ ۱۹۰۰ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۹۸۳ میں وفات پائی۔ ابتداءً اس کو مسیحیت کی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد وہ فلمی صنعت میں داخل ہو گیا۔

گارجین، ۷ اگست ۱۹۸۳ میں اس کے کچھ خیالات شائع کئے گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ آج بے شمار لوگ مسیحی ہیں۔ مگر وہ اضافی طور پر مسیحی ہیں نہ کہ حقیقی طور پر۔ حضرت مسیح اگر آج زمین پر واپس آئیں تو ان کے ماننے والے دوبارہ ان کو سولی پر چڑھا دیں گے:

If Christ came back, they'd crucify Him all over again

لوئی بونیل کی یہ بات صدفی صد درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مروجہ مسیحیت حضرت مسیح کے لائے ہوئے مذہب سے اتنی مختلف ہے کہ آج اگر حضرت مسیح زندہ ہوں تو خود ان کے ماننے والے انھیں برداشت نہ کریں۔

تاہم مسلمانوں کا حال بھی اس معاملہ میں ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ آج دنیا بھر میں تقریباً ایک ارب مسلمان ہیں جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے معتقد ہیں اور ان کے نام پر لڑنے مرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مگر ان مسلمانوں کا سارا جوش محمدؐ کی تاریخ سے ہے نہ کہ خود محمدؐ سے۔ وہ " محمد " جس کے ساتھ تاریخ شامل نہ ہو وہ موجودہ مسلمانوں کے لئے بھی اتنا ہی اجنبی ہے جتنا وہ اپنے ہم زمانہ لوگوں کے لئے تھا۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پچھلے چودہ سو سال میں عظمت کی جو روایات جمع ہو چکی ہیں۔ اگر آپ کی ذات سے ان کو ہٹا دیا جائے اور آپ دوبارہ اسی ابتدائی حالت میں ظاہر ہوں جیسا کہ آپ قدیم مکہ میں ظاہر ہوئے تھے تو مجھے اپنے علم و تجربہ کی حد تک یقین ہے کہ مسلمانوں میں آپ کو پہچاننے والے اتنے بھی نہ نکلیں گے جتنی ایک آدمی کے ہاتھ میں انگلیوں کی تعداد ہوتی ہے۔

مسلم اداروں میں جس محمد کی دھوم ہے وہ تاریخی محمد ہیں نہ کہ وہ محمد جو تاریخ بننے سے پہلے تھے۔ تاریخ بننے سے پہلے والے محمد اگر آج ان اداروں میں آجائیں تو ان کو نہ کوئی ادارہ شیخ التفسیر بنائے اور نہ شیخ الحدیث۔ ان کو نہ کسی جلسہ کی صدارت ملے اور نہ کسی جماعت کی امارت۔ مسلمانوں کی بستی سے وہ اسی طرح بے رحمی کے ساتھ نکال دئے جائیں جس طرح مکہ والوں نے اپنے زمانہ کے محمدؐ کو نکال دیا تھا۔ قدیم مکہ والے محمدؐ کو پانے کے لئے جوہر کی بنیاد پر قدردانی درکار ہے اور مسلمان آج اس صفت سے محروم ہیں۔

قدردانی

مسٹر جی ڈی برلا (۱۹۸۳-۱۸۹۴) کی عمر جب ۳۰ سال تھی اس وقت انھیں ایک غیر معروف طالب علم کا خط ملا۔ یہ خط کلکتہ سے آیا تھا۔ طالب علم نے بے تکلفانہ اور حوصلہ مندانہ انداز میں لکھا تھا کہ اگر آپ میری صرف اتنی مدد کریں کہ مجھ کو ایک خاص آلہ خریدنے کے لئے ۲۲ ہزار روپے دے دیں جس کو باہر سے منگوانا ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی دریافت پر نوبل انعام حاصل کرنے کے قابل ہوسکوں گا:

> If only you can help me with an amount of Rs. 22,000 for the purchase of a special type of instrument which has to be imported, I may assure you that I may be able to get the Nobel prize for my discovery.

اس پر اثر جذباتی اپیل کا جو فوری جواب مسٹر برلا نے مذکورہ طالب علم کو بھیجا اس کے ساتھ ۲۲ ہزار روپے کا چیک بھی شامل تھا۔ طالب علم نے اس رقم سے مذکورہ سائنسی آلہ درآمد کیا اور اس کے ذریعہ اپنی تحقیق جاری رکھی۔ طالب علم کا اندازہ صحیح نکلا۔ اس کی تحقیق جب چھپ کر سامنے آئی تو اس کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ اس کو سائنس کا نوبل انعام دیا گیا (ہندستان ٹائمس ۱۲ جون ۱۹۸۳)

یہ طالب علم وہی تھا جو بعد کو سر سی۔ وی۔ رمن کے نام سے مشہور ہوا۔ نوبل انعام اور سر کا خطاب ملنے کے بعد تو ہر ایک سی۔ وی رمن کا قدرداں تھا۔ مگر جب سی۔ وی رمن محض ایک معمولی طالب علم تھے اور ان کی ساری بڑائی ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی اس وقت سی وی رمن کی قدر کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ جی ڈی برلا نے یہ کام کیا اور یہی وجہ ہے کہ جی ڈی برلا ہندستان کی تاریخ میں ملک کے معماروں کی اعلیٰ ترین فہرست میں لکھے گئے۔

یہ خصوصیت جس کی ایک مثال مسٹر برلا کے مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے، یہ نہ صرف افراد کو اعلیٰ مرتبہ تک پہنچاتی ہے۔ بلکہ قوم کی ترقی میں اس کا بہت گہرا حصہ ہے۔ کسی قوم میں " برلا " جیسے جوہر شناس افراد کا ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے نوجوانوں کی صلاحیتیں بجھ کر نہیں رہ جائیں گی۔ بلکہ اپنے چھپے ہوئے امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے ہر قسم کے ضروری وسائل پالیں گی۔ اس کے برعکس جس قوم میں ایسے قدرداں موجود نہ ہوں وہاں ترقی کا مقام صرف ان لوگوں کے حصہ میں آتا ہے جو اتفاقی اسباب کے تحت کسی "گدی" کو پاجائیں۔ اور ظاہر ہے کہ گدیاں تو کسی قوم میں چند ہی ہوتی ہیں۔

ایک حدیث

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان اللہ یرضی لکم ثلاثاً۔ یرضی لکم ان تعبدوہ ولا تشرکوا بہ شیئاً وان تعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا وان تناصحوا من ولاہ اللہ امرکم۔ و یسخط لکم ثلاثا۔ قیل وقال وکثرۃ السؤال واضاعۃ المال (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تم سے تین باتوں پر راضی ہوتا ہے۔ وہ اس پر راضی ہوتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑے رہو اور متفرق نہ ہو۔ اور یہ کہ اللہ جس شخص کو تمہارا امیر بنائے اس کی خیر خواہی کرو۔ اور اللہ تم سے تین باتوں پر ناراض ہوتا ہے۔ قیل وقال سے۔ سوال کی کثرت سے اور مال کو ضائع کرنے سے۔

اللہ کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تمام توجہات کا مرکز بن جائے۔ اللہ کے بغیر آدمی کو اپنی زندگی سونی معلوم ہونے لگے۔ اس کے مقابلہ میں شرک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور چیز کو آدمی اپنی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنالے۔ شرک کو چھوڑنا اور اللہ کا عبادت گذار بننا آدمی کو بے نفس اور بے انا بناتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں وہ یقینی طور پر آپس میں جڑ جائیں گے۔ وہ ایک دوسرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا ذمہ دار ہو اس کے بارہ میں مسلمانوں کا رویہ خیر خواہ جیسا ہونا چاہئے نہ کہ حریف جیسا۔ مسلم کی ایک اور روایت کے مطابق دین ہر ایک کے لئے نصیحت (خیر خواہی) کا نام ہے اور اسی طرح حکمرانوں کے لئے بھی (ولائمۃ المسلمین) عام لوگ جب حکمرانوں کے اندر برائی دیکھتے ہیں تو اس کے خلاف ہنگامے کرتے ہیں اور اس کو تخت سے بے دخل کرنے کی مہم چلاتے ہیں۔ مگر مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ محبت کے ساتھ حکمراں کی اصلاح کی کوشش کرے۔

اللہ کو ایسے بندے پسند ہیں جو قول سے زیادہ عمل سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ اس لئے وہ قیل وقال کی بحث سے سخت ناراض ہوتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں پر غضب ناک ہوتا ہے جو غفلت اور بے حسی میں پڑے رہتے ہیں اور غیر ضروری سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اللہ جن لوگوں کو مال دے اور اس کو وہ حقیقی مد میں خرچ کرنے کے بجائے ادھر ادھر ضائع کرتے رہیں وہ خدا کی نظر میں بدترین جانور ہیں۔ خدا کبھی ایسے لوگوں پر اپنی رحمت کا سایہ نہیں کرے گا۔

مومن و کافر کا فرق

قرآن کی سورہ نمبر ۷۸ میں بتایا گیا ہے کہ جب قیامت آئے گی اور سارے لوگ خدا کے حضور جمع کئے جائیں گے تاکہ وہ اپنی اس کمائی کو دیکھیں جو انھوں نے اپنے آگے کے لئے بھیجی تھی۔ اس وقت منکر اور سرکش کا یہ حال ہوگا کہ جب وہ اپنے انجام کو دیکھے گا تو کہہ اٹھے گا: اے کاش میں مٹی ہوتا (ویقول الکافر یالیتنی کنتُ ترابا)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارہ میں روایات میں آتا ہے کہ جب ان کو ابو لولو فیروز نے زخمی کیا اور آپ کا آخر وقت آگیا تو آپ کے صاحبزادے آپ کا سر اپنی ران پر رکھے ہوئے تھے حضرت عمر نے کہا: اے عبد اللہ، میرا رخسار زمین سے ملادے (الصق خدی بالارض یاعبد اللہ) آپ کے صاحبزادے نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے اپنا چہرہ زمین پر رکھ کر کہا۔ اے عمر، تیری خرابی ہے اور تیری ماں کی خرابی ہے، اگر خدا نے تجھے معاف نہ کیا۔ اس کے بعد آپ کی وفات ہوگئی (طبقات ابن سعد)

ان دونوں واقعات کا مقابلہ کرکے دیکھئے۔ جو بات کافر کی زبان سے آخرت میں نکلے گی وہ مومن کی زبان سے اسی دنیا میں نکل رہی ہے۔ کافر موت کے بعد آنے والی دنیا میں چاہے گا کہ کاش وہ مٹی میں مل جاتا۔ مومن موت سے پہلے کی دنیا میں کہہ رہا ہے کہ مجھے مٹی میں ملادو۔

خدا جب سامنے ظاہر ہوجائے گا تو کس کی مجال ہے کہ اس سے سرکشی کرے۔ اس وقت ہر آدمی اس کے سامنے جھک جائے گا۔ مگر خدا کے لئے جھکنا صرف وہ معتبر ہے جو خدا کے سامنے آنے سے پہلے ہو۔ یہی کافر اور مومن کا فرق ہے۔ کافر اس وقت جھکے گا جب خدا عیاناً اس کے سامنے ظاہر ہوجائے۔ مگر مومن اس وقت خدا کے لئے جھک جاتا ہے جب کہ خدا ابھی پردۂ غیب میں چھپا ہوا ہے۔

لوگ خدا کے باغی صرف اس لئے ہیں کہ خدا آج ان کے سامنے موجود نہیں۔ جب خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ دکھائی دینے لگے تو کون اس کا باغی بن سکتا ہے۔ انسان تو شیر کے سامنے بھی اس کا باغی نہیں بنتا، پھر شیر کے خالق کے سامنے کون اس کا باغی بننے کی جرأت کرے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر آخرت میں گذرنے والا ہے وہ مومن پر اسی دنیا میں گذر جاتا ہے۔ کافر خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑے گا۔ مومن وہ ہے جو خدا کو دیکھے بغیر ڈھ پڑے۔

مسلم صحافت

دور اول کے مسلمان اس احساس کے تحت ابھرے تھے کہ انھوں نے پایا ہے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمان اس احساس پر کھڑے ہوئے ہیں کہ انھوں نے کھو دیا ہے۔ یہی فرق ان تمام علمی اور اخلاقی فرقوں کا اصل سبب ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمان اور دور اول کے مسلمانوں کے درمیان دکھائی دیتے ہیں۔

دور اول میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان کے لئے اسلام سب سے بڑی نعمت تھا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے پاس جو چیز ہے وہ صرف یہ احساس ہے کہ اسلام کی تاریخ نے ان کو جو سیاسی اور قومی حیثیت دی تھی اس کو دوسری قوموں نے ان سے چھین لیا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں احساس مظلومی (Persecution Complex) میں مبتلا ہیں۔ وہ دوسری قوموں کو ظالم اور اپنے کو مظلوم سمجھے ہوئے ہیں۔ کہیں امریکی، کہیں روسی، کہیں ہندو، کہیں یہودی اور کہیں کوئی اور قوم انھیں اپنے موجودہ مسائل کا ذمہ دار نظر آتی ہے۔ اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ میں ان کی تمام سرگرمیاں محض بے فائدہ احتجاج بن کر رہ گئیں۔

اس کا اثر مسلمانوں کی صحافت پر بھی ہے۔ موجودہ زمانہ کی مسلم صحافت کا کوئی ایک مشترک نام دینا ہو تو وہ یقینی طور پر احتجاج ہوگا۔ آج مسلمانوں کا ہر اخبار اور رسالہ ایک قسم کا احتجاج نامہ بن کر رہ گیا ہے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی صحافت کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے قومی کیس کی وکالت کرے۔ جب کہ صحیح مسلم صحافت وہ ہے جو اسلام کی وکالت کرنے والی ہو۔ جو اصولی بنیادوں پر چلائی جائے نہ کہ قومی بنیادوں پر۔

قومی وکالت میں قومی مسائل توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کی وکالت یہ ہے کہ خدا کے دین کو خدا کے بندوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے پچھلے زمانوں میں بے شمار رسول بھیجے اور ان کے ساتھ کتابیں اتاریں۔ مگر یہ کتابیں اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہ رہ سکیں۔ اس کے بعد پیغمبر آخر الزمان صلے اللہ علیہ وسلم آئے۔ ان پر جو کتاب اتری اس کو خدا نے کامل طور پر محفوظ کر دیا۔ اب ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ اس صحیح آسمانی ہدایت (قرآن) کو تمام انسانوں اور تمام قوموں تک پہنچائیں۔ مسلم صحافت حقیقۃً وہی ہے جو اس طرز کی اسلامی دعوت کی نمائندہ ہو۔

مسلم صحافت اور اسلامی صحافت، دونوں میں بظاہر بہت معمولی فرق نظر آتا ہے۔ مگر

حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک قومی صحافت ہے اور دوسری اصولی صحافت۔ ایک انسان کی نمائندہ ہے اور دوسری خدا کی نمائندہ۔ ایک کا مرکز توجہ دنیا کے مسائل ہوتے ہیں اور دوسری کا مرکز توجہ آخرت کے مسائل۔

مسلم قومی صحافت دوسری قوموں کو حریف کے روپ میں دیکھتی ہے۔ جب کہ اصولی اسلامی صحافت کے لئے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسلم قومی صحافت کے نزدیک دوسری قومیں ہم سے ہمارا اثاثہ چھینے ہوئے ہیں۔ جب کہ اسلامی صحافت کے نزدیک اصل واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پاس دوسری قوموں کے لئے خدا کی ایک امانت ہے جس کو ہمیں ان قوموں تک پہنچانا ہے۔ پہلی صورت میں ہمارے اندر دوسری قوموں کے لئے نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں، جب کہ دوسری صورت میں تمام قومیں ہمارے لئے محبت کا موضوع بن جاتی ہیں۔

یہ موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی فکری غلطی ہے جس میں تمام دنیا کے مسلمان مبتلا ہیں۔ اس وقت مسلمانوں پر دوسری قوموں کی طرف سے جو کچھ بیت رہا ہے وہ حقیقۃً ہماری اسی کوتاہی کی خدائی سزا ہے جب تک مسلمان اپنی اس غلطی کی اصلاح نہ کریں گے وہ اسی طرح دنیا میں بےقیمت بنے رہیں گے۔

مسلم قیادت موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔ اس کی وجہ قیادت کی یہ غلطی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مستقبل کو تعمیر کے بجائے سیاست میں تلاش کیا۔ سیاست کا مطلب عملی طور پر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لئے دوسروں کے خلاف مہم چلائی جائے۔ جب کہ تعمیر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لئے خود اپنے اوپر بھروسہ کیا جائے۔

کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ قوم کو اس حیثیت سے تیار کیا جائے کہ لوگوں کا شعور بیدار ہو۔ ان کے اندر کردار کی طاقت پیدا ہو۔ وہ تعلیم میں اونچے ہوں۔ وہ باہم ایک ہوکر رہنا جانیں۔ اقتصادی شعبوں میں انھوں نے اپنی جگہ بنائی ہو۔ صحافت اور ابلاغ عامہ میں وہ دوسروں سے پیچھے نہ ہوں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کو یہ فکر دیا جائے کہ وہ صاحب نظریہ افراد ہیں اور انھیں بامقصد انسان کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان رہنا ہے۔

انھیں چیزوں کے اوپر کسی قوم کی زندگی کا دارومدار ہے۔ مگر مسلم قیادت نے موجودہ زمانہ میں یہ کیا کہ اپنی تیسرے درجہ کی صحافت میں صرف دوسروں کے خلاف احتجاج اور مطالبہ کی مہم چلائی۔ اس نے خود اپنی تعمیر کے لئے وقت کے تقاضوں کے مطابق کوئی کام نہیں کیا۔

خدا کی یاد

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو اللہ کا بہت ذکر کرو (یاایھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً، الاحزاب ۴۱) اس کا مطلب بعض لوگ یہ لیتے ہیں کہ خوب زیادہ اللہ اللہ کرو۔ " اللہ " کا لفظ ہزاروں بار دہراؤ۔ مگر اس قسم کے ذکر کا مذکورہ آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن میں ذکر کسی قسم کی لفظی تکرار کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یاد کے معنی میں مذکورہ آیت کا مطلب ہے ۔۔۔ اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔

قرآن میں دوسرے مقام پر ہے کہ میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا (فاذکرونی اذکرکم، البقرۃ ۱۵۲) اس آیت میں خدا اپنے بندوں سے کہہ رہا ہے کہ تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا۔ ظاہر ہے کہ یہاں ذکر کو تکرار الفاظ کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ کیوں کہ خدا ایسا نہیں کرے گا کہ بندہ بندہ بار بار کہہ کر کسی کا ذکر کرے۔ یہاں ذکر لازمی طور پر یاد کے معنی میں ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ موت کا بہت زیادہ ذکر کرو (اکثروا ذکر ھادم اللذات) اس حدیث میں بھی ذکر لفظی تکرار کے معنی میں نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ایسا کوئی بھی نہیں کرتا کہ بیٹھ کر موت، موت، کہنے لگے۔ اس حدیث میں یقینی طور پر موت کا ذکر کرنے کا مطلب موت کو یاد کرنا ہے۔

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی آواز بہت اچھی تھی۔ قرآن پڑھتے تو لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا: ابو موسیٰ کو آل داؤد کی خوش الحانی دی گئی ہے (لقد اوتی ابو موسیٰ مزماراً من مزامیر آل داؤد)

روایات میں آتا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ملاقات حضرت ابو موسیٰ اشعری سے ہوتی تو اکثر ان سے کہتے کہ اے ابو موسیٰ، ہمارے رب کو ہمیں یاد دلاؤ (یا ابا موسیٰ ذکّرنا ربّنا عزّ وجل) حضرت عمر کے اس قول میں بھی ذکر کسی قسم کے تکرار لفظی کے معنی میں نہیں ہے۔ یعنی حضرت عمر کی منشا یہ نہیں تھی کہ حضرت ابو موسیٰ ان کے پاس بیٹھ کر اللہ اللہ یا رب، رب کریں۔ اس فقرہ میں ذکر کا لفظ یاد کے معنی میں ہے۔ یعنی قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر ہمیں خدا کی یاد دلاؤ۔

لغت میں ذکر کے معنی یاد کے ہیں۔ اس لفظ کا یہی مفہوم شریعت میں بھی ہے۔ ذکر سے مراد اللہ اور اس کی باتوں کی یاد ہے۔ یعنی آدمی کو خدا سے اتنا گہرا تعلق ہو جائے کہ وہ اس کے دل و دماغ پر سما جائے۔ وہ ہر موقع پر اس کو یاد آتا رہے۔

موضوع حدیث

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے جان بوجھ کر میرے اوپر جھوٹ باندھا تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے (من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار) یہ اور اس طرح کی دوسری روایات سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو آپ نے نہ کہی ہو سراسر حرام ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ جو شخص کسی روایت کے بارہ میں جانے کہ وہ موضوع ہے یا اس کے موضوع ہونے کا گمان ہو اس کو ایسی حدیث کا بیان کرنا حرام ہے ... ایسی حدیث خواہ احکام سے متعلق ہو یا ترغیب و ترہیب سے یا رقاق سے، ہر حال میں اس کو بیان کرنا حرام ہے۔

علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب الموضوعات (جلد اول) میں لکھا ہے:

قوم وضعوا الاحادیث فی الترغیب والترھیب لیحثوا الناس فی زعمھم علی الخیر ویزجروھم عن الشر وھذا تعاط علی الشریعۃ ومضمون فعلھم ان الشریعۃ ناقصۃ تحتاج الی تتمۃ فقد اتممناھا	ایک گروہ نے ترغیب و ترہیب میں حدیثیں گھڑی ہیں تاکہ اپنے گمان کے مطابق وہ لوگوں کو بھلائی کی طرف لائیں اور برائی سے انھیں روکیں۔ مگر یہ شریعت پر زیادتی ہے۔ ان کے اس عمل کا مطلب یہ ہے کہ شریعت ناقص ہے، وہ تکمیل کی محتاج ہے پس ہم نے اس کو مکمل کیا ہے۔

ماضی میں جن لوگوں نے حدیثیں گھڑیں وہ عام طور پر دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو دل سے اسلام کے مخالف تھے۔ اور اسلام کا مذاق اڑانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے مضحکہ خیز قسم کے قصے بنائے اور ان کو صحابہ کرام اور رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے عوام کے اندر پھیلا دیا۔

دوسرے وہ لوگ جو بذات خود مخلص تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ثابت شدہ احادیث عام طور پر سیدھی سادی ہیں اور عوام کے لئے زیادہ اثر انگیز ثابت نہیں ہوتیں۔ چنانچہ انھوں نے عوام کے اندر ڈر اور شوق پیدا کرنے کے لئے طلسماتی قسم کی حدیثیں بنائیں۔ ان حدیثوں میں چھوٹے چھوٹے اعمال پر بہت بڑے بڑے ثواب کی امید دلائی گئی تھی یا بہت بڑے بڑے عذاب سے ڈرایا گیا تھا ـــــ مذکورہ دونوں گروہوں میں ایک مخلص تھا اور دوسرا غیر مخلص۔ مگر دونوں نے دین میں ایسی خرابیاں پیدا کیں جن کی تلافی اب کسی طرح ممکن نہیں۔

ذاتی عینک

جب آدمی کے ذہن پر کسی چیز کا شدید غلبہ ہو تو اس کو ہر چیز میں وہی چیز نظر آتی ہے۔ ایک شخص بھوکا ہے اور روٹی کے لئے تڑپ رہا ہے۔ اس سے اگر پوچھا جائے کہ دو اور دو مل کر کتنے ہوتے ہیں تو وہ کہے گا کہ چار روٹیاں۔ حتیٰ کہ وہ سورج اور چاند کی طرف دیکھے گا تو ان کی گولائی میں بھی اس کو روٹی کی صورت دکھائی دے گی۔ اسی حقیقت کو نظیر اکبر آبادی نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے   بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

یہی صورت دین میں بھی پیش آتی ہے۔ مثلاً قرآن کی ایک آیت ہے:

یا ایہا الرسول بلغ ما انزل	اے رسول جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے
الیک من ربک و ان لم تفعل فما	اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تم نے اس
بلغت رسالتہ و اللہ یعصمک من الناس	کی رسالت نہیں پہنچائی اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔

شیعہ حضرات کے ذہن پر حضرت علی کی خلافت کا غلبہ ہے۔ وہ اسی کو سب سے بڑا دینی مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جب یہ آیت پڑھی تو فوراً ان کے ذہن نے کہا کہ اس آیت میں حضرت علی کی خلافت بلافصل کا بیان ہے۔ شیعہ علماء کا کہنا ہے کہ اس آیت میں جس چیز کی تبلیغ کا حکم ہے وہ حضرت علی کی خلافت ہے۔ آپ کو خدا نے وحی کی کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ میرے بعد علی ابن ابی طالب سلطنت اسلامی کے خلیفہ ہوں گے۔ ان کے نزدیک اس آیت میں عام احکام دین کی تبلیغ مراد نہیں ہے بلکہ علی کی خلافت کی تبلیغ مراد ہے۔

اسی طرح ہر آدمی کوئی نہ کوئی خیال اپنے ذہن میں لئے ہوئے ہے۔ وہ جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کو اپنا خیال قرآن کے صفحات میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن میں لکھا ہوا ہو کہ "کرو" تو وہ اپنی طرف سے لفظ بڑھا کر سمجھ لیتا ہے کہ فلاں کام کرو۔

یہی مثال ان لوگوں کی ہے جن کے ذہن میں یہ بسا ہوا ہے کہ اسلام کا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ وہ قرآن میں پڑھتے ہیں کہ دین قائم کرو (اقیموا الدین) ان کا ذہن ان الفاظ سے فوراً یہ معنی نکال لیتا ہے کہ دینی حکومت قائم کرو۔ حالانکہ یہاں دین کا لفظ اجتماعی نظام کے معنی میں نہیں ہے بلکہ انفرادی تقاضوں کے بارے میں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ـــــ ایمان اور اخلاص کی زندگی اختیار کرو۔ اپنی ذاتی زندگی میں خدا کی مرضی پر پوری طرح قائم ہو جاؤ۔

لفظی موشگافی

ہندستان کی آزادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک ہندستانی عدالت میں قتل کا ایک مقدمہ آیا۔ قاتل کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح وکیل تھے۔ قتل بہت زیادہ واضح تھا۔ تمام کارروائی اس طرح چل رہی تھی گویا قاتل کو سزا ہو کر رہے گی۔ مگر مسٹر جناح نہایت مطمئن تھے۔ وہ عدالت کی کارروائیوں میں بظاہر دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ قاتل اور اس کے ساتھیوں کو مسٹر جناح کے اوپر شبہ ہوا کہ وہ کسی وجہ سے کیس کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں۔ اور قاتل کو سزا دلوا کر رہیں گے۔ مگر مسٹر جناح ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ اطمینان رکھو، کچھ نہیں ہوگا۔

دن گزرتے رہے یہاں تک کہ قاتل کے لئے پھانسی کی سزا کا فیصلہ ہو گیا۔ مگر مسٹر جناح اب بھی مطمئن تھے۔ اس کے بعد اعلان ہوا کہ فلاں تاریخ کو اتنے بجے قاتل کو پھانسی دی جائے گی۔ مسٹر جناح بدستور مطمئن رہے یہاں تک کہ پھانسی کا وقت آگیا۔

مسٹر جناح اپنے پورے وکیلانہ لباس کے ساتھ پھانسی گھر پہنچے اور نہایت خاموشی کے ساتھ پوری کارروائی دیکھتے رہے۔ جب آخری لمحہ آیا اور ہینگ مین نے رسی کا حلقہ قاتل کی گردن میں ڈالا تو مسٹر جناح فوراً بولے کہ بس۔ اس کے آگے اگر کچھ اور کیا تو تم سب لوگوں کو پھانسی پر چڑھا دوں گا۔

اب سارے لوگ حیران ہو گئے۔ مسٹر جناح نے کہا کہ جج نے اپنے فیصلہ میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس کی گردن میں پھانسی دی جائے (He shall be hanged by the neck) اور ملزم کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے بعد ان الفاظ کی تعمیل ہو گئی، اب اس کے آگے آپ کچھ اور نہیں کر سکتے۔ اس وقت تک پھانسی کے ہندستانی قانون میں اتنے ہی الفاظ تھے۔ اس واقعہ کے بعد نیا قانون پاس کیا گیا جس میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ ملزم کی گردن میں پھانسی دی جائے گی تاوقتیکہ وہ مر جائے:

He shall be hanged by the neck till he is dead

اس قسم کی لفظی موشگافیاں دنیا میں اکثر لوگوں کے لئے بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ آدمی عدالت کی پکڑ سے بچ جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنی گرتی ہوئی قیادت کو دوبارہ سنبھالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو کبھی غلط ثابت ہونے نہیں دیتا۔ اس کے ذریعہ وہ بڑے بڑے فائدے حاصل کرتا ہے مگر یہ سب کچھ صرف موجودہ دنیا کی حد تک ہے۔ آخرت میں اس قسم کی موشگافی کسی کے کچھ کام نہ آئے گی۔ کیوں کہ آخرت میں تمام فیصلے حقیقت کی بنیاد پر ہوں گے نہ کہ لفظی کرتب کی بنیاد پر۔

اختلاف کا سبب

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد مسلمانوں کو سب سے زیادہ جس خطرہ سے ڈرایا تھا وہ آپس کا اختلاف تھا۔ یہ اندیشہ آج مسلمانوں کے بارہ میں پوری طرح صحیح ثابت ہو چکا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان آج کی دنیا کی واحد قوم ہیں جو سب سے زیادہ آپس میں لڑتے ہیں۔ جن کے درمیان سب سے زیادہ باہمی جھگڑا برپا رہتا ہے۔

مسلمانوں کے درمیان اس کمزوری کی ایک خاص نفسیاتی وجہ ہے، اور وہ ہے جھوٹا احساس برتری۔ مسلمان اپنے مخصوص عقائد کی وجہ سے ہمیشہ اُس وقت جھوٹے احساس برتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں جب کہ خدا کا خوف ان کے دلوں سے نکل گیا ہو۔

مسلمان کا عقیدہ ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ حق صرف وہ ہے جو اس کے پاس ہے۔ دوسری طرف اس کا عقیدہ اس کو یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا ہی طاقت ور ہے، باقی سب لوگ عاجز ہیں۔ اس طرح مسلمان بیک وقت دو احساسات کے درمیان ہوتا ہے۔ بندوں کی نسبت سے سب سے بہتر ہونے کا احساس، اور خدا کی نسبت سے سب سے کم تر ہونے کا احساس "صرف میرے پاس حق ہے، میرے سوا کسی کے پاس حق نہیں" یہ عقیدہ عین اپنی فطرت کے مطابق آدمی کے اندر اپنی برتری کا احساس پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف یہ احساس کہ خدا ہی ہر چیز کا مالک ہے، میرے پاس اپنی کوئی چیز نہیں "، یہ احساس اس کے اندر عجز کا جذبہ ابھارتا ہے۔ اس طرح یہ دوسرا احساس پہلے احساس کو متوازن کرتا رہتا ہے۔ اپنے کو خیر امت سمجھتے ہوئے بھی آدمی دوسروں کے درمیان اس طرح رہتا ہے گویا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

مگر جب مسلمانوں کے اندر بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو ان کے اندر سے جو چیز نکل جاتی ہے وہ یہی خدا کا ڈر ہے۔ اب مسلمان بے جان عقیدہ کے طور پر خدا کو مانتے ہیں۔ خدا کی عظمت اور کبریائی کے احساس سے ان کا دل خالی ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی وہ خاص نفسیات ہے جو ان کے درمیان آپس کی لڑائی کو جنم دیتی ہے۔ سمندر کا پانی اگر اڑ جائے تو وہاں صرف نمک باقی رہے گا۔ اسی طرح " میں حق پر ہوں " کے احساس سے جب " میں عاجز ہوں " کا احساس نکل جائے تو اس کے بعد آدمی کے اندر جو چیز باقی رہے گی وہ صرف اپنی برتری کا جذبہ ہے۔ اور برتری کا جذبہ عجز سے خالی ہونے کے بعد ظلم اور فساد کے سوا کوئی اور چیز آدمی کے اندر پیدا نہیں کرتا۔

کیسے عجیب لوگ

نظام، خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی اس کو قائم کرنے کے لئے ایسے افراد درکار ہوتے ہیں جن کے اندر حکمت اور کیرکٹر ہو۔ ایسے لوگ جن کے اندر نہ حکمت ہو اور نہ وہ کردار کی طاقت رکھتے ہوں وہ نہ اسلامی نظام قائم کر سکتے ہیں اور نہ غیر اسلامی نظام۔

۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا تو جواہر لال نہرو ملک کے پہلے وزیر اعظم بنائے گئے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ملک کے اکثر دانشور اور رہنما یا تو انگریزوں کے وفادار رہے تھے یا ان کا ماضی کا ریکارڈ بتا رہا تھا کہ وہ کانگرس اور تحریک آزادی کے مخالف رہے ہیں۔ جواہر لال نہرو سے کسی نے اس صورت حال کا ذکر کیا اور کہا کہ ایسے لوگوں کے ذریعہ آپ کیوں کر اپنی حکومت چلائیں گے۔ نہرو نے جواب دیا:

"ہر آدمی کی ایک قیمت ہے اور میں وہ قیمت ادا کر سکتا ہوں"

چنانچہ نہرو نے لوگوں کو مختلف عہدے اور حیثیت دے کر نئی حکومت کا وفادار بنا لیا اور اس طرح کامیاب طور پر ملک کا انتظام چلاتے رہے۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ ۱۹۸۰ میں آیات اللہ خمینی کو ایران میں اقتدار حاصل ہوا۔ اب ان کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا۔ کیوں کہ اس سے پہلے ایران میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی اور وہاں کا دانشور طبقہ شاہ کی وفاداری میں خمینی تحریک کا مخالف بنا ہوا تھا۔ امام خمینی کے سامنے یہ مسئلہ آیا تو انھوں نے کہا کہ "ہم ایسے تمام لوگوں کو مار ڈالیں گے"۔ چنانچہ انھوں نے ایک طرف سے ان تمام لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا جنھوں نے انقلاب سے پہلے کوئی مخالفانہ رول ادا کیا تھا۔ امام آیات اللہ خمینی اپنے "مخالفین" کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا اسلامی نظام بھی برباد ہو کر رہ گیا۔

۷ نومبر ۱۹۸۳ کو میری ملاقات ایک ایسے تعلیم یافتہ شخص سے ہوئی جو ۲۵ سال سے لندن میں رہتے ہیں اور اب انھوں نے وہیں کی شہریت اختیار کر لی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ برطانی قوم دوسری جنگ عظیم تک بہت بڑی شہنشاہیت کی مالک تھی۔ اب وہ تقریباً اپنے ملک تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ پھر انھوں نے اپنی موجودہ حالت سے مطابقت پیدا کر لی ہے یا ابھی تک وہ اپنے ماضی کی عظمت میں جی رہے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا کہ برطانی قوم نے اس معاملہ میں بڑی گہری ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔

انھوں نے اپنی موجودہ صورت حال سے مطابقت کر لی ہے۔ مگر وہ مطابقت اس طرح ہے کہ اپنی عظمت کا احساس بدستور انھیں حاصل ہے، وہ اس سے محروم نہیں ہوئے۔ انھوں نے ایسا کیا ہے کہ انھوں نے برطانی عظمت کو مغربی عظمت میں تبدیل کر لیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو بڑائی انھیں برطانیہ کی سطح پر حاصل نہیں ہے وہ آج بھی ان کو مغرب کی سطح پر حاصل ہے۔ "جب ہم خود بھی اسی مغرب کا حصہ ہیں تو ہم کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت"، برطانی قوم نے جب دیکھا کہ وہ اپنی عظمت کو انفرادی سطح پر قائم نہیں رکھ سکتے ہیں تو انھوں نے دوسروں کے ساتھ مل کر اپنی عظمت کو دوبارہ اجتماعی صورت میں حاصل کر لیا۔

دوسری طرف مسلم دنیا کا حال دیکھئے۔ پاکستان میں تقریباً ایک درجن بڑی بڑی اسلامی تنظیمیں اور جماعتیں ہیں۔ یہ تمام تنظیمیں اور جماعتیں پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنے کی علم بردار ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں کم ازکم دو بار ایسا ہوا ہے کہ یہ جماعتیں "متحدہ محاذ" بنا کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئی ہیں۔ پہلی بار صدر ایوب خاں کو حکومت کے عہدہ سے ہٹانے کے لئے اور دوسری بار ذوالفقار علی بھٹو کو ہٹانے کے لئے جو اس وقت وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز تھے۔ دونوں بار یہ جماعتیں منفی مقصد میں کامیاب ہو گئیں۔ انھوں نے ایوب خاں کو بھی حکومت سے نکال دیا اور بھٹو کو بھی۔

مگر اس کے بعد جب وہ وقت آیا کہ پاکستان کی یہ اسلامی تنظیمیں اور جماعتیں مل کر اسلامی نظام قائم کریں اور ملک کو اسلامی تہذیب اور اسلامی سیاست کا نمونہ بنا دیں تو تمام جماعتیں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ اب ہر جماعت یہ چاہنے لگی کہ اس کو تنہا حکومت کی کرسی مل جائے۔ چونکہ یہ ممکن نہ تھا، ان میں سے کوئی بھی حکومت پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ صدر ایوب کے ہٹنے کے بعد بھٹو نے حکومت پر قبضہ حاصل کر لیا اور وزیر اعظم بھٹو کے بعد جنرل ضیاء الحق نے۔

پاکستان کے "اسلام پسند" لیڈر اگر برطانیہ کے "کفر پسند" لیڈروں کی طرح ہوتے تو وہ اپنی قوم کے دوسرے ہم مذہبوں کی عظمت میں اپنی عظمت دیکھ لیتے۔ اور پھر ایک دوسرے سے مل جاتے نہ کہ الگ الگ ہو کر اپنے کو کمزور کر لیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پاکستان میں وہ اسلامی نظام عملاً قائم ہو چکا ہوتا جس کے لئے ابھی تک وہاں صرف پرجوش الفاظ بولے جا رہے ہیں ــــــ جن لوگوں کے اندر کافرانہ نظام قائم کرنے کی بھی صلاحیت نہیں وہ اسلامی نظام قائم کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ آسمان نے اس سے زیادہ عجیب منظر شاید کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

عورت کے بارہ میں

مغربی تہذیب کے مخصوص نظریات میں سے ایک نظریہ مرد اور عورت کی مساوات تھا۔ مغربی دنیا میں پچھلے سو سال سے اس نظریہ کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ تجربہ سراسر ناکام ثابت ہوا ہے۔ کسی بھی شعبہ میں یہ ممکن نہ ہو سکا کہ مرد اور عورت کو برابر کا درجہ دیا جا سکے۔ قانون کے اعتبار سے برابر کا درجہ پانے کے باوجود عملی طور پر دونوں سماج کے اندر برابر کا مقام حاصل نہ کر سکے۔

اس فرق کے بارہ میں ابتداءً یہ کہا گیا کہ یہ فرق ماحول (Environment) کا پیدا کردہ ہے۔ مگر جدید تحقیقات اس مفروضہ کو سراسر بے بنیاد ثابت کر رہی ہیں۔ مختلف شعبوں میں تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ یہ فرق حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام تر پیدائشی ہے نہ کہ تاریخی۔

نیو یارک کے نیوز ویک (۱۸ مئی ۱۹۸۱) میں ایک مفصل رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں مختلف امریکی محققین کے نتائج تحقیق شائع ہوئے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ عورت اور مرد کی بناوٹ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مرد کا مسائل کو حل کرنے میں زیادہ بہتر ثابت ہونا، عورتوں کا جذباتی طور پر سوچنا، لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کا زیادہ بہادرانہ انداز سے کھیلنا، ریاضیات میں مردوں کا زیادہ برتر رہنا، یہ سب دونوں صنفوں کے درمیان حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے نہ کہ محض ماحول کا۔

محققین کا خیال ہے کہ قائدانہ خصوصیتیں (Leadership capacities) مردوں میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں۔ جدید تحقیقات لوگوں کو اس عقیدہ کی طرف لے جا رہی ہیں کہ سابقہ خیال کے برعکس پرورش (Nurture) نہیں بلکہ فطرت (Nature) وہ اصل عامل ہے جس نے مرد اور عورت کے عمل میں فرق پیدا کیا ہے۔ عمومی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لڑنے بھڑنے کی صلاحیت عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر زیادہ ہوتی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ دونوں کے ہارمون (Harmone) جدا جدا ہوتے ہیں اور وہی دونوں کے درمیان فرق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ محققین نے نر کے Harmone testosterone کو مادہ کے جسم میں داخل کیا تو مادہ کے اندر نر کی خصوصیات محسوس کی جانے لگیں۔ کچھ لڑکیوں میں پیدائش سے پہلے مردانہ ہارمون داخل کر دئے گئے۔ چنانچہ پایا گیا کہ پیدائش کے بعد ان میں گڑیوں سے کھیلنے کا شوق بہت کم تھا، ان میں لڑکوں کی طرح جارحیت کا مزاج زیادہ پایا گیا۔

محققین نے پایا ہے کہ ہارمون خود دماغ کے ڈھانچہ کو بدل دیتے ہیں۔ نر اور مادہ کے دماغ (Brain) میں فرق پایا گیا ہے اور اس کا سبب دونوں کے ہارمون کا فرق ہے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ دونوں صنفوں کے درمیان ناقابل انکار فرق (Undeniable difference) موجود ہے۔

یہ تحقیقات واضح طور پر ثابت کر رہی ہیں کہ عورت اور مرد کی تخلیق میں فرق ہے اور جب دونوں میں فرق ہے تو دونوں کا دائرۂ عمل الگ الگ ہونا چاہیے۔ مگر جو لوگ لمبی مدت تک پچھلے خیال کے ساتھ وابستہ رہے ہیں وہ ابھی اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ایک مغربی عالم نے کہا:

Whether these physiological differences destine men and women for seperate roles in society is another and far more delicate question.

کیا یہ عضویاتی فرق مردوں اور عورتوں کے لئے سماج کے اندر الگ الگ کردار مقدر کرتے ہیں، یہ ایک علاحدہ اور زیادہ پیچیدہ سوال ہے (ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۸۱)

اس سے پہلے امریکہ کے ایک اور ہفتہ وار میگزین ٹائم (۲۰ مارچ ۱۹۷۲) نے اس موضوع پر تفصیلی رپورٹ شائع کی تھی۔ میگزین کے وسیع ادارتی اسٹاف میں سے ۲۰ تعلیم یافتہ خواتین کو مقرر کیا گیا کہ وہ "جدید امریکہ میں عورتوں کی حالت" کا جائزہ لیں۔ انھوں نے ہر میدان میں اس کا جائزہ لیا اور ہر شعبہ کے ماہرین سے مدد لی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی جو خصوصی نمبر کے طور پر مذکورہ میگزین میں شائع ہوئی۔ راقم الحروف نے اس رپورٹ کا ایک خلاصہ اسی زمانہ میں الجمعیۃ ویکلی (۱۷ نومبر ۱۹۷۲) میں شائع کیا تھا۔

ٹائم کی اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ سو سالہ جد و جہد کے باوجود امریکی عورت ابھی تک اسی مقام پر ہے جہاں وہ سو سال پہلے تھی۔ مرد ابھی تک جدید امریکہ میں جنس غالب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ مساوات کے نظریہ کے مطابق سماجی نہیں ہے بلکہ تمام تر حیاتیاتی اور نفسیاتی ہے۔ مغرب میں آزادیٔ نسواں کی تحریک سو سالہ تجربہ کے بعد اب اس رائے پر پہنچی ہے کہ حیاتیاتی حقائق عورت کو مرد کے برابر مقام دینے میں رکاوٹ ہیں۔ یہ قدرت کا ظلم ہے نہ کہ سماج کا ظلم۔ اس لئے اب ان کا مطالبہ ہے کہ سائنس آف یوجینکس کے ذریعہ رحم مادر میں جینٹک کوڈ کو بدل دیا جائے اور اس طرح نیا حیاتیاتی نظام وجود میں لایا جائے جس میں نئے قسم کی عورتیں پیدا ہوں اور مردوں کی برتری ختم کرکے یکساں صنفی صلاحیت کا سماج بن سکے ـــــ یہ تجویز اتنی عجیب و غریب ہے کہ اس پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

سماجی مظہر نہیں

نیوکلیر انرجی کو اگر آپ امریکہ کا سماجی مظہر (Social phenomenon) سمجھیں تو آپ کو نیوکلیر انرجی سے نفرت پیدا ہو جائے گی۔ کیوں کہ ایسی صورت میں نیوکلیر انرجی کے معنی آپ کے نزدیک یہ ہو جائیں گے کہ خطرناک بم بناؤ اور شہروں اور آبادیوں کو تباہ کرو۔ اس کے برعکس جب آپ نیوکلیر انرجی کو قدرتی مظہر (Natural phenomenon) سمجھتے ہیں تو آپ نیوکلیر انرجی کو الگ دیکھتے ہیں اور امریکہ یا کسی اور جنگی قوم کی طرف سے اس کے استعمال کو الگ۔ اب آپ ایٹم بم کو پسند نہیں کرتے مگر جہاں تک "ایٹمی" انرجی کا تعلق ہے اس سے آپ کی دل چسپی بدستور باقی رہتی ہے۔

نیوکلیر انرجی کے معاملہ میں کوئی شخص یہ غلطی نہیں کرتا کہ اس کو کسی جنگی قوم کا سماجی مظہر (Social phenomenon) سمجھے۔ مگر مذہب کا مطالعہ کرتے وقت کچھ لوگ یہی غلطی کرتے ہیں۔ مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک خدائی صداقت (Divine truth) ہے۔ مگر علم الانسان (Anthropology) میں مذہب کا مطالعہ اکثر ایک سماجی مظہر کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے مذہب کا تصور لوگوں کی نظر میں غلط ہو کر رہ گیا ہے۔ اس طرز مطالعہ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں نظریہ اور عمل کا فرق باقی نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر مسلمان قومیں جو کچھ عملاً کر رہی ہیں اسی کو آج کل کے بہت سے لوگوں نے اسلام سمجھ لیا ہے۔ یہی وہ طرز مطالعہ ہے جس نے موجودہ زمانہ میں اسلام کا خنجر (Dagger of Islam) اور محمد کی تلوار (Sword of Muhammad) جیسی کتابوں کو جنم دیا ہے۔ ان مصنفین نے یہ دیکھا کہ مسلمان خنجر اور تلوار کا استعمال کر رہے ہیں تو انھوں نے اپنے مخصوص تصور مذہب کی وجہ سے یہ سمجھ لیا کہ اسلام نام ہے تلوار اور خنجر کا۔

اس کے برعکس اسلام کو جب آپ ایک صداقت سمجھیں جو خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے اور قرآن اور سنت کے متن میں محفوظ ہے تو اسلام آپ کی نظر میں سماجی مظہر کا نام نہیں رہتا بلکہ ایک نظریہ کا نام بن جاتا ہے۔ اب آپ اسلام کو قرآن اور سنت کے متن کی روشنی میں دیکھتے ہیں نہ کہ مسلمانوں کے عمل کی روشنی میں۔

اسلام کو حقیقی طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو مسلمانوں سے الگ کر کے دیکھا جائے۔ اس کو سماجی مظہر سمجھنے کے بجائے ایک خدائی نظریہ سمجھا جائے۔ ایسی ہی صورت میں اسلام کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے۔

قانون کی حد

۲۶ اگست ۱۹۷۸ کو دہلی میں بھیانک جرم کا ایک واقعہ ہوا۔ ایک فوجی افسر ایم ایم چوپڑا کے دو بچے سنجے (۱۵) اور گیتا (۱۷) انتہائی بے قصور طور پر مار ڈالے گئے۔ نوجوان بہن بھائیوں کے اس قتل پر ملک کا ضمیر جاگ اٹھا۔ مجرمین کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر قتل کے دونوں مجرمین جسبیر سنگھ عرف بلا (۲۵) اور کلجیت سنگھ عرف رنگا (۲۳) ایک ٹرین میں سفر کرتے ہوئے آگرہ اسٹیشن پر پکڑ لئے گئے اس کے بعد دونوں پر قتل کا مقدمہ چلا۔ لمبی عدالتی کارروائی کے بعد دونوں کو پھانسی دینے کا فیصلہ ہوا۔ مختلف قانونی مراحل سے گذر کر بالآخر دونوں کو ۳۱ جنوری ۱۹۸۲ کو دہلی کے تہاڑ جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

اڈیشنل سیشن جج ایم۔ کے۔ چاولا نے پانچ صفحات کے فیصلہ میں دونوں کے لئے موت کا حکم دیتے ہوئے لکھا:

The ends of justice would be met only if the two accused were put to eternal sleep, thereby allowing others to live in peace

انصاف کے مقاصد صرف اسی طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ دونوں مجرم ہمیشہ کی نیند سلا دئے جائیں تاکہ دوسروں کو امن کے ساتھ جینے کا موقع ملے (ہندستان ٹائمس یکم فروری ۱۹۸۲)

جج کے یہ الفاظ انسانی قانون کی حد کو بہت اچھی طرح بتاتے ہیں۔ انسانی قانون کے بس میں صرف یہ ہے کہ وہ مجرم اور سماج کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ وہ مجرم کو اس کے جرم کی حقیقی سزا نہیں دے سکتا۔ ایک شخص جب کسی معصوم جان کو ناحق ذبح کر دے تو یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ موجودہ محدود دنیا کی کوئی بھی سزا اس کے جرم کے برابر نہیں ہو سکتی۔ دنیا کا جج بس اتنا ہی کر سکتا ہے کہ جس شخص کے اندر اس قسم کا مجرمانہ ذہن دیکھے اس کو آئندہ کے لئے سماج سے ہٹا دے۔

موجودہ دنیا کی یہ محدودیت تقاضا کرتی ہے کہ اس کے بعد ایک اور لامحدود دنیا آئے جہاں یہ کمی پوری ہو۔ جہاں کے جج کے امکان میں صرف یہ نہ ہو کہ وہ ظالم اور مظلوم میں جدائی کر دے بلکہ وہ ظالم کو اس کے ظلم کی ایسی سزا دے سکے جو انصاف کے تقاضے کو پورا کرنے والی ہو۔

اسلام اور عصر حاضر

حصہ اوّل

موجودہ زمانہ کے تمام انسانی مسائل، براہ راست یا بالواسطہ طور پر صرف ایک چیز کا نتیجہ ہیں ـــــ خدا اور انسان کے درمیان جدائی۔ دور جدید نے انسان کو مادی ساز و سامان تو بہت دئے مگر اس کے خدا کو اس سے چھین لیا۔ اس طرح اس نے جدید انسان کے جسم کے لئے خوراک کا انتظام کیا اور روح کو فاقہ کی حالت میں چھوڑ دیا۔ روح کو اگر جسم سے کامل طور پر جدا کر دیں تو جسم کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ اور اگر ایسا کریں کہ روح کی جو غذا ہے وہ اسے دینا بند کر دیں تو روح فاقہ کی حالت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ روح کے فاقہ سے روح پر وہ سب کچھ گذرنے لگتا ہے جو جسم کے فاقہ سے جسم پر گذرتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد ۲۸)۔ یہی بات حضرت مسیح نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان فرمائی: آدمی صرف روٹی ہی سے جیتا نہ رہے گا بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے (متی ۴:۴)

اسلام کے پاس آج کے انسان کو دینے کے لئے جو سب سے بڑی چیز ہے وہ یہی خدا کا عقیدہ ہے اگرچہ تمام مذاہب اصلاً خدا ہی کے مبلغ تھے۔ مگر بعد کے زمانہ میں وہ خدا کے تصور کو اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رکھ سکے۔ کسی نے خدا کو اپنا قومی خدا بنا لیا۔ کسی نے اس میں شرک کی ملاوٹ کر دی۔ کسی نے خدا کو مجرد فلسفیانہ تخیل بنا کر رکھ دیا۔ اس طرح یہ مذاہب اس قابل نہ رہے کہ خدا کو اس کی واقعی حیثیت میں لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں (یونس ۱۹) اب صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس کے یہاں خدا کا تصور اپنی صحیح اور کامل صورت میں محفوظ ہے۔ اس لئے جدید انسان کو اس کا مطلوب خدا صرف اسلام کے یہاں مل سکتا ہے (آل عمران ۸۵)

روحانی فاقہ

جدید تہذیب نے انسان کو خدا سے محروم کر کے اس کو روحانی فاقہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسی روحانی فاقہ کا نتیجہ ہے کہ موجودہ جاپان کے نوجوان، صنعتی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر یہ کہنے لگے ہیں کہ "ہمارا کلچر ایک مرچنٹ کلچر ہے اور صرف مرچنٹ کلچر انسان کے لئے کافی نہیں"۔ مغربی سوسائٹی کا وہ مظہر جس کو ہپی ازم کہتے ہیں وہ بھی اسی فاقہ زدگی کی ایک مثال ہے۔

ایک ہپی نوجوان دہلی کی سڑک پر پیدل چل رہا تھا۔ اس کے جسم پر نہایت معمولی ہندستانی

لباس تھا اور گلے کے ساتھ لٹکتی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈھول۔ نوجوان سے اس کا وطن پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ وہ کناڈا کا رہنے والا ہے۔ مزید سوالات کے دوران اس نے کہا: کناڈا میں میرے پاس ذاتی مکان اور ذاتی کار تھی۔ ایک اچھی بیوی تھی۔ معقول روزگار تھا۔ یہاں میرے پاس کوئی مکان نہیں جہاں بھی مجھے نیند آتی ہے میں سو جاتا ہوں، خواہ وہ ایک فٹ پاتھ ہو۔ میرے پاس اپنی سواری نہیں، روزگار نہیں۔ میری بیوی نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔

"یہاں آپ کو جب اتنی تکلیف ہے تو پھر آپ نے کناڈا کو چھوڑ کر انڈیا آنا کیوں پسند کیا،" اس کے جواب میں مغربی نوجوان نے نہایت سنجیدگی سے رک رک کر یہ الفاظ کہے: وہاں میں جسمانی طور پر مطمئن تھا، یہاں میں روحانی طور پر مطمئن ہوں:

There I was comfortable physically, here I am comfortable spiritually.

جدید تہذیب نے انسان کو بے شمار مادی چیزیں دیں۔ مگر یہ چیزیں اس کے وجود کے صرف "نصف حصہ" کو تسکین دے سکتی تھیں۔ بقیہ نصف کے لئے ان میں کوئی تسکین موجود نہیں تھی۔ جدید مشینی تہذیب کا یہی وہ تضاد ہے جس نے وہ تمام مظاہر پیدا کئے جن کو موجودہ زمانہ میں ہپی ازم، بورڈم، اَن رسٹ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اور جس کو پیس آف مائنڈ کو کھونا کہتے ہیں۔ یہاں مشہور ماہر نفسیات کارل ینگ (۱۹۶۱ - ۱۸۷۵) کا تجربہ قابل نقل ہے۔ انھوں نے کہا:

" پچھلے تیس برسوں میں روئے زمین کے تمام متمدن ممالک کے لوگوں نے مجھ سے (اپنے نفسیاتی امراض کے سلسلہ میں) مشورہ حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا ہے۔ میرے مریضوں میں زندگی کے نصف آخر میں پہنچنے والے تمام لوگ جو کہ ۳۵ سال کے بعد کہی جا سکتی ہے، کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کا مسئلہ اپنے آخری تجزیہ میں زندگی کا مذہبی نقطۂ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص کی بیماری یہ تھی کہ اس نے وہ چیز کھو دی تھی جو کہ موجودہ مذاہب ہر دور میں اپنے پیروؤں کو دیتے رہے ہیں۔ اور ان مریضوں میں سے کوئی بھی حقیقتاً اس وقت تک شفایاب نہ ہو سکا جب تک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پا لیا۔"

Quoted by C. A. Coulson, *Science & Christian Belief*, p. 110

علیحدگی کا عمل

قدیم زمانہ میں انسانی ذہن پر فلسفہ کا غلبہ تھا۔ فلسفہ چیزوں کو مکمل طور پر سمجھنے پر زور دیتا تھا۔ وہ اشیاء کے ظاہر سے گزر کر ان کے باطن تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ تاہم پانچ ہزار سالہ کوشش کے باوجود فلسفہ کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

سولھویں صدی عیسوی میں جب یورپ میں سائنسی مطالعہ کا آغاز ہوا تو سائنس دانوں نے اس کو اپنے لئے مفید سمجھا کہ وہ چیزوں کی حقیقت کو اس کی خاصیت سے جدا کر دیں۔ انھوں کے علم کی دو قسمیں قرار دیں:

۱۔ چیزوں کا علم (Knowledge of Things)

۲۔ حقیقتوں کا علم (Knowledge of Truths)

انھوں نے اپنے مطالعہ کے دوران محسوس کیا کہ حقیقت کے بارہ میں قطعی علم تک پہنچنا ان کے لئے ممکن نہیں۔ کیوں کہ حقیقت ہمیشہ اتنی لطیف ہوتی ہے جس کو انسانی پیمانوں سے ناپا اور تولا نہیں جا سکتا (الاسرار ۸۵) چنانچہ انھوں نے عملی موقف اختیار کرتے ہوئے حقیقت کو اپنی تحقیق کے دائرہ سے باہر قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم صرف "کیا" کے سوال کو لیں گے، ہم "کیوں" کے سوال پر غور نہیں کریں گے۔ اس طرح انھوں نے اپنی تحقیق کو صرف چیزوں کے علم تک محدود رکھا جس کا قطعی علم حاصل کیا جا سکتا تھا۔

یہ طرز فکر تاریخ میں کام کرتا رہا۔ اولاً گلیلیو (۱۶۵۰ - ۱۵۹۶) کے زمانہ میں پھول کی خوشبو کو پھول کی کیمسٹری سے جدا کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ڈیکارٹ (۱۶۵۰ - ۱۵۹۶) نے ثنویت (Dualism) کے اس اصول کی توسیع کی اور اس کو انسان کے مطالعہ میں استعمال کیا۔ اس نے روح کو الگ کر کے جسم کا مطالعہ شروع کیا۔ انسان کے روحانی حصہ کو اس کے وجود کے مادی حصہ سے الگ کر دیا گیا۔

مذکورہ ثنویت سے مادی سائنس کے میدان میں بظاہر کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ مقناطیس کے گرد مقناطیسی میدان (Magnetic Field) کی حقیقت کو سمجھے بغیر بھی یہ ممکن تھا کہ عملی طور پر مقناطیس کو بجلی پیدا کرنے اور موٹر چلانے کے لئے استعمال کیا جائے۔ مگر جب اس ثنویت کو انسان کے اوپر استعمال کیا گیا تو اس کے زبردست نقصانات ہوئے۔ کیوں کہ بے جان مادہ کی دنیا میں ثنویت چل سکتی ہے۔ مگر انسان ثنویت کو قبول نہیں کرتا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی آدمی کا پتھر کا اسٹیچو ہو اور اس کو آپ ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیں تو اسٹیچو کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ مگر انسان ایک نفسیاتی وجود ہے۔ اس لئے اگر زندہ انسان کو اس قسم کی کوٹھری میں بند کیا جائے تو یہ اس آدمی کو ہلاک کرنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اسٹیچو کو آپ آزادی سے محروم کر سکتے ہیں اور وہ کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرے گا۔ لیکن اگر انسان کو اس کی آزادی سے جدا کر دیں تو اس کی پوری شخصیت تہس نہس ہو جائے گی۔

مادہ کو اس کی معنویت سے اور جسم کو اس کی روح سے علیحدہ کرنے کا یہ معاملہ جو مغرب میں پیش

آیا اس نے وہ ذہنی زمین فراہم کردی جس میں خدا اور انسان کی وہ علیٰحدگی ممکن ہو سکے جو بعد کو مغرب میں پیش آئی۔

مسیحیت اور اسلام کا فرق

سائنسی تحقیق کا کام جب مسلم اسپین سے نکل کر اٹلی اور فرانس اور برطانیہ میں پہنچا اور وہاں اس کے لئے کام ہونے لگا تو جلد ہی ایک تیسرا فریق اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا جو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ یہ مسیحی چرچ تھا۔ مسیحیت جب فلسطین اور شام سے نکل کر یورپ میں داخل ہوئی تو اس کا سابقہ ارسطو کے افکار سے پیش آیا۔ چرچ نے اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے خود اپنے علم کلام کو ارسطو کے منطقی نظام پر ڈھال لیا۔ حتیٰ کہ چند سو سال گذرنے کے بعد وہ ان کے یہاں مقدس بن گیا۔ بعد کو جب سائنسی تحقیقات نے بتایا کہ ارسطو کے افکار محض قیاسی اور بے بنیاد تھے۔ ان کا حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق نہیں، تو چرچ نے محسوس کیا کہ اگر یہ نظریہ رائج ہوا تو اس کا عقائد کا نظام مشتبہ ہو جائے گا۔ اس نے اپنی غلطی کو ماننے کے بجائے طاقت کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانہ میں مسیحی چرچ کو یورپ میں زبردست اقتدار حاصل تھا۔ چنانچہ اس نے بزور جدید سائنس کو دبانا شروع کیا۔ تاہم بھیانک مظالم کے باوجود چرچ کو اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔

پندرھویں صدی عیسوی سے پہلے کے زمانہ میں سائنس کا ارتقا مسلم دنیا میں ہوا۔ اس وقت اسپین اور دوسرے مسلم علاقے سائنسی تحقیقات کا مرکز تھے۔ اس زمانہ میں سائنس اور مذہب کے درمیان کوئی ٹکراؤ پیش نہیں آیا۔ کیوں کہ سچے مذہب اور سچے علم میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ جس خدا نے دین کی وحی کی ہے، اسی نے اس کائنات کو بنایا ہے جس کی تحقیق سائنس کرتی ہے۔ پھر وحی اور علم میں ٹکراؤ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ مگر بعد کے مرحلہ میں سائنس کا ارتقا یورپ میں ہوا۔ یہاں مذہب کی نمائندگی کرنے کے لئے مسیحیت تھی جو تحریفات اور الحاقات کی بنا پر اپنی اصل ابتدائی شکل کھو چکی تھی۔ اسلام اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ نہ ہونا اور مسیحیت اور سائنس کے درمیان زبردست ٹکراؤ ہو جانا، دونوں دینوں کے درمیان اسی فرق کا براہ راست نتیجہ ہے۔

اس معاملہ میں اسلام اور عیسائیت کے فرق کو سمجھنے کے لئے ایک تقابلی مثال لیجئے۔

زمین اور سورج کی گردش کے بارہ میں قدیم یونان میں دو نظریے پیش کئے گئے تھے۔ ایک ارسطو کا نظریہ، جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین قائم ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ دوسرا ارسٹارکس کا نظریہ، جس کے مطابق زمین سورج کے گرد گھوم رہی تھی۔

ارسطو کا مرکزیت زمین کا نظریہ (Geocentric theory) عیسائیوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس نظریہ میں زمین کو بنیادی اہمیت حاصل ہو رہی تھی۔ اور چوں کہ انھوں نے حضرت مسیح کو خدائی کا مقام دے رکھا تھا اس لئے انھیں یہ بات زیادہ صحیح نظر آئی کہ وہی کرہ نظام شمسی کا مرکز ہے جہاں خداوند مسیح پیدا ہوئے ہوں۔ کوپرنیکس (۱۵۴۳-۱۴۷۳) نے جب مرکزیت آفتاب (Heliocentric Theory) کا اصول پیش کیا تو یورپ میں عیسائی پیشواؤں کو اقتدار حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے عقیدہ کے تحفظ کے لئے کوپرنیکس کی زبان بند کر دی۔ خداوند کی جنم بھومی کو تابع (Satellite) قرار دینا ایک ایسا جرم تھا جس کو مسیحیت کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

مگر یہ مسئلہ بگڑی ہوئی مسیحیت کا تھا نہ کہ حقیقی معنوں میں خدائی مذہب کا۔ چنانچہ مسلمان جو اس اعتقادی پیچیدگی میں مبتلا نہ تھے کہ پیغمبر کو خدا سمجھنے لگیں، انھوں نے مرکزیت آفتاب کے نظریہ کو زیادہ معقول پاکر اس کو قبول کر لیا۔ ان کے یہاں یہ سوال نہیں اٹھا کہ شمسی مرکزیت کا نظریہ مذہبی تعلیمات سے ٹکراتا ہے۔ پروفیسر برنس نے لکھا ہے:

> The Saracens were brilliant astronomers, mathmeticians, physicists, chemists, and physicians. . despite their reverance for Aristotle, they did not hesitate to criticize his notion of a universe of concentric spheres with the earth at the centre, and they admitted the possibility that the earth rotates on its axis and revolves around the sun.— Edward Mc Nall Burns, *Western Civilizations*, W.W. Narton & Company Inc. N Y, p. 264

مسلمان فلکیات۔ ریاضی، طبیعیات، کیمیا اور طب میں نہایت باکمال عالم تھے۔ ارسطو کے احترام کے باوجود انھوں نے اس میں تامل نہیں کیا کہ وہ اس کے اس نظریہ پر تنقید کریں کہ زمین مرکز ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ انھوں نے اس امکان کو تسلیم کیا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی سورج کے گرد گردش کر رہی ہے۔

مسیحیت میں تبدیلی

مسیحیت جب شام اور فلسطین سے نکل کر یورپ میں داخل ہوئی تو وہاں یونانی نظریات کا غلبہ تھا۔ مسیحی علماء نے یہاں تبلیغی مصلحت کی خاطر وہ عمل کیا جس کو قرآن میں مضاہاۃ (التوبہ ۳۰) کہا گیا ہے۔ انھوں نے مسیحیت کو لوگوں کے لئے قابل قبول بنانے کی خاطر اس کو مروجہ افکار کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ اس زمانہ میں زیوس (Zeus) یونانیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا جس کو وہ خدا کا اکلوتا بیٹا سمجھتے تھے۔ اس کی نقل کرتے ہوئے وہ بھی حضرت مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا کہنے لگے۔ اسی طرح اس زمانے کے جغرافی اور طبیعی نظریات

کو بھی انھوں نے کتاب مقدس کی تفسیر کے طور پر لے لیا اور اس کو اپنی مذہبی کتابوں میں اس طرح درج کر لیا جیسے کہ وہ بھی آسمان سے اترے ہوں۔

مسیحیوں کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں رومی بادشاہ قسطنطین نے مسیحیت قبول کر لی۔ وہ ۳۰۶ء سے لے کر ۳۳۷ء تک عظیم رومی سلطنت کا شہنشاہ رہا۔ اس نے اپنے شاہی اثرات کے تحت تمام یورپ میں مسیحیت پھیلادی۔ یہ لوگ جنھوں نے مسیحیت قبول کی انھوں نے کسی ذہنی اور فکری انقلاب کے ذریعہ مسیحیت نہیں قبول کی تھی بلکہ صرف حکومت کے زور پر قبول کی تھی۔ ان کا حقیقی ذہن اب بھی وہی رہا جو پہلے تھا۔ چنانچہ انھوں نے مسیحیت کو اپنے سابقہ خیالات کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ اس طرح بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسیحیت کے نام سے ایک ایسا مذہب وجود میں آگیا جس کا حضرت مسیح کی انجیل سے بہت کم تعلق تھا۔ یہ گویا رومی اور یونانی مذہب تھا جس کو مسیحیت کا نام دے کر اختیار کر لیا گیا۔ اڈولف ہارنک نے صحیح لکھا ہے کہ چوتھی صدی تک انجیل یونانی فلسفہ کے رنگ میں رنگ چکی تھی:

By the fourth century the living gospel had been masked in Greek philosophy

مذہب میں جب کوئی چیز عرصہ تک جاری رہے تو وہ مقدس بن جاتی ہے۔ چنانچہ یہ بدلی ہوئی مسیحیت چند سو سال کے بعد مقدس بن گئی۔ جو چیزابتداءً مصلحت کے تحت اختیار کی گئی تھی وہ مسیحیت کا حقیقی حصہ سمجھی جانے لگی۔ حتی کہ یونانیوں کے بے اصل علوم مسیحی علوم کہے جانے لگے۔ مثلاً مسیحی جغرافیہ (Topography Christian) وغیرہ۔

Adatf Harmack, Outline of the History of Dogma.

مذہب اور زندگی کی علیحدگی

مسلمانوں کے زوال کے بعد جب یورپ میں جدید تحقیق کا کام شروع ہوا تو "مسیحی علوم" کی غلطی واضح ہونے لگی۔ جدید علماء نے جب فلکیات اور جغرافیہ اور طبیعیات سے متعلق اپنی تحقیقات شائع کیں تو مذہبی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مسیحی چرچ نے اولاً ان علماء کی بے دینی کے فتوے دئے۔ جب اس سے لوگوں کی زبانیں بند نہیں ہوئیں تو پوپ کے حکم خاص سے احتساب کی عدالت (Inquisition) قائم ہوئی۔ اندازہ ہے کہ تقریباً تین لاکھ آدمیوں کو مسیحی احتساب کی عدالت میں کھڑا ہونا پڑا۔ ان کو سخت سزائیں دی گئیں۔ تقریباً ۳۰ ہزار آدمیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان سزا یافتگان میں گلیلیو اور برونو (Brunoe) جیسے لوگ بھی شامل تھے۔

اس کے نتیجہ میں چرچ اور سائنس کے درمیان جنگ شروع ہوئی جو بالآخر علم اور مذہب کی جنگ

بن گئی۔ مفروضہ مقدس عقائد پر بے جا اصرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ علم اور مذہب دونوں ایک دوسرے کے ضد ہیں۔ ایک کی ترقی دوسرے کے لئے موت کا حکم رکھتی ہے۔ قرآن کے مطابق علم اللہ سے قریب کرنے والی چیز ہے (فاطر ۲۸) مگر مسیحی تحریفات کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم لوگوں کو اللہ سے دور کرنے والا بن گیا۔

علم اور مذہب کا یہ تصادم تقریباً دو سو برس تک جاری رہا۔ یہاں تک ۱۸۵۹ میں چارلس ڈارون نے اپنی کتاب (Origin of Species) شائع کی۔ چرچ نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ مگر اب چرچ کا زور گھٹ چکا تھا۔ بالآخر دونوں کے درمیان (Secularism) کی صورت میں سمجھوتہ ہو گیا۔ مذہب اور علم کے دائرے ایک دوسرے سے الگ کر دئے گئے۔ مذہب کو شخصی دائرہ کی چیز قرار دے کر بقیہ تمام شعبوں میں انسان کے لئے آزادی کا حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ جو چاہے کرے اور جس طرح چاہے اپنی تحقیق چلائے۔

مذہب ایک رسمی ضمیمہ

تاہم یہ علیحدگی محض علم اور مذہب کی علیحدگی نہ تھی بلکہ یہ زندگی اور مذہب کی علیحدگی تھی۔ چرچ نے یہ نہیں کیا کہ جن غیر آسمانی افکار وخیالات کو اس نے اپنے مذہب میں شامل کیا تھا ان کو وہ اپنے مذہب سے خارج کر دے۔ ان کی ساری نامعقولیت کے باوجود وہ ان کو اپنے مذہب کا جزء بنائے رہا۔ ایسی حالت میں مذہب کو شخصی دائرہ میں جگہ ملنا بھی ناممکن تھا۔ کیوں کہ آدمی ایک سوچنے سمجھنے والی مخلوق ہے۔ جس چیز کی معنویت آدمی کے اوپر واضح نہ ہو اس کو وہ شخصی طور پر بھی اپنی زندگی کا جزء نہیں بنا سکتا۔ اس تقسیم کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ مذہب زندگی کا صرف ایک رسمی ضمیمہ بن جائے، وہ کسی کی زندگی میں حقیقی طور پر شامل نہ ہو سکے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب ۴) یعنی یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ دو غیر ہم آہنگ فکر یکساں قوت کے ساتھ آدمی کے ذہن میں جمع ہوں۔ جو چیز علمی اور فکری معیار پر پوری نہ اترے وہ کسی شخص کی زندگی کا ایک غیر موثر ضمیمہ تو بن سکتی ہے مگر وہ ایک زندہ عنصر کی حیثیت سے کبھی اس کی زندگی میں جگہ نہیں پا سکتی۔ مذہب کو شخصی طور باقی رکھنے کے لئے بھی اس کا مطابق عقل ہونا ضروری ہے۔ جو مذہب عقل کے مطابق نہ ہو وہ شخصی سطح پر بھی اپنے رکھنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ ایسا مذہب کسی آدمی کے ہاتھ میں بس "چھنگلیا" بن کر رہ جا کے ہاتھ کا "انگوٹھا" نہیں بن سکتا۔

فطرت انسانی کا تقاضا

جسم اور روح کی علیحدگی اور اس کے بعد خدا کو انسانی زندگی سے جدا کرنے کے نتیجہ میں تاریخ میں پہلی بار انسان کے سامنے یہ مسئلہ آیا ہے کہ سامان حیات کی افراط کے درمیان انسان احساس محرومی سے دوچار ہے۔ آج انسان کی صورت میں ہمارے سامنے ایک ایسا وجود ہے جس کو سب کچھ فراہم کرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر حقیقی خوشی دیکھنا ہمارے لیے مقدر نہیں۔ برٹرینڈرسل (۱۸۷۲- ۱۹۷۰) اپنی کتاب (The Conquest of Happiness) کا آغاز ان الفاظ میں کرتا ہے کہ جانور اس وقت تک خوش رہتے ہیں جب تک وہ صحت مند ہوں اور انھیں خوراک حاصل ہو۔ انسان کو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ مگر جدید دنیا میں انسان خوش نہیں، کم از کم اکثریت کا حال یہی ہے:

> Animals are happy so long as they have health and enough to eat. Human beings, one feels, ought to be, but in the modern world they are not, at least in a great majority of cases.

اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید تہذیب نے اپنی عظیم کامیابیوں کے باوجود انسان کی طلب کا صرف نصف حصہ فراہم کیا ہے اس نے "جسم" کے تقاضے فراہم کئے۔ مگر وہ "روح" کے تقاضے فراہم کرنے میں ناکام رہی۔

انسان معنویت چاہتا ہے اور جدید تہذیب اس کو صرف پتھر کا ایک ٹکڑا دیتی ہے۔ انسان زندگی چاہتا ہے اور جدید تہذیب اس کو انسان کی صورت میں ایک اسٹیچو فراہم کرتی ہے۔ انسان قلب ودماغ کی تسکین چاہتا ہے اور جدید تہذیب اس کو مشین کی بے روح گاڑی میں بٹھا کر چھوڑ دیتی ہے۔ انسان خالق کائنات سے ملنا چاہتا ہے اور سائنس اس کو مخلوق تک پہنچا کر اپنی سواری سے اتار دیتی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اپنے محسن کو سجدہ کرے۔ مگر سائنس نے جو دنیا بنائی ہے اس میں اس کو کہیں اپنا محسن نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ وہ حقیقی خدا کو نہ پاکر مفروضہ خداؤں کے آگے جھکنے لگتا ہے۔ مگر یہ ویسا ہی ہے جیسے کسی ماں کے یہاں اولاد نہ ہو تو وہ پلاسٹک کی گڑیا لے کر اپنی گود میں دبا لے۔ دوسرے تمام معبود قرآن کے الفاظ میں اسماء (یوسف ۴۰) ہیں نہ کہ حقیقتیں۔

انسان کے لئے ایک برتر خدا کی ضرورت اتنی مسلم ہے کہ وہ مفکرین بھی اس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں جو اپنے ذوق کے مطابق خدا اور مذہب کو ناپسند نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر برٹرینڈرسل نے لکھا ہے کہ اگر زندگی کو پورے معنوں میں انسانی زندگی بننا ہے تو اس کا کوئی مقصد ہونا چاہیے جو خود انسانی زندگی سے باہر ہو۔ ایسا مقصد جو غیر شخصی ہو اور انسانیت سے بلند تر ہو۔ مثلاً خدا، صداقت یا حسن:

If life is to be fully human it must serve some end which seems in some sense, outside human life, some end which is impersonal and above mankind, such as God or truth or beauty.
Bertrand Russell, *Principles of Social Reconstruction*, London, George Allen & Unwin Ltd. 1923, P. 215

یہ ایک منکر خدا کی زبان سے خدا کی فطری ضرورت کا اقرار ہے۔ دور جدید کے انسان کی محرومی یہ ہے کہ اس نے اپنے خدا کو کھو دیا ہے۔ اب اس کی نجات صرف اس میں ہے کہ دوبارہ وہ اپنے خدا کو پالے۔

علم الانسان کے ماہرین نے مختلف انسانی معاشروں کا مطالعہ کیا ہے۔ کئی ہزار سال کے تاریخی ریکارڈ کو سامنے رکھ کر انھوں نے انسان کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا متفقہ بیان ہے کہ انسان کی فطرت میں خدا کا تصور پیوست (Interwoven) ہے جس طرح بکری سے گھاس اور بلی سے گوشت کھانے کی جبلت کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح خدا کو انسانی فطرت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

موجودہ زمانہ میں اس کی ایک مثال کمیونسٹ سوسائٹی ہے۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب ۱۹۱۷ میں آیا۔ اس کے بعد روسی معاشرہ سے خدا کو نکال دیا گیا۔ تعلیم و تربیت کے تمام شعبے انکار خدا کی بنیاد پر قائم کئے گئے۔ مگر روس کی جدید نسل جو مکمل طور پر بے خدا نظام میں پیدا ہوئی ہے اور بے خدا تعلیم و تربیت کے تحت پلی اور بڑھی ہے، اس کے اندر بھی خدا کا شعور نہایت گہرائی کے ساتھ پیوست ہے۔

۱۹۷۳ کا واقعہ ہے۔ ایک روسی جہاز (Ilyushin Jet) ہندستان کی مشرقی سرحد پر اڑ رہا تھا کہ اس کا انجن خراب ہوگیا اور وہ بنگال میں گر پڑا۔ بعد کو جب جہاز کی دم سے (Black Box) نکالا گیا اور اس کو (Replay) کیا گیا تو معلوم ہوا کہ آخری لمحات میں نوجوان روسی پائلٹ کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ یہ تھا کہ پیٹر، ہم کو بچا:

Peter save us.

عجز کی تلافی

انسان کی زندگی کچھ اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ وہ مستقل طور پر عجز (Helplessness) کے احساس میں مبتلا رہتا ہے۔ اس سے کوئی بھی شخص مستثنیٰ نہیں خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، امیر ہو یا غریب، بڑا ہو یا چھوٹا۔

آدمی جسمانی اعتبار سے اتنا کمزور ہے کہ ایک معمولی حادثہ بھی اس کو زخمی کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کو زندہ رہنے کے لئے ایک بے حد متوازن جغرافیہ درکار ہے۔ جغرافی توازن میں بگاڑ کو وہ برداشت

نہیں کر پاتا۔ وہ جس کائنات میں ہے وہ اتنی زیادہ بڑی اور وسیع ہے کہ اس کے مقابلہ میں انسان اپنے آپ کو حد درجہ حقیر پاتا ہے۔ کوئی شخص علمی میدان میں تحقیق کر رہا ہو تو اس پر کھلتا ہے کہ حقائق اس سے زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہیں کہ اس کی محدود عقل ان کا احاطہ کر سکے۔ ایک آدمی جب کوئی کام کرتا ہے تو اس کو تجربہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات لامعلوم اسباب (Unknown Factors) حائل ہو کر اس کے کام کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اور اگر بالفرض کوئی خوش قسمت آدمی ان تلخ تجربات سے بچ جائے تو موت سے وہ اپنے آپ کو نہیں بچا پاتا۔ موت کا حملہ بالکل یک طرفہ ہوتا ہے۔ موت آدمی کے گھروندہ کو اس طرح تہس نہس کر دیتی ہے جیسے ایک سخت زلزلہ کسی پر رونق شہر کو اچانک ملبہ کا ڈھیر بنا دے۔

یہ احساس عجز ہر آدمی کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ چیز اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا سہارا پکڑے جو اس سے زیادہ طاقت ور ہو۔ جو اس کے لئے اس کے عجز کی تلافی بن جائے۔ یہی احساس بے چارگی آدمی کو خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ آدمی کو ایک ایسا خدا چاہئے جس کے سامنے وہ اپنے جذبات شکر کو انڈیل سکے۔ جس کے اوپر وہ اپنے معاملات میں بھروسہ کرے۔ جس کا عقیدہ اس کے لئے اس وقت بھی سہارا بنا رہے جب کہ بظاہر کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ جس سے وہ یہ امید کر سکے کہ وہ اس کی ہر بربادی کے بعد اس کو آباد کرے گا۔ اور ہر مشکل کو اس سے رفع فرمائے گا۔ اسلام کا خدا ایسی ہی ایک ہستی ہے جو پورے معنوں میں حقیقی ہے اور اسی کے ساتھ کامل بھی۔

خدا کا تصور مختلف مذاہب میں

آدمی کا یہ احساس عجز اس وقت تک تسکین نہیں پاتا جب تک اس کو "خدا" فراہم نہ کر دیا جائے۔ بظاہر ہر مذہب انسان کو یہی خدا فراہم کر رہا ہے۔ مگر اسلام کے سوا جو مذاہب ہیں وہ سب تحریف اور الحاق اور ضیاع کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ خدا کا تصور ان کے یہاں اپنی صحیح شکل میں باقی نہیں رہا ہے۔ اس لئے وہ خدا تو پیش کرتے ہیں مگر وہ ایسا خدا پیش کرتے ہیں جو واقعہ کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے انسان کو پوری تسکین نہ دے سکے۔

کیٹ اسٹیونس (Cat Stevens) بین اقوامی شہرت رکھنے والے پاپ موسیقی کے ماہر تھے۔ انھوں نے ۱۹۷۶ میں مسیحی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ ان کا موجودہ نام یوسف اسلام ہے۔ انھوں نے اپنے قبول اسلام کی کہانی بتاتے ہوئے کہا کہ مسیحی چرچ ہم کو خدا پر عقیدہ رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ مگر خدا سے مربوط ہونے کا مسیحی طریقہ صرف حضرت عیسیٰ کی معرفت ممکن ہے۔ کوئی آدمی خدا سے براہ راست ربط قائم نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو ایسے خدا سے متعارف کرتا ہے جو براہ راست

بندوں سے باتیں کرتا ہے اور اس کی روح سے اتصال قائم کرتا ہے۔ اسلام میں ہر آدمی براہ راست
ربط خدا سے قائم کر سکتا ہے۔

Monthly Arabia, London, July 1983

انسان کی فطرت ایک ایسا خدا چاہتی ہے جس سے وہ براہ راست مربوط ہو سکے۔ مگر موجودہ مذاہب
ایسا خدا دیتے ہیں جس سے وہ صرف بالواسطہ طور پر مربوط ہو سکتا ہے۔ تمام مذاہب میں صرف اسلام
انسان کو براہ راست خدا سے ملاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام آج بھی اپنی اصل الہامی شکل
رکھتی ہے۔ جب کہ دوسرے مذاہب انسانی ملاوٹ کی وجہ سے اپنی اصل الہامی صورت کو کھو چکے ہیں۔
تمام مذاہب اصلاً ایک تھے۔ مگر اب ان میں انسانی آمیزش کی وجہ سے فرق ہو گیا ہے (یونس ۱۹)
ہر مذہب ایسا ہے جو کوئی خدا پیش کر رہا ہے۔ مگر یہ انسانی طلب کے سراسر غیر مطابق ہے۔ کیوں کہ خدا کی
طلب ایک ایسی ہستی کی طلب ہے جس کو آدمی اپنا مرکز توجہ بنا سکے۔ اور مرکز توجہ ہمیشہ کوئی ایک چیز ہوتی
ہے نہ کئی چیز۔ کوئی مذہب کسی انسان کو خدا کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ مگر انسان کو جس خدا کی
تلاش ہے وہ وہی خدا ہو سکتا ہے جو اس کی اپنی ذات سے برتر ہو، ایسا خدا انسان کا معبود نہیں بن
سکتا جو خود اس کے اپنے جیسا ہو۔ کوئی مذہب خدا کو محض ایک روح مجرد (Vague Spirit) کی صورت
میں پیش کر رہا ہے۔ مگر انسان ایک دیکھنے اور سننے اور بولنے والے خدا کو چاہتا ہے۔ ایتھر یا قوت
کشش جیسی کوئی مجرد چیز اس کی مانگ کو پورا نہیں کر سکتی۔

مشہور مفکر آرتھر کوئسلر کو عزت اور مرتبہ حاصل تھا۔ اس کے پاس تقریباً چار لاکھ پونڈ نقد موجود
تھے۔ تین شادیوں کے باوجود وہ بے اولاد تھا۔ نیز رعشہ اور خون کے کینسر نے اس کو سخت پریشان
کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے مایوسی کے عالم میں مارچ ۱۹۸۳ میں اپنے لندن کے مکان میں خودکشی کر لی۔ اس
وقت اس کی عمر ۷۷ سال تھی۔

اسی طرح ہر روز دنیا بھر میں سیکڑوں آدمی خودکشی کرتے رہتے ہیں۔ خودکشی کے ان واقعات کی وجہ
ایک ہے ـــــ موجودہ دنیا میں اپنی آرزوؤں کی تکمیل سے مایوسی۔ مگر تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا
کہ خدا پر سچا عقیدہ رکھنے والوں نے کبھی خودکشی کی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ آدمی کو موجودہ دنیا
کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں امید عطا کرتا ہے۔ کیوں کہ خدا کی اسکیم میں زندگی صرف موجودہ دنیا کی
زندگی نہیں ہے۔ وہ موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ خدا پر یقین رکھنے والے کو اگر دنیا میں کوئی تکلیف
پہنچتی ہے تو وہ آئندہ زندگی کے ساتھ لو لگا لیتا ہے۔ وہ انسانوں کی دنیا سے مایوس ہو کر خدا کی دنیا

کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔ اس طرح سچے خداپرست کی تمام پریشانیاں ایک صحت مندرجائیت (Healthy Optimism) میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔

خدا کا بگڑا ہوا تصور

دوسرے مذاہب میں خدا کا جو بگڑا ہوا تصور پایا جاتا ہے وہ انسان کی طلب کا مکمل جواب نہیں بنتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی نفسیات ایک کامل خدا کی طالب ہے اور یہ مذاہب اس کو ناقص خدا کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اس بنا پر اگرچہ ایسا ہوتا ہے کہ اندرونی طلب سے مجبور ہوکر بہت سے لوگ اس کی طرف لپک پڑتے ہیں۔ مگر ان کی حقیقی روحانی تسکین اسی خدا سے ہوسکتی ہے جس کا تصور اسلام میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک شخص اپنی سواری کے لئے موٹر کار کا طالب ہو تو آپ اس کو کھلونا گاڑی (Toy Car) دے کر مطمئن نہیں کرسکتے۔ اس کا اطمینان تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ اس کو ایک واقعی کار مل جائے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (سنو خدا کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

خدا اگرچہ ہمارے سامنے نہیں ہے مگر اس کی تخلیق، ایک عظیم کائنات کی صورت میں ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس کو دیکھتے ہیں اور اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں انسان کا ذہن کسی ایسے خدا پر ہی مطمئن ہوسکتا ہے جو موجودہ کائنات کے شایان شان ہو۔ جو آدمی کو واقعی اس عظیم کائنات کا خالق دکھائی دے۔ اس سے کم تر درجہ کا خدا انسان کے ذہن کو اپیل نہیں کرسکتا۔

ایک امریکی سائنس داں والٹر آسکر لنڈ برگ نے اس کی ایک دل چسپ مثال دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ایک سائنس داں دوسروں کے مقابلہ میں ایک خصوصی موقع (Special Advantage) اس بات کا رکھتا ہے کہ وہ خدا کی سچائی کو سمجھ سکے۔ وہ اساسی اصول جس پر اس کے کام کی بنیاد ہے وہ دراصل خدا کے وجود کا ایک اظہار (An expression of God's existence) ہے۔" اس کے باوجود سائنس کی تعلیم کے بعد کیوں لوگ خدا کے منکر ہوجاتے ہیں۔ امریکی پروفیسر کے نزدیک، دو میں سے ایک خاص سبب اس کا یہ ہے کہ منظم مسیحیت میں نوجوانوں کے اندر گہرائی کے ساتھ ایک ایسے خدا کا عقیدہ پیوست ہے جو انسانی صورت میں پیدا ہوا نہ کہ ایسا انسان جو خدا کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس طرح کے ذہن بعد کو جب سائنس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو خدا کا یہ الٹا اور محدود تصور دھیرے دھیرے غیر عقلی اور غیر علمی معلوم ہونے لگتا ہے۔ بالآخر جب مطابقت پیدا کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوجاتی ہیں تو اس کے بعد خدا کا یہ تصور مکمل طور پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

> In organised Christianity there is instilled deeply in young people a concept of God created in the image of man, rather than of man created in the image of God. When such minds are later trained in science, this reversed and limited anthropomorphic concept gradually becomes more and more incompatible with the rational, inductive attitude of Science. Ultimately when all attempts at reconciliation fail, the concept of God may be abandoned entirely.
>
> • *The Evidence of God in an Expanding Universe*, p. 56

اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے۔ اصلاً اور ابتداءً دوسرے مذاہب اور اسلام ایک ہی تھے۔ مگر دوسرے مذاہب میں تبدیلیوں کی وجہ سے صحیح تصور خدا محفوظ نہ رہ سکا۔ جب کہ اسلام میں خدا کا تصور اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں محفوظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کو صحیح ترین روپ میں پیش کرتا ہے۔ اسلام کا خدا ایک خدا ہے۔ وہ ہر قسم کی طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے تنہا پوری کائنات کو پیدا کیا اور وہی تنہا پوری کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور بولتا ہے۔ وہ آدمی کی پکار پر ہر وقت اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود رہتا ہے۔ اس سے ہر وقت اور ہر مقام پر انسان کا ربط قائم ہو سکتا ہے۔ ہر چیز اس کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ وہ موت سے پہلے کے مرحلہ میں بھی آدمی کا مددگار ہے اور موت کے بعد کے مرحلہ میں بھی ـــــــ قرآن اسی خدا کا ایک تعارف ہے جس کو خدا کا کامل تعارف حاصل کرنا ہو اس کو قرآن پڑھنا چاہئے۔

حصہ دوم

موجودہ زمانہ میں تمام قومیں اجتماعی مسائل سے دوچار ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک ہوں یا غیر ترقی یافتہ ممالک، ہر جگہ انسانی معاشرہ ظلم و فساد کا شکار ہے۔ ہر جگہ یہ سوال در پیش ہے کہ معاشرہ کی تنظیم کس طرح کی جائے کہ وہ بہتر انسانی معاشرہ بن سکے۔

انسانی مسائل پر غور کرتے ہوئے سب سے اہم بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ انسان ایک ایسی دنیا میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کے سوال سے دوچار ہے جہاں بقیہ تمام چیزوں کے مسائل اول روز سے حل شدہ ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان نے کائنات کی شاہراہ چھوڑ رکھی ہے۔ اگر وہ خود بھی اسی شاہراہ پر آجائے جس پر بقیہ تمام چیزیں چل رہی ہیں تو اس کے مسائل بھی اسی طرح حل ہو جائیں گے جس طرح بقیہ چیزوں کے مسائل حل ہو چکے ہیں۔

کائنات کی تمام چیزیں ایک ہی آفاقی قانون میں جکڑی ہوئی ہیں۔ مگر انسان کا یہ حال ہے کہ ہر ایک اپنے لئے الگ الگ راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز دوسروں کے لئے نفع بخش بن کر زندہ ہے۔ مگر انسان دوسروں کے استحصال پر اپنا مستقبل تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ کائنات میں اگر کوئی چیز بلند ہے

تو وہ اپنا سایہ زمین پر ڈال کر تواضع کا اعتراف کرتی ہے۔ مگر انسان کو اگر کوئی بڑائی مل جائے تو وہ گھمنڈ کا اظہار کرتا ہے۔ کائنات میں ہر چیز صرف اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، وہ کسی دوسرے سے نہیں ٹکراتی۔ مگر انسان دوسروں سے ٹکراتا ہے۔ وہ دوسرے کی تخریب پر اپنی تعمیر کا منصوبہ بناتا ہے۔ کائنات میں ایسے "سیلاب" آتے ہیں جن کو آزادانہ موقع دیا جائے تو وہ سخت تباہی پھیلائیں۔ مگر کائناتی نظام یہ کرتا ہے کہ ان کا رخ ندیوں اور سمندروں کی گہرائی کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس انسانوں کے یہاں جب منفی جذبات کا طوفان اٹھتا ہے تو وہ اس کے رخ کو نہیں پھیرتے۔ یہاں ہر آدمی صرف یہ جانتا ہے کہ اپنی آفت کو دوسرے کے اوپر ڈال دے۔

معاشرہ کی اصلاح کے سلسلے میں اصل ضرورت یہ ہے کہ اس تضاد کو ختم کیا جائے۔ انسانی معاشرہ کو بھی اسی آفاقی نظام کا پابند بنایا جائے جس میں بقیہ تمام کائنات جکڑی ہوئی ہے۔ جس دن ایسا ہوگا اسی دن انسانی زندگی کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ جس قانون کو اختیار کرنے کے نتیجے میں بقیہ کائنات کے مسائل حل شدہ ہیں اسی قانون کو اختیار کرنے سے انسانی زندگی کے مسائل کیوں کر حل نہ ہوں گے۔

اجتماعی مسائل

اجتماع کیا ہے۔ اجتماع دراصل افراد ہی کے مجموعہ کا دوسرا نام ہے۔ سوسائٹی کا سلوک دراصل فرد فرد کے سلوک ہی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ افراد صحیح ہوں تو سوسائٹی صحیح ہوگی۔ افراد غلط ہوں تو سوسائٹی بھی غلط ہو جائے گی۔

خدا کا عقیدہ سوسائٹی کے ہر فرد کو صحیح ترین نقطۂ نظر دیتا ہے۔ وہ فرد فرد میں سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ اس طرح وہ ہر فرد کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ وہی کرے جو بحیثیت مجموعی پوری انسانیت کے لئے مفید ہے، اور وہ نہ کرے جو مجموعی انسانیت کے لئے مفید نہیں۔

خدا کا عقیدہ عظیم ترین دریافت ہے۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔ اس کی مثال کیرم بورڈ سے دی جاسکتی ہے۔ کیرم کے کھیل میں بورڈ کے درمیان ۱۹ گوٹیں ہوتی ہیں۔ کھلاڑی اگر اسٹرائکر کو اس طرح مارے جس سے تمام گوٹوں پر زد پڑ جائے تو ایسی مار کو شاہ ضرب (Master Stroke) کہتے ہیں۔ خدا پر عقیدہ بھی اسی قسم کا ایک ماسٹر اسٹروک ہے۔

خدا پر عقیدہ انسان کی پوری ہستی پر ضرب لگاتا ہے۔ وہ آدمی کی تمام قوتوں کو متحرک بنا دیتا ہے۔ خدا پر عقیدہ بظاہر ایک چیز ہے مگر وہ انسان کو ہر پہلو سے ایک اصلاح یافتہ انسان بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد

آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کی ہستی کا جو پہلو بھی دنیا میں ظاہر ہو وہ درست شکل میں ظاہر ہو، فطرت کے سیدھے راستہ سے وہ کسی حال میں انحراف نہ کرے۔ انسان کا پورا وجود خدا کی پکڑ میں ہے اس لئے خدا کا عقیدہ انسان کے پورے وجود کو متاثر کرنے والا بن جاتا ہے۔

۱۔ روح کو چھوڑ کر صرف جسم پر توجہ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر متکامل شخصیت (Integrated personality) نہیں پیدا ہوتی۔ اپنے اندر کمی کا احساس اس کو مستقل طور پر غیر مطمئن رکھتا ہے۔ وہ اس احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کو جو کچھ پانا چاہئے تھا وہ ابھی تک اس کو نہ پا سکا۔

یہ احساس محرومی اکثر حالات میں سماجی برائیوں کا سبب ہے۔ سماج کے اندر ظلم و فساد کی حقیقت دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی بے چینی کو دوسرے کے اوپر انڈیل دینا چاہتا ہے۔ ایک آدمی اپنی محروم خواہشوں کی تکمیل کے لئے دوسرے کے استغلال کا منصوبہ بناتا ہے مگر جب خدا کا عقیدہ اس کے ذہن میں اتر جائے تو اس کے بعد اس کے اندر متکامل شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد روح (Complex-free soul) بن جاتا ہے جس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد اگر اس کے پاس کم ہو تو اس کے اندر احساس کمتری کی برائیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ اس کے پاس زیادہ ہو تو وہ احساس برتری کے مرض میں مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں ایک معتدل انسان بنا رہتا ہے۔ اور یقینی طور پر یہی وہ چیز ہے جو کسی شخص کو بہتر سماجی فرد بناتی ہے۔

۲۔ دوسری چیز احساس ذمہ داری ہے۔ احساس ذمہ داری ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ آدمی یہ محسوس کرے کہ اس کے اوپر بھی کوئی طاقت ہے جو اس کو اپنی پکڑ میں لے سکتی ہے۔ خدا کو چھوڑنے کے بعد آدمی کے سامنے ایسی کوئی بلند تر طاقت باقی نہیں رہتی جس سے آدمی اندیشہ کرے اور جس کے سامنے جواب دہی کا احساس اس کو مجبور کرے کہ وہ سچائی پر قائم رہے۔

اس کے برعکس جب آدمی قادر مطلق خدا کو مانتا ہے تو اس کے فوراً بعد اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ مجھے اس کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔ جواب دہی کا خیال اس کو اپنے قول و عمل میں بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ یہ جذبہ اس کی پوری زندگی کو منظم کرتا ہے۔ وہ اس کے اوپر نگراں بن جاتا ہے۔ وہ اس کو ظلم اور استحصال (Exploitation) کے راستوں سے بچاتا ہے اور ہمیشہ انصاف اور بھلائی کو اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ مشہور انگریز جج سر سٹیفیو ہیل (۱۶۰۹ - ۱۶۷۶) نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "یہ کہنا کہ مذہب ایک فریب ہے، ان تمام ذمہ داریوں اور پابندیوں کو منسوخ کرنا ہے جن سے سماجی نظم کو برقرار رکھا جاتا ہے"

Religion without Revelation, by Julian Huxley, p. 155

کسی سوسائٹی کے بیشتر افراد جب اسلام کے تصور کے مطابق خدا کو اپنے عقیدے میں شامل کریں تو اس کے بعد اجتماعی معاملات میں زبردست تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ آدمی کا یہ احساس کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے اس کے اندر سے یہ مزاج ختم کر دیتا ہے کہ وہ اندر کچھ ہو اور باہر کچھ۔ ایسے لوگ دوسروں کا استغلال نہیں کرتے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس کا اعلیٰ حساب دینا پڑے گا۔ ان کی زندگی خود رخی زندگی (Self-oriented life) کے بجائے خدارخی زندگی (God-oriented life) بن جاتی ہے۔

خدا پر ایمان لانا ایک ایسی ہستی پر ایمان لانا ہے جو تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ جو انسان کے دلوں تک کا حال جانتا ہے جو انسان سے اس کے تمام کھلے اور چھپے کا حساب لے گا۔ اس طرح خدا پر ایمان لانا آدمی سے اس کی خودی اور سرکشی کو چھین لیتا ہے۔ ایسا آدمی انتہائی سنجیدہ (Sincere) اور کامل طور پر حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ یہی چیز ہر قسم کی اصلاح کا راز ہے۔ آدمی اگر سنجیدہ اور حقیقت پسند ہے تو وہ ہر کام کو صحیح طور پر انجام دے گا اور اگر وہ سنجیدہ اور حقیقت پسند نہ ہو تو جو کام بھی اس سے متعلق ہو گا اس کو وہ بگاڑ ڈالے گا ـــــ اسلام کے مطابق خدا کا عقیدہ آدمی کے اندر یہی سنجیدگی اور حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے۔

ہماری دنیا میں جو انسان ہیں وہ سب برابر نہیں۔ یہاں کوئی طاقت ور ہے اور کوئی کمزور۔ یہی فرق ہر قسم کے ظلم و فساد پیدا کرتا ہے۔ جو شخص اپنے کو طاقت ور پاتا ہے وہ اس کے اوپر چڑھ دوڑتا ہے جس کو وہ بظاہر کمزور دیکھ رہا ہے۔

خدا پر ایمان برائی کی اس جڑ کو کاٹ دیتا ہے۔ خدا پر ایمان بتاتا ہے کہ اصل معاملہ انسان اور انسان کے درمیان نہیں بلکہ اصل معاملہ خدا اور انسان کے درمیان ہے۔ یہاں ایک طرف خدا ہے جس کے پاس ہر قسم کی طاقتیں ہیں اور دوسری طرف انسان ہے جس کو خدا کے مقابلہ میں کوئی طاقت حاصل نہیں۔ گویا یہاں زیادہ طاقت اور کم طاقت کی تقسیم نہیں بلکہ طاقت اور بے طاقتی کی تقسیم ہے (فاطر ۱۵)

خدا پر ایمان آدمی کے ذہن کو یکسر بدل دیتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے معاملہ کو دوسرے انسانوں کی نسبت سے دیکھنے کے بجائے خدا کی نسبت سے دیکھنے لگتا ہے۔ کیونکہ بالآخر جس سے معاملہ پیش آنے والا ہے وہ خدا ہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی سے وہ تمام ظالمانہ خواہشیں حذف ہو جاتی ہیں جو اپنے معاملہ کو دوسرے انسانوں کی نسبت سے دیکھنے کی وجہ سے مصنوعی طور پر اس کے اندر پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی حقیقی سطح پر آجاتا ہے۔ وہ انسانِ اصلی (Man cut to size) بن جاتا ہے۔

دو شخص یا دو قوم کے درمیان جب بھی نزاع پیدا ہو تو بیشتر حالات میں غلطی دونوں طرف ہوتی،

ہے۔ اب ایسی حالات میں اگر ایک فریق اپنے حصہ کی غلطی مان لے تو دوسرا فریق بھی بآسانی اپنی غلطی کو ماننے پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک فریق اپنے حصہ کی غلطی نہ مانے تو دوسرا فریق بھی اپنے حصہ کی غلطی ماننے پر راضی نہیں ہوتا۔ اس طرح جھگڑا بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔

ایسے تمام معاملات میں اصل مشکل یہ ہوتی ہے کہ جھگڑا پیدا ہوتے ہی دونوں فریق اس کو اپنی عزت (Prestige) کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ ہر فریق بخوبی جانتا ہے کہ غلطی کا ایک جزء اس کی طرف بھی ہے۔ مگر یہ خیال اس کو اعتراف سے روکے رہتا ہے کہ اگر میں نے اپنی غلطی مان لی تو میری بے عزتی ہو جائے گی۔ اس اندیشہ کی بنا پر دونوں میں سے کوئی فریق اپنی غلطی کے اعتراف کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

لیکن اگر دونوں میں سے کوئی ایک ایسا کرے کہ وہ پہل کر کے اپنے حصہ کی غلطی مان لے تو صورت حال فوراً بدل جائے گی۔ جو معاملہ پہلے عزت کا معاملہ تھا وہ اب توازن کا معاملہ بن جائے گا۔ اس کے بعد دوسرے فریق کے لئے اعتراف کرنا اپنے کو نیچا کرنے کے ہم معنی نہیں رہتا بلکہ وہی چیز کرنا بن جاتا ہے جو دوسرا فریق عملاً کر چکا ہے۔ گویا ایک فریق کا اعتراف دوسرے فریق کے اعتراف کو پیشگی طور پر متوازن کر دیتا ہے۔

یہی حقیقت پسندی زندگی کی اصلاح کا سب سے بڑا راز ہے۔ اور یہ حقیقت پسندی صرف خدا پرستی سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا پر ایمان در اصل خدا کو کبیر مان کر اپنے آپ کو صغیر کے مقام پر رکھنا ہے۔ یہ ایمان اس حال میں وقوع میں آتا ہے کہ خدا اپنی کبریائی کو منوانے کے لئے ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ کسی انسان کے لئے سب سے بڑی حقیقت پسندی ہے۔ اب جو شخص اس پر راضی ہو جائے کہ ساری بڑائی خدا کی طرف ہے اور ساری چھوٹائی میری طرف، وہ گویا اپنی "کوتاہی" کو آخری حد تک تسلیم کر چکا ہے۔ اور جو شخص اپنی کوتاہی کو آخری حد تک تسلیم کر لے وہ کیسے کسی بات کو عزت کا مسئلہ بنائے گا۔ ایسے آدمی کے لئے ہر دوسرا اعتراف اسی چیز کو چھوٹی سطح پر ماننا ہے جس کو وہ زیادہ بڑی اور آخری سطح پر پہلے ہی مان چکا ہے۔

قدرت کا نظام توازن کے اصول پر قائم ہے۔ توازن کو قائم رکھنے میں قدرت جن تدبیروں سے کام لیتی ہے ان میں سے ایک تحویل (Diversion) ہے۔ یعنی قوت کی فاضل مقدار کو دوسری طرف موڑ دینا۔ بارش کے موسم میں جو پانی برستا ہے اس کی ساری مقدار اگر کھیتوں اور آبادیوں میں رہ جائے تو زبردست نقصان ہو۔ ایسے موقع پر قدرت یہ کرتی ہے کہ پانی کی ضروری مقدار کھیتوں اور آبادیوں کو دے کر بقیہ تمام پانی دریاؤں کی طرف محول (Divert) کر دیتی ہے۔

اسی اصول تحویل کو انسان نے مصنوعی طور پر بند (Dam) کی صورت میں اختیار کیا ہے۔ بند کا مقصد

یہ ہے کہ دریا کے پانی کے بے روک ٹوک بہاؤ پر کنٹرول قائم کیا جائے۔ جب بھی ایسا ہو کہ پانی حد سے بڑھتا ہوا نظر آئے تو اس کے رخ کو موڑ کر دوسری طرف کر دیا جائے تاکہ وہ دریا میں داخل ہو کر طغیانی نہ لا سکے بلکہ علیحدہ سے بنے ہوئے عظیم گڑھے میں جا کر گر جائے جس کو عام طور پر ذخیرۂ آب (Reservoir) کہا جاتا ہے۔ یہی اصول مشینوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے مثلاً اسٹیم انجن میں جب اسٹیم کی مقدار متعینہ حد سے زیادہ ہو جاتی ہے تو اسٹیم کے رخ کو پھیر کر اسے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسان کی اجتماعی زندگی کا بھی ہے۔ مختلف انسان جب مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے درمیان بار بار شکایت کی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں تلخیاں ابھرتی ہیں۔ اگر اس شکایت اور تلخی کو بڑھنے دیا جائے تو اختلاف اور عناد اور مقابلہ کی نوبت آجاتی ہے۔ انسانی جماعت یا انسانی معاشرہ کا درست طور پر کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ان حالات میں انسان کے لیے بھی ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے جس کی طرف اس کے جذبات کے مضر اضافہ کو موڑا جا سکے۔ خدا اور آخرت کا عقیدہ زندگی میں یہی کام کرتا ہے۔ وہ اجتماعیت کو نقصان پہنچانے والے جذبات کو انسان کی جانب سے موڑ کر خدا کی طرف کر دیتا ہے۔

حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں نے آپ کو باپ سے جدا کر دیا۔ اس کے بعد آپ کے دوسرے سگے بھائی بن یامین کے ساتھ بھی اسی قسم کا حادثہ پیش آیا۔ ان ناخوشگوار واقعات کے بعد قدرتی طور پر حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب کے اندر شدید جذبات پیدا ہوئے۔ آپ اگر اپنے ان جذبات کا نشانہ حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں کو بناتے تو زبردست انتشار اور اختلاف پیدا ہوتا۔ مگر آپ نے اپنے جذبات کے ہجوم کو خدا کی طرف موڑ دیا۔ آپ نے فرمایا: انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ۔ اسی طرح عمر فاروق رضی نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اسلامی جنرل خالد بن الولید کو معزول کر دیا۔ یہ خالد بن الولید جیسے شخص کے لئے زبردست جھٹکا تھا۔ مگر انھوں نے اپنے تمام جذبات کو یہ کہہ کر خدا کی طرف موڑ دیا: انی لا اقاتل فی سبیل عمر ولکن اقاتل فی سبیل رب عمر (میں عمر کے راستہ میں نہیں لڑتا بلکہ خدا کے راستہ میں لڑتا ہوں)

یہ کسی انسانی معاشرہ کے لئے عقیدۂ آخرت کی بہت بڑی دین ہے۔ اس کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی شکایات کی تلافی کے لئے خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس نے جو کچھ انسان سے نہیں پایا، اس کو وہ خدا سے پانے کی امید کر لیتا ہے۔ اس طرح خدا پرست آدمی کے منفی جذبات اپنے ہم جنسوں کی طرف رخ کرنے کے بجائے خدا کی طرف محول (Divert) ہوتے رہتے ہیں۔ جو پانی سیلاب بن کر انسانی آبادی کو نقصان

پہنچاتا وہ (Diversion Pool) میں جاکر گرجاتا ہے۔

خاتمہ

اس بحث کو میں جارج برنارڈ شا (۱۹۵۰-۱۸۵۶) کے ایک قول پر ختم کروں گا۔ برنارڈ شا نے ایک بار کہا کہ اگر محمد جیسا کوئی آدمی موجودہ دنیا کا ڈکٹیٹر ہو جائے تو وہ اس کے مسائل کو اس طرح حل کردے گا کہ دنیا میں وہ امن اور خوشی قائم ہو جائے جس کی ہمیں بہت زیادہ ضرورت ہے۔

> If a man like Muhmmad were to assume the dictatorship of the modern world, he would solve its problems in a way that would bring it much needed peace and happiness.

محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو جس چیز نے محمد بنایا وہ خدا پر کامل ایمان تھا۔ آپ کی زندگی مومن کامل کا نمونہ تھی۔ اس اعتبار سے اگر برنارڈ شا کے الفاظ کو بدل کر یہ کہا جائے تو بالکل درست ہو گا کہ —— آج دنیا میں اگر صحیح طور پر خدا کو ماننے والے پیدا ہو جائیں تو یقیناً دنیا میں امن قائم ہو جائے گا جس کی آج دنیا کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

جمعیۃ علماء مالیزیا کے تحت کوالالمپور میں ایک اسلامی کانفرنس ہوئی۔ یہاں ۵-۶ نومبر ۱۹۸۳ کے پروگرام میں میرا ایک مقالہ (اسلام اور عصر حاضر) رکھا گیا تھا۔ زیر نظر مقالہ اس مقالہ کا اردو ترجمہ ہے جو اس موقع پر پیش کرنے کے لیے انگریزی میں تیار کیا گیا۔

ایک سفر

اکتوبر ۱۹۸۳ کی شام کو ۹ بجے میں دہلی ایئرپورٹ کی انتظار گاہ میں تھا۔ مجھ کو جاپان ایئر لائنز سے روم ہوتے ہوئے افریقہ جانا تھا۔ اس اثنا میں بغل کی سیٹ سے دو خوش پوش مسافروں کی گفتگو کے یہ الفاظ میرے کان میں آئے :

آپ کہاں جا رہے ہیں

روم

آپ کہاں جا رہے ہیں

لندن

میں نے سوچا کہ انسان کس قدر بے خبر ہے۔ اس کی جیب میں چونکہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ ہے ، اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ وہ روم اور لندن جا رہا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ اس کے اوپر خدا کے طاقتور فرشتے مقرر ہیں جو اس انتظار میں ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور وہ آدمی کو اپنی پکڑ میں لے کر اس کو خدا کی عدالت میں پہنچا دیں۔ آدمی بالآخر خدا کی دنیا میں جانے والا ہے۔ مگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ خود اپنی دنیا میں جا رہا ہے۔ انسان کی یہ بے خبری بھی کیسی عجیب ہے۔

جاپان ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۶۷ سے میں نے روم تک کا سفر کیا۔ میں اکثر معروف کمپنیوں کے جہازوں میں سفر کر چکا ہوں۔ مگر جاپان ایئر لائنز مجھے سب سے بہتر معلوم ہوئی۔ اس جہاز کی ہر چیز دوسرے جہازوں سے بہتر تھی۔ جہاز کی بناوٹ، عملہ کی کارکردگی، مسافروں کی ضروریات کا اہتمام وغیرہ ہر چیز میں جاپان ایئر لائنز دوسری کمپنیوں سے ممتاز نظر آئی۔

روم سے طرابلس کا سفر الیتالیا کے ذریعہ طے ہوا۔ جہاز کی تقریباً نصف سیٹیں خالی نظر آئیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ لیبیا میں بیرونی دنیا کے لئے تجارتی مواقع زیادہ نہیں۔ سیاحت کی کشش بھی لیبیا میں زیادہ نہیں ہے۔ اور آجکل ہوائی سفر زیادہ تر یا تجارت کے لئے ہوتا ہے یا سیاحت کے لئے۔

تاہم پٹرو ڈالر کی طاقت کا اندازہ اس سے ہوا کہ الیتالیا (Alitalia) میں دوران پرواز جب دن کا کھانا آیا تو اس کے ساتھ ٹرے میں ایک کارڈ بھی تھا جس میں عربی اور دوسری تین زبانوں میں یہ فقرہ لکھا ہوا تھا :

الیتالیا) تضمن لکم ھذا الغذاء خالی من لحم الخنزیر (الیتالیا اس بات کی ذمہ داری
لیتی ہے کہ اس کھانے میں خنزیر کا گوشت شامل نہیں ہے)

طرابلس میں میرا قیام فندق الکبیر کے کمرہ نمبر ۸۱۳ میں تھا۔ یہ کمرہ سمندر کی طرف کھلتا ہے۔
میرے سامنے دور تک نہایت پرکشش منظر تھا۔ سمندر کے کنارے پختہ فیلڈ بنی ہوئی تھی۔ اس
میں کچھ لڑکے بےفکری کے ساتھ گیند کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ اس منظر کو میں نے دیکھا تو اس میں مجھے
دنیا میں پھیلے ہوئے غافل انسانوں کی تصویر دکھائی دی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا ——
لوگ کھیل رہے ہیں تاکہ وہ دوبارہ نہ کھیل سکیں۔ لوگ خوش ہیں تاکہ دوبارہ انھیں خوشیاں
نصیب نہ ہوں۔ لوگ جھوٹی لذتوں میں گم ہیں تاکہ وہ خدا کی بڑی لذتوں سے ہمیشہ کے لئے
محروم ہو جائیں۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۸۲ کو صبح کا وقت تھا۔ میں سمندر کے رخ پر بیٹھا ہوا کمرہ کے باہر دیکھ رہا تھا
سورج کی سنہری شعاعوں میں ہر چیز نہایت شاندار معلوم ہو رہی تھی۔ سڑک پر جدید ترین
کاروں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ سمندر کا پانی موجیں مارتا ہوا عجیب حسین منظر پیش کر رہا تھا۔ آسمان
پر بادل کے ٹکڑے آسمان کے آفاقی حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔ سمندر میں جگہ جگہ سمندری جہاز ابھرے
ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

یہ مناظر دیکھتے دیکھتے اچانک مجھ پر ایک لمحاتی تجربہ گذرا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں خدا
کے دیکھنے کو دیکھ رہا ہوں۔ جیسے میں خدا کے ہونے کا تجربہ کر رہا ہوں۔ خدا بھی تو اسی طرح
کائنات کو دیکھ رہا ہوگا۔ میں نے سوچا اگر یہ ممکن ہے کہ یہاں ایک انسان ہو۔ اس کو اپنی ذات کا
شعور حاصل ہو۔ وہ سوچے اور دیکھے۔ کائنات سے الگ اس کی اپنی مستقل ہستی ہو۔ اگر ایسے ایک
انسان کا وجود ممکن ہے تو خدا کا وجود کیوں کر ممکن نہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ذات میں خدا کی ذات شامل ہو گئی
ہو۔ میں اپنے وجود میں خدا کے وجود کو دیکھنے لگا۔ میرا شعور ذات میرے لئے شعور خداوندی
کے ہم معنی بن گیا۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں انھیں اس سے پہلے خود اپنا انکار کرنا
چاہیے۔ اور اگر وہ اپنا انکار نہیں کر سکتے تو انھیں یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ خدا کے وجود کا انکار
کریں۔

اس سفر میں میری ملاقات مختلف ملکوں کے مسلم دانش وروں سے ہوئی۔ ان سے گفتگو کے

دوران میں نے محسوس کیا کہ ہر ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہن پر ایک ہی چیز چھائی ہوئی ہے۔ اور وہ ہے مسلمانوں کے اوپر غیر قوموں کے حملہ کا مسئلہ۔ چنانچہ ہر آدمی بس دفاعی ذہن کے تحت سوچتا ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ مسلم دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی دوسرا کام کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں کی طرف سے مقابلہ آرائی کا ماحول ختم نہ کیا جائے، ملت کی تعمیر و ترقی کا کوئی حقیقی کام کرنا ممکن نہیں

سب سے عجیب بات جس کا مجھے بار بار تجربہ ہوا وہ یہ کہ آجکل دنیا بھر کے مسلمانوں میں "اسلامی دعوت" کا لفظ بہت زیادہ بولا جا رہا ہے۔ مگر اسلامی دعوت کا عملی مفہوم لوگوں کے ذہن میں شاید یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کے لئے جو بھی چیخ و پکار کی جائے وہ سب کا سب اسلامی دعوت ہے۔ حتیٰ کہ اسلامی دعوت کا لفظ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی قومی دعوت کے ہم معنیٰ بن کر رہ گیا ہے۔

میں نے لوگوں کے سامنے اپنا یہ نقطۂ نظر پیش کیا کہ اپنی قوتوں کو قومی دفاع کے محاذ پر خرچ کرنا گویا سبب کو چھوڑ کر نتیجہ پر محنت کرنا ہے۔ ہمارے تمام مسائل دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑنے کا نتیجہ ہیں۔ جب تک امت مسلمہ اپنے اس فرض منصبی کو ادا نہیں کرے گی وہ دوسری قوموں کی جارحیت کا شکار ہوتی رہے گی۔ اس صورت حال سے نکلنے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر نہیں۔

فندق الکبیر میں ۱۸ اکتوبر کو دوپہر کے کھانے میں میرے ساتھ دوسرے دو آدمی میز پر تھے۔ ایک صاحب یورپ کے ایک ملک سے آئے تھے، دوسرے امریکہ سے۔ ایک صاحب نے گفتگو کے دوران اپنی جیب سے دو رنگین فوٹو نکالے۔ یہ دو بچوں کے فوٹو تھے۔ ایک ۱۰ ماہ کا اور دوسرا دو سال کا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں میرے بچے ہیں اور وہ میری زندگی ہیں (They are my life)

اس کے بعد دوسرے صاحب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی بچی کا فوٹو نکال کر دکھاتے ہوئے کہا "یہ میری نواسی ہے اور میں ہر وقت اس کا فوٹو اپنی جیب میں رکھتا ہوں"

اسی طرح ایک بار ایک افریقی عالم کے ساتھ باہر جانا ہوا۔ راستہ میں بازار پڑتا تھا۔ وہ کپڑے کی ایک دکان میں گھسے اور اس طرح لال پیلے کپڑے کی خریداری شروع کر دی جیسے اس سے زیادہ اہم ان کے نزدیک کوئی کام ہی نہیں۔

میں نے سوچا کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں میں جی رہے ہیں۔ اور یہی

ئے ہیں جو بین اقوامی اسٹیج پر بیٹھ کر ملت اسلامیہ کے موضوع پر مجاہدانہ تقریریں کرتے ہیں۔
کناڈا سے آئے ہوئے ایک مسلمان پروفیسر نے سوال کیا کہ آپ کے اس قسم کے بیرونی سفروں کو انڈیا کی حکومت کس نظر سے دیکھتی ہے۔ میں نے کہا کہ میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں۔ اس لئے وہ اس میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ حسب ضرورت تعاون کرتے ہیں (جیسا کہ میں لدیپ کے سفر کے ذیل میں لکھ چکا ہوں) وہ فوراً بولے :
مگر اسلام تو سیاست سکھاتا ہے اور ہر مسلمان کو سیاسی ہونا چاہئے۔
اس کے بعد مزید گفتگو کے دوران انھوں نے مہاتما گاندھی کا ذکر کیا اور کہا کہ :

He was an enemy of Islam

میں نے کہا کہ یہ صحیح نہیں۔ مہاتما گاندھی اسلام دشمن نہیں تھے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس مسلم سیاست کے مخالف تھے جو تقسیم ملک کے نظریہ کے تحت ہندستانی مسلمانوں نے چلائی تھی۔ آپ چاہیں تو انھیں تقسیم دشمن کہہ سکتے ہیں مگر اسلام دشمن کہنا سراسر غلط ہے۔
یہ سن کر وہ مسکرائے اور کہا کہ آپ ہم کو حکومت ہند کے آدمی معلوم ہوتے ہیں ——— موجودہ مسلمانوں کی یہی منفی ذہنیت ہے جس نے ان سے حقیقت پسندانہ طرز فکر کو چھین لیا ہے۔ اور جس قوم سے حقیقت پسندانہ طرز فکر چھن جائے اس سے گویا سب سے بڑی چیز چھن گئی۔ ایسی قوم کا انجام صرف یہ ہے کہ وہ اپنے مفروضہ تخیلات کی دنیا میں جیتی رہے۔ اس کو خدا کی حقیقی دنیا میں کبھی کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔
۲۰ اکتوبر کو طرابلس کے ایک اخبار کے نمائندہ نے صحافتی انٹرویو لیا۔ انھوں نے ہمارے اسلامی مرکز سے متعلق اور عالم اسلام سے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ دور جدید کے مسلم مسائل کے بارے میں آپ کس طرح سوچتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کے تمام مسائل ان کی اسلام سے غفلت کا نتیجہ ہیں۔ جب تک یہ اصل وجہ دور نہ کی جائے کسی اور تدبیر سے مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔
اسلامی مرکز کے بارہ میں میں نے بتایا کہ وہ ۱۹۷۰ سے قائم ہے اور ماہنامہ الرسالہ اور کتابوں اور اجتماعات کے ذریعے پورے ملک میں خاموشی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ اسلامی مرکز ایک خالص غیر سیاسی ادارہ ہے جس کا مقصد مسلمانوں میں حقیقی اسلام کو زندہ کرنا ہے اور غیر مسلم عوام کو سچے اسلام سے متعارف کرنا ہے۔ میں نے بتایا کہ اسلامی مرکز کا صدر دفتر دہلی میں ہے اور اس کے ایک تحتی مرکز حیدر آباد میں قائم کیا گیا ہے۔ ہمارا منصوبہ ہے کہ دہلی کے مرکز کو اردو اور عربی

اور انگریزی اور ہندی میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی کا مرکز بنائیں اور حیدر آباد کے تحتی مرکز کو ملک کی دوسری علاقائی زبانوں کا۔

طرابلس سے واپسی میں میں نے لیبین ایر لائنز کے ذریعہ سفر کیا۔ یہ جہاز پہلے دمشق میں اترا۔ اس کے بعد اس نے مجھ کو کویت پہنچایا۔

ظہر اور عصر کی نمازیں میں نے اسی جہاز پر ادا کیں۔ ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے جب میں نے اپنا سر سجدہ میں رکھا تو عجیب احساس ہوا۔ سطح زمین پر سجدہ کرنے کے بجائے یہ فضا میں سجدہ تھا۔ جہاز جب فضا میں اڑ رہا ہوتا ہے تو بیک وقت دو چیزوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ مادہ کو خدا نے کس طرح انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے کہ وہ اس کو لئے ہوئے فضا میں اڑا چلا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسرا احساس اپنی بے چارگی کا رہتا ہے۔ دوران پرواز اگر جہاز میں کوئی خرابی ہو جائے تو اس کے بعد صرف موت ہوتی ہے جو مسافر کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ سجدہ میں یہ دونوں احساسات اس طرح سمٹ آئے کہ دیر تک سجدہ سے سر اٹھانے کا جی نہ چاہا۔ دل نے کہا: خدایا، کیسے عجیب ہیں تیرے کرشمے اور کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو ان کرشموں کو دیکھ کر بھی نہیں تڑپتے۔ جن کی آنکھیں بدستور خشک رہتی ہیں اور جن کی دنیا اس کے بعد بھی تیری گذرگاہ نہیں بنتی۔

کویت میں جہاز بدلنا تھا مگر یہاں تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے برٹش ایرویز کا اگلا جہاز چھوٹ گیا۔ اس لئے کویت میں مجھ کو ۲۴ گھنٹہ رکنا پڑا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۳ کو دوبارہ میں دہلی واپس آگیا۔

طرابلس سے کویت تک کا سفر میں نے لیبین ایرویز کے ذریعہ طے کیا۔ کویت سے دہلی کا سفر مجھے برٹش ایرویز کے ذریعہ طے کرنا تھا۔ مگر لیبین ایرویز کا جہاز لیٹ ہو گیا۔ ہم کویت اس حال میں پہنچے کہ جب لیبین ایرویز کا جہاز ہم کو لے کر کویت کے ہوائی اڈہ پر اتر رہا تھا تو برٹش ایرویز کا جہاز کویت کے ہوائی اڈہ سے پرواز کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ زندگی کا بڑا سفر بھی آدمی کو اسی طرح مرحلہ وار طے کرنا ہوتا ہے۔ یہاں بھی ایک "جہاز" کے بعد دوسرا "جہاز" درکار ہوتا ہے جو آدمی کے سفر کو برابر جاری رکھے۔ جس آدمی کی نظر صرف سامنے کی سواری پر ہو، اگلی سواری سے وہ بے خبر ہو تو عین ممکن ہے کہ جب وہ ایک مرحلہ سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں پہنچے تو وہاں صرف یہ خبر اس کو سننے کو ملے کہ اگلے جہاز کا وقت آچکا تھا اس لئے وہ تم کو لئے بغیر چلا گیا ——— پہلے زینہ پر قدم رکھتے ہوئے اگلے زینہ پر بھی نگاہ رکھئے، اسی وقت آپ سلامتی کے ساتھ چھت تک پہنچ سکتے ہیں۔

AL-RISALA

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی اڈیشن چھپ گیا ہے۔
فروری ۱۹۸۴ء کا شمارہ اس کا پہلا نمبر ہے۔
انگریزی الرسالہ کا زرِ تعاون اور ایجنسی کی شرائط وہی ہیں جو
اُردو الرسالہ کی ہیں۔
ذیل کے پتہ پر رابطہ قائم فرمائیں:

C-29, Nizamuddin West,
New Delhi 110 013

INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

1. The Way to Find God.
2. The Teachings of Islam.
3. The Good Life.
4. The Garden of Paradise.
5. The Fire of Hell.

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam-the true religion of submission to God

MAKTABA AL-RISALA
C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

Regd. D(DN) No. 532 Issue No. 87

AL-RISALA MONTHLY

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خان

اگر آپ درست طریقہ اختیار نہ کریں تو آپ
پانے والی چیز کو بھی پانے میں ناکام رہیں گے

مارچ ۱۹۸۴ء قیمت فی پرچہ — تین روپے شمارہ ۸۸

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

مارچ ۱۹۸۴
شمارہ ۸۸

سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

اعلان

ادارہ الرسالہ اور اسلامی مرکز کے لئے ہمارا نیا پتہ نوٹ فرمائیں:

سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013 (India)

Phone : 611128

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

پیغمبر اسلام کا اسوہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص تھا جس کا نام مُسَیلِمہ بن حُبَیب تھا۔ وہ یمامہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے پیغمبر ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ ۱۰ھ ہجری میں اس نے اپنے دو آدمیوں کے ذریعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خط بھیجا جس کا مضمون یہ تھا:

من مسیلمۃ رسول اللہ الی محمد رسول اللہ سلام علیک۔ امابعد فانی قد اُشرکت فی الامر معک۔ و ان لنا نصف الارض ولقریش نصف الارض ولکن قریشا قوم یعتدون (سیرۃ ابن ھشام)

میسلمہ خدا کے رسول کی طرف سے محمد خدا کے رسول کے نام۔ تمہارے اوپر سلامتی ہو۔ اس کے بعد یہ کہ میں نبوت میں تمہارے ساتھ تمہارا شریک بنادیا گیا ہوں اور یہ کہ نصف زمین (عرب) ہمارے لئے ہے اور نصف زمین قریش کے لئے۔ مگر قریش حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہیں۔

میسلمہ کے سفیر جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس کا خط پڑھا گیا تو آپ نے سفیروں سے پوچھا کہ تم لوگوں کا کہنا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھی وہی کہتے ہیں جو وہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا: اگر ایسا نہ ہوتا کہ سفیر قتل نہیں کئے جاتے تو میں تم دونوں کی گردن ماردیتا (اما واللہ لولا ان الرسل لاتقتل لضربت اعناقکما) اس کے بعد آپ نے مسیلمہ کو حسب ذیل خط لکھوایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من رسول اللہ الی مسیلمۃ الکذاب۔ السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ اما بعد فان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد اللہ کے رسول کی طرف سے مسیلمہ کذاب کے نام۔ سلامتی ہے اس شخص کے لئے جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اور زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور انجام صرف متقیوں کے لئے ہے۔

اس واقعہ میں ایک طرف سچے رسول اور جھوٹے رسول کا تقابل ملتا ہے۔ میسلمہ کا خط واضح طور پر جھوٹے رسول کا خط ہے اور پیغمبر اسلام کا خط واضح طور پر سچے رسول کا۔

دوسری بات جو پیغمبر اسلام کے اسوہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ غیر قوم کا سفیر خواہ وہ بدترین مجرم کیوں نہ ہو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کو اس کے وطن کی طرف واپس کردیا جائے گا۔ ان معاملات میں بین اقوامی اصول ہی اسلام کا اصول ہے۔

۲۵ واں گھنٹہ

ایک فرانسیسی مصنف نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کا نام ہے ۲۵ واں گھنٹہ :
25th Hour

اس کتاب میں مصنف نے دنیا کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ دنیا دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو مٹانے کی ایسی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں جس کا آخری نتیجہ صرف انسانیت کی مجموعی ہلاکت ہو۔ ہتھیاروں کی اندھادھند ریس نے دنیا کو خطرناک ہتھیاروں کا گدام بنادیا ہے۔ مسلسل جنگی تیاریوں نے دنیا کو اپنی بربادی کے آخری کنارے پہنچا دیا ہے۔

مصنف لکھتا ہے کہ ہمارا ۲۴ واں گھنٹہ ختم ہوچکا ہے 24th hour is past اب پچیسواں گھنٹہ (خاتمہ کا گھنٹہ) شروع ہونے والا ہے۔

مصنف نے جو بات " انسانی جنگ " کے بارہ میں کہی ہے وہ " خدائی قیامت " کے بارہ میں زیادہ صحیح ہے۔ خدا نے موجودہ دنیا کو محدود مدت کے لئے امتحان کے واسطے پیدا کیا ہے۔ یہ مدت صرف خدا کے علم میں ہے، وہ ہم کو تعین کے ساتھ معلوم نہیں۔ کسی بھی لمحہ خدا اس مدت کے خاتمہ کا اعلان کرسکتا ہے۔ اور اس کے بعد دنیا اور اس کا سارا تمدن عظیم زلزلہ کے ذریعہ تباہ ہوجائے گا۔ اور اس کے بعد ایک نئی ابدی اور کامل دنیا تخلیق کی جائے گی۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمین پر ہمارا ہر لمحہ گویا آخری لمحہ ہے۔ اگر ہم اپنی صبح میں ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہم شام نہ کرسکیں۔ اگر ہم اپنی شام میں ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہمیں دوبارہ صبح دیکھنے کو نہ ملے۔

موجودہ دنیا میں ہمارا ہر لمحہ آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت یہ امکان ہے کہ انسانیت اپنی مہلت عمر پوری کرچکی ہو۔ انسان اپنے " ۲۴ ویں گھنٹے " کو ختم کرکے ۲۵ ویں فیصلہ کن گھنٹے میں داخل ہوجائے۔

لوگ نیوکلیر جنگ کے خطرہ سے ڈر رہے ہیں۔ حالاں کہ انھیں خدا کی طرف سے قیامت کا صور پھونکا جانے سے ڈرنا چاہئے۔ کیوں کہ نیوکلیر جنگ کا ہونا یقینی نہیں۔ مگر قیامت کا آنا یقینی بھی ہے اور اس کا انجام ابدی بھی۔

پرستش کیا ہے

نیلما دیوی (Nilima Devi) ہندستان کی ایک رقاصہ ہے۔ وہ رقص کو ایک خدائی آرٹ (Divine art) سمجھتی ہے۔ وہ اپنے فن میں اتنا ڈوبی ہوئی ہے کہ وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ رقص کی صورت میں جو کچھ ظاہر کرنا چاہتی ہے وہ ان کو ظاہر نہیں کر پاتی۔ جسمانی حرکات کی محدودیت اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ایک انٹرویو (ہندستان ٹائمس، ۳۰ دسمبر ۱۹۸۳) میں اس نے کہا کہ رقص وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں جسمانی حرکات ختم ہوجاتی ہیں:

The dance starts where the gymnastics end.

نیلما دیوی کا کہنا ہے کہ وہ رقص کا کام بطور پیشہ کے نہیں کرتی۔ یہ میرے لئے ایک طریق زندگی ہے۔ انٹرویو لینے والے کے الفاظ میں، جب وہ رقص نہیں کرتی تو وہ اپنے آپ کو خالی محسوس کرتی ہے۔ ایسے لمحات میں اس کے پاس کوئی نقطۂ ارتکاز نہیں ہوتا جس میں وہ اپنی زندگی کو مرتکز کر سکے:

She says when she is not dancing she feels empty.
There is no focal point in her life at such moments.

رقاصہ نے جس چیز کو طریق زندگی (Way of life) کہا، اسی کا دوسرا نام پرستش ہے۔ اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ فن کی پرستش ایک رقاصہ کے اندر پیدا ہوجائے تو وہ اس کے اندر گہرے جذبات پیدا کر دیتی ہے ـــــ وہ رقص کو اس کے لئے زندگی بنا دیتی ہے۔ اس کے اندر جذبات کا ایسا طوفان برپا ہوتا ہے جس کے اظہار سے وہ اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگتی ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اپنے رقص کے ذریعہ وہ جو کچھ کہہ سکی ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو وہ کہنا چاہتی ہے۔ اس کے بغیر اس کی زندگی خالی ہوجاتی ہے۔ اس سے الگ ہو کر وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے لئے کوئی ایسا مرکزی نقطہ باقی نہیں رہا جہاں وہ اپنے وجود کو سمیٹ سکے۔

خدا کی پرستش کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ وہ ایک خدائی رقص ہے۔ جب کوئی بندہ اپنے رب کو پاتا ہے تو یہ اس کے لئے اتنا عظیم واقعہ ہوتا ہے کہ وہ رقص کر اٹھتا ہے۔ اس کا وہی حال ہوجاتا ہے جو مذکورہ مثال میں فن کے پرستار کا نظر آتا ہے ـــــ خدا اس کے تمام وجود کا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے۔ خدا سے الگ اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ خدا کے بارہ میں اس کے اندر ایسے گہرے جذبات اٹھتے ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے وہ الفاظ نہ پا سکے۔

ٹوٹنے کے بعد

مادہ کی آخری اکائی ایٹم ہے جس طرح سماج کی آخری اکائی فرد ہوتا ہے۔ اگر ہم ایٹم کو توڑنے میں کامیاب ہوجائیں تو ہم اس کو فنا نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو ایک نئی اور زیادہ بڑی قوت میں تبدیل کر دیتے ہیں جس کا نام جوہری توانائی (Atomic energy) ہے۔ مادہ منجمد توانائی ہے اور توانائی منتشر مادہ۔ مادہ اپنی ابتدائی شکل میں جتنی قوت رکھتا ہے، اس کے مقابلہ میں اس وقت اس کی قوت بہت بڑھ جاتی ہے جب کہ اس کے ایٹموں کو توڑ کر جوہری توانائی میں تبدیل کر دیا گیا ہو۔

معمولی مادی قوت اور جوہری قوت میں کیا فرق ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ دو ٹن کوئلہ ایک ریل گاڑی کو ستر میل تک لے جاتا ہے اور نو گیلن کروسین ایک موٹر کو پانچ سو میل تک دوڑانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں بارہ پونڈ یورینیم جب جوہری توانائی میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ایک تیز رفتار راکٹ کو دو لاکھ چالیس ہزار میل کا سفر طے کرا سکے۔

ایسا ہی معاملہ اس سماجی اکائی کا ہے جس کو انسان کہتے ہیں۔ انسان جب "ٹوٹتا ہے" تو وہ بے پناہ حد تک وسیع ہو جاتا ہے۔ جس طرح مادہ ٹوٹنے سے فنا نہیں ہوتا بلکہ اپنی قوت بڑھا لیتا ہے۔ اسی طرح انسان کی ہستی جب "شکست" سے دوچار ہوتی ہے تو وہ ختم نہیں ہوتی بلکہ نئی شدید تر طاقت حاصل کر لیتی ہے۔

انسان پر شکست کا حادثہ گزرنا اس کے تمام اندرونی تاروں کو چھیڑنے کے ہم معنی ہے۔ اس کے بعد اس کے تمام احساسات جاگ اٹھتے ہیں۔ اس کی چھپی ہوئی طاقتیں اپنی ناکامی کی تلافی کے لئے حرکت میں آجاتی ہیں۔ اس کے عزم و ارادہ کو مہمیز لگتی ہے۔ اس کے اندر ہاری ہوئی بازی کو دوبارہ جیتنے کا وہ بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جو سیل رواں کی طرح آگے بڑھتا ہے۔ اس کو روکنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا، حتی کہ پتھریلی چٹانوں کے بس میں بھی نہیں۔

مادہ کے اندر ایٹمی انفجار (Atomic explosion) اس کو بہت زیادہ طاقت ور بنا دیتا ہے۔ اسی طرح انسانی شخصیت کے اندر بھی بے پناہ امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ یہ امکانات اس وقت بروئے کار آتے ہیں جب کہ انسانی شخصیت کسی انفجار سے دوچار ہو جائے۔ اس پر کوئی ایسا حادثہ گذرے جو اس کی شخصیت کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ جو اس کے تاروں کو چھیڑ کر اس کے سازحیات کو بجا دے۔

ناموافق حالات

جانوروں کو جنگل کے ماحول میں ہر وقت اپنے دشمنوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ ہر وقت چوکنے رہتے ہیں۔ یہ چوکنا رہنا ان کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی فطری صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ ان کی شخصیت ختم ہونے نہیں پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جانوروں کو پالنے کے لئے جو بڑے بڑے پارک بنتے ہیں ان میں مصنوعی طور پر ان کے لئے خطرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مثلاً خرگوش کے پارک میں بلی ڈال دی جاتی ہے یا ہرن کے پارک میں ایک شیر یا ایک بھیڑیا ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح جانوروں کی چوکسی (Alertness) باقی رہتی ہے۔ وہ اپنے تحفظ کی خاطر ہر وقت زندہ اور سرگرم رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو دھیرے دھیرے وہ بجھ کر رہ جائیں گے۔

یہی بات انسانوں کے لئے بھی صحیح ہے۔ انسان کے اندر بے شمار صلاحیتیں ہیں۔ یہ صلاحیتیں عام حالات میں سوئی رہتی ہیں۔ وہ بیدار اس وقت ہوتی ہیں جب ان کو جھٹکا لگے۔ جب وہ عمل میں آئیں۔ کسی بھی مقام پر اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ جن خاندانوں میں آسودگی کے حالات آجاتے ہیں اس کے افراد بے حس اور کم عقل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جن خاندانوں کو مشکل حالات گھیرے ہوئے ہوں ان کے افراد میں ہر قسم کی ذہنی اور عملی صلاحیتیں زیادہ اجاگر ہوتی ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ اپنے ماحول میں عدم تحفظ کی صورت حال میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مکہ اور مدینہ کے مسلمان اس سے کہیں زیادہ عدم تحفظ کی صورت حال میں مبتلا تھے۔ اگر عدم تحفظ کوئی "برائی" ہوتی تو یقیناً اللہ کا رسول اور اس کے اصحاب کہیں زیادہ اس کے مستحق تھے کہ اللہ انھیں اس برائی سے دور رکھے۔ مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ ان کو مسلسل عدم تحفظ کی صورت حال میں رکھا۔ ان کو اپنی زندگی میں کبھی چین اور آسودگی نہ مل سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا نظام اللہ تعالیٰ نے جس ڈھنگ پر بنایا ہے وہ یہی ہے کہ یہاں دبنے سے ابھار پیدا ہو۔ مشکلوں کے مدرسہ میں انسان کی اعلیٰ تربیت ہو۔ غیر محفوظ حالات کے اندر مستعدی کا ظہور ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ انھیں لوگوں نے بڑی بڑی ترقیاں حاصل کیں جو حالات کے دباؤ میں مبتلا تھے۔ قدرت کا یہی قانون افراد کے لئے ہے اور یہی قوموں کے لئے۔

حقیقت پسندی نہ کہ شوق

شہد کی مکھیاں اپنا چھتہ جہاں بناتی ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پھولوں کا مقام اس سے کئی میل دور ہوتا ہے۔ ایک پھول میں بہت تھوڑی مقدار رس کی ہوتی ہے۔ اس لئے بھی اس کو بہت دور دور تک جانا ہوتا ہے تاکہ بہت سے پھولوں کا رس چوس کر اپنی مقدار حاصل کر سکے۔

شہد جمع کرنے والی مکھی سارے دن اڑانیں بھرتی ہے تاکہ وہ ایک ایک پھول کا رس نکالے اور اس کو لاکر اپنے چھتہ میں جمع کرے۔ مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ شہد کی مکھی صبح جب اپنے پہلے سفر پر نکلتی ہے تو اندھیرے میں روانہ ہوتی ہے۔ مگر شام کو جب پھولوں کے مقام سے وہ اپنی آخری باری کے لئے چلتی ہے تو اس کا یہ سفر نسبتاً اجالے میں ہوتا ہے۔ پہلی باری کے لئے اندھیرے میں چلنا اور آخری باری کے لئے اجالے میں سفر شروع کرنا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ دونوں وقتوں کا فرق ہے۔ صبح کے وقت سفر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اندھیرے سے اجالے کی طرف جارہی ہے۔ جب کہ شام کے وقت سفر کا مطلب اجالے سے اندھیرے کی طرف جانا ہے۔

شہد کی مکھی وقت کے اس فرق کو ملحوظ رکھتی ہے اور اس کی پوری طرح رعایت کرتی ہے۔ شہد کی مکھی اپنے لمبے سفر کو چونکہ سورج کی روشنی ہی میں صحیح صحیح انجام دے سکتی ہے۔ اندھیرے میں اس کا امکان رہتا ہے کہ وہ بھٹک جائے اور اپنی منزل پر نہ پہنچے، اس لئے صبح کو وہ اپنی پہلی باری اندھیرے میں شروع کر دیتی ہے۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ اگلے لمحات اجالے کے لمحات ہوں گے۔ اس کے برعکس شام کو اپنی آخری باری کے لئے وہ اجالا رہتے ہوئے چل پڑتی ہے۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ جتنی دیر ہوگی اتنا ہی اندھیرا بڑھتا چلا جائے گا۔

یہ قدرت کا سبق ہے۔ اس طرح قدرت بتاتی ہے کہ زندگی میں ہمارا ہر قدم حقائق کی بنیاد پر اٹھنا چاہئے نہ کہ خوش فہمیوں اور موہوم امیدوں کی بنیاد پر۔ آنے والے لمحات کبھی "اندھیرے" کے لمحات ہوتے ہیں اور کبھی "اجالے" کے لمحات، اگر اس فرق کی رعایت نہ کی جائے اور آنے والے لمحات کا لحاظ کئے بغیر بے خبری میں سفر شروع کر دیا جائے تو آنے والا لمحہ ہماری رعایت نہیں کرے گا۔ وہ اپنے نظام کے تحت آئے گا نہ کہ ہماری خوش فہمیوں کے تحت۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ کبھی ہم سمجھیں گے کہ ہم روشن مستقبل اور شاندار انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ حالانکہ اگلا لمحہ جب آئے گا تو معلوم ہوگا کہ ہم صرف اندھیروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دانش مندی کے ذریعہ

کیا یہ ممکن ہے کہ زندہ شیر کا مطالعہ کھلے جنگل میں عین اس کے قریب بیٹھ کر کیا جائے۔ اس طرح کہ آدمی اس کو چھوئے اور اس کے جسم کے اعضا کی صحیح پیمائش کر سکے۔ بظاہر یہ ایک ناممکن سی بات نظر آتی ہے۔ مگر خدا نے انسان کو جو عقل دی ہے وہ ایسی عجیب و غریب ہے کہ وہ ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔

امریکہ کے ایک ماہر حیوانات جارج بی شیلر نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ شیلر کو شیر ببر کی عادات و خصوصیات پر ایک کتاب لکھنی تھی۔ چنانچہ اس نے دو سال تک کھلے جنگل میں زندہ شیروں کے بالکل قریب جا کر ان کا مطالعہ کیا۔ اس نے اس قریبی مطالعہ کے ذریعہ جنگل کے بادشاہ کے بارہ میں عجیب عجیب حقائق دریافت کیے۔ مثلاً یہ کہ شیر ببر نہایت سست اور کاہل درندہ ہے۔ شیروں کے اکثر بچے بھوکے مر جاتے ہیں کیوں کہ ان کے ماں باپ اپنی سستی کی وجہ سے اپنے بچوں کے لیے خوراک مہیا نہیں کرتے، وغیرہ۔

مسٹر شیلر کو کیسے یہ موقع ملا کہ وہ کھلے جنگل میں زندہ شیر کے بالکل پاس جا کر شیر کا مطالعہ کریں۔ جواب یہ ہے عقل کے ذریعہ۔ مسٹر شیلر نے ایسے کارتوس تیار کیے جن میں گولی کے بجائے بے ہوش کرنے والی دوا بھری ہوتی تھی۔ اس بے ہوشی کے کارتوس کو مخصوص بندوق میں رکھ کر وہ داغتے تو وہ شیر کے پاس پہنچ کر منٹوں میں اس کو غافل اور بے ہوش کر دیتی تھی۔ انھوں نے اس طریقہ کے ذریعہ تقریباً ایک سو شیروں کو بے ہوشی کی دواؤں کا نشانہ بنا کر بے حس کر دیا۔ اور جب وہ بے حس ہو کر زمین پر گر پڑے تو ان کے قریب جا کر ان کی ہر چیز دیکھی اور غور کے ساتھ ان کا مکمل مطالعہ کیا۔

انسان جس طرح جنگل کے خونخوار درندوں کو قبضہ میں کر لیتا ہے، اسی طرح وہ انسانی بستی کے مردم نما بھیڑیوں پر بھی قابو پا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسانی بھیڑیوں پر بھی خدا کی دی ہوئی عقل کو اسی طرح استعمال کیا جائے جس طرح اسے جنگل کے بھیڑیوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک شخص آپ سے کسی اعتبار سے بڑا ہے اور آپ سے اپنی بڑائی منوانا چاہتا ہے تو آپ اس کی بڑائی مان کر اسے "بے ہوش" کر دیجیے اور پھر اپنی خاموش تعمیر میں لگ جائیے۔ اگر آپ ایسا کریں تو بالآخر وہ وقت آجائے گا کہ خود اس کو وہ واقعہ ماننا پڑے جس کا مطالبہ اس سے پہلے وہ آپ سے کر رہا تھا۔

اور تالا کھل گیا

اس کی ناکام کوشش اب جھنجلاہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ کافی دیر سے تالے کے ساتھ زور آزمائی کر رہا تھا۔ "یقیناً یہ تالے کی خرابی ہے جس کی وجہ سے یہ نہیں کھل رہا ہے۔" اس نے سوچا " رفیق صاحب کو بھی اس کے سوا کوئی تالا نہیں ملتا تھا۔ ساری کفایت ان کو بس تالے ہی میں کرنی تھی" اس کے بعد اس نے ملکی صنعت کو کوسنا شروع کر دیا۔ "ہمارے صنعت کار صرف چیزوں کی شکلیں بناتے ہیں اور ان کو دکھا کر گاہکوں سے پیسے وصول کرتے ہیں۔ ان کو اس سے غرض نہیں کہ گھر پہنچ کر وہ گاہک کے کام بھی دیں گی یا نہیں"۔ جھنجلاہٹ میں طرح طرح کے الفاظ اس کی زبان پر آرہے تھے۔ اس کا غصہ اب اس مقام پر پہنچ چکا تھا کہ اگلا مرحلہ یہ تھا کہ تالا کھولنے کے لئے وہ کنجی کے بجائے ہتھوڑے کا استعمال شروع کر دے۔

اتنے میں اس کے میزبان رفیق صاحب آگئے۔ "کیا تالا نہیں کھل رہا ہے"! انھوں نے کنجی اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ اچھا آپ کنجی غلط لگا رہے تھے۔ اصل میں آج ہی میں نے تالا بدل دیا ہے۔ مگر کنجی چھلّے میں ڈالنا بھول گیا۔ اس کی کنجی دوسری ہے"۔ اس کے بعد وہ دوڑ کر دوسری کنجی لائے اور دم بھر میں تالا کھل گیا۔

ایسا ہی کچھ حال موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ موجودہ زمانہ نے زندگی کے دروازوں کے تالے بدل دئے ہیں۔ مگر ان کا حال یہ ہے کہ پرانی کنجیوں کا گچھا لئے ہوئے تالوں کے ساتھ زور آزمائی کر رہے ہیں۔ اور جب پرانی کنجیوں سے نئے تالے نہیں کھلتے تو کبھی تالا بنانے والے پر اور کبھی سارے ماحول پر خفا ہوتے ہیں۔ حالانکہ محض غصہ اور نفرت کی بنا پر ایسا نہیں ہو سکتا کہ پرانی کنجیوں سے نئے تالے کھل جائیں۔

ہمارے تمام قائدین کا یہ حال ہے کہ ہر ایک نے اپنے ذوق کے مطابق کچھ "اسلام دشمن" تلاش کر رکھے ہیں اور ان مفروضہ دشمنوں کی سازش کو مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا سبب سمجھتے ہیں۔ مگر خدا کی دنیا میں اس سے زیادہ بے معنی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہاں ہر شخص اور ہر قوم کو صرف اپنی کوتاہیوں کی سزا ملتی ہے۔ اس دنیا میں ہر حادثہ جو کسی کے ساتھ پیش آتا ہے وہ اس کی اپنی کسی کمزوری کی قیمت ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہماری اکثر مصیبتیں زمانہ سے عدم مطابقت کی قیمت ہیں۔ اگر ہم اس عدم مطابقت کو ختم کر دیں تو آپ سے آپ موجودہ حالات ختم ہو جائیں گے۔

واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری کے دور میں جذباتی تقریریں اور تحریریں، اہلیت کی بنا پر حقوق حاصل کرنے کے دور میں رعایت اور رزرویشن کی باتیں، اکثریتی حکمرانی کے نظام میں اقلیتوں کے لئے قائدانہ رول ادا کرنے کے نعرے، تعمیری استحکام کے ذریعہ اوپر اٹھنے کے دور میں جلسوں اور جلوسوں کے ذریعہ قوم کا مستقبل برآمد کرنے کی کوشش، سماجی بنیادوں کی اہمیت کے زمانہ میں سیاسی سودے بازی کے ذریعہ ترقی کے منصوبے، یہ سب اسی کی مثالیں ہیں۔ یہ ماضی کے معیاروں پر حال کی دنیا سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کرنا ہے۔ جو کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ آج کا "نیا تالا" ان "پرانی کنجیوں" سے نہیں کھلتا۔ اس لئے دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم جھنجھلاہٹ اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا اپنے ظلم اور تعصب کی وجہ سے ہمیں کچھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ آج پوری مسلم قوم ایک قسم کی نفسیاتی مریض ہو کر رہ گئی ہے۔ اور اس المیہ کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے زمانہ کے تقاضے پورے نہیں کئے اس لئے زمانہ نے بھی ہمیں اپنے اندر جگہ نہیں دی۔ بدلے ہوئے زمانہ میں ہم ایک ردی ہوئی قوم بن کر رہ گئے۔

اعلان

بعض کتابوں کی قیمت میں تبدیلی کی گئی ہے۔ موجودہ قیمت درج ذیل ہے:

مذہب اور جدید چیلنج	۲۵ روپئے
ظہور اسلام	۲۵ روپئے
احیاء اسلام	۱۵ روپئے
پیغمبر انقلاب (عام اڈیشن)	۲۵ روپئے
پیغمبر انقلاب (ڈیلکس اڈیشن)	۵۰ روپئے
تعارف اسلام	۳ روپئے
انسان اپنے کو پہچان	۲ روپئے

مکتبہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

آزمودہ حل

رابرٹ ملتھوف (Robert Multhoff) کا ایک بہت بامعنی قول ہے۔ اس نے کہا کہ جو شخص تعمیم کو پسند کرتا ہے وہ عموماً جھوٹ بولتا ہے:

He who likes to generalize generally lies.

ایک تنہا واقعہ کو اگر آپ عمومی انداز میں بیان کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ استثناء کو عموم کی حیثیت دے رہے ہیں۔ ایک حادثہ جو کسی اتفاقی سبب سے پیش آیا ہے اس کو سماج کی عام حالت قرار دے رہے ہیں۔ ایسا آدمی ہمیشہ جھوٹ کی فضا میں رہتا ہے۔ وہ نہ کبھی سچائی کو پاتا اور نہ معاملہ کے سچے حل کو۔

ہمارے بہت سے اخبارات ہیں جن میں آپ کو اس قسم کی سرخیاں پڑھنے کو ملیں گی — ہندستان میں فرقہ وارانہ فساد، علی گڑھ میں فرقہ وارانہ فساد، حیدرآباد میں فرقہ وارانہ فساد۔ اس قسم کی خبریں صحیح ہونے کے باوجود ہمیشہ غلط ہوتی ہیں۔ وہ آدھی سچائی ہوتی ہیں نہ کہ پوری سچائی۔ کیوں کہ کوئی فساد کبھی پورے ملک یا پورے شہر میں نہیں ہوتا۔ مگر ہمارے لکھنے اور بولنے والے ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جس سے بظاہر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ پورا ملک یا پورا شہر فرقہ وارانہ فساد کی زد میں آ گیا ہے۔

جب بھی کہیں فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو وہ نہ سارے ہندستان میں ہوتا اور نہ کسی پورے شہر میں۔ مثلاً اس قسم کے فساد تقریباً سب کے سب ہندستان کے شمالی حصہ میں ہوتے ہیں۔ ہندستان کا جنوبی حصہ ہمیشہ اس سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح مثلاً علی گڑھ میں فساد ہوا تو وہ پرانے شہر میں ہوا۔ سول لائن کے علاقہ میں کوئی فساد نہیں ہوا۔ اسی طرح حیدرآباد کا فساد قدیم حیدرآباد کے علاقہ میں ہوا۔ نیا حیدرآباد اس سے بچا رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا قسم کی خبریں ہمیشہ "جھوٹ" ہوتی ہیں۔ اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ ہمارے قائدین آج تک اس مسئلہ کا سچا حل دریافت نہ کر سکے۔ چونکہ اپنے ذہن کے مطابق وہ "پورے" ملک یا "پورے" شہر میں فساد فرض کئے ہوئے ہیں اس لئے ان کو وہ غیر فساد زدہ حصہ نظر نہیں آتا جہاں فساد نہ ہونے کے اسباب کی تحقیق کر کے وہ اس کے مطابق فساد زدہ حصہ کو فساد سے بچانے کی تدبیر کر سکیں۔

ایک ہی شہر کے ایک حصہ میں فساد ہو اور اسی شہر کے دوسرے حصہ میں فساد نہ ہو تو یقیناً

یہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ فرق کیسے واقع ہوا۔ اس فرق کا راز دریافت کرکے ایسا کیا جا سکتا ہے کہ محفوظ حصہ کے تجربہ کو غیر محفوظ حصہ میں دہرایا جائے۔ جس طرح ایک حصہ فساد سے بچا ہے اسی طرح دوسرے حصہ کو بھی فساد سے بچایا جائے۔

ہمارے تمام قائدین تعمیم (Generalization) کے جھوٹ میں مبتلا ہیں۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ وہ اس نازک مسئلہ کا سچا حل دریافت نہ کرسکے۔

تعمیم سے بچ کر خالص حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندستان دو ہندستان کا نام ہے۔ اسی طرح علی گڑھ بھی دو علی گڑھ ہے اور حیدرآباد بھی دو حیدرآباد۔ ایک ملک دو ملک کیسے بنا اور ایک شہر دو شہر کیوں کر ہوگیا۔ اسی سوال کے جواب میں یہ راز چھپا ہوا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کیسے ہوتے ہیں اور کس طرح ان کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

ایک مقام کے ایک حصہ میں فساد ہو اور عین اسی زمانہ میں اس مقام کا دوسرا حصہ فساد سے بچا رہے تو ہم کو چاہئے کہ فساد کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے فساد نہ ہونے والے حصہ کا مطالعہ کریں اور وہاں فساد نہ ہونے کے اسباب کو جان کر اسی کو اس دوسرے حصہ میں رائج کریں جہاں فساد ہوا ہے۔ موجودہ حالات میں یہی فساد کے مسئلہ کے مطالعہ کا فطری طریقہ ہے اور یہی اس مسئلہ کے حل کی آسان ترین تدبیر بھی۔

شمالی ہندستان اور جنوبی ہندستان میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ " دوقومی " سیاست سب سے زیادہ شمالی ہندستان میں چلائی گئی۔ جب کہ جنوبی ہندستان کا علاقہ اس قسم کی تفریقی سیاست سے بڑی حد تک محفوظ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شمالی ہندستان میں فرقہ وارانہ کش مکش کی فضا پائی جاتی ہے۔ جب کہ جنوبی ہندستان میں اس قسم کی فضا تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح علی گڑھ کے شہری علاقہ اور سول لائن کے علاقہ میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ شہری علاقہ میں جاہلوں کی اکثریت ہے اور سول لائن میں تمام کے تمام پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ قدیم حیدرآباد اور جدید حیدرآباد میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ جدید حیدرآباد میں سب کے سب خوش حال لوگ بستے ہیں اور قدیم حیدرآباد میں کثرت سے غریب لوگ آباد ہیں۔

اس مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کس قسم کے حالات میں فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے اور کس قسم کے حالات میں وہ نہیں ہوتا۔ اب فسادات کو ختم کرنے کی آزمودہ تدبیر یہ ہے کہ شمالی ہند میں جنوبی ہند کے مانند حالات پیدا کئے جائیں۔ مسلمان اپنی طرف سے ان تمام اسباب کو ختم کر دیں جو دونوں فرقوں میں کش مکش اور تناؤ کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً حقوق کے مطالبے، احتجاجی سیاست اور مسجد اور مندر

کے جھگڑے کھڑے کرنا وغیرہ۔ اسی طرح یہ کیا جائے کہ "قدیم شہر" میں "جدید شہر" کے حالات پیدا کئے جائیں۔ یعنی اقلیتی فرقہ کے افراد کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنایا جائے ان کی اقتصادیات کو بہتر بنانے کی کوششیں کی جائیں۔ انھیں چیزوں نے ملک کے ایک حصہ میں فساد کو روک رکھا ہے اور یہی چیز اس ملک کے دوسرے حصہ میں بھی فساد کو روک سکتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کو ختم کرنے کے لئے ہمیں کوئی نیا حل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اسی آزمودہ تدبیر کو فساد زدہ علاقہ میں بھی استعمال کریں جو غیر فساد زدہ علاقہ میں آج بھی فرقہ وارانہ فساد کے خلاف ڈاٹ بنی ہوئی ہے۔

دہلی کے ایک مسلم محلہ میں ایک اردو پوسٹر نظر سے گذرا۔ سرخی یہ تھی:

"آگ اور خون میں نہائے ہوئے ہندستانی مسلمان سوال کرتے ہیں"

یورپ کے سفر میں ایک مقام پر میں نے دیکھا کہ ایک پرجوش نوجوان عربی اور انگریزی میں چھپا ہوا ایک کتابچہ تقسیم کر رہے ہیں۔ اس کے صفحۂ اول پر یہ الفاظ درج تھے:

"ہندستان جو مسلمانوں کے لئے عظیم مذبح بن چکا ہے"

ہندستان میں جزئی طور پر ضرور ایسے بعض واقعات ہوئے ہیں جن پر مذکورہ بالا الفاظ صادق آتے ہیں مگر پورے ملک کے بارہ میں اس قسم کے الفاظ بولنا سراسر خلاف واقعہ ہے۔ اور جو لوگ خلاف واقعہ بات پر اپنی عمارت کھڑی کرنا چاہیں وہ یقینی طور پر خدا کی مدد نہیں پا سکتے۔

اس طرح سوچنے اور بولنے میں ایک نقصان یہ ہے کہ آدمی کبھی مسئلہ کے صحیح حل تک نہیں پہنچتا۔ "مسئلہ کا حل کیا ہے" اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی یہ جانے کہ "مسئلہ کی نوعیت کیا ہے"۔ مسئلہ کی نوعیت کو جانے بغیر مسئلہ کا حل متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مذکورہ طرز پر سوچنے والے اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ مسئلہ کی نوعیت دریافت نہ کر سکے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ وہ مسئلہ کا حل پا سکیں۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ یہ طرز کلام آدمی سے حقیقت پسندی چھین لیتا ہے۔ دنیا کا نظام اس کے پیدا کرنے والے نے کامل حقیقت پسندی کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ یہاں کوئی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے اصول فطرت سے کلی مطابقت ضروری ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ دوسروں پر جھوٹا الزام دینے کو اپنا طریق کار بنائیں وہ یقینی طور پر حقیقت پسندی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا میں بے حقیقت ہو کر رہ جائیں۔

جواب کا صحیح طریقہ

مولانا محمد ہاشم القاسمی نے بتایا کہ وہ ایک مقام پر گئے۔ وہاں ایک مسجد میں انھوں نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد وہ وہاں بیٹھ گئے۔ اس وقت وہاں تقریباً پندرہ آدمی تھے۔ الرسالہ کا ذکر آیا تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: "ہاں میں الرسالہ کو جانتا ہوں۔ وہ تو ایک نیم مذہبی پرچہ ہے اس کو خالص دینی پرچہ نہیں کہہ سکتے۔"

اس کے بعد انھوں نے بآواز بلند الرسالہ کے خلاف تقریر شروع کر دی۔ تاہم مولانا قاسمی صاحب برہم نہیں ہوئے۔ انھوں نے خاموشی سے اپنی جیب سے تین روپیہ نکالا اور اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ بازار میں فلاں اسٹال پر الرسالہ فروخت ہو رہا ہے۔ وہاں سے ایک شمارہ لے کر آجاؤ۔ آدمی نے پوچھا کہ کس مہینہ کا شمارہ۔ انھوں نے کہا جس مہینہ کا بھی مل جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد جولائی ۱۹۸۲ کا شمارہ ان کے ہاتھ میں تھا۔

اب مولانا قاسمی نے کہا: دیکھئے یہ جولائی ۱۹۸۲ کا الرسالہ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اس کے اوراق کھول کھول کر ایک ایک سرخی پڑھنی شروع کی اور مذکورہ بزرگ سے پوچھا کہ بتائیے ان میں سے کون سا مضمون آپ کے خیال میں نیم مذہبی ہے۔ عنوانات یہ تھے: جنت کا دروازہ، روزہ کی حقیقت ہر طرف فریب، شناختی کارڈ کے بغیر۔

"شناختی کارڈ کے بغیر" کے الفاظ سن کر مذکورہ بزرگ فوراً بولے۔ اس کو دیکھئے یہ نیم مذہبی نہیں تو اور کیا ہے۔ شناختی کارڈ کا دین اور مذہب سے کیا تعلق۔

مولانا قاسمی نے کہا کہ آپ کے بیان کے مطابق یہ مضمون یقینی طور پر نیم مذہبی ہے۔ اب میں اس مضمون کو پڑھتا ہوں۔ آپ بھی سنیں اور سب حاضرین سنیں اور اس کے بعد فیصلہ کریں۔

اس مضمون کا تقریباً نصف حصہ ایک واقعہ پر مشتمل ہے۔ مولانا قاسمی جب نصف تک پہنچے تو مذکورہ بزرگ نے پھر بولنا شروع کیا۔ مولانا قاسمی نے کہا: آپ تھوڑی دیر رکئے۔ میں پورا مضمون پڑھ دوں۔ اس کے بعد آپ تبصرہ کریں۔ اس کے بعد انھوں نے اگلی سطریں پڑھنی شروع کیں تو وہ سراسر آخرت سے متعلق تھا، اب جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہے تھے مذکورہ بزرگ ٹھنڈے ہوتے جارہے تھے، یہاں تک کہ جب مضمون ختم ہوا تو وہ بالکل لاجواب ہو چکے تھے۔ تمام حاضرین کہہ اٹھے کہ یہ تو سراسر مذہبی بات ہے۔ اور نہایت موثر انداز میں ہے۔ پھر اس پر اعتراض کیا۔

انتقام نہیں

ایک صاحب ٹرانسپورٹ کا کام کرتے ہیں۔ ان کے پاس ایک گاڑی تھی جس کا لائسنس رسمی طور پر دوسرے کے نام تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اس آدمی کی نیت خراب ہوگئی۔ اس نے چاہا کہ کاغذ میں قانونی اندراج سے فائدہ اٹھاکر گاڑی پر قبضہ کرلے یا اس کے معاوضہ میں ان سے کوئی بڑی رقم حاصل کرے۔ ٹرانسپورٹ کے مالک کے سامنے جب یہ بات آئی تو اس کے بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اپنے اس "دوست" کا جانی دشمن ہوگیا۔

اب اس کا ذہن ہر وقت ایک ہی سوچ میں رہتا۔ وہ یہ کہ اس شخص کو کس طرح مروایا جائے۔ انتقام کے جذبہ نے اس کے ذہن کو جرائم کا کارخانہ بنادیا۔ اب اس کو نہ اپنے کاروبار کی ترقی کی فکر تھی نہ اپنے گھر کو بنانے کی۔ ساری فکر اس بات کی تھی کہ مذکورہ شخص کو کسی نہ کسی طرح ہلاک کردیا جائے۔ اسی حال میں چھ ماہ گذر گئے۔ بالآخر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ وہ اتفاقاً ایک مقام پر گیا ہوا تھا۔ ایک سڑک سے گذرتے ہوئے اس کے کان میں کچھ آوازیں آئیں۔ اس کو محسوس ہوا کہ یہاں کوئی تقریر ہو رہی ہے۔ وہ جلسہ گاہ کی طرف مڑ گیا اور وہاں بیٹھ کر تقریر سننے لگا۔ تقریر کرنے والا کہہ رہا تھا:

انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا۔

تقریر کی سادگی نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ انتہائی غور کے ساتھ مقرر کی باتیں سنتا رہا جو بار بار مختلف مثالوں کے ذریعہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر رہا تھا۔ تقریر کے بعد جب وہ جلسہ گاہ سے اٹھا تو وہ دوسرا انسان بن چکا تھا۔ اس نے طے کیا کہ وہ انتقام کے ذہن کو ختم کردے گا اور مذکورہ شخص کے معاملہ کو خدا کے حوالہ کرکے اپنے کاروبار کی ترقی میں لگ جائے گا۔

ٹرانسپورٹ کے مالک کو اب تک کام کرنے کا صرف "تخریبی ڈھانچہ" معلوم تھا۔ اب انھوں نے کام کرنے کا "تعمیری ڈھانچہ" دریافت کرلیا۔ ان کو معلوم ہوا کہ کام کرنے کا وہی ایک انداز نہیں ہے جس پر دوسرے اکثر لوگ چل رہے ہیں۔ کام کرنے کا ایک اور انداز بھی ہے۔ اور وہ ہے ــــ دوسرے کے پیچھے دوڑنے کے بجائے اپنے پیچھے دوڑنا۔

مذکورہ شخص نے اب اسی دوسرے طریقے کو پکڑ لیا۔ انھوں نے ۶ ستمبر ۱۹۸۲ کی ایک ملاقات میں کہا کہ "اب وہ اپنے کو زیادہ پرسکون بھی پاتے ہیں اور زیادہ کامیاب بھی"

بدعنوانی

بمبئی میں ایک کئی منزلہ عمارت بنائی گئی۔ اس کا نام "آکاش دیپ" رکھا گیا۔ مگر جب وہ بن کر تیار ہوئی تو اچانک گر پڑی۔ بتایا جاتا ہے کہ گرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تعمیر میں سمنٹ کا جز مقررہ مقدار سے کم استعمال کیا گیا تھا۔

ایک ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر نے اس سلسلے میں اپنا بیان دیتے ہوئے کہا:

RCC construction is a scientific process which is excellent in the hands of qualified and experienced people, but dangerous if managed by incompetent engineers and contractors.

آر سی سی تعمیر ایک سائنسی طریقہ ہے جو بہت عمدہ ہے جب کہ وہ لائق اور تجربہ کار لوگوں کے ہاتھ میں ہو مگر وہ اس وقت خطرناک ہو جاتا ہے جب اس کو استعمال کرنے والے نااہل انجنیر اور ٹھیکہ دار ہوں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۴ ستمبر ۱۹۸۳)

بظاہر یہ ایک صحیح اور خوب صورت بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے اندر ایک مغالطہ چھپا ہوا ہے۔ یہ مغالطہ اس وقت کھل جاتا ہے جب کہ ہم نااہل (Incompetent) کی جگہ بدعنوان (Corrupt) کا لفظ رکھ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس قسم کے مسائل لوگوں کی حرص اور بدعنوانی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ فنی عدم مہارت کی وجہ سے۔

بھاکرا ڈیم ہندستان کا اعلیٰ ترین سرکاری منصوبہ تھا۔ اس کی تعمیر میں ملک کے بہترین انجنیر لگائے گئے۔ مگر جب وہ بن کر تیار ہوا تو اس کی دیواروں میں شگاف ہو گیا جس کی تعمیر کے لیے دوبارہ کروڑوں روپیہ لگانا پڑا۔ اس قسم کے واقعات ہر روز ہمارے ملک میں ہو رہے ہیں۔ یہ سب کام ہمیشہ فنی ماہرین کی نگرانی میں انجام پاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ حال ہے کہ سڑکیں بننے کے بعد جلد ہی خراب ہو جاتی ہیں۔ عمارتیں تیار ہونے کے ساتھ ہی قابل مرمت ہو جاتی ہیں۔ منصوبے تکمیل کو پہنچ کر غیر مکمل نظر آنے لگتے ہیں۔ اس قسم کے تمام واقعات کی وجہ بدعنوانی ہے نہ کہ فنی مہارت کی کمی۔

بدعنوانی ایک نفسیاتی خرابی ہے اور فنی مہارت میں کمی ایک ٹکنکل خرابی۔ نفسیاتی خرابی کو ٹکنکل اصلاح کے ذریعہ دور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں واقعۃً ایک بہتر سماج بنے تو افراد قوم کی نفسیاتی اصلاح کرنی ہوگی۔ صرف ٹکنکل کورس میں اضافہ سے یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

مستقل ارادہ

کسی مفکر کا قول ہے : " لوگوں میں طاقت کی اتنی کمی نہیں جتنی مستقل ارادے کی کمی ہے۔" واقعہ یہ ہے کہ اکثر لوگوں کے اندر صلاحیت پوری طرح موجود ہوتی ہے۔ مگر اس کا فائدہ وہ صرف اس لئے نہیں اٹھا پاتے کہ وہ استقلال کے ساتھ دیر تک جد وجہد نہیں کر سکتے۔ اور کسی واقعی کامیابی کے لئے لمبی جد وجہد فیصلہ کن طور پر ضروری ہے۔ اگر آپ اپنی کوششوں کا کوئی ٹھوس اور مفید نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں تو پہلے دن یہ سوچ لیجئے کہ آپ کو لمبی مدت تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اگر آپ کے اندر انتظار کی طاقت نہیں ہے تو آپ کو اپنے لئے کسی پائدار کامیابی کی امید بھی نہیں رکھنا چاہئے۔ زندگی کا راز ایک لفظ میں یہ ہے ——— جتنا زیادہ انتظار اتنی ہی زیادہ ترقی۔

قومی زندگی کی " تعمیر " تھوڑے سے وقت میں بھی ہو سکتی ہے اور اس کے لئے زیادہ مدت بھی درکار ہوتی ہے۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ آپ کس قسم کی قومیت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اگر قوم کے اندر فوری جوش پیدا کرنا مقصود ہے۔ اگر محض منفی نوعیت کے کسی وقتی ابال کو آپ مقصد سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اگر عوامی نفسیات کو اپیل کرنے والے نعرے لگا کر تھوڑی دیر کے لئے ایک بھیڑ جمع کر لینے کو آپ کام سمجھتے ہیں۔ اگر جلسوں کی دھوم کا نام آپ کے نزدیک قوم کی تعمیر ہے تو اس قسم کی قومی تعمیر، اگر اتفاق سے اس کے حالات فراہم ہو گئے ہوں، آناً فاناً ہو سکتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ قوم کی تعمیر سے زیادہ قیادت کی تعمیر ہے۔ کیونکہ اس طرح کے شور و شر سے وقتی طور پر کچھ قائدین کو تو ضرور فائدہ ہو جاتا ہے۔ مگر انسانیت کے اس مجموعی تسلسل کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا جس کو قوم یا ملت کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اس قسم کے طریقے گویا ایک قسم کا استحصال ہیں۔ جن سے فائدہ اٹھا کر وقتی طور پر کچھ لوگ اپنی قیادت جما لیتے ہیں۔ یہ سستی لیڈری حاصل کرنے کا ایک کامیاب نسخہ ہے۔ جس کو سطحی قسم کے لوگ نادانی کی بنا پر یا ذاتی حوصلوں کی تکمیل کے لئے اختیار کرتے ہیں۔

اگر ہم واقعی ملت کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم شاہ بلوط کا درخت اگانے اٹھے ہیں نہ کہ ککڑی کی بیل جمانے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو لازمی طور پر لمبا منصوبہ چاہتا ہے۔ تھوڑی مدت میں اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی لیڈر ایسے نعرے لگاتا ہے تو وہ یا تو اس کی سادہ لوحی کی دلیل ہے یا اس کی استحصالی ذہنیت کی۔ اور اگر کوئی قوم ایسی ہے جو لمبے انتظار کے بغیر اپنی تعمیر و ترقی کا قلعہ بنا بنایا دیکھنا چاہتی ہے تو اس کو جان لینا چاہئے کہ ایسے قلعے صرف ذہنوں میں بنتے ہیں، عالم واقعہ میں نہیں۔

میں پڑھ کر پڑھاؤں گا

فادر ہنری ہراس (۱۹۵۶ - ۱۸۸۹) ایک اسپینی مسیحی تھے۔ وہ ۳۴ سال کی عمر میں ۱۸ نومبر ۱۹۲۲ کو بمبئی کے ساحل پر اترے۔ ہندستان کی زمین نے ان کو متاثر کیا۔ ان کو محسوس ہوا کہ ان کے تبلیغی حوصلہ کے لئے اس ملک میں کام کا اچھا میدان ہے۔ انھوں نے طے کر لیا کہ وہ یہاں رہ کر اپنا تبلیغی کام انجام دیں گے۔

مگر ہندستان ان کا وطن نہیں تھا۔ کام سے پہلے ضروری تھا کہ یہاں ان کے لئے قیام کی کوئی بنیاد ہو۔ یہاں اپنی جگہ بنا کر ہی وہ یہاں کی آبادی میں اپنے تبلیغی کام کو جاری رکھ سکتے تھے۔ انھوں نے طے کیا کہ ہندستان میں وہ بحیثیت معلم کے قیام کریں گے اور اس کے بعد کالج میں اور کالج کے باہر اپنے لئے کام کی تدبیر کریں گے۔ بمبئی کا ہراس انسٹی ٹیوٹ انھیں کی یادگار ہے۔

فادر ہراس (Fr. Henry Heras) چند دن بعد سینٹ زیویرس کالج بمبئی کے پرنسپل سے ملے۔ وہ ایک تاریخ داں تھے۔ انھوں نے اپنے ملک سے تاریخ میں ڈگری لی تھی۔ پرنسپل نے ان کے کاغذات دیکھ کر پوچھا: "آپ یہاں کون سی تاریخ پڑھانا پسند کریں گے" فادر ہراس نے فوراً جواب دیا "ہندستانی تاریخ" پرنسپل کا اگلا سوال تھا: ہندستانی تاریخ میں آپ کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "کچھ نہیں"۔ "پھر آپ کیسے ہندستانی تاریخ پڑھائیں گے" پرنسپل نے پوچھا۔ فادر ہراس کا جواب تھا: I shall study it.

میں ہندستانی تاریخ کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو تیار کروں گا۔ پھر اس کو پڑھاؤں گا۔

فادر ہراس جانتے تھے کہ معلمی کا کام وہ بطور پیشہ نہیں اختیار کر رہے ہیں کہ یورپ کی تاریخ یا جو مضمون بھی وہ چاہیں پڑھائیں اور مہینہ کے آخر میں تنخواہ لے کر مطمئن ہو جائیں۔ ان کے لئے معلمی کا کام ایک خاص مقصد کی خاطر تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ اپنے تبلیغی کام کے لئے مناسب بنیاد فراہم کریں اور اس مقصد کے اعتبار سے ان کے لئے "ہندستانی" تاریخ سب سے زیادہ موزوں مضمون تھا۔ وہ ہندستان میں تھے اس لئے ہندستانی تاریخ کے معلم بن کر وہ زیادہ بہتر طور پر یہاں کے نوجوانوں میں اپنے دین کی تبلیغ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندستان کی تاریخ سے ناآشنا ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے مضمون کے لئے ہندستانی تاریخ کو پسند کیا۔

انھوں نے ہندستانی تاریخ کے مطالعہ میں اتنی زیادہ محنت کی کہ وہ نہ صرف اس مضمون کے اچھے معلم بن گئے بلکہ ہندستانی تاریخ میں سر جدو ناتھ سرکار اور ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کے درجہ کے مورخ کی حیثیت حاصل کر لی۔

اسی خرچ سے

ایک عالم کا واقعہ ہے۔ ان کی زندگی ایک تصنیفی ادارہ میں گذری۔ وہ بہت سادہ طور پر رہتے تھے۔ اپنی مختصر آمدنی میں بھی وہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچت کر لیا کرتے تھے۔ ان کی صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کی انھوں نے شادی کی تو شادی میں کچھ خرچ نہیں کیا۔ ایک نوجوان سے سادہ طور پر نکاح پڑھایا اور اس کے بعد لڑکی کو رخصت کر دیا۔ البتہ انھوں نے رخصت کرتے ہوئے اپنی لڑکی اور داماد کو ایک چک دیا۔ یہ چک دس ہزار روپے کا تھا۔ انھوں نے کہا: یہی میری زندگی بھر کی بچت ہے جو بینک میں جمع تھی۔ اس رقم کو میں شادی کے رسوم میں بھی خرچ کر سکتا تھا۔ تاہم اس کے مقابلہ میں مجھے یہ زیادہ پسند آیا کہ میں اس کو نقد تم لوگوں کے حوالے کر دوں۔ تم لوگ اسے سنبھالو اور اس کو اپنی زندگی کی تعمیر میں استعمال کرو۔"

لڑکی اور داماد نے باہم مشورہ کیا تو ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اس رقم سے کوئی کاروبار شروع کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ابتدا میں ان کو کافی محنت کرنی پڑی۔ بعض اوقات بڑے سخت مراحل سامنے آئے۔ مگر وہ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے کاروبار پر جمے رہے۔ بالآخر حالات بدلنا شروع ہوئے۔ مذکورہ "دس ہزار" روپیہ میں برکت ہوئی اور وہ لوگ چند سال کے بعد کافی ترقی کر گئے۔ اب وہ اپنے مقام پر ایک باعزت اور خوش حال زندگی گذار رہے ہیں۔

شادی آدمی کی زندگی کا ایک بے حد سنجیدہ واقعہ ہے۔ وہ دھوم مچانے کا دن نہیں بلکہ زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس کرنے کا دن ہے۔ اس دن ایک مرد اور ایک عورت اپنے کو گاڑھے اقرار (نساء ۲۱) میں باندھتے ہیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ نکاح کی تقریب سادہ ہو، وہ فضول نمائشوں سے بالکل پاک ہو۔ اور اگر کسی کو خرچ ہی کرنا ہے تو اس خرچ کی ایک اچھی صورت وہ ہے جس کی مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

اگر ہمارے درمیان اس قسم کا رواج پڑ جائے تو شادی قومی تعمیر کے پروگرام کا ایک اہم جزء بن جائے۔ ہر خاندان میں نہایت خاموشی کے ساتھ ترقی کا سلسلہ چل پڑے۔ قوم کے اربوں روپے جو ہر سال چند دن کے تماشوں میں ضائع ہو جاتے ہیں، قوم کی تعمیر کا ایک مستحکم ذریعہ بن جائیں۔ وہ قومی اقتصادیات کے منصوبہ کا جزء بن جائیں۔ اور قوم اقتصادی حیثیت سے اوپر اٹھ جائے تو یہ صرف ایک اقتصادی واقعہ نہیں ہوگا بلکہ بے شمار پہلوؤں سے وہ قوم کی ترقی کے لئے مفید ہوگا ——— یہ ایک مزید فائدہ ہے مگر مزید خرچ کے بغیر۔

ناقابل توجیہ

انسانی دماغ اتنا زیادہ پیچیدہ ہے کہ بے شمار تحقیقات کے باوجود آج بھی ہم اس کے بارہ میں بہت کم جانتے ہیں۔ ایک محقق کے الفاظ میں، دماغ کے بارہ میں ہمارا علم جتنا بڑھتا ہے اتنا ہی زیادہ پتہ چلتا ہے کہ ہم کتنا کم جانتے ہیں اور ابھی کتنا زیادہ جاننا باقی ہے :

The more we know the more we realize how little we know and how much more we need to know.

تحقیقات بتاتی ہیں کہ آئن سٹائن جیسے عبقری انسان جنھوں نے بظاہر اپنی ذہنی صلاحیت کو آخری حد تک استعمال کیا، انھوں نے بھی حقیقۃً اپنے دماغ (Brain) کا بہت چھوٹا سا حصہ استعمال کیا۔ ان کے دماغ کا بیشتر حصہ غیر استعمال شدہ رہا، یہاں تک کہ ان کی موت آگئی۔ اس کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرت نے کیوں اور کیسے ارتقائی عمل کے ذریعہ اس معجزاتی چیز کو پیدا کیا جس کو دماغ کہا جاتا ہے :

Why and how then has nature produced through the evolutionary process this marvellous thing called the human brain.

کہا جاتا ہے کہ ضرورت اور استعمال سے چیزیں ترقی کرتی ہیں۔ مگر جو دماغ سرے سے استعمال ہی نہیں ہوا وہ کیسے وجود میں آیا۔ ڈارونزم کا کہنا ہے کہ جسمانی اعضاء اور دماغ پہلے سے پیدا شدہ موجود نہیں تھے۔ وہ حالات کے مقابلہ میں زندہ رہنے کی کوشش کے دوران وجود میں آئے ہیں :

The human organism, including the brain, has developed in response to the challenges it has faced in its effort to survive.

مگر سوال یہ ہے کہ دماغ کے جو حصے سرے سے کبھی استعمال ہی نہیں ہوئے وہ آخر کیسے وجود میں آکر ترقی کرنے لگے۔ جب "استعمال" چیزوں کا خالق ہے تو "عدم استعمال" نے کس طرح چیزوں کو پیدا کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر استعمال شدہ دماغ کا ہر انسان کے ساتھ پیدا ہونا اور مسلسل موجود رہنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ خارج سے انسان کو دئے جا رہے ہیں نہ کہ انسانی کوشش سے اس کو حاصل ہو رہے ہیں۔ غیر استعمالی دماغ کی موجودگی ڈارون کے اس نظریہ کی نفی کر رہی ہے کہ فطرت میں بقاء اصلح (Survival of the fittest) اور انتخابی طریق عمل (Selection process) پایا جاتا ہے۔

غلط تعارف

قرآن کی تعلیمات پر ہمارے ادارہ کی ایک انگریزی کتاب دارالسلطنت کے ایک انگریزی پریس میں چھپ رہی تھی۔ ہمارا آدمی ایک بار پریس گیا تو اس کے غیر مسلم مشین مین نے پوچھا: یہ کیسی کتاب ہے۔ آدمی نے بتایا کہ یہ قرآنی تعلیمات کے بارہ میں ہے۔ مشین مین نے دوبارہ کہا: پھر تو یہ مارکاٹ سکھانے والی کتاب ہوگی۔ کیوں کہ تمھارے قرآن میں یہی سب چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔

ایک مسلمان بزرگ نے اس واقعہ کو سنا تو فرمایا کہ یہ مس انڈرسٹینڈنگ ہے۔ میں نے کہا کہ یہ مس انڈرسٹینڈنگ نہیں بلکہ پراپر انڈرسٹینڈنگ ہے۔ قرآن بلاشبہہ مارکاٹ کی کتاب نہیں مگر ہم نے اپنے قول وعمل سے دنیا کے سامنے جس اسلام کا تعارف کرایا ہے وہ یہی ہے۔ اگر ایک غیر مسلم اسلام کے بارہ میں کتاب لکھے اور اس کا نام خنجر اسلام ([illegible] of Isl) رکھ دے تو مسلمان فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ مگر خود ان کے مشہور ترین اسلامی مفکر کا حال یہ ہے کہ وہ فخر کے ساتھ کہتا ہے:

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں — خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

ایسی حالت میں دوسرے لوگ کیا کریں۔ کیا وہ آپ کے الفاظ کو بدل کر اس طرح لکھ لیں:

پھولوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں — پھولوں کا گلستاں ہے قومی نشاں ہمارا

مسلمانوں میں جب بگاڑ آتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ ان کے اندر احساس فخر باقی رہتا ہے اور احساس ذمہ داری ان سے نکل جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ انھیں حق ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ مگر دوسروں کو ان پر تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ ہر خوبی کا مستحق اپنے کو سمجھ لیتے ہیں اور خرابی کا مستحق دوسروں کو۔

موجودہ زمانہ میں ایران اور پاکستان اپنے کو اسلام کا سب سے بڑا علم بردار بتاتے ہیں۔ ہمارے قائدین میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ "پاکستان اسلام کا قلعہ ہے" اور "ایران کا انقلاب خالص اسلامی انقلاب ہے"۔ مگر ان ملکوں میں اسلام کا جو سب سے بڑا عملی نمونہ دکھایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ لوگوں کو مارو، انھیں کوڑے لگاؤ، ان سے ان کی آزادیاں چھین لو، مفروضہ دشمنوں کے خلاف لامتناہی جنگ جاری رکھو۔ پھر دوسرے لوگوں سے آپ کیا امید رکھتے ہیں۔ کیا وہ ایسا کریں کہ اسلامی ملکوں سے آنے والی خبروں کو جب وہ پڑھیں تو اپنے ذہن میں اس کے معنی بدل لیا کریں۔ وہ گولی کو پھول کے معنی میں لے لیں اور کوڑے کو مصافحہ کرنے کے معنی میں۔

امتحان

ایک ایٹم بم نے ۱۹۴۵ میں ہیروشیما کے پورے شہر کو تباہ کر دیا تھا۔ اب ہیروشیما ٹائپ جیسے ایک ملین تباہ کن طاقت کے ہتھیار انسان کے قبضہ میں ہیں۔ گویا آج انسان اس پوزیشن میں ہے کہ دنیا کے تمام شہروں اور تمام قابل ذکر آبادیوں کو صرف چند دن میں تباہ و برباد کر دے۔

یہ ہتھیار کیا ہیں۔ وہ دراصل قدرت کے وسائل کا غلط استعمال (Misuse) ہیں۔ تلوار لوہے کا غلط استعمال ہے اور ایٹم بم نیوکلیر انرجی کا غلط استعمال۔

جن چیزوں سے ہتھیار بنائے جاتے ہیں وہ کروروں سال سے "نیچر" کے قبضہ میں تھے۔ مگر ان سے کوئی تباہی پیدا نہیں ہوئی۔ مگر یہ چیزیں جب انسان کے قبضہ میں آئیں تو وہ اچانک تباہ کن بن گئیں۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "نیچر" کو آزادی حاصل نہیں۔ جب کہ انسان آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ساری خرابیاں انسانی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں:

What philosophers call as 'problem of evil'
is simply a misuse of human freedom.

موجودہ زمانہ کا انقلاب "آزادئ انسانی کا انقلاب" کہا جاتا ہے۔ اب ہمیں ایک اور انقلاب "پابندئ انسانی کا انقلاب" لانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو سکے۔ انسان کو موجودہ دنیا میں آزادانہ انتخاب کا جو موقع ملا ہوا ہے وہ امتحان ہے نہ کہ انسان کا حق۔ انسان اگر اپنے انتخاب (Choice) کو صحیح رخ پر استعمال کرے گا تو وہ کامیاب ہوگا اور اگر وہ اس کو غلط رخ پر استعمال کرے گا تو اس کے لئے ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔

نیچر کے کنٹرول کی صورت میں وسائل کا درست رہنا اور انسان کے کنٹرول کی صورت میں بگاڑ آجانا بتاتا ہے کہ دنیا کے نظام کو درست رکھنے کی صحیح تدبیر کیا ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ انسان کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ بھی ان وسائل کا اسی طریقہ سے استعمال کرے جس طریقہ سے نیچر ان کو استعمال کرتی ہے۔ نیچر کے نمونہ کو انسانی زندگی میں قائم کرنا ہی اصل کام ہے، فرد کے لئے بھی اور سماج کے لئے بھی۔

حقیقت پسندی

باغ لگانے کا کام "باغ کانفرنس" سے شروع نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ ایک ایک پودے کو وہ حالات فراہم کئے جائیں جن میں وہ اپنی ذاتی اپجا ؤکی صلاحیت کو بروئے کار لائے اور درخت کی صورت میں ترقی کرکے باغ کے مجموعہ کا جزء بن جائے۔

یہی طریقہ ملت کی تعمیر کا بھی ہے۔ ملت کی تعمیر دراصل افراد کی تعمیر کا نام ہے۔ ایک ایک فرد کو باشعور بنانا، ایک ایک فرد کی چھپی ہوئی فطری صلاحیتوں کو بیدار کرکے اس کو حقیقی انسان کے درجہ پر پہنچانا، ایک ایک فرد کے اندر یہ احساس پیدا کرنا کہ وہ دوسرے بھائیوں کے لئے مسئلہ بنے بغیر اپنے ترقیاتی امکانات کو ظہور میں لانے کی جدوجہد کرے۔ اسی قسم کے عمل کا نام ملت کی تعمیر ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ بے فائدہ شور وغل ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی کے لئے بے روک ٹوک مواقع کھلے ہوئے ہوں اور میدان میں اس کا کوئی حریف موجود نہ ہو۔ ایسا نہ کبھی اس زمین پر کسی کے لئے ہوا اور نہ آج کسی کے لئے ایسا ہو سکتا ہے۔ زندگی حقیقۃً رکاوٹوں کے درمیان سے اپنے لئے راستہ نکالنے کا نام ہے نہ کہ رکاوٹوں کی غیر موجودگی میں بے خوف وخطر دوڑنے کا۔

تاریخ کا مطالعہ جس طرح یہ بتاتا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کا آغاز ہمیشہ رکاوٹوں اور مشکلوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے، اسی طرح تاریخ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ رکاوٹیں خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں، ہمیشہ آدمی کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ کھلا ہوتا ہے جس سے چل کر وہ اپنی منزل پر پہنچ سکے۔ مگر یہ راستہ انھیں لوگوں کے لئے ہے جو راستہ کے بند مقامات پر سر نہ ٹکرائیں بلکہ دوسرے گوشوں میں اپنے لئے کوئی "درہ" تلاش کرکے آگے بڑھ جائیں۔

پھر تاریخ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ حادثہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو، اس کی تلافی کی صورت بھی انسان کے لئے ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی آفت یا حادثہ انسان کے لئے اس امکان کو ختم نہیں کرتا کہ وہ دوبارہ زیادہ بہتر منصوبہ کے ساتھ اپنے عمل کا آغاز کرے اور کھوئی ہوئی چیز کو دوبارہ نئے انداز سے حاصل کرلے۔

جو کچھ کسی دوسرے انسان کے پاس ہے وہی آپ بھی حاصل کرسکتے ہیں بشرطیکہ آپ اس راز کو جان لیں کہ اس دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے حقیقت پسندانہ جدوجہد سے ملتا ہے نہ تمناؤں اور خوش خیالیوں سے۔

نماز ابدی فلاح کا ربانی نسخہ ہے۔ مگر نماز پڑھنے والے اس کو رسمی پرستش سمجھتے ہیں اور نماز نہ پڑھنے والے اس کو رسمی بوجھ خیال کرتے ہیں ۔۔۔

نماز کی ادائگی میں کوتاہ ہونا بے عملی ہے اور نماز کے حکم کو بدلنا سرکشی

نماز کا اصل مقصد اللہ کی یاد ہے۔ مگر اس کا نظام اتنی حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ زندگی کے تمام تقاضے نہایت جامعیت کے ساتھ اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ نماز اتحاد اور اجتماعیت کا سبق ہے ۔ وہ بندے کو اپنے رب سے جوڑتی ہے۔ وہ ہمارے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے ۔ وہ ہمارے اوقات کو منظم کرتی ہے۔ وہ ہلکی جسمانی ورزش کا فائدہ دیتی ہے۔ وہ باربار ہماری صفائی کرتی رہتی ہے، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز ہر قسم کی روحانی اور جسمانی برکتوں کا مجموعہ ہے۔ مسلمان اگر حقیقی شعور کے ساتھ نماز پر قائم ہو جائیں تو ان کی دنیا بدل جائے اور وہی ان کے تمام مسائل کے حل کے لئے کافی ہو جائے۔

فرض نمازوں کا پانچ ہونا روایات سے بتواتر ثابت ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور دوسری کتب حدیث میں کثرت سے ایسی روایات ہیں جن میں الصلوات الخمس کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں جو مخصوص اوقات میں مقرر کی گئی ہیں۔ تاہم قرآن میں نماز کی بے حد تاکید کے باوجود "پانچ" کا لفظ نہیں آیا ہے۔ اس سے کچھ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ فرض نمازوں کی تعداد پانچ نہیں ہے بلکہ تین یا اس سے کم ہے۔ وہ اولاً حدیث کی حجیت کا انکار کر دیتے ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ قرآن کے مطابق پانچ وقت نماز ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر یہ محض دھوکا ہے۔ اگر کوئی شخص سنجیدہ ہو اور فی الواقع مسئلہ کو سمجھنا چاہتا ہو تو قرآن سے بھی بلا اشتباہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں اور مقررہ وقت پر ان کی ادائگی ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

اس سلسلے میں قرآن کی حسب ذیل آیت پر غور کیجئے۔

حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ (بقرہ ۲۳۸) پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی

جملہ کی ترکیب بتا رہی ہے کہ اس آیت میں صلوٰۃ وسطیٰ کا لفظ جس نماز کے لئے آیا ہے وہ صلوات سے علیحدہ نماز ہے۔ یعنی یہ کہا گیا ہے کہ "نمازوں" کی پابندی کرو اور اسی کے ساتھ اس نماز کی جس کا وقت "نمازوں" کے بیچ میں آتا ہے۔ صلوات جمع کا لفظ ہے جو عربی قواعد کے مطابق کم از کم تین نمازوں کے لئے ہے۔ مگر استعمال بتاتا ہے

کہ یہاں اس سے تین سے زیادہ نمازیں مراد لینا ضروری ہے۔ کیوں کہ تین کے عدد میں کوئی چوتھی چیز رکھی جائے تو وہ اس کا "بیچ" نہیں بن سکتی۔ کم سے کم عدد جو یہاں صلوات سے مراد ہو سکتا ہے وہ چار ہے۔ چار کا عدد لینے کی صورت ہی میں یہ ممکن ہے کہ ایک اور نماز اس میں اس طرح شامل کی جائے کہ وہ اس کا بیچ بن جائے۔ گویا صلوٰۃ وسطیٰ وہ بیچ کی نماز ہے جس کے دونوں طرف دو دو نمازیں ہیں۔ باعتبار مفہوم آیت کا ترجمہ یہ ہوگا ——————

"بیچ کی نماز کی پابندی کرو۔ اور بیچ کی نماز سے پہلے دو نمازوں کی اور بیچ کی نماز کے بعد دو نمازوں کی۔" اس سے صاف طور پر یہ نظام معلوم ہوتا ہے کہ رات میں دو نمازیں مقرر کی گئی ہیں اور پھر دن میں دو نمازیں۔ اور ان کے بیچ میں ایک نماز ہے۔ رات کی دو نمازوں سے مراد مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں۔ دن کی دو نمازوں سے مراد فجر اور ظہر اور بیچ کی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اس طرح کل پانچ نمازیں ہو جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو نقشۂ ذیل:

پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو اس نماز کی جو نمازوں کے بیچ میں ہے (قرآن)

پھر یہ بات بھی قرآن میں بالکل واضح ہے کہ نماز اہل ایمان پر معین اوقات کے ساتھ فرض کی گئی ہے (ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا، نساء ۱۰۳) اس سلسلے میں جو پانچ اوقات حدیث سے معلوم ہوتے ہیں، ٹھیک وہی اوقات خود قرآن سے بھی ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

۱۔ سورج نکلنے سے پہلے	(قبل طلوع الشمس ، طٰہٰ ۱۳۰)	فجر
۲۔ دوپہر ڈھلنے کے وقت	(لدلوک الشمس ، بنی اسرائیل ۷۸)	ظہر
۳۔ غروب آفتاب سے پہلے	(وقبل غروبہا ، طٰہٰ ۱۳۰)	عصر
۴۔ جب شام ہوتی ہے	حین تمسون ، روم ۱۷)	مغرب
۵۔ جب رات تاریک ہو جائے	(الی غسق اللیل ، بنی اسرائیل ۷۸)	عشاء

اس طرح قرآن سے پانچ نمازیں مع تعیین اوقات ثابت ہو جاتی ہیں۔

اوپر جو باتیں عرض کی گئیں، وہ ایسے شخص کے لئے بالکل کافی ہیں جو حقیقۃً بات کو سمجھنا چاہتا ہو اور اس بات کی تمنا رکھتا ہو کہ جب وہ اللہ کے یہاں پہنچے تو اللہ اس سے راضی ہو جائے۔ مگر جو لوگ بحث وجدال کی سطح پر ہیں ان کو کسی بھی دلیل سے چپ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اسی وقت چپ ہوں گے جب کہ اللہ اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے اور ان سے بولنے کی مہلت چھین لے۔

عظیم خاموشی

ویگا (Vega) ایک ستارہ ہے جو زمین سے ۲۶ سال نور کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حال میں دریافت ہوا ہے کہ اس کے گرد سیارے بن رہے ہیں۔ یہ دریافت سائنس دانوں کے لئے بے حد دلچسپی کی چیز ہے کیوں کہ اس سے ان کے اس نظریہ کی بالواسطہ تصدیق ہوتی ہے کہ " زمین " سیاراتی نظام کا ایک ارتقائی مرحلہ ہے۔

مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ دوسرا اس سے بڑا سوال یہ ہے کہ علما رفلکیات کے نزدیک اکثر تاروں کے گرد سیارے (Planets) ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۵۰۰۰۰ ملین سورج (تارے) کے گرد ایسے سیارے موجود ہیں جن کی عمر ہماری زمین سے دگنا ہے۔ مذکورہ نظریہ کے مطابق ان سیاروں پر اعلیٰ ترقی یافتہ مشینی تہذیب (Super-advanced technological civilisation) پائی جانی چاہیئے۔ جب کہ یہ سیارے چٹانوں اور گیس اور گرد کے سوا کچھ نہیں۔

انتہائی طاقت ور دوربینوں سے کائنات میں بہت دور تک نہایت توجہ سے مشاہدہ کیا گیا ہے۔ مخصوص ریڈیو کے ذریعہ کائناتی تہذیبوں کے سگنل سننے کی کوشش بہت بڑے پیمانہ پر کی گئی ہے۔ مگر اب تک زمین کے سوا کسی اور سیارہ پر کسی تہذیب کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ پروفیسر گلن ڈیوڈ برن (Glen David Brin) نے اس سلسلہ میں ایک مقالہ شائع کیا ہے جس میں وہ اس صورت حال کو عظیم خاموشی (Great Silence) سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس موضوع پر موجودہ زمانہ میں بے پناہ سرمایہ خرچ کیا گیا ہے۔ نہایت اعلیٰ دماغ اس کی تحقیق میں مسلسل لگے ہوئے ہیں۔ مگر ابھی تک ادنیٰ درجہ میں بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ چنانچہ اب سائنس داں اس سوال سے دوچار ہیں کہ کیا ہم اس کہکشاں میں اکیلے ہیں،

Are we alone in the galaxy.

دوسرے سیاروں پر تہذیب نہ ہونے کے بارہ میں مختلف قیاسی توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ ایک زیادہ عام توجیہہ یہ ہے کہ تہذیبیں جب جوہری ہتھیاروں کی دریافت تک پہنچتی ہیں تو خود اپنے آپ کو فنا کر لیتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض مفروضہ ہے۔ کیوں کہ اب تک مختلف کہکشاؤں میں سے کسی کہکشاں میں حال یا ماضی کی کسی جوہری جنگ کا سراغ نہیں ملا (ہندستان ٹائمس ۲۰ ستمبر ۱۹۸۳)

زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں پر اعلیٰ تہذیب کی تلاش در اصل کائناتی توجیہہ کی تلاش ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مذہبی خدا کے بجائے سائنسی خدا کی تلاش ہے۔ اس قسم کی تلاش ہمیشہ "عظیم خاموشی" ہی پر ختم ہوگی۔ کیوں کہ وہاں خاموشی کے سوا اور کوئی چیز موجود نہیں۔

تہذیب انسانی کا راز یا کائنات کی توجیہہ انسان اور کائنات کے خالق نے پیغمبروں پر الہام کیا ہے۔ اور پیغمبر کے کلام ہی میں ہم اس کا صحیح جواب پا سکتے ہیں۔ اس کے سوا جہاں بھی اس کو تلاش کیا جائے گا وہ صرف وقت اور قوت کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

کائناتی واقعات کی توجیہہ کی تلاش خود یہ ثابت کرتی ہے کہ جو واقعات ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں وہ بذات خود اپنی توجیہہ کے لئے کافی نہیں۔ کائناتی واقعات کی توجیہہ کے لئے ہمیں ان واقعات کے ماورا کوئی چیز درکار ہے۔ کسی ماوراچیز کی دریافت کئے بغیر معلوم واقعات ہمارے لئے غیر توجیہہ شدہ بنے رہیں گے۔

اس کے ساتھ اس دوسری حقیقت کو ملا لیجئے کہ ہزاروں سال کی فلسفیانہ تلاش کے باوجود آج تک اس توجیہہ کی دریافت نہ ہو سکی۔ اس سے یہ قرینہ حاصل ہوتا ہے کہ فلسفیانہ یا غیر مذہبی نوعیت کی توجیہہ یہاں سرے سے موجود ہی نہیں۔

اب ہمارے لئے دوسرا بدل صرف مذہبی یا پیغمبرانہ توجیہہ کا رہ جاتا ہے۔ پیغمبر پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک زندہ خالق ہے جس نے اپنے ذاتی ارادہ اور شعور کے تحت اس کو پیدا کیا ہے اور وہی اپنے ارادے کے تحت اس کو چلا رہا ہے۔

پیغمبروں کے اس بیان کو جب کائنات کے معلوم واقعات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو تمام واقعات خاموش زبان میں اس کی تصدیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک زندہ کائنات کی توجیہہ ایک زندہ حقیقت ہی ہو سکتی ہے۔ اور یہی واقعہ پیغمبروں کے بیان کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں "عظیم خاموشی" نہیں بلکہ عظیم پکار ہے۔ مگر اس عظیم پکار کو وہی سن سکتا ہے جو اپنے سر کے ساتھ کان رکھتا ہو۔ چاند کو روشن کرنے کے سورج چاہئے۔ اسی طرح سورج کو روشن کرنے کے لئے ایک عظیم تر سورج درکار ہے۔ بارش کو برسانے کے لئے سمندر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح سمندر کا وجود تقاضا کرتا ہے کہ یہاں ایک اور بڑا سمندر ہو۔ یہ واقعات جس کو دلیل نظر نہ آئیں اس کو اپنی عقل پر شبہہ کرنا چاہئے نہ کہ خدا پر۔

مارکسی اشتراکیت

انسان اپنے آپ کو ایک وسیع اور عظیم کائنات میں پاتا ہے جس کا وہ بے حد حقیر حصہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کائنات سے الگ نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ اپنے بارہ میں اس سے الگ ہو کر سوچ بھی نہیں سکتا۔ قدرتی طور پر انسان یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے اور کائنات کے درمیان تعلق کو دریافت کرے۔ وہ کائنات سے اپنا صحیح رشتہ قائم کرے۔ تاہم انسان اکثر اس رشتہ کو دریافت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ انسان کی تمام گمراہیاں دراصل اسی عدم دریافت کا دوسرا نام ہیں۔

شرک کیا ہے۔ شرک یہ ہے کہ کائناتی مظاہر کو خدا کا مختلف روپ فرض کر لیا جائے اور یہ یقین کر لیا جائے کہ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ ان کو پوجتا رہے۔ انسان اور کائنات دونوں خدا کی مخلوق ہیں مگر شرک یہ کرتا ہے کہ انسان کو عابد کے مقام پر رکھ دیتا ہے اور کائنات کو معبود کے مقام پر۔

مارکس کی غلطی بھی ایک اعتبار سے اسی نوعیت کی ہے۔ مارکس نے یہ فرض کیا کہ انسان اور بقیہ کائنات دونوں ایک ہی مجموعہ کے مختلف اجزاء ہیں۔ جس طرح مٹی اور پانی دونوں ایک ہی قانون طبیعی کے تابع ہیں، اسی طرح انسان اور کائنات بھی ایک ہی قانون مادی کے تابع ہیں۔ جو قانون مادی دنیا میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ وہی قانون انسانی سماج میں بھی تغیر پیدا کرتا ہے۔

یہ مارکسی فکر کی بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے اس کا پورا نظام فکر غلط ہو کر رہ گیا۔ اس نے انسان کو محض مادی روپ میں دیکھا اور انسان اور کائنات کے درمیان ویسا ہی تعلق قائم کیا جیسا تعلق مٹی کے قوانین اور پانی کے قوانین کے درمیان ہوتا ہے۔ مارکس نے انسان کو کائناتی قوانین کا بے اختیارانہ معمول سمجھ لیا۔ حالانکہ کائنات انسان کے اختیارانہ عمل کا ماڈل ہے نہ کہ انسان کی بے اختیاری کی توسیع۔

کارل مارکس کی زندگی کے دو دور ہیں۔ پہلے دور کے مارکس کو انسانیت دوست مارکس (Humanist Marx) کہہ سکتے ہیں اور دوسرے دور کے مارکس کو اس کے اپنے الفاظ میں سائنٹفک مارکس (Scientific Marx) ۔

مارکس جرمنی میں اس وقت پیدا ہوا جب کہ وہاں صنعتی انقلاب آچکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو لوٹ رہا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنی حرص اور جارحیت کا نشانہ بناتا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ وہ ان لوگوں کا حامی بن گیا جو اس زمانہ کے جرمنی اور فرانس اور برطانیہ میں سوشلزم کے اصول پر بہتر سماج کی تعمیر کی باتیں کرتے تھے۔

تاہم جلد ہی مارکس کو یہ احساس ہوا کہ سوشلسٹوں کے پاس اخلاقی اپیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور محض اخلاقی اپیل کے ذریعہ بہتر سماج کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اپنے بعد کے دور میں اس نے اس قسم کے سوشلزم کو خیالی سوشلزم (Utopian Socialism) کا نام دیا۔ اس کے بجائے وہ سائنٹفک سوشلزم کا حامی بن گیا جس کو اب عام طور پر کمیونزم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

خیالی سوشلزم کے علم بر داروں کا کہنا تھا کہ بنیادی معاشی سرگرمیاں حکومت کے قبضہ یا کنٹرول میں رہنی چاہئیں تاکہ وہ عمومی انصاف کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی تنظیم کرے۔ مگر مارکس نے کہا کہ اصل مسئلہ حکومت کے کنٹرول یا نگرانی کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ سماج " میں تمام انسان اپنی غرض اور ذاتی مفاد کے تحت جیتے ہیں۔ جب تک لوگوں کے اندر ذاتی مفاد کا ذہن ختم نہ ہو، بہتر انسانی سماج کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

مارکس نے اپنے طویل مطالعہ کے بعد یہ " دریافت " کیا کہ انسان کا مزاج اور اس کی عادتیں تقسیم اور تبادلہ کے اس نظام کے مطابق بنتی ہیں جو کسی سماج میں رائج ہو۔ مفاد پرستی کا موجودہ مزاج اس لئے ہے کہ سماج کے اندر تقسیم اور تبادلہ کا سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے۔ اگر اس کو بدل کر سماج میں تقسیم اور تبادلہ کا اشتراکی نظام رائج کر دیا جائے تو انسانوں کا مزاج بھی بدل جائے گا۔

اس اعتبار سے مارکس نے انسانی سماج کے تین دور قرار دئے۔

مارکس کے نزدیک انسانی سماج ایک ترقی پذیر حقیقت ہے۔ وہ خود اپنے اندرونی قانون کے تحت ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس سفر کے مطابق انسانی سماج کے تین درجے ہیں۔

سرمایہ دارانہ سماج (Capitalist society)

سوشلسٹ سماج (Socialist society)

کمیونسٹ سماج (Communist society)

مارکس کے نزدیک یہ تینوں قسم کے سماج معاشی اسباب کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔

انسانی سماج کو قائم رکھنے کے لئے بہت سی مادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہ چیزیں سماج کے تمام لوگ مل جل کر تیار کرتے ہیں۔ کوئی شخص ایک کام کرتا ہے اور کوئی دوسرا کام۔ مگر کسی آدمی کی ضرورت صرف وہی ایک چیز نہیں ہوتی جو اس نے خود بنائی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے لئے اس کے سوا بہت سی دوسری چیزوں کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ ہر آدمی اپنی پیداوار کا ایک

حصہ دوسرے کو دے کر اس سے وہ چیز حاصل کرے جس کو وہ خود نہیں بنا سکا تھا۔ اس طرح سماج کے مختلف افراد میں باہمی لین دین وجود میں آتا ہے۔ اور اسی لین دین سے وہ اجتماعی زندگی پیدا ہوتی ہے جس کو سماج کہا جاتا ہے۔ مارکس کے نزدیک سماج اس کے سوا کسی چیز کا نام نہیں کہ وہ باہمی لین دین کی اجتماعی تشکیل ہے۔

مارکسی نقطۂ نظر کے مطابق، کسی سماج کے بارے میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ ترقی کے کس مرتبہ پر ہے، یہ دیکھنا چاہیے کہ وہاں لین دین کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک اس لین دین کی تین صورتیں ہیں:

قدر تبادلہ (Exchange value)

قدر اصل (Intrinsic value)

قدر استعمال (Use value)

قدر تبادلہ کسی چیز کی وہ قیمت ہے جو سپلائی اور مانگ کے دوطرفہ تقاضوں سے متعین ہوتی ہے چونکہ مختلف اسباب سے کبھی بازار میں چیز زیادہ ہوتی ہے اور مانگ کم اور کبھی چیز کم ہوتی ہے اور مانگ زیادہ۔ اس بنا پر قدر تبادلہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ ایک ہی چیز کبھی کم قیمت پر ملتی ہے اور کبھی زیادہ قیمت پر۔ جس سماج میں چیزوں کا لین دین قدر تبادلہ کے اعتبار سے ہو وہ مارکس کی نظر میں سرمایہ دارانہ سماج ہے۔

قدر اصل کسی چیز کی وہ واقعی قیمت ہے جو انسانی محنت کی بنا پر اس کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ مارکس کے تجزیہ کے مطابق چوں کہ کسی چیز کا خام مادہ ہمیشہ یکساں قیمت کا ہوتا ہے اور اسی طرح وہ انسانی محنت بھی یکساں ہوتی ہے جو خام مادہ کو بنی ہوئی چیز میں ڈھالنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ اس بنا پر ہر چیز اپنی قدر اصل کے اعتبار سے ایک ہی قیمت رکھتی ہے۔ باعتبار حقیقت، اس میں نہ کمی کا امکان ہے نہ زیادتی کا۔ جس سماج کا نظام تبادلہ قدر اصل کی بنیاد پر قائم ہو اس کو مارکس سوشلسٹ سماج کہتا ہے۔

قدر استعمال کسی چیز کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسان کی ایک ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ مارکس کے نزدیک ارتقا یافتہ انسانی سماج ایسا ہی ہوگا۔ یہی وہ سماج ہے جس کو مارکس کمیونسٹ سماج کہتا ہے۔

اگر کسی سماج میں جنس کی صرف قدر استعمال دیکھی جانے لگے تو وہاں جنس کی قدر تبادلہ اور قدر اصل دونوں ختم ہو چکے ہوں گے۔ ایسے سماج میں افراد چیزوں کو اپنی استعمالی قیمت کے اعتبار سے دیکھیں گے نہ کہ ان کی اصلی قیمت یا تبادلی قیمت کے اعتبار سے۔ ایسے سماج میں انسان عین اس طرح چیزوں کا تبادلہ

کریں گے جس طرح دو چھوٹے بچے آپس میں چیزوں کو بدل لیتے ہیں۔ مثلاً ایک بچے کے پاس ضرورت سے زائد ایک نارنگی ہے اور دوسرے کے پاس ضرورت سے زائد گاڑی۔ نارنگی والا بچہ گاڑی چاہتا ہے اور گاڑی والا بچہ نارنگی۔ چنانچہ یہ دونوں بچے بے نیازانہ طور پر آپس میں تبادلہ کرلیں گے۔ اس مثال میں دونوں بچوں کے سامنے نارنگی اور گاڑی کی صرف قدر استعمال ہے۔ اگر یہ بچے قدر اصل اور قدر تبادلہ کو دیکھتے تو معاملہ مختلف ہوتا۔ پھر یہ ہوتا کہ جس بچے کے پاس گاڑی تھی وہ یہ مطالبہ کرتا کہ چار درجن نارنگیاں لاؤ تب میں تم کو گاڑی دوں گا۔ جس سماج میں جنس کو صرف قدر استعمال کے اعتبار سے دیکھا جائے اس سماج میں اشیاء کا تبادلہ اس طرح ہوگا جیساکہ مذکورہ بچوں نے کرلیا۔ مارکس کے نزدیک ان بچوں اور کمیونسٹ سماج کے تبادلہ اجناس میں صرف یہ فرق ہے کہ بچوں نے یہ تبادلہ غیر شعوری طور پر کیا جب کہ کمیونسٹ سماج میں ایک خاص اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی ماحول میں یہ تبادلہ شعوری طور پر ہوگا۔

سماج کی ان تینوں قسموں کی تشریح دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ جس سماج میں چیزوں کا لین دین نفع کی غرض سے ہو وہ سرمایہ دارانہ سماج ہے۔ جس سماج میں کوئی شخص کسی سے نفع کا طالب نہ ہو اور ہر شخص کو اس کی محنت کے بقدر پورا معاوضہ ملے وہ سوشلسٹ سماج ہے۔ اور جہاں آدمی ان دونوں چیزوں سے بلند ہو جائے، جہاں نہ تو ایسا ہو کہ آدمی ایک دوسرے سے نفع حاصل کرنا چاہے، نہ یہی ضروری ہو کہ کوئی شخص جتنا کرے اتنا ہی وہ اپنے لئے پائے۔ بلکہ ہر شخص کو کسی رکاوٹ کے بغیر اس کی ضرورت کی چیزیں حسب خواہش اس طرح ملتی رہیں جیسے آج ہوا اور پانی مل رہے ہیں۔ یہی آخری سماج کمیونسٹ سماج ہے جو مارکس کے تجزیہ کے مطابق انسانی سماج کے ارتقاء کی بلند ترین منزل ہے۔ یہ ایسا سماجی نظام ہے جس میں چیزوں کی صرف قدر استعمال دیکھی جائے گی اور اسی نقطۂ نظر سے افراد مختلف جنسوں کا آپس میں تبادلہ کریں گے۔ ایک چیز کے بدلے دوسری چیز لیتے ہوئے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کس نے کتنی محنت خرچ کی ہے اور اس کو اپنی محنت کا کتنا معاوضہ مل رہا ہے۔ تمام تبادلے صرف استعمالی ضرورت کے پیش نظر ہوں گے نہ کہ نفع طلبی یا معاوضۂ خدمت کے طور پر۔

ابنزر الیٹ (Ebenezer Elliot) نے کمیونسٹ کی تعریف ان لفظوں میں کی تھی —— کمیونسٹ کون ہے۔ کمیونسٹ وہ ہے جو غیر مساوی کمائی کی مساوی تقسیم چاہتا ہے:

What is a communist ? One who hath yearnings
For equal division of unequal earnings.

روس میں کمیونسٹ انقلاب ۱۹۱۷ میں پیش آیا۔ اس کا مطلب یہ ہے روس میں کمیونسٹ سماج کی

تعمیر پر اب جلد ہی ستر سال پورے ہو جائیں گے۔ کمیونسٹ پارٹی نے روس کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں ذاتی ملکیت کے تمام اداروں کو افراد کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اور وہ کوشش شروع کر دی جس کو اسٹالن نے سوویت انسان (Soviet Man) کی تعمیر کا نام دیا تھا۔ مگر ایک منظم اور ہمہ گیر ریاست کی طویل کوشش کے باوجود ابھی تک سوویت انسان وجود میں نہیں آیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ روس کے کمیونسٹ لیڈروں کو روس میں آزادانہ انتخاب کرانے کی ہمت نہیں۔ کیوں کہ انھیں یقین ہے اگر انھوں نے آزادانہ انتخاب کرایا تو روسی عوام ۹۹ فی صد ووٹ ان کے خلاف دے کر ان کے اقتدار کا تختہ الٹ دیں گے۔

روس کے کمیونسٹ لیڈروں نے قدر تبادلہ (Exchange value) پر مبنی معاشی نظام کو بے رحمی کے ساتھ توڑ دیا اور طاقت کے زور پر یہ کوشش شروع کر دی کہ قدر اصل (Intrinsic value) کی بنیاد پر سماج کی تشکیل ہو سکے۔ اور اس کے بعد قدر استعمال (Use value) کی بنیاد پر تشکیل پانے والے سماج کی طرف سفر شروع ہو۔ مگر ناقابل بیان مظالم کے باوجود پہلا مرحلہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ اور دوسرے مرحلہ کے سماج کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

جن چیزوں کو مارکس نے " سرمایہ دارانہ سماج" کا نتیجہ قرار دیا تھا وہ سب آج اشتراکی روس کے اندر موجود ہیں۔ روسی حکومت مسلسل ایسے شہریوں کا اعلان کرتی رہتی ہے جو کام چوری، غبن، جاسوسی، غداری اور رجعت پسندی جیسے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اگر اشتراکی سماج میں مارکس کے مزعومہ نتائج نکلتے ہوں تو اشتراکی سماج میں ستر سال بعد بھی لوگوں کا یہ حال کیوں ہے۔

ایک کتاب میں راقم الحروف نے ایک قصہ پڑھا جو مندرجہ ذیل الفاظ میں درج تھا۔

A communist deputy approached a conservative member of the French Senate and showed to him a special edition of the works of Karl Marx, printed in Braille. "These are for the blind." He explained. "Monsieur," replied the Senator, "All the works of Marx are for the blind."

ایک اشتراکی ڈپٹی فرانس کی پارلیمنٹ کے ایک قدامت پسند ممبر سے ملا اور اس کو کارل مارکس کی تحریروں کا ایک خصوصی اڈیشن دکھایا جو بریل طریقہ پر چھپا ہوا تھا۔ اشتراکی نے کہا کہ یہ اڈیشن اندھوں کے لئے ہے۔ فرانسیسی نے جواب دیا۔ جناب، مارکس کی تمام تحریریں اندھوں ہی کے لئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مارکس کے نظریہ پر وہی ایمان لا سکتا ہے جو اندھے پن کی وجہ سے حق اور ناحق کو نہ جانے۔ آنکھ والا آدمی تو اس کی لغویت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مارکس نے اپنے نقطۂ نظر کو سائنس کے نام پر پیش کیا تھا۔ مگر یہ خوش خیالی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مارکسزم محض ایک خیالی فلسفہ تھا جو علم اور منطق کی میزان پر ایک دن بھی پورا نہ اتر سکا۔ چنانچہ مارکس کے جلد ہی بعد مارکس کے فلسفہ میں نظرِ ثانی (Rivisionism) کی تحریک چل پڑی جو مسلسل جاری رہی۔ نظرِ ثانی کی تحریک اصل مارکسزم میں اتنی تبدیلی پیدا کر چکی ہے کہ سڈنی ہک (Sidney Hook) نے بجا طور پر جدید مارکسزم کو مارکس کی آمدِ ثانی (Marx's Second Coming) کا نام دیا ہے۔ اپنی غیر عملیت کی وجہ سے ایک مبصر کے الفاظ میں کارل مارکس اب پرولتاریوں (Proletariat) کا نہیں بلکہ پروفیسروں (Professoriat) کا چیمپین بن چکا ہے (TOI, 15-1-1984)

ایوجین کینِنکا (Eugene Keninka) نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ ایک متعین اصول جس کو مارکسزم کہا جا سکے کہیں موجود ہے:

If there is a coherent doctrine called Marxism.

کمیونزم آج اپنے نظریہ کی بنیاد پر کہیں موجود نہیں وہ صرف اس لئے موجود ہے کہ اس کے نام پر ایک طاقتور ریاست قائم ہے اور بہت سے مفادات اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں۔ اب لوگ نظری صداقت کی بنا پر نہیں بلکہ جبر یا مفاد کی بنا پر کمیونسٹ بنے ہوئے ہیں۔ اسی بنا پر ایک مبصر نے کہا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ آدمی کمیونسٹ ہو حالانکہ وہ مارکسسٹ نہ ہو:

It is possible to be a communist without being a Marxist.

کمیونسٹ ملکوں میں چوں کہ اظہارِ خیال کی آزادی نہیں ہے۔ اس لئے وہاں کے عوام اپنے احساسات کو لطیفوں کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ ہندستان کا ایک شخص مشرقی (کمیونسٹ) یورپ کے دورہ پر گیا۔ واپس آکر اس نے اپنے سفر کے جو تاثرات بیان کئے ان میں سے ایک قصہ یہ بھی تھا جس کو اس نے وہاں کی نجی ملاقاتوں میں سنا:

> One morning a school girl came to her teacher and said very proudly: "Our cat has had a litter of six kittens and they are all Communists." The teacher was impressed with the child and invited the Inspector to visit the school and see for himself how well-doctrinated her students were. A week later the inspector arrived. "Tell the gentleman about your cats," the teacher asked her student. "She has had six kittens and they are all democrats," said the girl. "What !" exclaimed the teacher aghast and let down, say now they are democrats ?" "Since then their eyes have opened," replied the student.

ایک صبح کو ایک اسکول کی لڑکی اپنی ٹیچر کے پاس آئی۔ اس نے فخریہ انداز میں کہا کہ ہماری بلی نے چھ

بچے دیے ہیں۔ اور وہ سب کے سب کمیونسٹ ہیں۔ ٹیچر لڑکی کی بات سے بہت متاثر ہوئی۔ اس نے انسپکٹر کو دعوت دی کہ وہ آئے اور خود دیکھے کہ اس کے طلبہ کس قدر تربیت یافتہ ہیں۔ ایک ہفتہ کے بعد انسپکٹر آیا۔ ٹیچر نے لڑکی کو بلایا اور کہا کہ ان صاحب سے اپنی بلی کے بارہ میں بتاؤ۔ لڑکی نے کہا کہ ہماری بلی نے چھ بچے دئے تھے اور وہ سب کے سب جمہوریت پسند ہیں۔ ٹیچر کو یہ سن کر تعجب ہوا۔ اس نے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے ہفتہ تم نے بتایا تھا کہ وہ سب کے سب کمیونسٹ ہیں۔ اب تم یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ وہ سب کے سب جمہوریت پسند ہیں۔ لڑکی نے جواب دیا کہ اتنے دنوں میں ان بچوں کی آنکھیں کھل گئیں (ہندستان ٹائمس ۱۴ جنوری ۱۹۸۴)

یہ صورت جو مارکس کے ساتھ پیش آئی یہی موجودہ زمانہ میں بعض مسلم مفکرین کے معاملہ میں بھی پیش آئی ہے۔ ان مسلم مفکرین نے اپنی انتہا پسندانہ خوش خیالی کے تحت اسلام کی ایک تعبیر پیش کی۔ یہ تعبیر وقتی طور پر بہت سے لوگوں کو پسند آئی۔ وہ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ پچھلے چالیس پچاس سال کے نتیجہ میں اب ان مفکرین کے نام پر ایک حلقہ بن گیا اور اس کا ایک ڈھانچہ (Establishment) قائم ہوگیا۔ اس کی وجہ سے اب اس فکری حلقہ سے وابستگی میں قیادت اور اقتصادی مفاد کی کشش پیدا ہوگئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان مفکرین کے وابستگان اپنے قائد کے نظریہ کو مانے بغیر اس کے حلقہ سے وابستہ ہیں۔ وہ "مارکسی" نہ ہوتے ہوئے بھی "کمیونسٹ" بنے ہوئے ہیں۔

جو کھوئے وہی پاتا ہے

خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت خالد کو ایک جہاد پر روانہ کیا۔ اس وقت آپ نے ان کو جو نصیحتیں کیں ان میں سے ایک نصیحت یہ تھی کہ موت کے حریص بنو، تم کو زندگی دی جائے گی (احرص علی الموت توھب لک الحیاۃ)

صرف معلومات سے کوئی شخص عالم نہیں بنتا

حضرت مالک بن انس کا قول ہے کہ علم ایک روشنی ہے جو صرف ایسے دل سے مانوس ہوتا ہے جو ڈرنے والا اور فروتنی کرنے والا ہو (العلم نور لا یأنس الاّ بقلب تقی خاشع)

خوش حالی زیادہ سخت آزمائش ہے

ابو یعلی اور بزار نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَأنا لِفتنة السراء اخوف علیکم من فتنة الضراء۔ انکم ابتلیتم بفتنة الضراء فصبرتم وان الدنیا حلوۃ خضرۃ

میں تمہارے بارہ میں خوش حالی کے فتنے سے زیادہ ڈرتا ہوں بہ نسبت تنگ حالی کے فتنہ کے۔ تم تنگ دستی کے فتنہ میں مبتلا کئے گئے اور تم نے صبر کیا۔ مگر دنیا بڑی شیریں اور سرسبز ہے۔

طبرانی نے عوف بن مالک کے واسطہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

نصب علیکم الدنیا صباً حتی لا یزیغکم بعدان زغتم الا ھی

دنیا تمہارے اوپر بہہ پڑے گی یہاں تک کہ میرے بعد تمہارے اندر کجی آئی تو دنیا کے سوا کسی اور سبب سے نہیں آئے گی۔

گھمنڈ خدا کے یہاں قابل معافی نہیں

عن سفیان الثوری: کل معصیة عن شھوۃ فانه یُرجی غفرانھا وکل معصیة عن الکبر فانه لا یرجی غفرانھا۔ لان معصیة ابلیس کان اصلھا من الکبر وزلة آدم کان اصلھا من الشھوۃ

حضرت سفیان ثوری نے کہا کہ ہر گناہ جو خواہش سے ہوتا ہے اس کی معافی کی امید ہے اور ہر گناہ جو بڑائی سے ہوتا ہے اس کی معافی کی امید نہیں کیوں کہ ابلیس کا گناہ بڑائی کے سبب سے تھا اور آدم کی لغزش خواہش کے سبب سے۔

آدم کو توبہ کے بعد معافی مل گئی۔ ابلیس ہمیشہ کے لئے رحمت سے دور کر دیا گیا۔

الزام تراشی کی کوئی حد نہیں

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ غزوۂ حنین میں جو اموال غنیمت حاصل ہوئے تھے جب ان کی تقسیم ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کچھ اشراف عرب کو باقی لوگوں پر ترجیح دی اور ان کو نسبتاً زیادہ دیا۔ ایک مسلمان نے یہ دیکھ کر کہا کہ خدا کی قسم، یہ ایک ایسی تقسیم ہے جس میں نہ عدل کیا گیا ہے اور نہ اس میں اللہ کی رضا چاہی گئی ہے (و اللہ ھذہ قسمۃ ما عدل فیھا، وما أرید فیھا وجہ اللہ)

نصیحت کرنے کا پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے

حضرت خزیم ایک صحابی تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ان کے بارہ میں فرمایا: خزیم اسدی کیا ہی اچھے آدمی ہیں۔ کاش ان کے بالوں کی لٹ لمبی نہ ہوتی اور ان کی تہمد نیچے نہ لٹکتی (نعم الرجل خزیم الاسدی لولا طول جمتہ واسبال ازارہ، سنن ابی داؤد) حضرت خزیم کو جب معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے ایسا کہا ہے تو انھوں نے ایک چھری لی اور اپنے بال کی لٹوں کو کاٹ دیا۔ اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت عبد اللہ کے بارے میں ایک بار فرمایا کہ عبد اللہ کیسے اچھے آدمی ہیں۔ کاش وہ رات کو نماز پڑھتے (نعم الرجل عبد اللہ لو کان یصلی باللیل، بخاری) حضرت عبد اللہ کو جب معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے ایسا کہا ہے تو انھوں نے فوراً اس پر عمل شروع کر دیا حتی کہ وہ راتوں کو بہت کم سوتے تھے۔

جس کی شرارت کا اثر اس کے بعد بھی باقی رہے

ایک حکیم کا قول ہے کہ برکت اس کے لئے ہے کہ جب وہ مرا تو اسی کے ساتھ اس کے گناہ بھی مر گئے۔ اور ہلاکت اس کے لئے ہے کہ جب وہ مرے تو اس کے بعد اس کے گناہ باقی رہیں (طوبیٰ لمن اذا مات ماتت معہ ذنوبہ وویل لمن یموت وذنوبہ باقیۃ بعدہ)

بول چال بند کرنا جائز نہیں

عن عطاء بن یزید اللیثی ثم الجندعی ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال: لا یحل لاحد ان یھجر اخاہ فوق ثلاث لیال۔ یلتقیان فیصد ھذا ویصد ھذا۔ وخیرھما الذی یبدأ بالسلام۔ (اخرجہ البخاری)

رسول اللہؐ نے فرمایا: کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین رات سے زیادہ چھوڑے رکھے دونوں ایک دوسرے سے ملیں مگر وہ اس سے اعراض کرے اور یہ اس سے اعراض کرے۔ اور ان دونوں میں

(فی کتاب الادب) سے بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔

جب ہر چیز آخرت کی یاد کا ذریعہ بن جائے

ابن کثیر نے سورہ توبہ کی تفسیر کے آخر میں ایک حدیث نقل کی ہے جو حسب ذیل ہے:

قال الطبرانی حدثنا محمد بن عبداللہ الحضرمی حدثنا محمد بن عبد اللہ بن یزید المقری حدثنا سفیان بن عیینہ عن قطن عن ابی الطفیل عن ابی ذر قال: ترکنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما طائر یقلب جناحیہ فی الھواء الا وھو یذکرلنا منہ علماً۔

طبرانی نے روایت کی ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا اور حال یہ تھا کہ اگر کوئی چڑیا اپنے دونوں پروں کو فضا میں ہلاتی تو اس سے بھی آپ ہم کو کسی علم کی یاد دہانی کرتے تھے۔

اصلاح صرف قرن اول کی تقلید سے

امام مالک نے فرمایا کہ امت مسلمہ کا آخر بھی صرف اسی سے درست ہوگا جس سے اس کا اول درست ہوا تھا۔
(لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا)

عمل کی قیمت ملتی ہے نہ کہ محض آرزوؤں کی

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک بار فرمایا۔ اے اللہ کے بندو، میں تم کو اور اپنے کو تقویٰ اور اطاعت کی نصیحت کرتا ہوں۔ اور عمل اپنے آگے بھیجنے کی اور بے بنیاد آرزوؤں کو چھوڑنے کی۔ کیوں کہ جو شخص عمل میں کم رہ جائے اس کو آرزوئیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں (اوصیکم عباد اللہ ونفسی بتقوی اللہ ولزوم طاعتہ۔ وتقدیم العمل وترک الامل فانہ من فرط فی عملہ لم ینتفع بشئ من املہ)

دشمن سے بھی نفرت نہ کیجئے

احد کی جنگ میں دشمنوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکے۔ پتھر آپ کو لگے۔ آپ کے دانت ٹوٹ گئے اور آپ کے چہرہ سے خون بہنے لگا۔ اس جنگ میں آپ کے چچا حضرت حمزہ مارے گئے اور بہت سے صحابہ قتل ہوئے۔ چنانچہ آپ کے کچھ اصحاب نے آپ سے کہا کہ ان دشمنوں کے خلاف بد دعا کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں لعنت کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ داعی اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (انی لم ابعث لعانا ولکن بعثت داعیا ورحمۃ)

پیغمبر اسلام

قرآن میں ہے وما محمّد الا رسول قد خلت من قبلہ الرّسل (آل عمران ۱۴۴)
اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام محمد صلّے اللہ علیہ وسلم ویسے ہی ایک رسول تھے جیسے دوسرے تمام رسول۔ آپ میں اور دوسرے رسولوں میں درجہ اور منصب کا کوئی فرق نہیں۔ خدا کے تمام رسول ایک ہی دین لے کر آئے۔ ان میں سے کوئی رسول نہ دوسرے رسولوں سے افضل تھا۔ اور نہ ان میں سے کسی کا دین دوسروں کے دین کے مقابلہ میں زیادہ کامل۔

اس سلسلے میں یہاں چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم لا تخیرونی بین الانبیاء (متفق علیہ)

مجھ کو نبیوں کے درمیان ممتاز نہ ٹھہراؤ۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تفضلوا بین انبیاء اللہ (بخاری)

اللہ کے نبیوں میں کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم ما ینبغی لاحد ان یقول انی خیر من یونس بن متی (متفق علیہ)

کسی شخص کو نہیں چاہئے کہ وہ کہے کہ میں یونس ابن متی سے بہتر ہوں۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال انا خیر من یونس بن متی فقد کذب (بخاری)

جس شخص نے کہا کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں اس نے جھوٹ کہا۔

پھر محمد صلّے اللہ علیہ وسلّم اور دوسرے رسولوں میں کیا فرق تھا۔ وہ فرق یہ تھا کہ دوسرے رسول صرف رسول تھے اور آپ اسی کے ساتھ آخری رسول (ولٰکن رسول اللہ وخاتم النبیین) دوسرے رسول سلسلۂ رسالت کی درمیانی کڑی تھے اور آپ سلسلۂ رسالت کی آخری کڑی۔

ایک شخص جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ آپ کے یہاں

کچھ ایسی چیزیں پاتا ہے جو دوسرے انبیاء کے یہاں نہیں پائی جاتیں۔ اب چوں کہ قرآن آپ کی اضافی حیثیت صرف یہ قرار دیتا ہے کہ آپ خاتم النبیین تھے، اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ مانیں کہ یہ مزید چیزیں خاتم النبین ہونے کی حیثیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان مزید چیزوں کی توجیہہ ختم نبوت کے تصور کے تحت کی جائے گی نہ کہ کسی اور تصور کے تحت۔ جو چیزیں آپ میں اور دوسرے رسولوں میں مشترک ہیں وہ آپ کی حیثیتِ رسالت کے خانہ میں جائیں گی۔ اور جو چیزیں آپ میں اور دوسرے نبیوں میں مشترک نہیں وہ آپ کی حیثیت خاتم النبیین کے خانہ میں۔

مثلاً محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ کے مخالفین پر سیاسی فتوحات حاصل ہوئیں۔ آپ کا دین زمین کے ایک بڑے حصہ میں غالب اور حکمراں ہوگیا۔ یہ ایسی چیز جو دوسرے نبیوں کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ یہ فرق کیوں ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ آپ خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ آپ کا لایا ہوا دین ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔ (انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون) کوئی طاقت اس میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہ کرسکے۔ آسمانی کتاب میں تحریف کے بعد نیا نبی آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ چوں کہ آپ کے بعد خدائی اسکیم میں کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب کی مستقل اور قابل اعتماد حفاظت کا انتظام کر دیا جائے۔ یہی وہ مقصد ہے جو سیاسی غلبہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔

یہ خدا کی ایک خاص مصلحت تھی جس کے لئے آپ کو اور آپ کے پیروؤں کو عرب میں اور اطراف عرب میں کامل غلبہ دیا گیا۔ اس طرح خدا کی آخری کتاب کی پشت پر ایک ایسی طاقت و حکومت کھڑی کر دی گئی جو صدیوں تک مسلسل اس کی حفاظت کرتی رہی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسلام دشمن طاقتیں قرآن کو مٹا ڈالتیں یا اس کو اس طرح بدل دیتیں کہ وہ لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیاسی غلبہ کو جمع کرنا آپ کے لائے ہوئے دین کی حفاظت کے لئے تھا۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ سیاسی غلبہ کے ذریعہ یہ مقصد صد فی صد حاصل ہوا۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی جو تصویر قرآن و حدیث سے ثابت ہوتی ہے وہ یہی ہے۔ اور آپ کی صحیح اور سچی تصویر یقینی طور پر وہی ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہو۔

ایک سفر

۸ ستمبر ۱۹۸۳ کو جب انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۰۲ مجھ کو لئے ہوئے تقریباً نو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دہلی سے بنگلور جا رہی تھی تو اچانک مجھ کو خیال آیا کہ خدا انسانی سفر کو تیز رفتار بنا کر خاموش زبان میں یہ کہہ رہا ہے کہ میرا پیغام لے کر دوڑو اور اس کو تمام لوگوں تک پہنچا دو، قبل اس کے کہ میرے کسی بندے پر موت آئے اور وہ بے خبری کی حالت میں اپنے انجام کو پہنچ جائے ——— آدمی موت سے کتنا قریب ہے، مگر وہ اس واقفیت سے کتنا دور ہے جس کے بغیر کامیابی کے ساتھ موت کا استقبال نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارا جہاز جب ہوائی اڈہ کی سڑک (رن وے) پر دوڑ رہا تھا تو میں نے سوچا کہ یہ جہاز اگر اسی طرح اپنا پر پھیلائے ہوئے زمین پر دوڑتا رہے اور رن وے سے اوپر اٹھ کر پرواز نہ کرے تو کل کے اخبار کے لئے صفحۂ اوّل کی ایک خبر بن جائے گی، جہاز اور اس کے مسافروں کی ہلاکت کی خبر۔ مگر جہاز نے جب ایسا کیا کہ وہ رن وے کی حد آنے سے پہلے فضا میں اڑ گیا اور تمام مسافروں کو لئے ہوئے خیریت کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ گیا تو اس کی کوئی خبر اخبار میں نہیں چھپی۔

ایسا کیوں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اخبار والوں کو جہاز کی بربادی سے اتنی زیادہ دلچسپی ہے۔ مگر جہاز کی آبادی اور کامیابی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس سوال کا جواب میری سمجھ میں اس وقت آیا جب کہ میں نے اس کی برعکس صورت پر غور کیا۔

میں نے اپنے جی میں کہا کہ فرض کرو کہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہو۔ یعنی ہر جہاز جو ہوائی اڈہ سے روانہ ہو وہ فضا میں اڑنے سے پہلے برباد ہو جایا کرے۔ اس کے بعد استثنائی طور پر یہ واقعہ ہو کہ ایک جہاز اپنے مقام سے اڑے اور کامیابی کے ساتھ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے تو اس کی خبر تمام اخبارات میں خصوصی اہتمام کے ساتھ چھاپی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ نہ جہاز کی بربادی کا ہے اور نہ اس کی آبادی کا۔ اصل مسئلہ نئے پن کا ہے۔ لوگ ہمیشہ کوئی نئی چیز چاہتے ہیں۔ یہی نئی چیز چاہنے کا جذبہ ہے جس کی بنا پر آج اخبار والے تباہ شدہ جہاز کی خبر فوراً چھاپتے ہیں جو کبھی کبھی ہوتا ہے۔ اور منزل پر پہنچنے کی خبر نہیں چھاپتے کیوں کہ وہ روزانہ برابر ہو رہا ہے۔ اور اب اس میں کوئی نیا پن نہیں ——— اکثر سوالات کا جواب اس وقت سمجھ میں آجاتا ہے جب کہ اس کی برعکس صورت پر غور کیا جائے۔

۹ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ فریزر ٹاؤن کی جامع مسجد میں نماز جمعہ سے پہلے ایک تقریر ہوئی۔ وسیع مسجد تقریباً پوری بھری ہوئی تھی۔ میں نے سورہ جمعہ کے آخری رکوع کی روشنی میں ۴۰ منٹ کی ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ان آیات میں مسجد کے فعل کو بھی "ذکر" کہا گیا ہے اور مسجد کے باہر جو فعل مطلوب ہے اس کو بھی ذکر کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں جمع کرکے ہم سے جو عمل کرایا جاتا ہے اسی کو ہمیں مسجد کے باہر بھی دہرانا ہے۔ پھر میں نے بتایا کہ زندگی کا راز ہے اہم کی خاطر غیر اہم کو چھوڑنا، اور یہی وہ سبق ہے جو جمعہ کی نماز کے ذریعہ ہمیں دیا جاتا ہے۔

بنگلور سے روزنامہ دکن ہرالڈ نکلتا ہے۔ یہ کرناٹک کا سب سے بڑا انگریزی اخبار ہے۔ اس اخبار کے دو رپورٹر انٹرویو لینے کے لئے آئے۔ ۳ ½ بجے سے ۴ بجے تک ان سے ملاقات رہی۔ انھوں نے ہمارے مشن (اسلامی مرکز) کی تفصیلات دریافت کیں۔ مشن کے مقصد کے سلسلے میں میں نے بتایا کہ ہمارا مقصد ہے ــــــ لوگوں کے اندر جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی پیدا کرنا۔ اس مقصد کی مختلف پہلوؤں سے وضاحت کی اور اس ضمن میں ان کے سوالات کے جوابات دئے۔ دکن ہرالڈ (۱۸ ستمبر ۱۹۸۳) میں جو رپورٹ چھپی تھی اس کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

VOICE OF REASON

In these times of religious fanaticism tearing at the fabric of national life, sane voices teaching tolerance - even respect for the other faith - are hard to come by. It was a pleasure, therefore, to meet the other day, Maulana Wahiduddin Khan, who is on a mission to "promote love between man and man."

In scholarly circles, Maulana Wahiduddin Khan, founder of the Islamic Centre in Delhi, is considered among the greatest contemporary Muslim thinkers anywhere. The 58-year-old Maulana has devoted his life to spreading the message of Islam in its true spirit. Unfortunately, he says, practising one's religion has come to mean for many the hatred of others. "Unless moulders of public opinion try to banish such mistaken notions implanted in people's minds our future will be bleak." The erudite Urdu scholar has over 33 books to his credit. His magnum opus, *Al-Islam Yatahadda*, is prescribed study at the renowned Al-Azhar University of Cairo, and other universities in the Gulf. Reviewing the book, *Al-Ahram*, the Cairo daily, said : "It is one of the greatest books ever written in the whole history of Islam." The Maulana plans to bring out an Islamic encyclopaedia shortly.

A crusader for communal peace in the country, he declares that fanaticism should be fought tooth and nail in order to foster communal harmony.

Widely travelled, the Maulana edits *Al-Risala*, a monthly Urdu magazine devoted to serious study of Islam and contemporary issues. Its English version is due next month.

For all his learning, Maulana Wahiduddin Khan is a very unassuming man. He doesn't talk of achievements, but only goals. And he believes that alone his voice would be drowned in the cacophony of the fanatics. More and more should share in building bridges between man and man, he appeals. Any takers?

شام کو مغرب اور عشاء کے درمیان گلستان ہال میں خطاب ہوا۔ ہال پورا بھرا ہوا تھا
میں نے ایک گھنٹہ کی تقریر میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ اللہ کا ڈر دلوں میں آجانا، یہی ہمارے تمام
مسائل کا حل ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں ہے انتم الاعلون ان کنتم مومنین (تم ہی غالب
ہوگے اگر تم مومن ہو) اس آیت میں مومن سے مراد اگر "کلمہ گو" ہو تو آج کلمہ گو مسلمانوں کی تعداد
ساری دنیا میں تقریباً ایک ارب ہے۔ مگر مسلمان آج سب سے زیادہ مغلوب حالت میں ہیں۔ اس
سے ثابت ہوتا ہے کہ مومن سے مراد کلمہ گو نہیں۔ مومن سے مراد وہ انسان ہے جس کو خدا کی یافت ہوجائے
اور خدا جیسی عظیم ہستی کی یافت آدمی کے اندر جو کیفیت پیدا کرتی ہے اسی کا نام تقویٰ اور خوف ہے۔
مسلمانوں کے اندر سے خوف خدا رخصت ہوگیا ہے۔ یہی ان کے تمام مسائل کا اصل سبب ہے۔
مختلف تاریخی مثالوں کے ذریعہ میں نے اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

۱۰ دسمبر کو ۱۱ بجے ڈاکٹر حیات اسماعیل صاحب کے مکان (بنسن روڈ) پر ایک نشست ہوئی
جس میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی موجود تھیں۔ اس موقع پر میں نے " ایمان بالغیب " کی وضاحت
کی۔ میں نے کہا کہ ایمان بالغیب کا لفظ کثرت استعمال سے ہمارے لئے کچھ رسمی سا ہوگیا ہے۔ اس لئے
ہم اس کی پوری معنویت کو سمجھ نہیں پاتے۔ ایسی حالت میں اگر لفظ کو بدل دیا جائے تو بات
پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ ایمان بالغیب کا مطلب وہی ہے جس کو آجکل کی زبان میں ڈسکوری
(دریافت) کہا جاتا ہے۔ میں نے تاریخ کی مثالوں سے بتایا کہ ڈسکوری کس طرح آدمی کے
اندر انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ اگر ہم ایمان کو لوگوں کے لئے ڈسکوری بنا دیں تو اچانک ہم
دیکھیں گے کہ نئی شخصیت والے انسان پیدا ہوگئے ہیں۔ تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔

رات کو ۹ بجے بنگلور سٹی کی جامع مسجد میں خطاب ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر ہوئی
میں نے صحابہ کرام اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تقابلی مثالوں سے یہ دکھایا کہ صحابہ نے
ایک بڑی چیز پائی تھی اور ہم اس بڑی چیز کو نہ پاسکے۔ وہ خدا کو پائے ہوئے تھے اس لئے ہر
دوسری چیز ان کی نظر میں چھوٹی ہوگئی تھی۔ ہم نے خدا کو نہیں پایا ہے اس لئے چھوٹی چیز بھی ہم کو بڑی
چیز معلوم ہوتی ہے۔ کسی نقصان کو ہم برداشت نہیں کر پاتے۔ حالانکہ زندگی کا راز یہ ہے کہ
جو آدمی نقصان کو برداشت کرے وہی نفع کا مالک بنتا ہے۔

۱۱ دسمبر کو صبح ۱۰ بجے ہرشا ہوٹل کے ہال میں تقریر ہوئی۔ اس میں میں نے دکھایا کہ قرآن ہی
اس آسمان کے نیچے خدا کی واحد محفوظ اور مستند کتاب ہے اور وہی تمام انسانوں کی نجات کا ذریعہ

ہوسکتی ہے۔ اس سلسلے میں دعوت اسلامی کی اہمیت واضح کی۔

ایک بجے دن میں جناب اعظم جان صاحب کے مکان پر ایک نشست ہوئی۔ اس نشست میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شہر کے معزز افراد جمع ہوئے تھے۔ اس موقع پر میں نے دعوت الی اللہ اور شہادت علی الناس کی اہمیت پر گفتگو کی اور موجودہ زمانہ میں اس کے امکانات بیان کئے۔

شام کو مغرب بعد کمرشیل اسٹریٹ پر ایک ہال میں تقریر ہوئی۔ اس میں میں نے "ختم رسالت" کی اہمیت واضح کی۔ ۱۲ ستمبر کو دن میں ۱۲ بجے الامین کالج کے طلبہ کے سامنے تقریر ہوئی اس تقریر میں میں نے علم کی اہمیت واضح کی اور تاریخ کی مثالوں سے بتایا کہ کس طرح علم قوموں کی زندگی اور مستقبل کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوا ہے۔

بنگلور کی آبادی تقریباً ۳۰ لاکھ ہے جس میں تقریباً ۲۰ فی صد مسلمان ہیں۔ اگر یہاں مسلمانوں کی حیثیت کا اندازہ ان مسلمانوں سے لگایا جائے جو اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں نسبتاً بہتر ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ بنگلور ہندستان کے ان انتہائی چند شہروں میں سے ہے جہاں وہ واقعی معنوں میں خوش حال ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو نہ صرف خلیجی ممالک سے حصہ مل رہا ہے، بلکہ شہر کی تجارتوں میں ان کا تناسب ان کی آبادی سے قابل لحاظ حد تک زیادہ ہے۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے اپنی خوش حالی کا صحیح استعمال کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق ایسے لوگ شاذو نادر ہوں گے جو باقاعدہ طور پر اپنی سالانہ زکوٰۃ نکالتے ہوں۔ ایسے لوگ بھی کم ملتے ہیں جنھوں نے اپنی آمدنیوں کو خود اپنی ذات کے اعتبار سے تعمیری مدوں میں خرچ کیا ہو۔

کئی ایسے لوگ مجھ سے ملنے کے لئے آئے جو مجھ سے سوالات پوچھنا چاہتے تھے۔ مگر ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے واقعی معنوں میں کوئی کارآمد سوال کیا ہو۔ کسی کا سوال فاتحہ اور درگاہ کے بارہ میں تھا۔ کوئی اس سوال کا جواب چاہتا تھا کہ مردہ کو ایصال ثواب کس طرح کرنا چاہئے، وغیرہ۔

تاہم بنگلور میں بڑی تعداد میں ایسے مسلمان ہیں جن کو "تعلیم یافتہ" کہا جا سکتا ہے۔ ان کی قابل لحاظ تعداد سنجیدگی کے ساتھ الرسالہ کا مطالعہ کر رہی ہے۔ اور اس کے پیغام کا وزن محسوس کرتی ہے۔ نوجوانوں میں ایک تعداد ایسی پیدا ہو گئی ہے جو الرسالہ کے مشن کے لئے کام کرنے کی خواہش مند ہے۔ اور اس کے لئے سرگرم ہے۔ یہاں حلقہ الرسالہ کے ہفتہ وار اجتماع کا نظم بھی قائم ہو گیا ہے۔

ہر تقریر کے ساتھ اجتماع گاہ میں کتابوں کا اسٹال رکھا گیا۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں کتابیں خریدیں۔ اور مطالعہ کے لئے لے گئے۔

بنگلور سے ۲۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر وھائٹ فیلڈ میں ستیہ سائی بابا کا مرکز ہے۔ ۱۰ ستمبر کی سہ پہر کو ہم اسے دیکھنے کے لئے گئے۔ "سائی بابا کا کنگڈم یہاں سے ایک کیلومیٹر کے بعد شروع ہو جائے گا" ڈاکٹر اسماعیل صاحب نے کہا جو گاڑی میں میری بغل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سڑک کے کنارے ایک بورڈ دکھائی دیا جس پر لکھا ہوا تھا:

Kingdom of Satya Sai Baba

بورڈ دیکھنے سے پہلے میں نے سمجھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے کنگڈم (سلطنت) کا لفظ تفریح کے طور پر کہا ہے۔ مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ واقعۃً اس کا نام یہی ہے۔ سائی بابا کا یہ مرکز سڑک کے کنارے تقریباً تین کیلومیٹر لمبے اور دو کیلومیٹر چوڑے علاقہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ہر قسم کے فارم، اسکول، کالج، اسپتال، لائبریری، پریس، وغیرہ وغیرہ چیزیں موجود ہیں۔ یہ پوری طرح ایک خود کفیل دنیا ہے۔ جو اپنی ضرورت کی تمام چیزیں (غلہ سے لے کر کتاب تک) خود تیار کرتی ہے۔

اس وقت سائی بابا اپنے مرکز میں موجود نہ تھے، کہیں باہر گئے ہوئے تھے، اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ ان کے کچھ معتقدین سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مسٹر وی۔ کے نرسمہن (سابق اڈیٹر انڈین اکسپرس) سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ان کے ہاتھ میں ایک الکٹرانک گھڑی تھی جس کے متعلق انھوں نے کہا کہ سائی بابا نے اس کو مجھے جنگل کے درمیان دیا تھا:

It was given to me by Swami in the middle of the forest.

میں نے قریب سے دیکھا تو یہ گھڑی ٹھیک ویسی ہی تھی جیسی عام گھڑی ہوتی ہے۔ میں حیران ہوا کہ لوگ کتنے سادہ ہیں کہ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ سائی بابا نے یہ گھڑی کسی آسمانی فیکٹری سے پر اسرار طور پر حاصل کر کے انھیں دی ہے۔ اگر واقعی یہ گھڑیاں "آسمان" سے آتی ہیں تو ان کا ڈزائن عام زمینی گھڑیوں سے مختلف کیوں نہیں۔

مسٹر نرسمہن نے کہا کہ سائی بابا خدا کے اوتار ہیں۔ اوتار کی تشریح انھوں نے اس طرح کی کہ لکڑی کا چھوٹا پل ٹوٹ جائے تو گاؤں والے خود ہی اس کی مرمت کر لیتے ہیں۔ مگر جب لوہے کا بڑا پل ٹوٹتا ہے تو انجنیر کو خود اس کو درست کرنے کے لئے آنا پڑتا ہے۔

میں نے کہا آج جب کہ انسانی سماج کا انجنیئر خود اصلاح کے لئے زمین پر آگیا ہے تو انسانی سماج کی خرابیوں کی اصلاح کیوں نہیں ہوتی۔ انھوں نے اب ایک اور مثال دی۔ انھوں نے کہا کہ ایک شخص بھگوان کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ بارش کی وجہ سے میرا گھر گر رہا ہے، بارش کو بند کیجئے۔ اب اگر بھگوان بارش کو بند کر دیں تو کسان آکر فریاد کریں گے کہ ہماری فصل سوکھے کی وجہ سے برباد ہوگئی۔ میں نے کہا کہ آپ کے اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ پل کے ٹوٹنے میں بھی کوئی مصلحت تھی، اس لئے بھگوان اس کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ جب ایسا ہے تو پھر بھگوان کو زمین پر آنے کی حاجت ہی نہیں تھی۔ کیوں کہ آپ کے کہنے کے مطابق وہ اس وقت زمین پر آتے ہیں جب کہ ٹوٹے ہوئے پل کو درست کرنے کی ضرورت ہو۔

۴ فروری ۱۹۸۴ کو دہلی میں ایک کشمیری نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ماہنامہ الرسالہ شروع سے خریدتے ہیں۔ اور مکتبہ الرسالہ کی مطبوعات بھی پڑھ چکے ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں الرسالہ کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔

حال میں ایک سفر کے دوران وہ ایک دن کے لئے بنگلور میں ٹھہرے تھے۔ بنگلور میں انھوں نے ایک دکاندار سے الرسالہ کا تذکرہ کیا۔ دکاندار نے جواب دیا کہ ہم اس نام کے کسی رسالے سے واقف نہیں اور ہم رسالے وغیرہ پڑھتے بھی نہیں۔ یہ سب مولویوں کے جھگڑے ہیں اور مولوی ہم کو بہت برباد کر چکے ہیں۔

مذکورہ کشمیری نوجوان بنگلور سے یہ تاثر لے کر لوٹے کہ بنگلور میں ابھی الرسالہ کی آواز نہیں پہنچی ہے۔ حالاں کہ ان کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے بنگلور کے ایک دکاندار کو بنگلور سمجھ لیا۔ اگر وہ بنگلور کے سفر میں ہمارے ساتھ ہوتے تو ان کا تاثر دوسرا ہوتا۔ کیوں کہ بنگلور میں خدا کے فضل سے الرسالہ کی کئی ایجنسیاں کامیابی سے چل رہی ہیں۔ اور وہاں راقم الحروف کی تقریروں میں بھی کثرت سے تعلیم یافتہ طبقہ شریک ہوا۔

میں نے مذکورہ کشمیری نوجوان سے کہا کہ بنگلور ایک بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں بہت سے لوگ الرسالہ کو برابر پڑھ رہے ہیں۔ مگر کسی شہر میں الرسالہ کے قارئین کا ہونا اور چیز ہے اور شہر کے ہر ہر فرد تک الرسالہ کا پہنچنا دوسری چیز۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی کے خلاف یا موافق ایک رائے قائم کر لیتا ہے۔ حالاں کہ اس کی رائے اس کے محدود مشاہدہ کی نسبت سے ہوتی ہے نہ کہ وسیع تر معنوں میں پوری صورت واقعہ کی نسبت سے۔ اکثر یقین صرف اس بات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی کو پوری بات کا علم ہی نہیں۔

THE INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

The INTRODUCTION TO ISLAM SERIES is the rendering into English of the Urdu Ta'arufi Set by Maulana Wahiduddin Khan. It provides the general public with an understanding of the basic teachings of divinely revealed religion.

The titles in this series:

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

Maktaba Al-Risala

الرسالہ (انگریزی)

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن فروری ۱۹۸۴ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کی قیمت فی شمارہ ۳ روپیہ اور سالانہ ۳۶ روپیہ ہے ایجنسی وغیرہ کی شرائط وہی ہیں جو اردو الرسالہ کی ہیں۔

الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن زیادہ تر اردو الرسالہ یا ادارۂ الرسالہ کی اردو مطبوعات کے ترجمے پر مشتمل ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم کو ان اصحاب کے قلمی تعاون کی ضرورت ہے جو انگریزی تحریر پر بخوبی قدرت رکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں سے ہماری اپیل ہے کہ وہ الرسالہ یا ہماری دوسری اردو مطبوعات سے انگریزی ترجمے کرکے روانہ فرمائیں۔ ہم ایسے لوگوں کے انتہائی مشکور ہوں گے۔ جو اصحاب انگریزی ترجمے کے کام میں معاونت فرمائیں ان سے گزارش ہے کہ ہر ترجمہ، خواہ وہ الرسالہ سے لیا گیا ہو یا کسی کتاب سے، اس کا مکمل حوالہ ضرور درج کریں۔

منیجر الرسالہ: سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۳

فارم IV رول نمبر ۸

ماہنامہ الرسالہ۔ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی

۱۔ مقام اشاعت جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۲۔ وقفہ اشاعت ماہانہ

۳۔ نام پرنٹر (طابع) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۴۔ نام پبلشر (ناشر) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسئول) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

۶۔ نام اور پتہ مالک رسالہ ثانی اثنین خاں

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

میں ثانی اثنین خاں تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں، میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

ثانی اثنین خاں

یکم مارچ ۱۹۸۴ء

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زرتعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہوجاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd. D(DN) No. 532

MARCH 1984
ISSUE No. 88

AL-RISALA MONTHLY

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	20/-
ظہور اسلام	20/-
احیاء اسلام	12/-
پیغمبر انقلاب	20/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	1/-
تعارف اسلام	2/50
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-

اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	2/-
منزل کی طرف	6/-
حقیقت حج	1/-
اسلامی دعوت	3/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-

ENGLISH PUBLICATIONS

The Way to find God	3/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	4/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad : The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ ▢ جمعیۃ بلڈنگ ▢ قاسم جان اسٹریٹ ▢ دہلی ۶

سرپرست

مولانا وحیدالدین خاں

تم چڑیوں کو اپنے سر کے اوپر اڑنے سے نہیں روک سکتے
البتہ تم چڑیوں کو اس سے روک سکتے ہو کہ
وہ تمہارے سر میں گھونسلا نہ بنائیں (ایک چینی مثل)

اپریل ۱۹۸۴ء قیمت فی پرچہ — تین روپے شمارہ ۸۹

آخری سفر

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ

سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

مطبوعات اسلامی مرکز

ناشر :

مکتبہ الرسالہ

سی ـ ۲۹ نظام الدین ویسٹ ـ نئی دهلی ۱۱۰۰۱۳

فون نمبر : ۶۱۱۱۲۸

سال اشاعت ۱۹۸۴

طابع

جے کے آفسٹ پرنٹرس دہلی ۶

۲۵واں گھنٹہ

ایک فرانسیسی مصنف نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کا نام ہے ۲۵واں گھنٹہ :

25th Hour

اس کتاب میں مصنف نے دنیا کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ دنیا دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو مٹانے کی ایسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں جس کا آخری نتیجہ صرف انسانیت کی مجموعی ہلاکت ہو۔ ہتھیاروں کی اندھادھند ریس نے دنیا کو خطرناک ہتھیاروں کا گدام بنادیا ہے۔ مسلسل جنگی تیاریوں نے دنیا کو اپنی بربادی کے آخری کنارے پہنچا دیا ہے۔

مصنف لکھتا ہے کہ ہمارا ۲۴ واں گھنٹہ ختم ہوچکا ہے 24th hour is past اب پچیسواں گھنٹہ (خاتمہ کا گھنٹہ) شروع ہونے والا ہے۔

مصنف نے جو بات " انسانی جنگ " کے بارہ میں کہی ہے وہ " خدائی قیامت " کے بارہ میں زیادہ صحیح ہے۔ خدا نے موجودہ دنیا کو محدود مدت کے لئے امتحان کے واسطے پیدا کیا ہے۔ یہ مدت صرف خدا کے علم میں ہے، وہ ہم کو تعین کے ساتھ معلوم نہیں۔ کسی بھی لمحہ خدا اس مدت کے خاتمہ کا اعلان کرسکتا ہے۔ اور اس کے بعد دنیا اور اس کا سارا تمدن عظیم زلزلہ کے ذریعہ تباہ ہوجائے گا۔ اور اس کے بعد ایک نئی ابدی اور کامل دنیا تخلیق کی جائے گی۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمین پر ہمارا ہر لمحہ گویا آخری لمحہ ہے۔ اگر ہم اپنی صبح میں ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہم شام نہ کرسکیں۔ اگر ہم اپنی شام میں ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہمیں دوبارہ صبح دیکھنے کو نہ ملے۔

موجودہ دنیا میں ہمارا ہر لمحہ آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت یہ امکان ہے کہ انسانیت اپنی مہلت عمر پوری کرچکی ہو۔ انسان اپنے " ۲۴ویں گھنٹے" کو ختم کرکے ۲۵ویں فیصلہ کن گھنٹے میں داخل ہوجائے۔

لوگ نیوکلیر جنگ کے خطرہ سے ڈر رہے ہیں۔ حالاں کہ انھیں خدا کی طرف سے قیامت کا صور پھونکا جانے سے ڈرنا چاہئے۔ کیوں کہ نیوکلیر جنگ کا ہونا یقینی نہیں۔ مگر قیامت کا آنا یقینی بھی ہے اور اس کا انجام ابدی بھی۔

موت کے دروازہ پر

موت کا مرحلہ سب سے زیادہ یقینی مرحلہ ہے جس سے آدمی کو لازماً گزرنا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو زندگی نہ ملے۔ مگر جس کو زندگی ملی اس کے لئے موت کا آنا لازمی ہے۔ ہر آدمی جو زندہ ہے وہ ایک روز مرے گا۔ ہر آدمی جو دیکھتا اور بولتا ہے یقیناً ایک روز اس کی آنکھ بے نور ہوگی اور اس کا بولنا بند ہو جائے گا۔ ہر آدمی پر وہ وقت آتا ہے جب کہ وہ موت کے دروازہ پر کھڑا کر دیا جائے۔ اس وقت اس کے پیچھے دنیا ہوگی اور اس کے آگے آخرت۔ وہ ایک ایسی دنیا کو چھوڑ رہا ہوگا جہاں وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے گا اور ایک ایسی دنیا میں داخل ہو رہا ہوگا جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ وہ اپنے عمل کے میدان سے ہٹا کر وہاں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ اپنے عمل کا ابدی انجام بھگتتا رہے۔

زندگی ایک بے اعتبار چیز ہے، جب کہ موت بالکل یقینی ہے۔ ہم زندہ صرف اس لئے ہیں کہ ابھی ہم مرے نہیں ہیں اور موت وہ چیز ہے جس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ہم ہر لمحہ موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں حالاں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ مرے ہوئے ہیں۔ وہ موت جس کا وقت مقرر نہ ہو، جو ابھی اگلے لمحہ آسکتی ہو وہ گویا ہر وقت آرہی ہے اس کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ آچکی ہے، بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ وہ آنے والی ہے۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو (عد نفسك من اهل القبور)

موت ہر چیز کو باطل کر دیتی ہے، وہ ہماری زندگی کا سب سے زیادہ بھیانک واقعہ ہے۔ تاہم موت اگر صرف زندگی کا خاتمہ ہوتی تو وہ زیادہ بھیانک نہیں تھی۔ موت کا مطلب اگر صرف یہ ہوتا کہ اب آئندہ کے لئے اس انسان کا وجود نہ رہے گا جو چلتا تھا اور جو دیکھتا اور سنتا تھا تو اپنی ساری ہولناکیوں کے باوجود یہ صرف ایک وقتی حادثہ تھا نہ کہ کوئی مستقل مسئلہ۔ مگر اصل مشکل یہ ہے کہ موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں۔ وہ ایک نئی اور ابدی زندگی کا آغاز ہے۔ موت کا مطلب اپنے ابدی انجام کی دنیا میں داخل ہونا ہے۔

ہر آدمی زندگی سے موت کی طرف سفر کر رہا ہے۔ کسی کا سفر دنیا کی خاطر ہے اور کسی کا آخرت کی خاطر۔ کوئی سامنے کی چیزوں میں جی رہا ہے کوئی چھپی ہوئی چیزوں میں۔ کوئی اپنی خواہش اور انا کی تسکین کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے اور کسی کو خدا کے خوف اور خدا کی محبت نے بے چین کر رکھا ہے۔ دونوں قسم کے لوگ شام کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی تھکان کو مٹائیں اور اگلے دن دوبارہ صبح کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی پسند کی دنیا میں دوبارہ سرگرم ہو جائیں۔ موجودہ دنیا میں دونوں بظاہر یکساں نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آنے والی منزل کے اعتبار سے دونوں کا حال یکساں نہیں۔ جو شخص خدا اور آخرت میں جی رہا ہے وہ اپنے کو بچا رہا ہے اور جو شخص دنیا کی دلچسپیوں اور اپنے نفس کی خواہشوں میں جی رہا ہے وہ اپنے کو ہلاک کر رہا ہے۔

ہم خدا کے ملک میں ہیں

ایک امریکی خاتون سیاحت کی غرض سے روس گئیں۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ہر جگہ کمیونسٹ پارٹی کے چیف کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ یہ بات انھیں پسند نہیں آئی۔ ایک موقع پر وہ کچھ روسیوں سے اس پر تنقید کرنے لگیں۔ خاتون کے ساتھی نے ان کے کان میں چپکے سے کہا

" میڈم آپ اس وقت روس میں ہیں ، امریکہ میں نہیں ہیں "

آدمی اپنے ملک میں اپنی مرضی کے مطابق رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ کسی غیر ملک میں جائے تو وہاں اس کو دوسرے ملک کے نظام کی پابندی کرنی پڑے گی۔ اگر وہ وہاں کے نظام کی خلاف ورزی کرے تو وہ مجرم قرار پائے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ وسیع تر معنوں میں دنیا کا ہے۔ انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہوتا ہے جس کو اس نے خود نہیں بنایا ہے۔ یہ مکمل طور پر خدا کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ گویا انسان یہاں اپنے ملک میں نہیں ہے بلکہ خدا کے ملک میں ہے۔

ایسی حالت میں انسان کی کامیابی کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ خدا کی اسکیم کو جانے اور اس اسکیم کے مطابق اس دنیا میں رہے۔ اگر وہ یہاں خدا کی اسکیم کے خلاف رہے گا تو وہ باغی قرار پائے گا اور اس قابل ٹھہرے گا کہ خدا اس کو سخت سزا دے کر ہمیشہ کے لئے اپنی تمام نعمتوں سے محروم کر دے۔

دنیا میں خدا کی مرضی کے مطابق رہنے کا طریقہ کیا ہے، یہی وہ سوال ہے جس کا جواب دینے کے لئے خدا نے اپنے پیغمبر کھڑے کئے۔ پیغمبروں نے انسان کی قابل فہم زبان میں کھول کھول کر بتایا کہ انسان سے خدا کو کیا مطلوب ہے۔ اور خدا کی وہ اسکیم کیا ہے جس کی انسان کو پابندی کرنی چاہیے۔

قرآن اسی پیغمبرانہ ہدایت کا مستند مجموعہ ہے۔ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ خدا اس کو اپنے وفادار بندوں میں شمار کرے اور اس کو اپنی ابدی نعمتوں میں حصہ دار بنائے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ قرآن کو پڑھے اور اس کو اپنی زندگی کا رہنما بنا لے۔

جو شخص ایسا نہیں کرے گا اس کا انجام شدید تر شکل میں وہی ہوگا جو روس میں امریکہ نوازوں کا ہوتا ہے یا امریکہ میں روس نوازوں کا۔

موت کا مرحلہ

موت کا لمحہ تمام قابل قیاس اور ناقابل قیاس لمحات سے زیادہ شدید ہے۔ ہر دوسری مصیبت جس کے لئے آدمی پریشان ہوتا ہے۔ اس مصیبت کے مقابلہ میں ہیچ ہے جو موت کی صورت میں اس کے سامنے آنے والی ہے۔

موت زندگی کے سخت ترین مرحلہ کی طرف سفر ہے۔ یہ کامل بے اختیاری، کامل بے سروسامانی اور کامل بے مددگاری کے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔ دنیا کی ہر تکلیف کی ایک حد ہوتی ہے، موت ہم کو ایک ایسی دنیا میں داخل کر دیتی ہے جس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

موجودہ دنیا میں بھی آدمی باعتبار حقیقت اسی حال میں ہے۔ انسان اپنی ذات کے اعتبار سے اتنا کمزور ہے کہ وہ معمولی ناخوشگواری کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک سوئی کا چبھنا، ایک دن کی بھوک پیاس، چند دن کے لئے نیند نہ آنا بھی اس کے پورے وجود کو تڑپا دیتا ہے۔ تاہم موجودہ دنیا میں اس کو اس کی ضرورت کے مطابق تمام چیزیں حاصل ہیں اس لئے وہ اپنی بے چارگی کو بھولا رہتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت سے ناآشنا رہتا ہے۔

اگر آدمی سے موجودہ دنیا چھین لی جائے۔ جہاں پانی اور غذا ہے، جہاں ہوا اور روشنی ہے، جہاں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے تمدن بنانے کے امکانات ہیں۔ اگر موجودہ دنیا آدمی سے چھین لی جائے تو خلا کے کسی دوسرے مقام پر وہ اپنے لئے اس قسم کی ایک اور دنیا کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد اس کا انجام اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ وہ اندھیرے میں بھٹکتا رہے۔

دنیا میں آدمی پر مصیبت پڑتی ہے تو وہ آہ وا ویلا کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ آنے والے دن کو جانے تو وہ کہے گا کہ خدایا جو کچھ بیت رہا ہے اس سے کہیں زیادہ سخت ہے وہ جو بیتنے والا ہے۔ دنیا میں آدمی کو عزت اور آرام حاصل ہو تو وہ فخر اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ آنے والے لمحات کو جانے تو وہ کہہ اٹھے گا کہ خدایا اس عزت اور آرام کی کوئی حیثیت نہیں، اگر آنے والے طویل تر مرحلہ میں وہ باقی نہ رہے۔

موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ ایک نئے مرحلۂ حیات کا آغاز ہے۔ یہ نیا مرحلہ کسی کے لئے تمام مصیبتوں سے زیادہ بڑی مصیبت کا غار ہوگا اور کسی کے لئے تمام راحتوں سے زیادہ بڑی راحت کا دروازہ۔

کیسا عجیب

کرناٹک کے گورنر مسٹر گووند نرائن کی لڑکی نندنی کی عمر ابھی صرف ۲۸ سال تھی کہ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۱ کو نئی دہلی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ایک ہنستی ہوئی زندگی اچانک خاموش ہوگئی۔

نندنی بہت ذہین اور تندرست تھی۔ اس کی تعلیم خالص انگریزی طرز پر ہوئی۔ اس کے بعد اس نے امریکہ سے جرنلزم (صحافت) کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ہندستان ٹائمس میں سینیر رپورٹر تھی۔ اپنی مختلف خصوصیات کی وجہ سے نندنی اپنے اخباری ساتھیوں کے درمیان بہت مقبول تھی۔ اس کے ایک ساتھی کے الفاظ میں نندنی کی زندگی کا نظریہ یہ تھا:

She loved life to the full and wanted to live it to the full

وہ زندگی سے آخری حد تک پیار کرتی تھی اور زندگی کے ساتھ آخری حد تک رہنا چاہتی تھی۔

نندنی کی وفات پر اس کے ساتھی رپورٹروں نے ایک یادداشت (ہندستان ٹائمس ۱۷ ستمبر ۱۹۸۱) شائع کی ہے۔ اس یادداشت کے خاتمہ پر وہ لکھتے ہیں —— نندنی کی موت اس حقیقت کی ایک بے رحم یاد دہانی ہے کہ ہر آدمی کا ایک بے حد مقرر وقت ہے:

It is a cruel reminder of the fact that there is a deadline for everyone.

کیسی عجیب بات ہے۔ ایک جیتی جاگتی زندگی اچانک بجھ جاتی ہے۔ ایک ہنستا ہوا چہرہ ایک لمحہ میں اس طرح ختم ہوجاتا ہے جیسے کہ وہ مٹی سے بھی زیادہ بے قیمت تھا۔ حوصلوں اور تمناؤں سے بھری ہوئی ایک روح دفعتہً اس طرح منظر سے ہٹا دی جاتی ہے جیسے اس کے حوصلوں اور تمناؤں کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

زندگی کس قدر بامعنی ہے۔ مگر اس کا انجام اس کو کس قدر بے معنی بنا دیتا ہے۔ آدمی بظاہر کتنا آزاد ہے مگر موت کے سامنے وہ کتنا مجبور نظر آتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنا زیادہ عزیز رکھتا ہے، مگر قدرت کا فیصلہ اس کی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنی بے رحمی سے کچل دیتا ہے۔

آدمی اگر صرف اپنی موت کو یاد رکھے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے۔ کامیاب اجتماعی زندگی کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی اپنی حد کے اندر رہنے پر راضی ہوجائے اور موت بلاشبہ اس حقیقت کی سب سے بہتر معلم ہے۔

ساٹھ کیلو میٹر

جابر حسین ایک ریلوے گارڈ تھے۔ ان کی ملازمت کی مدت پوری ہو چکی تھی۔ ۱۷ جولائی ۱۹۸۱ کو وہ اندور۔ بلاسپور اکسپرس لے کر روانہ ہوئے۔ یہ گارڈ کی حیثیت سے ان کا آخری سفر تھا۔ کیونکہ اگلے دن ۱۸ جولائی سے وہ ریٹائر ہونے والے تھے۔ ریٹائر منٹ کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کا پورا نقشہ بنا رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اب وہ اپنے اس نقشہ کو زیر عمل لانے کے کنارے پہنچ چکے ہیں۔ ریلوے گارڈ کی حیثیت سے اپنی ڈیوٹی کے آخری سفر پر روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا " کل سے میری دوسری زندگی شروع ہوگی "

یہ سفر جابر حسین کے لئے واقعی آخری سفر تھا اور اس کے بعد ہی ان کی دوسری زندگی شروع ہو گئی۔ مگر اس معنی میں نہیں جس میں کہ انہوں نے سمجھا تھا بلکہ کسی اور معنی میں۔ ان کی اکسپرس ٹرین اپنی منزل سے ساٹھ کیلو میٹر کے فاصلہ پر تھی کہ پیچھے سے آنے والی ایک مال گاڑی ان کی ٹرین سے ٹکرا گئی۔ گارڈ کا ڈبہ چکنا چور ہو گیا۔ جابر حسین فوراً ہلاک ہو گئے۔ ایک ریلوے افسر نے اس حادثہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا :

Sixty kilometres more and it would have
been the end of his official journey.

جابر حسین نے اگر ۶۰ کیلو میٹر اور طے کر لیا ہوتا تو ریلوے ملازم کی حیثیت سے ان کا سفر پورا ہو جاتا (انڈین اکسپریس ۱۸ جولائی ۱۹۸۱)

یہی اس دنیا میں ہر آدمی کا حال ہے۔ ہر آدمی اپنی زندگی کو لمبی تصور کئے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا سفر "۶۰ کیلو میٹر" کے بعد پورا ہوگا۔ مگر موت کا فرشتہ اس کو ۶۰ کیلو میٹر سے پہلے ہی پکڑ لیتا ہے۔ ہر آدمی موجودہ دنیا میں "اپنی کل" کی تعمیر کا ایک نقشہ لئے ہوئے ہے۔ مگر اچانک موت آکر اس کو بتاتی ہے کہ اس کی "کل" اس دنیا میں شروع نہیں ہوتی جہاں ۱۷ جولائی کے بعد ۱۸ جولائی اور ۱۸ جولائی کے بعد ۱۹ جولائی کی تاریخیں آتی ہیں۔ بلکہ اس کی کل اس ابدی دنیا میں شروع ہوتی ہے جہاں دنیا کے کیلنڈر لپیٹ کر رکھ دئے جاتے ہیں۔ آدمی جہاں اپنے سفر کو ختم سمجھ رہا ہے وہیں سے اس کے حقیقی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

زندگی کا سفر

مصطفیٰ رشید شروانی، مشہور مجاہد آزادی اور صنعت کار اور ممبر راجیہ سبھا، ٹرین کے ذریعہ الہ آباد سے دہلی جارہے تھے۔ گورنر کشمیر مسٹر ایل کے نہرو بھی انھیں کے کمپارٹمنٹ میں تھے۔ ٹرین غازی آباد پہنچی تھی کہ مصطفیٰ رشید شروانی پر دل کا سخت دورہ پڑا۔ قبل اس کے کہ انھیں کوئی طبی امداد پہنچے، فوراً ہی ٹرین میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ ۸ اپریل ۱۹۸۱ کا واقعہ ہے۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۵۹ سال تھی۔

اس طرح کے واقعات مختلف شکلوں میں ہر روز ہوتے ہیں۔ ہر دن بے شمار زندہ لوگ موت کے دروازہ میں داخل ہوجاتے ہیں۔ ہر روز لاکھوں آدمیوں کے ساتھ یہ واقعہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے نکل کر کسی "دہلی" کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ مگر درمیان ہی میں ان کو خدا کے فرشتے پکڑ لیتے ہیں اور ان کو "دہلی" کے بجائے آخرت کی منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔

ہر آدمی امیدوں اور تمناؤں کی ایک دنیا اپنے ذہن میں لئے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی امیدوں کی دنیا کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میں اپنے خوابوں والے "کل" کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ مگر بہت جلد اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمناؤں والی دنیا کے بجائے خدا کی دنیا کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ دنیا کی منزل کی طرف نہیں بلکہ آخرت کی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ آدمی کہاں جا رہا ہے اور کہاں پہنچ رہا ہے، مگر کسی کو اس کی خبر نہیں۔

آدمی اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کو دیکھ کر خوش ہو وہ خود اپنے اس مستقبل کی طرف ہانک دیا جاتا ہے جس کے لئے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ آدمی اپنے آرام کے لئے ایک شان دار مکان کھڑا کرتا ہے مگر ابھی وہ وقت نہیں آتا کہ وہ اپنے خوابوں کے مکان میں سکھ چین کے ساتھ رہے کہ موت اس کے اور اس کے مکان کے درمیان حائل ہوجاتی ہے۔ آدمی اپنی معاش کو بڑھاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں عزت و ترقی کی بلندیوں پر اپنے کو بٹھانے جا رہا ہوں مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا دن اس کے لئے جس چیز کا انتظار کر رہا تھا وہ ایک سنسان قبر تھی نہ کہ عزت و ترقی کی رونقیں۔

خدا ہر دن کسی "دہلی" کے مسافر کو "قبر" میں پہنچا رہا ہے۔ مگر آدمی ان واقعات سے سبق نہیں لیتا۔ اس کے باوجود ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ وہ "دہلی" کی طرف چلا جا رہا ہے، قبر کی منزل اس کے لئے کبھی آنے والی نہیں۔

موت کے آگے

فرانس کے لوئی یازدہم (۱۴۲۳-۱۴۸۳) نے ساٹھ سال تک بادشاہ کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ آخر عمر میں وہ ایک بند قلعہ میں رہنے لگا جہاں بہت کم لوگوں کو داخلہ کی اجازت تھی۔ قلعہ کے چاروں طرف گہری خندق کھود دی گئی تھی تاکہ کوئی اس کے قریب نہ پہنچ سکے۔ قلعہ کی دیواروں پر ہر وقت چالیس تیر انداز بیٹھے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ چالیس گھوڑسوار دن رات اس کے چاروں طرف گشت کرتے رہتے تھے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ جو بھی بلا اجازت قلعہ کے اندر آنے کی کوشش کرے اس کو پکڑ کر اسی وقت قتل کر دیا جائے۔ قلعہ کے اندر بادشاہ کے لئے ہر قسم کا عیش و عشرت کا سامان مہیا کیا گیا تھا تاکہ بادشاہ کا دل کبھی غمگین نہ ہونے پائے۔

لوئی یازدہم کو زندہ رہنے کا اتنا شوق تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ موت کا لفظ اس کے سامنے ہرگز نہ بولا جائے۔ ایک ماہر ڈاکٹر ہر آن بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ اس ڈاکٹر کو دس ہزار سنہری کراون ماہوار دئے جاتے تھے۔ اس وقت یورپ کے کسی میدان جنگ میں چالیس سال کام کرکے بھی ایک فوجی افسر اتنی تنخواہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

تاہم ان میں سے کوئی چیز بادشاہ کو بڑھاپے اور کمزوری سے نہ بچا سکی۔ آخر عمر میں وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ مشکل سے وہ کھانے کی کوئی چیز اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے جینے کی خواہش وہم کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس کو کسی نے بتایا کہ کچھوے پانچ سو سال تک جیتے ہیں اور وہ زندگی بخش خواص کے مالک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے کچھ لوگوں کو تین بحری جہاز دیکر جرمنی اور اٹلی روانہ کیا تاکہ وہاں سے اس کے لئے بحری کچھوے لے آئیں۔ یہ کچھوے اس کے قریب ایک بڑے حوض میں رکھے گئے تاکہ اس کو زندگی کا فیضان عطا کر سکیں۔

آخرکار لوئی پر فالج کا حملہ ہوا اور ۳۰ اگست ۱۴۸۳ کو موت نے اس پر قابو پا لیا۔ بالآخر اس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص موت کو نہیں جیت سکتا۔ اس کی زبان سے جو آخری الفاظ مرنے سے پہلے نکلے وہ یہ تھے:

میں اتنا بیمار تو نہیں ہوں جتنا آپ لوگ خیال کرتے ہیں۔

تاہم اس کی تمام کوششیں بے کار ہو گئیں۔ ۳۰ اگست ۱۴۸۳ کو وہ مر گیا۔ آخرکار بادشاہ فرانس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص موت کو جیت نہیں سکتا۔

روپیہ سے راکھ تک

گھنشیام داس برلا (۱۹۸۳-۱۸۹۴) ہندستان کے مشہور ترین صنعت کار تھے۔ ان کی اعلیٰ کامیابی کا راز ان کی بے حد با اصول زندگی تھی۔ انھوں نے ۱۲ سال کی عمر میں معمولی کاروبار سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر وہ عظیم ترقی تک پہنچے آج ان کا خاندان ہندستان کا واحد سب سے بڑا کاروباری خاندان ہے۔

مسٹر برلا کا معمول تھا کہ صبح ۵ بجے اٹھتے اور شام ۹ بجے تک مسلسل کام میں مشغول رہتے۔ ان کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ وہ شراب کے بجائے کافی پیتے تھے۔ دو کھانے کے درمیان پانی کے سوا اور کچھ نہیں لیتے تھے۔ اکثر اپنا کھانا خود اپنے ہاتھ سے پکاتے۔

مسٹر برلا روزانہ صبح کو ٹہلنے کے لئے نکلتے تھے۔ اس معمول میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، خواہ وہ ہندستان میں ہوں یا ہندستان کے باہر۔ ۱۱ جون ۱۹۸۳ کو وہ لندن میں تھے۔ وہ حسب معمول صبح کے ناشتہ کے بعد ریجنٹ اسٹریٹ پر ٹہلنے کے لئے نکلے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد انھیں تکلیف محسوس ہوئی۔ انھوں نے اپنے دو مددگاروں کو بتایا جو اس وقت ان کے ساتھ تھے۔ وہ انھیں فوراً گھر واپس لائے۔ گھر آتے ہی وہ بے ہوش ہوگئے۔ اس کے بعد انھیں لندن کے مڈل سکس اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال میں انھیں تھوڑی دیر کے لئے ہوش آیا۔ وہاں انھوں نے کہا ——— ڈاکٹر، مجھے کیا تکلیف ہے۔

What is wrong with me, Doctor ?

ڈاکٹروں نے کہا۔ ہم پانچ منٹ میں معائنہ کرکے بتاتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ ڈاکٹروں کا معائنہ مکمل ہو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ مسٹر برلا کی وصیت تھی کہ جہاں میرا انتقال ہو وہیں میرے آخری مراسم ادا کئے جائیں۔ چنانچہ مسٹر برلا کی لاش کو لندن میں بجلی کے ذریعہ جلا دیا گیا۔ اور ان کی راکھ ہندستان لاکر یہاں کی ندیوں میں بہادی گئی۔ مسٹر برلا کی اسکول میں تعلیم نہیں ہوئی۔ تاہم بعد کو انھوں نے ذاتی محنت سے اپنے اندر لیاقت پیدا کی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بنے۔ ان کی ایک کتاب کا ہندی نام ہے ——— روپیہ کی کہانی۔

مسٹر برلا نے "روپیہ کی کہانی" لکھی، حالانکہ بالآخر وہ خود "راکھ کی کہانی" بننے والے تھے۔ یہی ہر آدمی کا معاملہ ہے۔ ہر آدمی اپنی کامیابی کی داستان لکھ رہا ہے۔ حالانکہ آخر کار وہ جہاں پہنچنے والا ہے وہ مکمل بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جب سفر ختم ہوگا

ایکسپرس ٹرین لمبا سفر طے کرنے کے بعد منزل پر پہنچ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ظاہر ہونے والے آثار بتا رہے تھے کہ آخری اسٹیشن قریب آگیا ہے۔ ٹرین کے سیکڑوں مسافروں میں نئی زندگی پیدا ہوگئی تھی۔ کوئی بستر باندھ رہا تھا۔ کوئی کپڑے بدل رہا تھا۔ کوئی اشتیاق بھری نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی، ہر ایک آنے والے پُر مسرت لمحہ کا منتظر تھا جبکہ وہ ٹرین سے اتر کر اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔

اچانک زور کا دھماکا ہوا۔ ایکسپرس ٹرین یارڈ میں کھڑی ہوئی دوسری ٹرین سے ٹکرا گئی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ـــــــ خوشیاں اچانک غم میں تبدیل ہوگئیں۔ زندگیاں موت کی آغوش میں سوگئیں، امیدوں کے محل کی ایک ایک اینٹ بکھر گئی۔ ایک کہانی جس کا اختتام بظاہر طربیہ (Comedy) پر ہو رہا تھا، اپنے آخری نقطہ پر پہنچ کر اچانک المیہ (Tragedy) میں تبدیل ہوگیا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ زندگی کا ہے۔ آدمی بے شمار کوششوں کے بعد پُر اعتماد معاشی زندگی بناتا ہے۔ وہ اپنے حوصلوں کو ایک بنے ہوئے گھر کی صورت میں تعمیر کرتا ہے۔ وہ اپنے لئے ایک کامیاب زندگی کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر عین اس وقت اس کی موت آجاتی ہے۔ اپنے گھر کو سونا چھوڑ کر وہ قبر میں لیٹ جاتا ہے۔ اس کا چکنا جسم مٹی اور کیڑے کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کی کوششوں کا حاصل اس سے اس طرح جدا ہو جاتا ہے جیسے آدمی اور اس کے درمیان کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

"کوٹھی" کا خواب دیکھنے والا مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ "قبر" میں داخل ہو، وہ قبر کے راستہ سے گزر کر حشر کے میدان میں پہنچ جائے۔ یہ دوسری دنیا اس کی آرزوؤں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں وہ اتنا مفلس ہوتا ہے کہ اس کے جسم پر کپڑا بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ساری کمائی اس سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھی اس سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اس کا زور اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز وہاں اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود نہیں ہوتی جن کے بل پر وہ دنیا میں گھمنڈ کر رہا تھا۔

آہ وہ سفر بھی کیسا عجیب ہے جو عین اختتام پر پہنچ کر حادثہ کا شکار ہو جائے۔

قبر نہیں دروازہ

"حافظ جی کے لڑکے کا انتقال ہوگیا ہے۔ جنازہ کی نماز تیار ہے۔ میں آپ کو بلانے کے لئے آیا ہوں"۔ یہ سنتے ہی میں نے کتاب بند کی اور وضو کر کے ان کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

قبرستان پہنچا تو وہاں میرے سوا تھوڑے سے آدمی اور کھڑے تھے۔ گنا تو چھوٹے بڑے سترہ آدمی تھے جن میں میت کے گھر کے افراد بھی شامل تھے۔ مجھے ایک مہینہ پہلے کی بات یاد آئی جب کہ سیٹھ فضل علی کے ایک رشتہ دار کا جنازہ اسی قبرستان میں آیا تھا اور قبرستان کے خصوصی حصہ میں دفن ہوا تھا۔ اس دن آدمیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ شمار کرنا مشکل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بستی کی تمام مسلم آبادی نکل آئی ہے۔

میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد محلہ کے امام صاحب نماز جنازہ کے لئے کھڑے ہوگئے۔ میں نے بھی صف میں شامل ہو کر نیت باندھ لی مگر امام صاحب نے اتنی تیزی سے نماز پڑھائی کہ میں کوئی دعا بھی پوری نہ پڑھ سکا۔ بس جلدی جلدی چار بار اللہ اکبر کی آواز آئی اور تھوڑی دیر بعد انھوں نے سلام پھیر دیا۔ لوگ اپنے جوتے پہن کر اطمینان کے ساتھ اس طرح کھڑے ہوگئے گویا "نماز جنازہ" کے نام سے جو کام انھیں کرنا تھا اس کو انھوں نے پوری طرح انجام دے دیا ہے۔

قبر قریب ہی تھی۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابھی کھودی جارہی ہے۔ لوگ دو دو چار چار کر کے اِدھر اُدھر کھڑے ہوگئے۔ کوئی فرقہ وارانہ مظالم کی داستان سنانے لگا۔ کسی نے موسم کی سختی کا ذکر چھیڑ دیا۔ کوئی بازار بھاؤ کے متعلق اپنی معلومات پیش کرنے لگا۔ غرض اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔

میں قبر کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ میرے ذہن میں وہ آیتیں اور حدیثیں گھوم رہی تھیں جن میں قیامت، حشر، جنت، دوزخ وغیرہ کے حالات بتائے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قبر ایک کھلا ہوا دروازہ ہے جس کے سامنے کھڑے ہو کر میں دوسری دنیا کے مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میرا دل بے قرار ہوگیا۔ میری زبان سے نکلا "زندگی کا اصل مسئلہ وہ نہیں ہے جس میں لوگ الجھے ہوئے ہیں۔ بلکہ اصل مسئلہ وہ ہے جو موت کے بعد سامنے آنے والا ہے۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وہ اس وقت کس واقعہ کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایک شخص کی عارضی دنیا سے حقیقی دنیا کی طرف روانگی کی تقریب ہے۔ یہ قبر جو ہمارے سامنے کھودی جارہی ہے، یہ قبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک دروازہ ہے جو ایک شخص کو دوسری دنیا میں داخل کرنے کے لئے کھولا گیا ہے۔ جانے والا ابھی اس دروازہ میں داخل ہو کر اُس پار چلا جائے گا۔

جب بھی کوئی شخص مرتا ہے تو یہ ایک خاص وقت ہوتا ہے۔ اس وقت گویا تھوڑی دیر کے لئے اس دنیا کا دروازہ کھولا جاتا ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو اس کھلے ہوئے دروازہ سے دوسری دنیا کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے جہاں ہم میں سے ہر شخص کو ایک روز جانا ہے۔ مگر آج کی دنیا کے مناظر نے لوگوں کی نگاہوں کو اس قدر الجھا رکھا ہے کہ عین دروازہ پر کھڑے ہو کر بھی انھیں اس پار کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ وہ حقیقت کے انتہائی قریب پہنچ کر بھی حقیقت سے بے خبر رہ جاتے ہیں۔

گڑھے میں پاؤں

مسٹر پی۔ وی۔ وینکٹیشورن ایک سرکاری ادارہ میں چیف مارکٹنگ منیجر تھے۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۲ کی شام کو انھوں نے دہلی کے گوپالا ٹاور میں ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ آٹھویں منزل پر اپنی میٹنگ سے فارغ ہوکر وہ دفتر سے باہر نکلے تو بجلی فیل ہوچکی تھی، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ لفٹ تک آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ سمجھے کہ لفٹ آگئی ہے حالاں کہ لفٹ ابھی اوپر نویں منزل پر تھی۔ مسٹر وینکٹیشور لفٹ کے دروازے کی طرف لپکے۔ اس وقت وہ میٹنگ کے فیصلوں سے اتنا خوش تھے کہ وہ صورت حال کی نزاکت کا اندازہ نہ کرسکے۔ انھوں نے اپنا ایک پاؤں لفٹ کے اندر ڈال دیا۔ مگر وہاں خالی تھا۔ وہ اچانک آٹھویں منزل سے زمین پر آگئے۔ ان کا ذاتی ڈاکٹر ان کے ساتھ تھا مگر وہ صرف یہ خدمت انجام دے سکا کہ نیچے اتر کر ان کی لاش کو دیکھے اور ان کے مردہ ہونے کا اعلان کرے۔ موت کے وقت ان کی عمر اکیاون سال تھی (ہندستان ٹائمس ۳۰ مئی ۱۹۸۲)

مسٹر وینکٹیشور ایک نہایت کامیاب افسر تھے۔ حال میں ایک سرکاری جرنل میں ان کے بارے میں یہ الفاظ چھپے تھے ——— ایک بہادر کارکن، ایک مستعد اور اختراعی منتظم، جس کے اندر میں آگ لگی ہوئی ہو اور جس کے دماغ میں نظریات کا خزانہ ہو، ایک ہوشیار جنرل:

A thoroughbred professional and a dashing innovative manager
with fire in his belly and ideas in his mind, an astute general

دنیا کے اعتبار سے مسٹر وینکٹیشور کا کیس ایک انوکھا کیس ہے۔ مگر آخرت کے اعتبار سے ہر آدمی یہی فعل انجام دے رہا ہے، ہر آدمی عقل مندی اور کامیابی کے جوش میں ایسی جگہ اپنا پاؤں رکھ رہا ہے جو اس کو سیدھے آخرت کے گڑھے میں گرا دینے والا ہے ——— کسی کو بے عزت کرنے والے الفاظ بولنا، کسی کو ستانے کے لئے اقدام کرنا، کسی کے خلاف ضد اور انتقام کے تحت کارروائی کرنا، کسی کے ساتھ ظلم اور بے انصافی برتنا۔ کسی کو ناحق اپنے زور و طاقت کا نشانہ بنانا، کسی کا بے دلیل مذاق اڑانا، یہ سب گویا "آٹھویں منزل" کے خالی مقام پر پاؤں رکھنا ہے۔ ایسا ہر اقدام آدمی کو تباہی کے نچلے گڑھے میں پہنچا دیتا ہے۔ اس کے بعد نہ اس کے ساتھی اس کو بچانے والے ثابت ہوسکتے ہیں نہ اس کی خوش فہمیاں ——— ہر آدمی گڑھے میں پاؤں رکھ رہا ہے۔ اگرچہ بطور خود وہ سمجھتا ہے کہ وہ محفوظ تختہ پر اپنا قدم جمائے ہوئے ہے۔

انسان کا المیہ

ڈاکٹر اتم پرکاش (۱۹۲۸-۱۹۸۲) ہندستان کے ایک نامور سرجن تھے۔ وہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں شعبہ سرجری کے ہڈ تھے۔ ڈاکٹر پرکاش کو پدم بھوشن کا انعام ملا تھا۔ سرجری کی عالمی کانگرس ۱۷ فروری کو دہلی میں ہونے والی تھی جس کی صدارت کی کرسی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر ۱۴ فروری کو ان پر دل کا دورہ پڑا اور اسپتال پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۵۴ سال تھی۔

سرجری پر ہونے والی ورلڈ کانگرس کی کامیابی ان کے ذاتی وقار کو بہت زیادہ بڑھا دیتی۔ اس بنا پر وہ اس کے معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ انھوں نے راشٹرپتی سنجیوا ریڈی کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ کانگرس کا افتتاح کریں۔ مگر جب سارے انتظامات مکمل ہو چکے تو راشٹرپتی بھون سکریٹریٹ سے بتایا گیا کہ راشٹرپتی ان کے اجلاس میں صرف اس وقت شرکت کر سکیں گے جب کہ مرکزی وزیر صحت بھی وہاں موجود ہوں۔ پروٹوکول (آداب شاہی) کے مطابق ایسا ہونا ضروری ہے۔

اس سے پہلے ڈاکٹر پرکاش کے منصوبہ میں وزیر صحت کو بلانا شامل نہ تھا۔ مگر اب ضروری ہو گیا کہ وزیر صحت کو بھی شرکت اجلاس کی دعوت دی جائے۔ ڈاکٹر پرکاش نے وزیر صحت کے دفتر کا طواف شروع کیا۔ مگر اب یہاں دوسری رکاوٹ حائل تھی۔ وزیر صحت اجلاس میں شرکت پر راضی نہ ہو سکے۔ ایک ایسے اجلاس میں شرکت کرنا ان کی عزت نفس کے خلاف تھا جس کے اولین پروگرام میں ان کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ یہ صدمات ڈاکٹر اتم پرکاش کے لئے اتنے سخت ثابت ہوئے کہ اجلاس کے تین دن پہلے ان پر دل کا سخت دورہ پڑا اور اسی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کوئی شخص اپنے وقت سے پہلے نہیں مرتا۔ مگر ایک اخباری مبصر (ہندستان ٹائمس ۱۶ فروری ۱۹۸۲) کے یہ الفاظ بالکل درست ہیں کہ موت کے طویل سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہ دہلی کے سب سے زیادہ پریشان آدمی تھے:

He was the most worried man in town before he took the long road

آج آدمی وقار کے کھونے کو بھی برداشت نہیں کر پاتا۔ پھر آنے والی دنیا میں آدمی کا کیا حال ہوگا۔ جب اس کو بھوک اور پیاس لگے گی مگر وہاں کھانا نہ ہوگا جس کو وہ کھائے اور پانی نہ ہوگا جس سے وہ اپنی پیاس بجھائے۔ وہ تیز دھوپ میں جل رہا ہوگا مگر اس کے لئے کوئی سایہ نہ ہوگا جس کے نیچے وہ پناہ لے۔ عذاب اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگا مگر وہاں کوئی مددگار نہ ہوگا جو اس کی مدد کو پہنچے۔ آہ وہ انسان جو کنکری کی چوٹ کو برداشت نہیں کر پاتا حالانکہ اس کے اوپر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ کر گرنے والا ہے۔

چھوڑنے کے لئے

برطانی دورِ حکومت میں ہندستان کا دار السلطنت کلکتہ تھا۔ ۱۹۱۱ میں برطانیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ دار السلطنت کو کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا جائے۔ انگریز ماہر تعمیرات سرایڈ ون لیوٹنس (۱۸۶۹-۱۹۴۴) نے نئے دار السلطنت کا نقشہ بنایا۔ ۱۹۱۳ میں پرانی دہلی کے جنوب میں رائے سینا پہاڑیوں کے علاقہ میں تعمیرات شروع ہوئیں۔ بالآخر وہ عالی شان آبادی وجود میں آئی جس کو نئی دہلی کہا جاتا ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کہ ساری دنیا میں ایک نئی سیاسی لہر آچکی تھی۔ یہ قومی تحریکوں کی لہر تھی۔ سیاسی افکار کی دنیا میں نئے انقلابات نے نوآبادیاتی نظام کا جواز ختم کر دیا تھا۔ ہندستان میں آزادی کی تحریک تیزی سے جڑ پکڑ رہی تھی۔ بظاہر یہ بات کھل چکی تھی کہ ہندستان میں برطانیہ کی حکومت اب زیادہ دیر تک باقی رہنے والی نہیں۔

نئی دہلی کی تعمیر کے بعد اسی زمانہ میں فرانس کے ایک لیڈر نے ہندستان کا دورہ کیا۔ جب وہ نئی دہلی آئے اور یہاں نیا تعمیر شدہ عظیم دار السلطنت دیکھا تو انھوں نے اس پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہا: ——— انھوں نے کیسی شاندار دنیا بنائی ہے، صرف اس لئے کہ وہ اسے چھوڑ دیں:

What a magnificent world they built to leave

یہ کہانی صرف برطانیہ کی کہانی نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ یہاں ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کو لئے ہوئے دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ اپنی تمام قوتوں کا استعمال کر کے وہ اپنا ایک "شاندار گھر" بناتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب کہ اس کی آرزوؤں کا گھر بن کر مکمل ہوتا ہے، اچانک موت کا فرشتہ آجاتا ہے اور اس کو اس کی محنتوں سے بنائی ہوئی دنیا سے جدا کر کے وہاں پہنچا دیتا ہے جس کو آرتھر کوئسلر نے نامعلوم ملک Unknown Country کا نام دیا ہے۔

زندگی کی کہانی اگر اتنی ہی ہو تو وہ کیسی عجیب دردناک کہانی ہے۔ مگر جس طرح دنیا کی ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا کا بھی ایک تکمیلی جوڑا ہے۔ اور وہ جوڑا آخرت ہے۔ جو شخص آخرت کو بھولا ہوا ہے اس کی زندگی یقیناً صرف ایک المیہ ہے۔ مگر جو شخص امکان آخرت سے فائدہ اٹھائے اور موجودہ دنیا کے مواقع کو اگلی دنیا کی تعمیر میں صرف کرے۔ اس کے لئے موجودہ دنیا ایک نئی زیادہ کامیاب زندگی کا قیمتی زینہ بن جائے گی۔

آخرت کے بغیر انسان کی زندگی صرف ایک المیہ ہے۔ مگر آخرت کو ملانے کے بعد وہ ایک طربیہ میں بدل جاتی ہے۔

موت کا سبق

ایک مجرم کو بتایا گیا کہ عدالت اس کے خلاف فیصلہ کر چکی ہے اور کل صبح اس کو پھانسی دے دی جائے گی۔ پھانسی اگرچہ کل کے دن ہونے والی تھی مگر آج ہی اس کا یہ حال ہوا گویا اس کو پھانسی دی جا چکی ہو۔ زندگی اس کے لئے بے قیمت ہو گئی۔ اس کا ہنسنا اور بولنا ختم ہو گیا۔ اس کے ہاتھ جو دوسروں کے خلاف اٹھتے تھے، اب اس قابل نہ رہے کہ کسی کے خلاف اٹھیں۔ اس کے پاؤں جو ہر طرف دوڑنے کے لئے آزاد تھے، اب ان میں یہ طاقت بھی نہ رہی کہ وہ کہیں بھاگنے کی کوشش کریں۔

موت بتاتی ہے کہ یہی معاملہ ہر ایک کا ہے۔ ہر آدمی جو آج زندہ نظر آتا ہے، کل کے دن اسے "پھانسی" کے تختہ پر لٹکنا ہے۔ مگر ہر آدمی اس سے بے خبر ہے۔ ہر ایک اپنے آج میں گم ہے، کسی کو اپنے کل کا احساس نہیں۔ یہاں ہر آدمی "مجرم" ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اپنے مجرم ہونے کو جانتے ہوں۔

آدمی زمین پر چلتا پھرتا ہے۔ وہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ وہ اپنے مال اور اپنے ساتھیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ اس سے پوچھے بغیر اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔ اس کے چلتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں۔ اس کی دیکھنے والی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی ہر چیز سے جدا ہو کر قبر کی تنہائی میں چلا جاتا ہے۔

موت کا یہ واقعہ آدمی کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ آدمی اختیار سے بے اختیاری کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اجالے سے اندھیرے کی طرف جا رہا ہے۔ وہ سب کچھ سے بے کچھ کی طرف جا رہا ہے۔ موت سے پہلے وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں وہ اپنے ارادہ کا آپ مالک ہے۔ موت کے بعد وہ ایک ایسی دنیا میں چلا جاتا ہے جہاں وہ کسی اور کی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور ہوگا۔

آدمی اگر اس حقیقت کو یاد رکھے تو اس کی زندگی بالکل بدل جائے۔ کسی پر قابو پاکر اسے ستانا اس کو مضحکہ خیز معلوم ہو۔ کیونکہ جو شخص خود کل دوسرے کے قابو میں جانے والا ہے وہ کسی کو ستا کر کیا پائے گا۔ اپنے کو بڑا سمجھنے پر اسے شرم آئے گی۔ کیونکہ جو بڑائی بالآخر چھن جانے والی ہو اس کی کیا حقیقت۔

موت کا حملہ

سکندر اعظم (۳۲۳ - ۳۵۶ ق م) یونانی بادشاہ فلپ کا لڑکا تھا۔ اس نے تخت ملنے کے بعد دس سال کی مدت میں اس زمانہ کی معلوم دنیا کا بیشتر حصہ فتح کر ڈالا۔ مصر کا شہر اسکندریہ اس کے فتح مصر کی یادگار کے طور پر اب بھی موجود ہے۔ مگر بالآخر اس کا انجام کیا ہوا۔ وہ عراق کے قدیم شہر بابل کے ایک محل میں اسی طرح بے بسی کے ساتھ مرگیا جس طرح ایک غریب اور کمزور آدمی اپنی جھونپڑی میں مرتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں جو چاہا وہ پایا اور پھر سب کچھ پاکر خالی ہاتھ اس دنیا سے چلا گیا۔ اس کی وسیع سلطنت اس کے مرنے کے بعد اس کے تین فوجی سرداروں میں تقسیم ہوگئی، کیونکہ اس کا واحد بیٹا اس کی زندگی ہی میں قتل کیا جا چکا تھا۔

سکندر کی عظمت کا یہ حال تھا کہ جولیس سیزر ایک بار اسپین میں سکندر کے مجسمہ کے سامنے سے گزرا تو اس کو دیکھ کر وہ بے اختیار رونے لگا۔ اس نے کہا کہ سکندر نے جو فاتحانہ کارنامے دس برس کی مدت میں انجام دئے اس کا دسواں حصہ بھی میں اب تک انجام نہ دے سکا۔

سکندر مخالفت کو بالکل برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ مخالفت شروع ہوتے ہی اس کو فوراً کچل دینا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر کی غیر معمولی فتوحات کا باعث اس کی برق رفتاری تھی۔ اچانک پہنچ کر دشمن کو دبوچ لینے کی صلاحیت اس کے اندر دنیا کے تمام جنرلوں سے زیادہ تھی، مگر موت اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ثابت ہوئی۔ ۱۳ جون ۳۲۳ ق م کو جب موت اس کے اوپر حملہ آور ہوئی تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو بالکل بے بسی کے ساتھ موت کے حوالے کردے۔

موت اس لئے آتی ہے کہ وہ انسان کو بتائے کہ وہ خدا کے آگے کس قدر بے بس ہے۔ آدمی ہر روز اپنے چاروں طرف موت کے واقعات کو دیکھتا ہے مگر وہ اس سے کوئی سبق نہیں لیتا۔ وہ زندگی کی اس سب سے بڑی حقیقت کو بھولا رہتا ہے، یہاں تک کہ موت آکر اس سے خود اس مہلت کو چھین لیتی ہے کہ وہ سوچے اور اس سے سبق لے۔ موت آدمی کے لئے سب سے بڑا سبق ہے، مگر موت سے آدمی سب سے کم جو چیز لے رہا ہے وہ یہی ہے۔

آنے والا طوفان

۱۱ اگست ۱۹۷۹ کو موروی (گجرات) میں اچانک ایک سیلاب آیا جس نے پوری بستی کو تہس نہس کر دیا۔ بستی کے کنارے ایک بڑا بند تھا۔ غیر معمولی بارش سے اس کا پانی بہت اونچا ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس نے بند کو توڑ ڈالا۔ ایک مشاہد کے الفاظ میں "تقریباً ۲۰ فٹ اونچی پانی کی دیوار" اتنی تیزی کے ساتھ بستی کے اندر داخل ہوئی کہ کوئی اس سے بچ نہ سکتا تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر پانی کا یہ طوفان بستی کی تمام چیزوں کو برباد کر کے نکل گیا۔ اندازہ ہے کہ تقریباً ۲۵ ہزار آدمی اس اچانک سیلاب میں مرگئے۔ جب کہ بستی کی کل آبادی تقریباً ۴۰ ہزار تھی۔ بربادی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ دیگر چندوں کے علاوہ صرف مرکزی حکومت نے فوری امداد کے طور پر پانچ کرور روپے حکومت گجرات کو دئے ہیں۔

ایک انگریزی اخبار کے نامہ نگار ارن کمار نے جو چشم دید رپورٹ (ہندستان ٹائمس ۱۹ اگست ۱۹۷۹) شائع کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ بچے ہیں ان میں سے ہر شخص کے پاس بتانے کے لئے ایک پُر درد کہانی ہے۔ ان کو جو صدمہ اور تکلیف پہنچی ہے اس کے احساس سے وہ ابھی تک نکل نہیں سکے ہیں، کچھ کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی گویائی کھو دی ہے۔ وہ بالکل سراسیمہ اور ہکا بکا دکھائی دیتے ہیں:

Some have lost their speech and look absolutely dazed and blank.

ایک اور خبر میں بتایا گیا ہے کہ ایک تباہ حال زمین دار کو اس وقت حیرت ناک خوشی ہوئی جب سرکاری ذمے داروں نے اس کو ۱۸ ہزار روپے نقد اور ۲۲۵ گرام سونے کے زیورات یہ کہہ کر دئے کہ یہ تمھارے گھر کے اندر سے دستیاب ہوئے ہیں (ہندستان ٹائمس ۲۰ اگست ۱۹۷۹)

اس طرح کے واقعات جو زمین پر روزانہ ہوتے رہتے ہیں، وہ اس لئے ہوتے ہیں تاکہ آدمی آخرت کے دن کو یاد کرے۔ آخرت کا عظیم تر سیلاب بھی بالکل اچانک آئے گا۔ بہت سے لوگ اس دن اس طرح برباد ہوں گے کہ ان کے الفاظ کے ذخیرے تک ختم ہو جائیں گے جو دنیا میں ہر آدمی کو نہایت وافر مقدار میں حاصل ہیں۔ ان کی چلتی ہوئی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ وہ سراسیمہ نظروں سے اپنی ہولناک بربادی کو دیکھیں گے اور کچھ بول نہ سکیں گے۔ دوسری طرف کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو یہ خوش خبری دی جائے گی کہ ہلاکت اور بربادی کے عمومی طوفان نے تم کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا۔ تمھارا بہترین اثاثہ اللہ کے مزید انعام کے ساتھ آج تمھارے حوالے کیا جائے گا۔ ایک ہی سیلاب کچھ لوگوں کو جہنم میں دھکیل دے گا اور کچھ لوگوں کے لئے وہ جنت کی ابدی خوشیوں میں داخلہ کا دن بن جائے گا۔ "سیلاب" سے پہلے آدمی کا حال، یہ ہے کہ وہ اپنے ہر ظالمانہ روش کو درست ثابت کرنے کے لئے شان دار الفاظ پالیتا ہے۔ مگر "سیلاب" کی ہولناکی کو دیکھتے ہی اس کا سارا زور ختم ہو جائے گا اور ایسا معلوم ہوگا گویا اس کے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں جن سے وہ اپنی روش کی صفائی پیش کر سکے۔

اس وقت کیا ہوگا

بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ مجھے قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر سناؤ (اقرأ علی) میں نے کہا، اے خدا کے رسول میں آپ کو قرآن سناؤں اور وہ آپ کے اوپر اترا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں، مجھے پسند ہے کہ میں قرآن کو اپنے سوا دوسرے سے سنوں۔ میں نے سورۂ نساء پڑھنی شروع کی۔ یہاں تک کہ میں اس آیت پر پہنچا: فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنابک علیٰ ھٰؤلاء شہیدا (پھر کیا ہوگا جب ہم ہر قوم سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور ان لوگوں پر تم کو گواہ بنا کر لائیں گے) آپ نے فرمایا، بس کرو۔ میں نے دیکھا تو آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے (فاذا عیناہ تذرفان)

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب خدا کی عدالت قائم ہوگی۔ کسی کے لئے ڈھٹائی اور انکار کا موقع نہ ہوگا۔ وہی شخص جس کو دنیا میں لوگوں نے بے قیمت سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا اسی کو خدا کی طرف سے اس خاص بندہ کی حیثیت سے سامنے لایا جائے گا جس کو خدا نے اپنی طرف سے لوگوں کو آنے والے دن سے باخبر کرنے کے لئے چنا تھا۔ جس کو لوگوں نے اپنے درمیان سب سے کمزور آدمی سمجھ لیا تھا وہی اس وقت خدا کے حکم سے وہ شخص ہوگا جس کی گواہی پر لوگوں کے لئے جنت اور جہنم کا فیصلہ کیا جائے۔

ان لوگوں کا اس وقت کیا حال ہوگا جو دنیا میں بہت بولنے والے تھے مگر وہاں اپنے آپ کو گونگا پائیں گے۔ جو دنیا میں عزت اور طاقت والے سمجھے جاتے تھے وہاں اپنے آپ کو بالکل بے زور دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ جب ان کا ظاہری پردہ اتارا جائے گا اور لوگ دیکھیں گے کہ دین کا لبادہ پہننے والے دین سے بالکل خالی تھے۔ جب کتنی سفیدیاں کالی نظر آئیں گی اور کتنی رونقیں اتنی قبیح ہو جائیں گی کہ لوگ اس کی طرف نظر کرنے سے بھی گھبرائیں گے۔

موجودہ دنیا میں لوگ مصنوعی غلافوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ کسی کے لئے خوبصورت الفاظ اس کی اندرونی حالت کا پردہ بنے ہوئے ہیں اور کسی کے لئے اس کی مادی رونقیں۔ مگر آخرت میں لوگوں کے الفاظ بھی ان سے چھن جائیں گے اور ان کی مادی رونقیں بھی۔ اس وقت ہر آدمی اپنی اصلی صورت میں سامنے آجائے گا۔ کیسا سخت ہوگا وہ دن۔ اگر آج لوگوں کو اس کا اندازہ ہو جائے تو ان کے الفاظ کی شدت ختم ہو جائے، کسی چیز میں ان کے لئے لذت باقی نہ رہے۔ دنیا کی عزت بھی ان کو اتنی ہی بے معنی معلوم ہو جتنا دنیا کی بے عزتی۔

دنیا کی حقیقت

مسٹر آر۔ این پانڈے (۲۵ سال) ہندستانی فوج میں سکنڈ لفٹننٹ تھے۔ وہ ۱۲ نومبر ۱۹۸۳ کو جموں توی اکسپریس پر سوار ہوئے۔ ٹرین آگے بڑھی تو انھیں احساس ہوا کہ وہ غلط ٹرین پر سوار ہو گئے ہیں۔ انھیں دراصل اُتکل اکسپریس پر سوار ہونا چاہئے تھا۔ جب اوکھلا کا اسٹیشن آیا تو وہ فرسٹ کلاس کا دروازہ کھول کر باہر کود پڑے۔ ٹرین اس وقت پوری رفتار میں تھی۔ وہ پہیہ کے نیچے آگئے اور اسی وقت کٹ کر مر گئے (ہندستان ٹائمس ۱۳ نومبر ۱۹۸۳)

یہ واقعہ موجودہ دنیا میں انسان کی بے بسی کی ایک تصویر ہے۔ انسان ٹرین بناتا ہے جب وہ اس پر بیٹھتا ہے تو وہ اس کو لے کر دوڑتی ہے اور منزل پر پہنچا دیتی ہے۔ مگر اسی ٹرین کے مقابلہ میں انسان اتنا کمزور ہے کہ اس کے پہیہ کے نیچے آنے کے بعد وہ اس کی زد سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔

ایک کامیاب انسان ہے۔ وہ ایک بہت بڑے مکان میں رہتا ہے جو اس کی خوش حال زندگی کی علامت ہے۔ اس کے گھر کے سامنے موٹر کار کھڑی ہوتی ہے جو اس کی شان میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ ایک کارخانہ کا مالک ہے جو اس کی دولت اور ترقی کا سرچشمہ ہے۔ اس کے بے شمار ساتھی ہیں جو اس کی قوت و شوکت کا زندہ ثبوت ہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن سے آدمی کی دنیوی ترقی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ تمام چیزیں سمیٹ کر اوپر سے آدمی کے سر پر گرائی جائیں تو وہ اس کی بربادی کا ذریعہ بن جائیں گی۔ یہ گویا ایک بہت بڑا ملبہ ہوگا جو آدمی کے اوپر پٹک دیا گیا اور اس کے نیچے دب کر اس کا وجود فنا ہو گیا۔

اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دنیوی ترقی کی حقیقت کیا ہے۔ دنیا کی تمام ترقیاں اسی وقت تک ترقیاں نظر آتی ہیں جب تک وہ فریب کے روپ میں ہوں۔ جیسے ہی وہ اپنے اصلی روپ میں آئیں وہ صرف بربادی کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ یہ ترقیاں اپنے آخری انجام کے اعتبار سے کسی کے لئے قبرستان تو بن سکتی ہیں مگر وہ کسی کے لئے کامیابی کا شاندار محل نہیں بن سکتیں۔

لذتیں جنت میں لذت ہیں اور دنیا میں صرف فریب لذت۔ انسان کی غلطی یہ ہے کہ جو چیز جنت میں ملنے والی ہے اس کو وہ موجودہ دنیا ہی میں پانا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے آدمی یہاں بھی محروم رہتا ہے اور وہاں بھی۔

کل کو جانیے

ضیاء الرحمن (۱۹۸۱-۱۹۳۶) سابق صدر بنگلہ دیش ڈھاکہ سے چاٹگام گئے۔ وہاں وہ ۳۰ مئی ۱۹۸۱ کو سرکاری ریسٹ ہاؤس میں آرام کر رہے تھے کہ رات کے وقت ان پر حملہ کرکے انھیں ہلاک کر دیا گیا۔ ان کو ہلاک کرنے والا بنگلہ دیش کا ایک فوجی افسر میجر جنرل منظور تھا۔ میجر جنرل منظور نے یہ گمان کیا تھا کہ صدر ضیاء الرحمن کو اقتدار سے ہٹانے کے بعد وہ بنگلہ دیش کی حکومت پر قبضہ کرلیں گے۔ مگر ان کا اندازہ غلط نکلا۔ فوج کے ایک دستہ کے سوا عام فوجیوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ صرف دو دن بعد ۲ جون ۱۹۸۱ کو مخالف فوجیوں نے انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

جنرل منظور کا جو انجام ہوا وہی اس دنیا میں ہر آدمی کا انجام ہو رہا ہے۔ کسی کا بظاہر فوج کی گولی کے ذریعہ ہوتا ہے اور کوئی فرشتوں کے ذریعہ موت کے انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ کوئی "جنرل منظور" یہ نہیں سوچتا کہ اپنے حریف کو قتل کرنے کے اگلے ہی دن وہ بھی قتل کر دیا جائے گا۔ دوسرے کو موت کے گڑھے میں گرانے کے بعد وہ خود بھی لازمی طور پر موت کے گڑھے میں دھکیل دیا جائے گا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو کسی نہ کسی دائرہ میں اقتدار دیا جاتا ہے۔ کسی کے اختیار کا دائرہ بڑا ہے اور کسی کا دائرہ چھوٹا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہر آدمی اپنے دائرہ میں وہی بن جاتا ہے جو دوسرا اپنے دائرہ میں بنا ہوا ہے۔ یہاں ہر شخص "جنرل منظور" ہے۔ ہر شخص دوسرے کی کاٹ میں لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوسرے کی نفی پر اپنا اثبات کرنا چاہتا ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کا غلط اندازہ کرکے سمجھتا ہے کہ اگر اس نے دوسرے کو اس کے مقام سے ہٹا دیا تو اس کا خالی مقام اسے مل جائے گا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ جو چیز اس کا انتظار کر رہی ہے وہ کسی کا خالی مقام نہیں بلکہ خود اس کی اپنی قبر ہے۔

ہر شخص جو آج اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے وہ کل اپنے کو ناکام دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہر روز ہو رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص آج کے بعد آنے والے کل کو نہیں دیکھتا۔ ہر شخص اپنے "آج" کو جاننے کا ماہر ہے، کسی کو اپنے "کل" کی خبر نہیں۔

اپنے آج کو جاننے والو، اپنے کل کو جانو۔ کیونکہ بالآخر تم جس سے دوچار ہونے والے ہو وہ تمھارا کل ہے نہ کہ تمھارا آج۔

بے خبر انسان

آئیوری کوسٹ مغربی افریقہ کا ایک ساحلی ملک ہے۔ یہاں بجلی افراط کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ گھروں اور دکانوں کی جگمگاہٹ کی وجہ سے اس کو افریقہ کا شوکیس کہا جاتا تھا (ٹائمس آف انڈیا ۴ جنوری ۱۹۸۴)

دسمبر ۱۹۸۳ میں اچانک وہ ایسا ملک بن گیا جہاں لوگ عالی شان ہوٹلوں میں موم بتی کی روشنی میں کھانا کھائیں اور گھروں اور دفتروں کو بھی موم بتی سے روشن کریں۔ آئیوری کوسٹ میں ۹۲ فی صد پن بجلی کا رواج تھا۔ مگر بارش رک جانے کی بنا پر ڈیم سوکھ گئے اور اکثر ٹربائن کا چلنا بند ہو گیا۔ چنانچہ بجلی کی کٹوتی کا یہ عالم ہوا کہ بعض اوقات مسلسل ۱۸ گھنٹے تک بجلی غائب رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعتی پیداوار گھٹ کر ۲۵ فی صد رہ گئی۔ کمپوٹر، الکٹرک ٹائپ رائٹر، ریفریجریٹر، اور اکثر بجلی سے چلنے والی چیزیں بند رہنے لگیں۔

بہت سے بڑے بڑے تاجروں نے اس اندیشہ سے دفتر جانا چھوڑ دیا کہ کہیں وہ لفٹ میں اٹک کر نہ رہ جائیں۔ ایک تاجر نے اپنا حال بتاتے ہوئے نیویارک ٹائمز کے نمائندہ سے کہا کہ سالہا سال سے میرا یہ حال تھا کہ میں اپنے ایرکنڈیشنڈ مکان سے ایرکنڈیشنڈ کار میں اور پھر ایرکنڈیشنڈ دفتر میں جاتا تھا۔ میں نے کبھی یہ جانا ہی نہیں کہ حقیقۃً آئیوری کوسٹ کتنا زیادہ گرم ہے:

For years, I had gone from my air-conditioned villa to my air-conditioned car to my air-conditioned office. I never realised just how hot it really is here.

افریقہ جیسے گرم ملک میں ایرکنڈیشنڈ ماحول میں رہنے والا تاجر گویا ایک مصنوعی دنیا میں رہ رہا تھا۔ جب بجلی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اس وقت اس کو معلوم ہوا کہ اصل صورت حال اس کے برعکس تھی جس کو وہ اپنے ذہن میں بطور خود فرض کئے ہوئے تھا۔

یہی حال زیادہ بڑے پیمانے پر تمام انسانوں کا ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو آزاد پاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ جب انسان کی موت آئے گی اس وقت اچانک اس کو معلوم ہوگا کہ یہ محض فریب تھا ـــــ اس نے امتحان کی آزادی کو استحقاق کی آزادی سمجھ لیا تھا۔ اس نے خدا کے اثاثہ کو اپنا اثاثہ فرض کر لیا تھا۔ وہ اپنے اعمال کے لئے خدا کے یہاں جواب دہ تھا مگر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ وہ خواہ کچھ بھی کرے کوئی اس سے پوچھ گچھ کرنے والا نہیں۔

آخری منزل

ایورسٹ دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ ہمالیہ کی یہ مشہور چوٹی سطح سمندر سے ۲۹۰۲۸ فٹ (۸۸۴۸ میٹر) بلند ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلا قابلِ ذکر شخص جس نے اس بلند چوٹی پر اپنا قدم رکھنے کی سنجیدہ کوشش کی وہ ایک انگریز موریس ولسن (Maurice Wilson) تھا۔ اس نے ۱۹۳۴ میں اس کے اوپر چڑھائی کی۔ مگر جس چیز کو اس نے اپنی زندگی کا کلائمکس سمجھا تھا وہ اس کے لئے اینٹی کلائمکس (Anti-climax) بن گیا۔

موریس ولسن پہلی جنگ عظیم میں ایک سپاہی تھا۔ اس کو دنیا کی "آخری بلندی" پر پہنچنے کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ اس نے اپنے خاندان کی کامیاب تجارت کو اس کے اوپر قربان کر دیا۔ اس نے اپنا تمام سرمایہ خرچ کرکے ذاتی طور پر ایک سکنڈ ہینڈ ہوائی جہاز خریدا۔ وہ انگلستان سے ہندوستان تک چھ ہزار میل کا سفر طے کرکے پورنیہ میں اترا۔ اس کو اپنا ہوائی جہاز آگے لے جانے کی اجازت نہیں ملی۔ چنانچہ اس نے اپنا جہاز فروخت کر دیا۔ اس کے بعد اس نے دارجیلنگ اور تبت کے راستے سے ایورسٹ کی طرف سفر شروع کر دیا۔

آخر میں اس کے پاس ایک چھوٹا خیمہ، کچھ چاول، ایک خودکار کیمرہ اور چند دوسری چیزیں باقی رہ گئیں۔ تاہم وہ اوپر چڑھتا رہا۔ وہ کامیابی کے ساتھ ۱۹۵۰۰ فٹ کی بلندی تک چڑھ گیا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ کو اس کی ۳۶ ویں برتھ ڈے تھی۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ اپنی زندگی کے اس تاریخی دن کو ایورسٹ کی چوٹی پر کھڑا ہو۔ اس نے اپنی ڈائری میں چند دن پہلے یہ الفاظ لکھے:

Only 13000 feet more to go. I have the distinct feeling that I'll reach the summit on April 21

صرف تیرہ ہزار فیٹ جانا اور باقی ہے۔ مجھے یہ واضح احساس ہو رہا ہے کہ میں ۲۱ اپریل (۱۹۳۴) کو چوٹی پر پہنچ جاؤں گا۔

ان پر فخر سطروں کو لکھنے کے بعد ہمالیہ کا سخت طوفان اور موسم کی شدت اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ وہ مجبور ہو گیا کہ پیچھے لوٹے۔ چنانچہ وہ اتر کر اپنے نچلے ٹھکانہ پر آگیا۔ مگر اس کے بعد اس کو دوبارہ اوپر چڑھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا

پیش آیا، اس کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ ایک سال بعد تن زنگ نارگے اوپر چڑھ رہا تھا کہ اس کو ایک مقام پر موریس ولسن کی لاش ملی اور اسی کے ساتھ اس کی ڈائری بھی۔ جس کا آخری اندراج وہ جملہ تھا جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔

موریس ولسن ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی پر خودکار کیمرہ کے ذریعہ اپنی تصویر کھینچنا چاہتا تھا اس کو امید تھی کہ کیمرہ کی آنکھ اس کو فتح کی چوٹی پر دیکھے گی۔ جب یہ تاریخ آئی تو وہاں نہ کوئی ولسن تھا جو اپنی فتح و کامیابی کو دیکھ کر خوش ہو، اور نہ کوئی کیمرہ تھا جو اس کی فتح و کامیابی کے واقعہ کو ریکارڈ کرے۔

یہ کہانی بدلی ہوئی صورت میں ہر آدمی کی کہانی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کامیابی کی چوٹی پر پہنچنے کی طرف آگے بڑھ رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہاں ہر آدمی صرف ایک ایسی منزل کی جانب چلا جارہا ہے جہاں موت کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں جو اس کا استقبال کرنے کیلئے موجود ہو۔

موجودہ دنیا میں کچھ لوگ وہ ہیں جو دنیوی کامیابیوں کی صرف تمنا کرتے رہتے ہیں۔ اور بالآخر اس طرح مرجاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی خوابوں کی دنیا کی طرف سفر بھی شروع نہیں کیا تھا۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اپنی زندگی میں، کم یا زیادہ، ان خواہشوں کو پالیتے ہیں۔ مگر پانے والے بھی ان چیزوں سے اتنا ہی دور رہتے ہیں جتنا کہ نہ پانے والے۔ کیونکہ ان کو پالینے کے بعد آدمی پر کھلتا ہے کہ اس کو وہ طاقت اور مواقع حاصل نہیں جو ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ اس دنیا میں پانے والا بھی اتنا ہی محروم ہے جتنا نہ پانے والا۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

انسان کتنا زیادہ محروم ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ پانے والا سمجھتا ہے۔ زندگی کس قدر غیر یقینی ہے مگر آدمی اس کو کس قدر یقینی سمجھ لیتا ہے۔ آدمی صرف نامعلوم کل کے راستہ پر جارہا ہے مگر وہ گمان کرلیتا ہے کہ وہ معلوم آج میں اپنی کامیاب دنیا تعمیر کررہا ہے۔

کتنے بے خبر ہیں وہ لوگ جو اپنے کو جاننے والا سمجھتے ہیں۔ کیسے ناکام ہیں وہ لوگ جن کا نام کامیاب انسانوں کی فہرست میں سب سے آگے لکھا ہوا ہے۔

موت کے دوسری طرف

سکندر اعظم نے بڑی بڑی فتوحات کیں۔ مگر جب آخر وقت آیا تو اس نے کہا: میں دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ مگر موت نے مجھ کو فتح کر لیا۔ افسوس کہ مجھ کو زندگی کا وہ سکون بھی حاصل نہ ہو سکا جو ایک معمولی آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔ نپولین بوناپارٹ کے آخری احساسات یہ تھے: مایوسی میرے نزدیک جرم تھی مگر آج مجھ سے زیادہ مایوس انسان دنیا میں کوئی نہیں۔ میں دو چیزوں کا بھوکا تھا۔ ایک حکومت، دوسرے محبت۔ حکومت مجھے ملی مگر وہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ محبت کو میں نے بہت تلاش کیا مگر میں نے اسے کبھی نہیں پایا۔ انسان کی زندگی اگر یہی ہے جو مجھ کو ملی تو یقیناً انسانی زندگی ایک بے معنی چیز ہے۔ کیوں کہ اس کا انجام مایوسی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ ہارون الرشید ایک بہت بڑی سلطنت کا حکمراں تھا۔ مگر آخر عمر میں اس نے کہا: میں نے ساری عمر غم غلط کرنے کی کوشش کی، پھر بھی میں غم غلط نہ کر سکا۔ میں نے بے حد غم اور فکر کی زندگی گزاری ہے۔ زندگی کا کوئی دن ایسا نہیں جو میں نے بے فکری کے ساتھ گزارا ہو۔ اب میں موت کے کنارے ہوں۔ جلد ہی قبر میرے جسم کو نگل لے گی۔ یہی ہر انسان کا آخری انجام ہے۔ مگر ہر انسان اپنے انجام سے غافل رہتا ہے۔ خلیفہ منصور عباسی کی موت کا وقت آیا تو اس نے کہا: اگر میں کچھ دن اور زندہ رہتا تو اس حکومت کو آگ لگا دیتا جس نے مجھے بار بار سچائی سے ہٹا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نیکی اس ساری حکومت سے بہتر ہے۔ مگر یہ بات مجھ کو اس وقت معلوم ہوئی جب موت نے مجھے اپنے چنگل میں لے لیا۔

دنیا کے اکثر کامیاب ترین انسانوں نے اس احساس کے ساتھ جان دی ہے کہ وہ دنیا کے ناکام ترین انسان تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کے قریب پہنچ کر آدمی پر جو کچھ گزرتا ہے اگر وہی اس پر موت سے پہلے گزر جائے تو اس کی زندگی بالکل بدل جائے۔ ہر آدمی جب موت کے کنارے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی وہ تمام رونقیں راکھ کے ڈھیر سے بھی زیادہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں جن میں وہ اس قدر گم تھا کہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی اسے فرصت ہی نہ ملی۔ اس کے پیچھے ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس کو وہ کھو چکا اور آگے ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس کے لئے اس نے کچھ نہیں کیا۔

موت جب سر پہ آجائے اس وقت موت کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ موت کو یاد کرنے کا وقت اس سے پہلے ہے۔ جب آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر ظلم کرے اور اپنی ظالمانہ کارروائیوں کو عین انصاف کہے اس وقت وہ کچھ سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس وقت وہ اپنی انا کی تسکین کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے جو اس کو نہیں کرنا چاہئے۔ مگر جب اس کی طاقت ختم ہو جاتی ہے، جب اس کے الفاظ جواب دینے لگتے ہیں، جب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ موت کے بے رحم فرشتہ کے قبضہ میں ہے اس وقت اس کو اپنی غلطیاں یاد آتی ہیں۔ حالاں کہ یاد آنے کا وقت وہ تھا جب کہ وہ غلطیاں کر رہا تھا اور کسی نصیحت کی پروا کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

پانچ سکنڈ کا فاصلہ

۳ جون ۱۹۷۹ کو راقم الحروف میرٹھ میں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ میں اور مولانا شکیل احمد قاسمی صدر بازار کی سڑک پر ایک ساتھ جا رہے تھے۔

اس کے بعد اچانک ایک واقعہ ہوا۔ ہمارے سامنے ایک مکان کے آگے کا حصہ دھماکہ کے ساتھ گر پڑا۔ اینٹ اور پتھر سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ اس وقت ہم دونوں جائے حادثہ سے بمشکل پانچ سکنڈ کی مسافت پر تھے۔ اگر ہم پانچ سکنڈ آگے ہوتے یا مکان پانچ سکنڈ بعد گرتا تو یقیناً ہم دونوں اس کی زد میں آجاتے۔ ہمارا سفر شاید درمیان ہی میں ختم ہو جاتا جس کی منزل ہم نے بہت آگے سمجھ رکھی تھی۔

میں نے سوچا۔ آدمی اور اس کی موت کے درمیان صرف پانچ سکنڈ کا فاصلہ ہے۔ کسی بھی آدمی کے لئے ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ اس کا پانچ سکنڈ کا سفر پورا ہو جائے اور اچانک وہ اپنے آپ کو دوسری دنیا میں پائے۔

آدمی اگر اچھی طرح اس بات کو جان لے کہ اس کے اور موت کے درمیان صرف پانچ سکنڈ کا فاصلہ ہے تو اس کی دنیا بالکل بدل جائے۔ وہ ایک اور ہی قسم کا انسان بن جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں جینے لگے۔

زندگی کا راز یہ ہے کہ آدمی اس بات کو جان لے کہ وہ ہر وقت موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ ایسی موت جس کے معاً بعد آدمی، حدیث کے الفاظ میں، یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں داخل ہو جاتا ہے، یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھے میں جا گرتا ہے۔ آدمی کا ہر قدم اس کو دو انتہائی انجام میں سے کسی ایک انجام کے قریب پہنچا رہا ہے۔ مگر انسان اتنا بے حس بنا ہوا ہے کہ اس کو اس کی خبر نہیں۔

لوگ جھوٹی خدا پرستی پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ آخرت میں صرف حقیقی خدا پرستی کسی شخص کے کام آئے گی۔ حقیقی خدا پرستی یہ ہے کہ آدمی اس طرح اللہ سے ڈرنے لگے کہ وہ اس کے ذہن پر چھا جائے، وہ اس کے صبح و شام کا نگراں بن جائے۔ وہ جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ وہ خدا کے سامنے ایسا کر رہا ہے۔ اس کو دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر ستانے لگے۔

کیسی عجیب محرومی

آپ کسی شخص کو ایک ڈالر دیں اور اس سے کہیں کہ آگے اسی قسم کے ایک کرور سکے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر تم تیزی سے جاؤ تو اس پورے ذخیرہ کو حاصل کر سکتے ہو۔ ایسا آدمی ڈالر دیکھ کر کیا کرے گا۔ وہ ایک کو بھول کر ایک کرور کی طرف دوڑ پڑے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دنیا اور آخرت کا ہے۔ موجودہ دنیا آخرت کا تعارف ہے۔ یہاں آدمی ان نعمتوں اور لذتوں کی ابتدائی پہچان حاصل کرتا ہے جس کو خدا نے کامل طور پر آخرت میں مہیا کر رکھا ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ آدمی جزء سے کل کو سمجھے۔ وہ قطرہ کو دیکھ کر سمندر کا اندازہ کرے۔

اگر آدمی کو دنیا کی صحیح معرفت حاصل ہو تو اس کے لئے دنیا مذکورہ ایک ڈالر کی مانند ہو جائے گی۔ وہ چھوٹی لذت کو چھوڑ کر بڑی لذت کی طرف بھاگے گا۔ وہ دنیا کو بھول کر آخرت کی طرف دوڑ پڑے گا۔ اس کے برعکس جو شخص دنیا کی صحیح نوعیت کو نہ سمجھے وہ موجودہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے گا۔ وہ آخرت کو بھول کر اسی دنیا کی چیزوں میں ہمہ تن مشغول ہو جائے گا۔

سورج اس لئے ہے کہ وہ آخرت کی روشنیوں سے بھری زندگی سے انسان کو متعارف کرے۔ مگر انسان سورج کو دیکھ کر یہ کرتا ہے کہ وہ خود سورج ہی کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ پھولوں اور درختوں کا حسن اس لئے ہے کہ وہ آدمی کو آخرت کے حسن کی یاد دلائے۔ مگر انسان پھولوں اور درختوں کو آخری چیز سمجھ کر انھیں کے درمیان اپنی مستقل جنت بنانے لگتا ہے۔ دنیا کی لذتیں اس لئے ہیں کہ انسان کو ہمہ تن آخرت کا مشتاق بنا دیں مگر انسان انھیں لذتوں میں ایسا کھوتا ہے کہ اس کو آخرت کی یاد بھی نہیں آتی۔

جو شخص موجودہ دنیا کی دلفریبیوں میں گم ہو جائے اس نے اپنی آخرت کو کھو دیا۔ ایسا شخص آخرت میں پہنچے گا تو وہاں کی ابدی نعمتوں کو دیکھ کر اس کا یہ حال ہوگا گویا اس کا سینہ حسرت و یاس کا قبرستان بن چکا ہے۔ وہ کہے گا کہ میں بھی کیسا نادان تھا۔ میں نے چھوٹے عیش کی خاطر حقیقی عیش کو کھو دیا۔ میں نے جھوٹی لذت کے پیچھے حقیقی لذت گنوا دی۔ میں نے جھوٹی آزادی سے فریب کھا کر اپنے آپ کو حقیقی آزادی سے محروم کر لیا۔

آخرت تک جانا ہے

مولانا اشرف علی تھانوی ایک بار ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ ان کو اعظم گڑھ جانا تھا۔ ایک ریلوے گارڈ جوان کا معتقد تھا اسٹیشن پر ان سے ملنے کے لئے آیا۔ اتنے میں ایک دیہاتی آدمی بھی آگیا۔ اس نے گنے کا ایک گٹھا تحفہ کے طور پر مولانا کو پیش کیا۔ مولانا نے قبول کر لیا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ ان گنوں کا وزن کرا کے ان کو بک کروا لو۔ گارڈ نے کہا: بک کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس ٹرین سے جو گارڈ جا رہا ہے میں اس سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ خیال رکھے گا۔ مولانا نے کہا کہ تمہارا گارڈ تو اسی ٹرین تک ساتھ رہے گا اور مجھے آگے جانا ہے۔ گارڈ نے سمجھا کہ مولانا کو آگے کسی اسٹیشن پر یہ ٹرین بدل کر دوسری ٹرین پکڑنا ہے۔ اس نے کہا: کوئی ہرج نہیں۔ میں گارڈ کو بتا دیتا ہوں وہ آگے والے گارڈ سے بھی کہہ دے گا اور آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی۔ مولانا نے کہا: مجھے اس سے بھی آگے جانا ہے۔ گارڈ نے حیرت سے پوچھا: آخر آپ کہاں تک جائیں گے۔ ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ آپ اعظم گڑھ جا رہے ہیں۔ مولانا نے کسی قدر خاموشی کے بعد کہا: مجھے آخرت تک جانا ہے، وہاں تک کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا؟"

یہ معاملہ محض ریل کے سفر کا نہیں بلکہ تمام معاملات کا ہے۔ آدمی کا ہر معاملہ آخرت کا معاملہ ہے۔ دنیا میں کوئی "گارڈ" وقتی طور پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ مگر آخرت کی منزل پر پہنچ کر کوئی گارڈ ساتھ دینے والا نہیں۔ جس کا ذہن یہ ہو کہ مجھے آخرت تک جانا ہے وہ ہر اس چیز کو بے قیمت سمجھے گا جو آخرت میں بے قیمت ہو جانے والی ہو، خواہ آج وہ کتنی ہی قیمتی نظر آئے۔ اسی طرح وہ ہر اس چیز کو وزن دینے پر مجبور رہتا ہے جو آخرت میں باوزن ثابت ہونے والی ہو، خواہ آج کی دنیا میں بظاہر وہ کتنی ہی بے وزن دکھائی دے۔

آدمی حق کا انکار کرنے کے لئے آج خوبصورت الفاظ پا لیتا ہے۔ مگر آخرت میں اس کو معلوم ہوگا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے۔ آدمی طاقت کے بل پر بے انصافی کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ مظلوم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ مگر آخرت میں وہ دیکھے گا کہ اس کی طاقت پیچھے کی دنیا میں رہ گئی ہے، آخرت میں وہ اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود نہیں ہے۔ آدمی کے ساز و سامان اس کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اپنے گھمنڈ کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر آخرت میں وہ پائے گا کہ اس کے وہ ساز و سامان اس سے بہت دور ہو چکے ہیں جن کے اوپر وہ گھمنڈ کیا کرتا تھا۔

مومن اور غیر مومن کا فرق ایک لفظ میں یہ ہے کہ غیر مومن یہ سمجھ کر زندگی گزارتا ہے کہ اس کو اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور مومن اس نفسیات کے ساتھ جیتا ہے کہ اس کو آخرت تک جانا ہے۔ نفسیات کا یہ فرق دونوں کی زندگیوں میں اتنا زیادہ عملی فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ایک جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور دوسرا جنت کا۔

زندگی کا اسٹیج

حیدر آباد کا واقعہ ہے۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۸۱ کو مسٹر پی کے راما ریڈی (۹۰ سال) اور ان کی ۸۰ سالہ بیوی پھولا بائی رات کے وقت اپنے گھر واقع بنجارہ ہلز میں سو رہے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے گھر میں اس وقت صرف ان کا ملازم رامیا (۵۰ سال) تھا۔ رامیا نے عین نیند کی حالت میں کلہاڑی سے بوڑھے میاں بیوی پر حملہ کیا اور نہایت بے دردی کے ساتھ دونوں کو مار ڈالا۔ اس کے بعد رامیا نے بکس سے تقریباً ایک لاکھ روپے کے ہیرے اور زیورات نکالے اور رات کی تاریکی میں گھر سے باہر نکل گیا۔

راستہ چلتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں پولس کے دو آدمی رات کی ڈیوٹی میں پہرہ دے رہے تھے۔ ان کو شبہ ہوا چنانچہ انھوں نے رامیا کو پکڑ لیا۔ پوچھ گچھ اور ڈرانے دھمکانے کے بعد اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا اور چرایا ہوا مال پولس کے حوالے کر دیا۔ دونوں پولس کے آدمیوں نے رامیا کو اور اس سے برآمد شدہ مال کو لے جا کر تھانہ میں جمع کر دیا۔ ان کا نام شیخ محبوب اور ایس ایم رشید بتایا گیا ہے۔

محکمہ پولس کے افسران کے علم میں یہ واقعہ آیا تو وہ شیخ محبوب اور ایس ایم رشید کی کارکردگی اور دیانت داری سے بہت خوش ہوئے اس کے بعد دونوں کو نقد انعامات دئے گئے اور اسی کے ساتھ دونوں کو ترقی بھی دے دی گئی۔ شیخ محبوب کو اسٹیشن آفیسر کے عہدہ پر متعین کر دیا گیا اور ایس ایم رشید کو ہیڈ کانسٹبل بنا دیا گیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک واقعہ بیک وقت دو آدمیوں کے لئے دو معنی کا حامل ہوتا ہے۔ ایک واقعہ پیش آتا ہے مگر اسی ایک واقعہ سے ایک شخص کو کریڈٹ دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو ڈسکریڈٹ کیا جاتا ہے۔ ایک شخص کو قاتل ثابت کر کے مجرم کے خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو ایماندار اور فرض شناس ظاہر کر کے انعام کا مستحق بنا دیا جاتا ہے۔

دنیا میں جتنے واقعات پیش آتے ہیں سب کی نوعیت یہی ہے۔ یہاں کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں یہاں کوئی شخص کسی کو نہ فائدہ پہنچا سکتا اور نہ نقصان۔ نہ کوئی کسی کو زندگی دے سکتا اور نہ موت۔ تاہم یہ سارے واقعات یہاں ایک یا دوسرے کے ہاتھ سے پیش آتے ہیں۔ دنیا ایک قسم کا خدائی اسٹیج ہے۔ یہاں مختلف حالات پیدا کر کے خدا ہر ایک کو یہ موقع دیتا ہے کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو وہ علی الاعلان ظاہر کر دے۔ جو شخص مجرمانہ ذہن لئے ہوئے ہے وہ اپنے موافق حالات پا کر جرم کرے اور خدا کے قانون کے مطابق سزا کا مستحق ہو۔ جو شخص اپنے اندر حق پرستی کا ذہن لئے ہوئے ہے وہ اپنے موافق حالات میں حق اور انصاف کا معاملہ کرے تاکہ وہ خدا کے یہاں انعام اور قدر افزائی کے لائق ٹھہرے۔

سننے والا سن رہا ہے

امریکہ کے خفیہ محکمہ (.N.S.A) کے ایک سابق افسر نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے (The Puzzle Palace) ۔ اس کتاب میں اس کے مصنف نے بڑے دلچسپ انکشافات کئے ہیں۔ ان میں سے ایک کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ سے بھیجے جانے والے ٹیلی فون، ٹیلکس اور تار کے پیغامات کی تعداد ہر روز ایک ملین سے زیادہ ہوتی ہے۔ جدید نظام کے مطابق یہ پیغامات پہلے ورجینیا کے زمینی اسٹیشن (Earth Station) پر موصول ہوتے ہیں۔ وہاں سے وہ مصنوعی سیارہ کی طرف بھیجے جاتے ہیں جو ۲۳۰۰ میل اوپر زمین کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ یہ سارا عمل فی الفور ایک سکنڈ سے بھی کم وقفہ میں انجام پاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مشینی پیغام جو امریکہ سے باہر جاتا ہے یا امریکہ کے اندر آتا ہے وہ اصل مخاطب تک پہنچنے سے پہلے امریکی حکومت تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ امریکہ کا خفیہ محکمہ جن لوگوں کے پیغامات کو جاننا چاہتا ہے، ان کا نمبر وہ زمینی اسٹیشن کے دفتر میں دیدیتا ہے۔ یہاں مذکورہ افراد کی گفتگوئیں اور پیغامات خودکار آلات کے ذریعہ ریکارڈ ہوتے رہتے ہیں۔ گویا آپ اگر واشنگٹن سے دہلی کے لئے ٹیلی فون کریں تو آپ کے منہ سے جو الفاظ نکلیں گے، قبل اس کے کہ آپ کا مخاطب ان کو سنے، امریکہ کی حکومت ان کو سن چکی ہوگی۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ دسمبر ۱۹۸۲) کے امریکی نامہ نگار نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے اس کا عنوان قائم کیا ہے۔ ہوشیار، ممکن ہے کہ امریکہ آپ کی بات سن رہا ہو۔

Careful, Uncle Sam may be listening.

اس قسم کے واقعات خدا کی نشانی ہیں۔ وہ اس لئے ہو رہے ہیں تاکہ آدمی اپنی زبان کو احتیاط کے ساتھ استعمال کرے۔ آدمی دوسرے آدمی سے ایک غلط بات کہتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں صرف ایک آدمی سے کہہ رہا ہوں مگر آدمی کو جاننا چاہئے کہ اس کی بات اس کے مخاطب سے پہلے خدا تک پہنچ رہی ہے۔ مذکورہ واقعہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے —— اے انسان، ہوشیار رہ، کیونکہ تیری ہر بات کو خدا سن رہا ہے۔

فیصلہ کے دن

انڈین اکسپریس (بنگلور) کی اشاعت مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۸۲ کی ایک خبر کا عنوان ہے چمک دار چیز سونا نہیں ! Glitter is not gold

خبر میں بتایا گیا ہے کہ مس سبل ڈی سلوا (Miss Sybil D'Silva) جو بنگلور میں آرٹیلری روڈ پر رہتی ہیں، وہ اپنے گھر پر تھیں کہ تقریباً ۴۵ سال کی ایک عورت ان کے پاس آئی۔ اس کی گود میں چھ مہینہ کا ایک بچہ تھا۔ عورت نے مس ڈی سلوا سے کہا کہ اس کا شوہر بہت زیادہ بیمار ہے اور اس کے علاج کے لئے فوری طور پر ۵ ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ عورت نے سونے کا ایک ہار اپنی جیب سے نکالا اور کہا کہ میں آپ سے بھیک نہیں مانگ رہی ہوں۔ میں صرف اس سونے کے ہار کو بیچنا چاہتی ہوں۔ اگرچہ یہ ہار مجھے بہت عزیز ہے مگر شوہر کی صحت اس سے زیادہ عزیز ہے۔ اس ہار کی قیمت بازار میں دس ہزار روپے سے کم نہیں ہے۔ میں اپنی ضرورت کی بنا پر آپ کو صرف ۵ ہزار میں دے دوں گی۔

مس ڈی سلوا نے ہار لینے سے انکار کیا لیکن عورت اپنی مجبوری بیان کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس نے مس ڈی سلوا کو متاثر کر لیا۔ انھوں نے روپیہ دے کر ہار خرید لیا۔

اگلے دن مس ڈی سلوا بنگلور کی کمرشل اسٹریٹ پر گئیں اور وہاں ایک سنار کو انھوں نے وہ ہار دکھایا۔ سنار نے وہ ہار لے کر اپنی کسوٹی پر جانچا۔ کسوٹی پر جانچنے کے بعد ہار کی حقیقت کھل گئی۔ مس ڈی سلوا نے بنگلور پولیس کو یہ کہانی سناتے ہوئے کہا کہ سنار نے مجھے بتایا کہ یہ تو پیتل ہے۔

He told me it was brass

یہی آخرت کا معاملہ بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی اپنے کئے پر مگن ہے۔ ہر آدمی اپنے کام کو سونا سمجھتا ہے۔ مگر کوئی سونا اسی وقت سونا ہے جب کہ وہ سنار کی کسوٹی پر بھی سونا ثابت ہو۔ آخرت میں خدا ہر آدمی کے عمل کو اپنی کسوٹی پر جانچے گا۔ جس کا عمل وہاں کی جانچ میں سونا ثابت ہو اسی کے عمل کی قیمت ہے، اور جس کے عمل کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے کہ یہ تو پیتل تھا، اس کا سونا اس کے لئے صرف رسوائی اور بربادی کی علامت ہوگا۔ جس چیز کو آدمی آج اتنا قیمتی سمجھے ہوئے ہے کہ وہ اس کو کسی طرح چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اس دن وہ اس سے اتنا بیزار ہوگا کہ وہ چاہے گا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ اس کے اور اس کے عمل کے درمیان جدائی ہو جائے مگر اس دن جدائی نہ ہو سکے گی۔ جس چیز کو وہ فخر کی چیز سمجھے ہوئے تھا، اس دن وہ اس کے لئے صرف ذلت اور رسوائی کی چیز بن جائے گی۔

آہ یہ انسان

تقریباً ایک درجن انڈے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ بظاہر سب انڈے تھے۔ سب اوپر سے دیکھنے میں اچھے لگتے تھے۔ مگر جب توڑا گیا تو ایک کے بعد ایک سب خراب نکلتے چلے گئے۔ آخر میں یہ معلوم ہوا کہ ان میں کوئی ایک بھی اچھا نہ تھا۔ سارے انڈے اندر سے خراب انڈے تھے اگرچہ بظاہر اوپر سے اچھے نظر آتے تھے۔

ایسا ہی کچھ حال آجکل انسانوں کا ہو رہا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ہر آدمی آدمی ہے۔ وہ عمدہ کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ وہ خوبصورت باتیں کرتا ہے۔ اوپر سے ہر آدمی اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے پاس اپنے کارناموں کی نہ ختم ہونے والی داستانیں ہیں۔ مگر جب تجربہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندر سے کچھ اور تھا۔ اوپر کے خوبصورت خول کے اندر ایک انتہائی بدہئیت اور بالکل مختلف قسم کا انسان چھپا ہوا تھا۔

جب کسی سے لین دین ہوتا ہے، جب کوئی واقعی معاملہ پڑتا ہے، جب شکایت اور تلخی کا کوئی موقع سامنے آتا ہے، جب کسی کے مفاد اور مصلحت پر ضرب پڑتی ہے تو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اندر کا اصلی انسان وہ نہ تھا جو اوپر سے دکھائی دے رہا تھا۔ خوبصورت کپڑوں کے اندر جو چیز چھپی ہوئی ہے وہ گندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ خود غرضی، سطحیت، ظاہر داری، فخر، حسد، غرور، موقع پرستی، تعصب، استحصال، یہی وہ چیزیں ہیں جو لوگ اپنے خوبصورت جسموں کے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی بظاہر اچھا انڈا ہے۔ مگر توڑنے کے بعد ہر آدمی خراب انڈا ہے۔

یہی آج کی انسانی دنیا ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو آج کی دنیا میں صرف دو چیزیں نظر آتی ہیں۔ دکھ کی آہیں، یا ظلم کے قہقہے۔ کچھ لوگ بے انصافیوں کا شکار ہو کر آہیں بھر رہے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے حیوانی ارادوں کی تکمیل کر کے فتح کے قہقہے لگا رہے ہیں۔ کچھ لوگ بے شعوری کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور کچھ لوگ بے حسی کے گڑھے میں۔

مگر یہ صورت باقی رہنے والی نہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو ایک اور دنیا میں پائے گا۔ ایک ایسی دنیا جہاں فیصلہ کا سارا اختیار خدا کو ہوگا نہ کہ انسان کو۔

شکار کرنے والے

کرنل جے پال نے اپنی شکاری یادداشتوں پر ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے عظیم شکار:

Great Hunt, Lt. Col. Jaipal, Carlton Press, New York 1982

جم کاربٹ (Jim Corbett) ایک شکاری تھا، وہ شیر کو گولی مار کر ہلاک کرنے سے خاص دل چسپی رکھتا تھا، تاہم اپنے اس قاتلانہ فعل کے لئے اس کے پاس ایک خوبصورت توجیہہ تھی۔ "میں گاؤں والوں کو مردم خور شیروں سے بچانے کے لئے ان کا شکار کرتا ہوں" اسی طرح اکثر شکاریوں کے پاس اپنے وحشیانہ کھیل کی خوبصورت تاویلات موجود ہوتی ہیں۔ مگر کرنل جے پال کو اس قسم کی فرضی توجیہات تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے صفائی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کر لیا ہے جس کو دوسرے لوگ صفائی کے ساتھ تسلیم نہیں کرتے۔

کرنل جے پال کے لئے گھڑیال کو مارنا ایک پسندیدہ کھیل تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ منظر بڑا دلچسپ ہوتا تھا جب کہ میں گھڑیال کے پیچھے رینگ کر چلتا۔ پھر کبھی گھڑیال چھپ سے پانی میں کود پڑتا۔ اور جب اس کو گولی لگتی تو وہ عجیب طریقے سے اپنی دم پٹکتا اور اپنا منھ کھول دیتا یہ سب چیزیں مجھ کو بڑی عجیب قسم کی پرجوش مسرت دیتی تھیں:

All this gave me quite a lot of thrills

انسان کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ دوسرے کی گھات میں لگے۔ وہ دوسرے کو ستانے کے منصوبے بنائے اور جب دوسرے کو ستانے میں کامیاب ہو جائے تو اپنی کامیابی پر خوشی کے قہقہے لگائے۔ یہی مزاج انسان کے امتحان کا اصل پرچہ ہے۔ جو اپنے اس مزاج سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی کا شکار کرنے لگے وہ جہنمی ہے اور جو شخص اپنے اس مزاج پر قابو پالے اور دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لئے رحمت بنا ہوا ہو وہی وہ شخص ہے جس کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

یہ سونے والے

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے نہیں دیکھا کہ جہنم جیسی چیز سے بھاگنے والا سو گیا ہو اور میں نے نہیں دیکھا کہ جنت جیسی چیز کو چاہنے والا سو گیا ہو (ما رأیت مثل النار نام هاربها و ما رأیت مثل الجنة نام طالبها)

جہنم کا عذاب کتنا ہولناک ہے۔ مگر آدمی اس سے غافل ہے۔ جنت کی نعمتیں کتنی لذیذ ہیں مگر آدمی کو اس کا کوئی شوق نہیں۔ یقیناً یہ زمین پر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب ہے۔

لوگ سو رہے ہیں تاکہ اس وقت جاگیں جب کہ جہنمی آگ کے شعلے ان کے لئے سونے کو ناممکن بنا دیں۔ لوگ غافل ہیں تاکہ اس وقت ہوشیار ہوں جب کہ محرومی اور رسوائی ان کے اوپر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ان کے لئے اس سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

آج ہر آدمی بے ہوش نظر آتا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ میں اس طرح گم ہے جیسے اس کے اوپر کوئی اوز طاقت نہیں۔ حالاں کہ موت ہر روز بتا رہی ہے کہ آدمی ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہے جس کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہیں چلتا۔ انسان کتنا زیادہ مجبور ہے مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ با اختیار سمجھتا ہے۔

آدمی وعدہ کرتا ہے مگر اس کے بعد اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے اوپر کسی کا ایک حق آتا ہے مگر وہ اس کو ادا نہیں کرتا۔ آدمی کے سامنے ایک سچائی آتی ہے مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ دوسرے کے اوپر یک طرفہ الزام لگاتا ہے اور اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ چھوٹوں کو نظر انداز کر کے بڑوں کا استقبال کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اصول کے تابع کرنے کے بجائے خواہشات کے تابع کرتا ہے۔ وہ زور آور سے دبتا ہے اور بے زور کو ستاتا ہے۔ وہ خدا کو مرکز توجہ بنانے کے بجائے خود اپنی ذات کو اپنا مرکز توجہ بناتا ہے۔ وہ جنت کے اشتیاق اور جہنم کے اندیشوں میں جینے کے بجائے دنیا کے اشتیاق اور دنیا کے اندیشوں میں جیتا ہے۔

آدمی یہ سب کچھ کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اپنی اس روش سے اپنے آپ کو جہنم کے قریب لے جا رہا ہے اور اپنے آپ کو جنت کے لئے نا اہل ثابت کر رہا ہے۔

آہ وہ انسان جس کو اسی چیز کا شوق نہیں جس کا اسے سب سے زیادہ شوق ہونا چاہئے۔ آہ وہ انسان جو اسی چیز سے سب سے زیادہ بے خوف ہے جس سے اس کو سب سے زیادہ خوف کرنا چاہئے۔

اس دن کیا ہوگا

خدا ہر چیز کا مالک ہے۔ دنیا میں کسی کو جو کچھ ملتا ہے خدا کے دئے سے ملتا ہے۔ خدا کے سوا کسی کے پاس کوئی چیز ہی نہیں جو وہ کسی کو دے سکے۔ ایسی حالت میں اگر کچھ لوگ ایسا کریں کہ ایک شخص کو جائز ذریعہ پر ملی ہوئی چیز کو اس سے چھیننے لگیں تو گویا وہ خدا کے دئے کو چھین رہے ہیں، وہ خدا کے منصوبہ کو باطل کرنا چاہتے ہیں۔

دنیا میں ایک شخص کو مکان ملے مگر کچھ لوگ اس کو بے گھر کرنے کی سازشیں کریں۔ اس کی معاش کا جائز انتظام ہو مگر لوگ اس کی معاشیات کو تباہ کرنے پر اتر آئیں۔ اس کو عزت کی زندگی حاصل ہو مگر لوگ اس کو بے عزت کرنے کی کارروائیاں کریں۔ وہ سکون و عافیت کے ساتھ اپنے ماحول میں رہ رہا ہو مگر لوگ اس کو جھوٹے مقدمات میں الجھا کر اس کے سکون کو غارت کرنے لگیں۔ ایسا ہر واقعہ خدا کے انتظام میں مداخلت ہے۔ یہ بے اختیار مخلوق کا ایسے خالق سے لڑنا ہے جو تنہا اور مکمل طور پر ہر قسم کا اختیار رکھتا ہے۔

ایسے واقعات کا مطلب یہ ہے کہ ـــــ خدا نے چاہا مگر بندوں نے نہ چاہا۔ خدا نے اپنے فیصلہ کے تحت تقسیم رزق کا ایک انتظام کیا مگر بندے اس تقسیم کو ماننے پر راضی نہ ہوئے۔ خدا کے مقابلہ میں بندوں کی یہ سرکشی موجودہ دنیا میں بظاہر کامیاب نظر آتی ہے۔ مگر یہ کامیابی صرف اس لئے ہے کہ موجودہ دنیا میں لوگوں کو امتحان کی آزادی حاصل ہے، جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوگی، آدمی اپنے آپ کو اتنا بے زور پائے گا کہ اس کے پاس الفاظ بھی نہ ہوں گے کہ وہ کسی کے خلاف بولے، اس کے پاس دل بھی نہ ہوگا کہ کسی کو ملیا میٹ کرنے کا منصوبہ بنائے۔

موجودہ دنیا میں انسان کو آزادی حاصل ہے۔ یہاں کسی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ خدا کے چاہے کو باطل کرے، وہ خدا کے تقسیم رزق کو کھنڈت کرنے کی کوشش کرے۔ مگر ایسے لوگوں کا حال اس وقت کیا ہوگا جب امتحان کی موجودہ آزادی ختم ہو چکی ہوگی۔ جب وہی ہوگا جو خدا چاہے اور وہ نہ ہو سکے گا جو خدا نہ چاہے، اس روز خدا کہے گا ـــــ میں دیتا ہوں جس کو چاہوں، اب جس کو کرنا ہے میرے چاہے کو باطل کرے۔

کل کو یاد رکھئے

لارڈ کرزن ۱۸۹۸ میں ہندوستان کے وائسرائے ہو کر انگلستان سے یہاں آئے۔ ان کے دو لڑکیاں تھیں۔ تیسری پیدائش کے وقت لارڈ کرزن اور لیڈی کرزن کی بہت خواہش تھی کہ ان کے یہاں لڑکا پیدا ہو۔ دونوں بڑی امیدوں کے ساتھ آنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر تیسری بار بھی مارچ ۱۹۰۴ میں ان کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اس وقت ان کا قیام نالدرا میں تھا اس مناسبت سے انھوں نے اپنی لڑکی کا نام الکزنڈر نالدرا کرزن رکھا۔ لارڈ کرزن نے اس زمانہ میں اپنی بیوی کے نام جو خطوط لکھے ان میں سے ایک خط وہ ہے جو انھوں نے شملہ سے لندن بھیجا تھا۔ اس خط میں انھوں نے اپنی بیوی کو تسکین دلانے کی کوشش کی۔ ان کے خط کا ایک جملہ یہ تھا: لڑکا یا لڑکی کا کیا فائدہ جب کہ ہم دونوں اس دنیا سے جا چکے ہوں گے۔

After all what does sex matter after we are both of us gone.

لارڈ کرزن کا یہ جملہ محض اپنی مایوس نفسیات کو چھپانے کی ایک کوشش تھی۔ لیکن یہی بات اگر آدمی کے اندر شعوری طور پر پیدا ہو جائے تو دنیا کا آدھا مسئلہ حل ہو جائے۔ دولت، اولاد، اقتدار، یہی وہ چیزیں ہیں جن کو آدمی سب سے زیادہ چاہتا ہے اور ان کو حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر ڈالتا ہے۔ اگر آدمی یہ سوچ لے کہ کسی چیز کو پانے کا کیا فائدہ جب کہ چند ہی روز بعد اس کو چھوڑ کر چلا جانا ہے تو لوگوں کے اندر قناعت آجائے، اور دنیا کا تمام ظلم و فساد ختم ہو جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں پانے اور نہ پانے میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ جو پانا اگلے روز کھونا بننے والا ہو اس پانے کی کیا قیمت ہے۔ آدمی اپنی ساری کوشش خرچ کر کے جو چیز حاصل کرتا ہے وہ صرف اس لئے ہوتی ہے کہ اگلے لمحہ وہ اس کو کھو دے۔ ہر زندگی بالآخر موت سے دوچار ہونے والی ہے، ہر وہ محبوب چیز جس کو آدمی اپنے گرد و پیش جمع کرتا ہے اس کو چھوڑ کر وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے چلا جانے والا ہے۔

آدمی "آج" میں جیتا ہے، وہ "کل" کو بالکل بھولا ہوا ہے۔ آدمی دوسرے کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر بناتا ہے حالاں کہ اگلے دن وہ قبر میں جانے والا ہے۔ آدمی دوسرے کے اوپر جھوٹے مقدمے چلا کر اس کو انسانی عدالت میں لے جاتا ہے حالانکہ فرشتے خود اس کو خدا کی عدالت میں لے جانے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ آدمی دوسرے کو نظر انداز کر کے اپنی عظمت کے گنبد میں خوش ہوتا ہے حالاں کہ بہت جلد اس کا گنبد اس طرح ڈھ جانے والا ہے کہ اس کی ایک اینٹ بھی باقی نہ رہے۔

جہنم کا خطرہ

خدا نے انسان کو اس کی بناوٹ کے اعتبار سے جنتی نفسیات کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کے بعد اس کو موجودہ دنیا میں ڈال دیا جہاں ایسے حالات ہیں جو آدمی کے اندر جہنمی نفسیات کو ابھارتے ہیں۔ اب جو شخص اسفل سافلین میں رہتے ہوئے اپنے کو احسن تقویم کی سطح پر رہے جائے، بالفاظ دیگر جہنمی نفسیات کو ابھارنے والے ماحول میں دوبارہ اپنے اندر چھپی ہوئی جنتی نفسیات کو بیدار کرے تو وہی وہ شخص ہے جو مرنے کے بعد اللہ کے پڑوس میں اور اس کی نعمتوں میں جگہ پائے گا۔ باقی لوگ دھوئیں اور آگ کی دنیا میں عذاب سہنے کے لئے چھوڑ دئے جائیں گے (التین)

موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس لئے اس کو اسی ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ یہاں بار بار آدمی کے لئے آزمائشی حالات پیدا ہوں۔ یہاں نفع اور نقصان کے معاملات ہیں جو آدمی کے اندر حرص، طمع اور خود غرضی کے احساسات ابھارتے ہیں۔ یہاں سطحی دل چسپیاں ہیں جو آدمی کو شہوت پرستی، نشہ بازی اور لذتیت کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہاں ایک آدمی اور دوسرے آدمی کا مقابلہ پیش آتا ہے جس کی وجہ سے آدمی کے اندر خود پرستی اور انانیت کا شیطان جاگتا ہے۔ یہاں مفادات کا ٹکراؤ ہے جس کی وجہ سے غصہ، نفرت اور کمینہ پن کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ یہی موجودہ دنیا کا "اسفل سافلین" ہونا ہے۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے اوپر اٹھائے اور اپنے کو "احسن تقویم" کی سطح پر لے جائے جو باعتبار پیدائش اس کی حقیقی سطح ہے۔

ایک پھل اندر سے اچھا ہے یا خراب، اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ اسے توڑا جائے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ کوئی انسان جنتی نفسیات میں جی رہا ہے یا جہنمی نفسیات میں، اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ اس کی ہستی کو توڑا جائے۔ جب آدمی کے ساتھ کسی قسم کی ناموافق صورت حال پیش آتی ہے تو اس وقت اس کی ہستی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے موقع پر آدمی جو رد عمل ظاہر کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنتی تقویم کی سطح پر تھا یا جہنمی تقویم کی سطح پر۔ جب دو آدمیوں کے درمیان روپیہ یا جائداد کا جھگڑا کھڑا ہوتا ہے۔ جب دو صاحب معاملہ افراد کے درمیان کوئی کھٹ پٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ جب دو الگ الگ خیال رکھنے والوں کے درمیان رائے کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ جب ایک منصب کے دو دعویداروں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے تو یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب کہ یہ پتہ چلتا ہے کہ آدمی حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے۔ ایسے مواقع پر جو شخص نفرت، خود غرضی، بے انصافی اور انانیت کا مظاہرہ کرے وہ اپنے اس عمل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ جہنمی نفسیات میں جی رہا تھا، وہ ابلیس اور شیطان کا پڑوسی تھا۔ اس کے برعکس جس شخص کا رد عمل ان مواقع پر محبت، بے غرضی، انصاف پسندی اور تواضع کی صورت میں ظاہر ہو وہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ جنتی نفسیات میں جی رہا ہے، اس کے روز و شب خدا اور اس کے فرشتوں کے پڑوس میں گزرتے ہیں۔ جو شخص دنیا میں شیطان کا پڑوسی ہے، آخرت میں بھی اس کو شیطان ہی کا پڑوس حاصل ہوگا اور جو شخص دنیا میں خدا اور فرشتوں کا پڑوسی ہے، وہ آخرت میں بھی خدا اور فرشتوں کے پڑوس میں رہے گا۔

جب موت ہر چیز کو باطل کردے گی

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عمل کے نام پر دنیا میں وہ جو کچھ کرتے رہے وہ بے عملی کی بدترین شکل تھی۔ دنیا میں اپنے آپ کو اوپر اٹھا کر فخر کرتے رہے حالاں کہ ان کے لئے قابل فخر بات یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے حکم کے آگے جھکا دیں۔ اپنی غلطیوں کی توجیہہ و تاویل کو کامیابی سمجھتے رہے حالاں کہ ان کی کامیابی یہ تھی کہ وہ اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرلیں۔ ان کو الفاظ اس لئے دئے گئے تھے کہ ان کو اللہ کی تعریف میں استعمال کریں۔ مگر وہ اپنے الفاظ کے ذخیرہ کو انسان کی تعریف میں خرچ کرتے رہے۔ ان کے اندر خوف و محبت کے نازک جذبات اس لئے رکھے گئے تھے کہ وہ ان کو خدا کے لئے وقف کردیں۔ مگر وہ دوسری چیزوں کو اپنے خوف و محبت کے جذبات کا مرکز بناتے رہے۔ انھوں نے مال جمع کرنے کو سب سے بڑی چیز سمجھا حالاں کہ ان کے لئے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ وہ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں دے کر بے مال ہوجائیں۔ ان کا اصلی کمال یہ تھا کہ وہ کمزوروں کا لحاظ کریں مگر وہ کمزوروں کو نظر انداز کر کے طاقت وروں کا استقبال کرتے رہے۔ ان کے لئے زیادہ بہتر یہ تھا کہ معانی کے خاموش سمندر میں غوطہ لگائیں مگر وہ شور و غل کے ہنگامے کھڑے کرنے میں مشغول رہے۔ ان کی ترقی کا راز یہ تھا کہ وہ اپنی ذات کا احتساب کرنے والے بنیں مگر وہ دوسروں کا احتساب کرنے میں مصروف رہے۔ ان سے یہ مطلوب تھا کہ دنیا کا مال یا دنیا کی عزت پائیں تو اس کو بے حقیقت سمجھیں اور اس سے بے رغبتی کا ثبوت دیں مگر اسی کو وہ سب سے بڑی چیز سمجھ بیٹھے۔

آج کی دنیا میں لوگ دوسروں کے ظلم کا اعلان کرنے کے بہادر بنے ہوئے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ اصل بہادری یہ تھی کہ وہ خود اپنے ظلم کو جاننے کے بہادر بنیں۔ لوگ کسی نہ کسی غیر خدا کا دامن تھام کر سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے اپنے لئے مضبوط پناہ حاصل کرلی، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ خدا کے سوا کوئی نہ تھا جو کسی کے لئے پناہ بن سکے۔ لوگ الفاظ بول کر اپنے کو بری الذمہ سمجھ رہے ہیں۔ اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ یہ صرف حقائق تھے جو کسی کو بری الذمہ کرسکتے تھے۔ لوگ دنیا کے اسباب کو اکھٹا کر کے مطمئن ہیں کہ جو کچھ ان کو پانا تھا وہ انھوں نے پالیا، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب موت ان کی ہر چیز کو باطل کردے گی اور ان کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کچھ بھی نہیں پایا تھا۔ لوگ دوسروں کی غلطیوں کی فہرست مرتب کر رہے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب فرشتے خود ان کی غلطیوں کی فہرست ان کے سامنے پیش کریں گے۔ لوگ زندگی کو اصل مسئلہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ ان کا اصل مسئلہ موت تھا نہ کہ دنیا کی چند روزہ زندگی۔ لوگ اپنے خود ساختہ معیار کے مطابق پاکر اپنے کو برحق سمجھ رہے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ حق پر صرف وہ تھا جو اللہ کے مقرر کئے ہوئے معیار کے مطابق تھا۔ لوگ استقبال کرنے والوں کی بھیڑ پاکر اپنے کو خوش قسمت سمجھ رہے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ خوش قسمت صرف وہ تھا جس کے استقبال کے لئے اللہ اور اس کے فرشتے اس کا انتظار کر رہے تھے —— ہر آدمی نے اپنی خوش خیالیوں کی ایک دنیا بنا رکھی ہے اور اپنے آپ کو اس کے اندر پاکر مطمئن ہے۔ مگر قیامت ایسے تمام گھروندوں کو توڑ دے گی۔ اس وقت صرف وہ شخص محفوظ ہوگا جو خدا کے "گھر" میں پناہ پکڑے ہوئے تھا، جس نے اپنے لئے خدا کا سایہ حاصل کرلیا تھا۔

یہ جہنمی قافلے

"ہر آدمی جنت کی تلاش میں ہے مگر ہر آدمی اپنی جنت کو دوزخ میں تلاش کر رہا ہے" میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "لوگ کانٹوں میں پھول کو ڈھونڈ رہے ہیں، وہ اپنی زندگی کو کھنڈر کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بہت جلد ان کے لئے ایک شاندار محل کھڑا ہونے والا ہے"۔

ہر آدمی اپنی زندگی کو سنوارنے میں لگا ہوا ہے۔ کوئی تجارت اور ملازمت کے میدان میں محنت کر رہا ہے۔ کوئی قیادت کے میدان میں اپنا نام اونچا کرنے کے لئے سرگرم ہے۔ کسی کا دماغ خوبصورت الفاظ کا کارخانہ بنا ہوا ہے تاکہ وہ عوام کی بھیڑ کو زیادہ سے زیادہ اپنے گرد جمع کر سکے۔ ہر آدمی اپنے ذہن میں اپنے مستقبل کا ایک سہانا خواب لئے ہوئے ہے اور ہر آدمی اپنے خواب کو واقعہ بنانے میں رات دن مصروف ہے۔ مگر لوگوں سے قریب ہو کر ان کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اپنے خوابوں کی دنیا کو حاصل کرنے کے لئے لوگوں کے پاس عمل غیر صالح کے سوا کوئی سرمایہ نہیں۔

آدمی اپنے رشتہ داروں کے حقوق سے بے پرواہو کر اپنے بچوں کا مستقبل بنانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو دکھ پہنچا کر دور کے لوگوں میں خوش نام ہونے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بے انصافی کر کے باہر کی دنیا میں انصاف کا علم بردار بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے خلاف ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہیں مگر دوسروں کے خلاف سب کچھ کہنے اور کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے۔

خدا نے اپنی دنیا میں انسان کے لئے وہ سب کچھ رکھا ہے جو وہ چاہتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ بھی۔ مگر خدا کی دنیا میں ہر اچھی چیز کو پانے کا ذریعہ اچھا عمل ہے ——— خدا کا انعام ان لوگوں کو ملتا ہے جو اپنے متعلقین کے حقوق ادا کریں۔ جو اپنے پڑوسیوں کو اپنے شر سے بچائیں۔ جو اپنے اہل معاملہ کے ساتھ انصاف کریں۔ جو خود پسندی کے بجائے خدا پسندی کے اوپر اپنی زندگیوں کو اٹھائیں۔ جو لوگوں سے حق اور عدل کی بنیاد پر معاملہ کریں نہ کہ اکڑ اور خود غرضی کی بنیاد پر۔ جو حق کے آگے جھک جائیں چاہے وہ ان کے خلاف کیوں نہ ہو۔ جو اپنی انا کو خدا کے حوالے کر دیں اور خدا کی دنیا میں بے انا بن کر رہنے پر راضی ہو جائیں۔

لوگ جہنمی انگاروں میں کودتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خوبصورت پھولوں سے کھیل رہے ہیں۔ وہ دوزخ کے راستوں میں دوڑ رہے ہیں اور خوش ہیں کہ بہت جلد وہ جنت کے باغوں میں پہنچنے والے ہیں۔ آہ وہ قافلہ جس کے پاس جھوٹی خوش فہمی کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ آہ وہ لوگ جو خدا کی دنیا میں اپنے لئے ایک ایسی دنیا بنانا چاہتے ہیں جس کی خدا نے اجازت نہیں دی۔

خدا سے ڈرو

آج کوئی بستی ایسی نہیں ہے جہاں ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم نہ کر رہا ہو۔ آج مسلمان اپنے بھائی کو ستانے کے لئے سب سے زیادہ شیر بنا ہوا ہے۔ مگر لوگ کس آدمی کو ستاتے ہیں۔ اس آدمی کو جو ان کی نظر میں کمزور ہو۔ جو دادا گیری کرنا نہ جانتا ہو، جس نے اپنے آگے پیچھے ساتھیوں کی فوج نہ جمع کر رکھی ہو، جو پولس اور کچہری سے دور رہنا چاہتا ہو۔ لوگ بے زوروں کے لئے بہادر ہیں اور جو شخص لوگوں کو زور آور دکھائی دیتا ہو اس کے لئے کوئی بہادر نہیں۔

مگر یہ اندھے پن کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ اگر ان کے پاس دیکھنے والی آنکھ ہو تو وہ سب سے زیادہ اس سے ڈریں جس کو وہ بے زور سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص بے زور ہے اس کے پیچھے خدا کھڑا ہوا ہے۔

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آزمائش کے منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے۔ خدا کو جانچ کر ہر شخص کے بارے میں جاننا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہے اور وہ کون ہے جو اللہ سے بے خوف ہے۔ اس کی جانچ کیسے ہو۔ اس کی جانچ ان اشخاص کی سطح پر نہیں ہو سکتی جو اپنی زور آوری کی وجہ سے لوگوں کو مرعوب کئے رہتے ہیں، جن کی طاقت دیکھ کر لوگوں کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ان کے خلاف اگر لوگ برائی نہ کریں تو یہ ان کی اپنی طاقت سے ڈرنے کی وجہ سے ہوگا نہ کہ خدا کے ڈر کی وجہ سے۔

مگر ایک شخص ہے جس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں جو لوگوں کو مرعوب اور خوف زدہ کرتی ہے۔ اس کو ستانے سے اگر کوئی شخص بچتا ہے تو اس کی وجہ یقیناً اخلاقی ہوگی نہ کہ مادی۔ خدا کچھ افراد کو بے زور اور بے حیثیت بنا کر لوگوں کے درمیان رکھتا ہے اور پھر ان کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ جو شخص کمزور آدمی کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرا وہ گویا خدا سے ڈرا، اس کا ٹھکانا جنت ہوگا۔ جو شخص کمزور آدمی کے ساتھ بے انصافی کرنے سے نہیں ڈرا وہ گویا خدا سے نہیں ڈرا، ایسا شخص جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔

ہر آدمی بری زندگی گزار کر مرجاتا ہے تاکہ موت کے بعد اور زیادہ بری زندگی کی طرف دھکیل دیا جائے!

جب حقیقت کھلے گی

دنیا میں کچھ لوگ وہ ہیں جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ دکھاوے کے لئے خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حال آخرت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہاں جب کہا جائے گا کہ اپنے رب کو سجدہ کرو تو وہ وہاں سجدہ نہ کرسکیں گے (قرآن ۴۲ - ۶۸)

سجدہ محض ایک وقتی اور رسمی نوعیت کا جسمانی فعل نہیں۔ وہ اپنے آپ کو حقیقت اعلیٰ کے آگے جھکانا ہے، وہ اپنی پوری زندگی کو حق و صداقت کے تابع بنا دینا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں محدود معنوں میں صرف "سجدہ" کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہ آیت پوری زندگی کے بارہ میں ایک اہم حقیقت کو بتا رہی ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر شخص اور ہر قوم کا یہ حال ہے کہ ان کے دل سچائی کے آگے جھکے ہوئے نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو حق کے تابع نہیں بنایا ہے۔ مگر ظاہری رویہ میں ہر ایک یہ دکھا رہا ہے کہ وہ حق پر قائم ہے۔ ہر ایک اپنی زبان سے ایسے الفاظ بول رہا ہے گویا کہ اس کا کیس انصاف کا کیس ہے نہ کہ ظلم اور استغلال کا کیس۔

مگر اس قسم کی دھاندلی صرف موجودہ امتحانی دنیا میں ممکن ہے۔ آخرت کے آتے ہی پوری صورت حال بالکل بدل جائے گی۔ بازار میں کھوٹے سکے چل سکتے ہیں مگر بنک میں کھوٹے سکے نہیں چلتے۔ اسی طرح آخرت میں اس کا امکان ختم ہو جائے گا کہ کوئی جھوٹی بات کو سچے الفاظ میں بیان کرے۔ کوئی بے انصافی کے عمل کو انصاف کا عمل ثابت کرے۔

آخرت میں یہ ہوگا کہ الفاظ جھوٹے معانی کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ کسی کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ ظلم کو انصاف بتائے اور باطل کو حق کے لباس میں پیش کرے۔ اس وقت ظاہر اور باطن کا فرق ختم ہو جائے گا۔ آدمی کی زبان وہی بول سکے گی جو اس کے دل میں ہے۔ اس دن ہر آدمی عین اس روپ میں دکھائی دے گا جو باعتبار حقیقت تھا نہ کہ اس روپ میں جو وہ مصنوعی طور پر دوسروں کے سامنے ظاہر کر رہا تھا۔

لوگ انسان کے سامنے اپنے آپ کو حق بجانب دکھا کر مطمئن ہیں کہ وہ حق بجانب ثابت ہو گئے۔ حالانکہ حق بجانب وہ ہے جو خدا کے سامنے حق بجانب ثابت ہو۔ اور وہاں کا حال یہ ہے کہ وہاں صرف حق حق ثابت ہوگا اور جو باطل ہے وہ وہاں صرف باطل ہو کر رہ جائے گا۔

نازک سوال

آرتھر کونسلر موت کی طرف سفر کو نامعلوم ملک (Unknown Country) کی طرف سفر کہتا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ موت ہماری زندگی کا سب سے عجیب اور پر اسرار واقعہ ہے۔ ہر آدمی متجسس ہوتا ہے کہ یہ معلوم کرے کہ مر کر وہ کہاں پہنچنے والا ہے۔

امریکہ کے مشہور مشنری ڈاکٹر بلی گرہم کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے مسرّت کا راز (The Secret of Happiness) اس کتاب میں بلی گرہم نے لکھا ہے کہ ایک بار مجھے دنیا کے ایک بہت بڑے لیڈر کا ارجنٹ پیغام ملا۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ فوراً مجھ سے ملاقات کرو۔

میں روانہ ہو کر مذکورہ لیڈر کے یہاں پہنچا۔ جب میں لیڈر سے اس کے دفتر میں ملا تو وہ فوراً مجھے الگ کمرہ میں لے گیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑے موثر لہجہ میں کہا :

I am an old man. Life has lost all meaning. I am ready to take a fateful leap into the Unknown. Young man, can you give me a ray of hope.

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ زندگی نے اپنی تمام معنویت کھو دی ہے۔ عنقریب میں نامعلوم دنیا کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان شخص، کیا تم مجھے امید کی کوئی کرن دے سکتے ہو۔

موت ہر آدمی کا پیچھا کر رہی ہے۔ بچپن اور جوانی کی عمر میں آدمی اسے بھولا رہتا ہے۔ مگر بالآخر تقدیر کا فیصلہ غالب آتا ہے۔ بڑھاپے میں جب اس کی طاقتیں گھٹ جاتی ہیں۔ تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب میں بہر حال جلد ہی مر جاؤں گا۔ اس وقت وہ مجبور ہوتا ہے کہ سوچے کہ "موت کے بعد کیا ہونے والا ہے"، اسے تلاش ہوتی ہے کہ وہ کوئی امید کی کرن پالے جو موت کے بعد آنے والے حالات میں اس کی زندگی کو تابناک کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے پیغمبر اسی امید کی روشنی کو دینے کے لئے آئے۔ پیغمبروں نے انسان کو بتایا کہ موت کے بعد ایک اور دنیا ہے جو ابدی بھی ہے اور معیاری بھی۔ موت کے بعد کی اس کامل دنیا میں اس کو داخلہ ملے گا جو موت سے پہلے کی دنیا میں صالح اعمال سے اس کا استحقاق ثابت کرے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے :

...and God calls to the home of peace.

اور خدا امن کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ واللہ یدعوا الی دار السلام، یونس ۲۵)

آج بونا کل کاٹنا

گھنشیام داس برلا (۱۹۸۳ ۔ ۱۸۹۴) راجستھان کے ایک گاؤں پلانی میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ ایک معمولی آدمی تھے اور کلکتہ میں جوٹ کے دلال کے طور پر کام کرتے تھے۔ چودہ سال کی عمر میں مسٹر برلا بھی کلکتہ چلے گئے اور وہاں اپنے باپ کے کام میں مدد کرنے لگے۔

مسٹر برلا کو ایک روز کلکتہ کے کسی تجارتی دفتر کی عمارت میں اوپر کی منزل پر جانا تھا۔ وہ جب لفٹ میں سوار ہونے لگے تو انھیں روک دیا گیا۔ کیوں کہ یہ لفٹ صرف انگریز افسروں کے استعمال کے لئے تھی۔ جب وہ سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر پہنچے تو وہاں بھی ان کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔ ان کو ایک بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا جو چپراسیوں کے لئے مخصوص تھی۔ تاہم نوجوان برلا اس بنچ پر نہیں بیٹھے اور کام ہونے تک برابر کھڑے رہے۔

انگریزی دور میں مذکورہ بالا قسم کے تجربات نے مسٹر برلا کے اندر قومی آزادی کے خیالات پیدا کر دئے۔ وہ تحریک آزادی میں مہاتما گاندھی کے ساتھی بن گئے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ سرمایہ دار طبقہ کانگرس کے قریب آنے سے گھبراتا تھا۔ مگر مسٹر برلا نہایت دوربین اور حوصلہ مند آدمی تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے کی کانگرس میں ۱۹۴۷ کے بعد کی کانگرس کی جھلک دیکھ لی۔ انھوں نے قومی تحریک کے دور کے ہندستان میں آزادی کے دور کے ہندستان کا مشاہدہ کر لیا۔ انھوں نے اس راز کو پالیا کہ آج کے "لیڈر" کل کے "وزیر" ہوں گے، آج اگر وہ ان لیڈروں کی مدد کریں تو کل وہ ان سے زبردست فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آزادی کی تحریک کی باقاعدہ مالی مدد شروع کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ تک وہ اس سلسلے میں گاندھی جی کو اور کانگرس پارٹی کو تقریباً ۲۰ کروڑ روپے دے چکے تھے۔

آزادی کے بعد مسٹر برلا کو اس کا زبردست فائدہ حاصل ہوا۔ نئی حکومت کی طرف سے ان کو ہر قسم کی غیر معمولی سہولتیں ملنا شروع ہوگئیں۔ انھوں نے اتنی تیزی سے ترقی کی کہ آزاد ہندستان کے سب سے بڑے صنعت کار بن گئے۔ آج برلا کا خاندان ہندستان کا سب سے زیادہ دولتمند خاندان سمجھا جاتا ہے۔

جو آدمی آج بوتا ہے وہی آدمی کل کاٹتا ہے۔ یہ بات آج کی دنیا کے لئے بھی صحیح ہے اور یہی کل کی دنیا کے لئے بھی۔

موت کے کنارے

آج وہ بے وقت مجھ سے ملنے آگیا تھا اور بہت کم میرے پاس ٹھہرا۔ خلاف معمول اس نے چائے بھی قبول نہیں کی۔ "مجھے بہت جلد گھر پہنچنا ہے۔ وہاں میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی" اس نے کہا اور اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کرکے تیزی سے روانہ ہوگیا۔ اس کی واپسی کو بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس کی بیوی گھبرائی ہوئی آواز میں بول رہی تھی "آپ کے دوست کا ۔ ۔ ۔" اس نے کہا۔ بظاہر اس کا جملہ ادھورا تھا۔ مگر اس کے رونے کی آواز نے اس کو پورا کر دیا۔ میں ٹیلی فون بند کرکے فوراً اس کے گھر کی طرف بھاگا۔ معلوم ہوا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھ سے رخصت ہو کر وہ اپنے گھر پہنچا۔ ابھی سیڑھیوں ہی پر تھا کہ لڑھک کر گر پڑا۔ لوگ اٹھا کر اندر لے گئے۔ فوراً ڈاکٹر بلایا گیا مگر ڈاکٹر نے آکر صرف یہ خبر دی کہ وہ اس دنیا سے جا چکا ہے۔

اسکوٹر پر سوار ہو کر وہ میرے یہاں سے روانہ ہوا تو بظاہر وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ مگر حقیقۃً وہ موت کی طرف جا رہا تھا۔ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں۔ اس طرح کے واقعات ہر روز اور ہر جگہ پیش آرہے ہیں۔ ۲۶ مئی ۱۹۷۹ کو امریکہ کا ایک بڑا جیٹ جہاز جس میں ۲۷۱ مسافر سوار تھے، اوہرے (O'Hare) ہوائی اڈے سے اڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ زمین پر گر گیا۔ جہاز سمیت سارے مسافر جل کر راکھ ہوگئے۔ یہ معاملہ چند انسانوں کا نہیں بلکہ یہی معاملہ تمام انسانوں کا ہے۔ سارے انسان جو زمین پر چلتے اور دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ سب موت کی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ ہر آدمی سب سے زیادہ جس چیز کے قریب ہے وہ موت ہے۔ ہر آدمی موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ ہر آدمی ہر آن اس خطرہ میں مبتلا ہے کہ اس کا آخری وقت آجائے اور وہ اچانک اس دنیا سے اٹھا کر اگلی دنیا میں پہنچا دیا جائے، جہاں سے کسی کو واپس نہیں آنا ہے۔ جہاں آدمی کے لئے یا تو جنت ہے یا جہنم۔

ایک اندھا آدمی چلتے چلتے کنوئیں کے کنارے پہنچ جائے تو ہر آدمی جانتا ہے کہ اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس کو کنوئیں کے خطرہ سے آگاہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ ایسے نازک موقع پر آدمی قبلہ و کعبہ کی زبان اور نحو و صرف کے قواعد تک بھول جاتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے "کنواں کنواں"۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ساری انسانیت اس سے بھی زیادہ خطرناک "کنوئیں" کے کنارے کھڑی ہوئی ہے۔ مگر ہر آدمی دوسرے دوسرے کاموں میں لگا ہوا ہے۔ کوئی شخص "کنواں کنواں" پکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی دیوانہ اس قسم کی پکار بلند کرے تو لوگوں کی طرف سے جواب ملتا ہے ——— "یہ شخص قوم کو بزدلی کی نیند سلانا چاہتا ہے، وہ جہاد کے جذبہ کو ختم کر رہا ہے، وہ حقیقی مسائل سے لوگوں کو ہٹا دینا چاہتا ہے، وہ زندگی کا پیغام بر نہیں بلکہ موت کا داعی ہے۔ وہ مایوسی اور بے ہمتی کا سبق دے رہا ہے"۔

لوگ کنوئیں کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ محفوظ مکان میں ہیں۔ لوگ موت کی طرف جا رہے ہیں مگر خوش ہیں کہ وہ زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں۔

آنے والا دن

موجودہ دنیا میں جب کوئی آدمی خدا کو مانتا ہے تو وہ دلیل کی بنیاد پر خدا کو مانتا ہے۔ آخرت میں جو لوگ خدا کو مانیں گے وہ خدا کے زور و قوت کی بنیاد پر خدا کو مانیں گے۔ گویا موجودہ دنیا میں دلیل خدا کی نمائندہ ہے۔ اس کے برعکس آخرت میں یہ ہوگا کہ خدا خود اپنی ذات کمال کے ساتھ اپنے آپ کو منوانے کے لئے انسان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقت میں خدا کو ماننے والا کون ہے اور اس کو نہ ماننے والا کون۔ خدا کو ماننے والا وہ ہے جو معقولیت کے وزن کو مانے۔ جو حق کے آگے اس وقت جھک جائے جب کہ اس کے ساتھ لفظی دلیل کے سوا کوئی اور زور شامل نہ ہو۔ اس کے برعکس جس کا یہ حال ہو کہ کوئی بات محض اپنی سچائی کی بنا پر اس کو متاثر نہ کرسکے، وہ کسی سچائی کو صرف اس وقت مانے جب کہ وہ کسی وجہ سے اس کو ماننے کے لئے مجبور ہو گیا ہو۔ جس سچائی کے ساتھ ایسا کوئی دباؤ موجود نہ ہو وہ اس کو ماننے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتا ہو، ایسا آدمی خدا کو ماننے والا نہیں ہے۔ اس کا معبود ظاہری طاقت ہے نہ کہ غیبی خدا۔

خدا اپنے ماننے کا ثبوت غیب کی سطح پر لے رہا ہے اور لوگ اس کو ماننے کا ثبوت شہود کی سطح پر دینا چاہتے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی حق کے آگے جھک جائے مگر آدمی صرف طاقت کے آگے جھکنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی محض خدا کے خوف کی بنا پر انصاف کے طریقہ کو اپنالے۔ مگر انسان صرف اس وقت انصاف کرنے پر راضی ہوتا ہے جب کہ وہ اس کے لئے مجبور ہو گیا ہو۔ جہاں مجبوری نہ ہو وہاں وہ فوراً سرکشی کرنے لگتا ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی کو موقع ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو چھپالے۔ مگر قیامت ہر آدمی کو برہنہ کر دے گی۔ اس وقت بہت سے خدا پرست غیر خدا پرستوں کی صف میں نظر آئیں گے، بہت سے حق کو ماننے والے حق کو نہ ماننے کے مجرم قرار دئے جائیں گے۔ بہت سے لوگ جو جنت کا الاٹمنٹ لئے ہوئے ہیں وہ اپنے کو جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا پائیں گے۔

انسان کتنا زیادہ بے ڈر بنا ہوا ہے۔ حالانکہ کتنا زیادہ ڈر کا لمحہ اس کے لئے آنے والا ہے۔

سب سے بڑی خبر

ایک ایم سی نوجوان دہلی میں سرکاری ملازم ہیں۔ ان سے میری پرانی ملاقات ہے۔ ایک روز میں کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا، رات کو واپس آیا تو گھر والوں نے بتایا کہ آج مذکورہ نوجوان کئی بار آپ سے ملنے کے لئے آچکے ہیں۔ ابھی باتیں ہورہی تھیں کہ گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا گیا تو مذکورہ نوجوان تیسری بار مجھ سے ملنے کے لئے دروازے پر موجود تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی وہ مسکرا کر بولے "آج میں آپ کو ایک خوش خبری دینے آیا ہوں"۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ میرا پرموشن ہوگیا ہے اور اب میری تنخواہ میں سو روپیہ ماہوار کا اضافہ ہو جائے گا۔

میں نے سوچا کہ آدمی کے پاس اگر کوئی اہم خبر ہو تو وہ اس کو چھپانے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اہم خبر کو آدمی بتا کر رہتا ہے۔ بلکہ وہ ڈھونڈتا ہے کہ کوئی ملے تاکہ وہ اس کو بتا سکے۔ کسی نے نئی کار خریدی ہو یا نیا مکان بنایا ہو تو اس کا چرچا کئے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔ کسی مجلس میں اگر اس کی کار یا اس کا مکان موضوع گفتگو نہ ہو تو وہ کسی نہ کسی طرح موضوع کو بدل کر ایسے رخ پر لاتا ہے کہ وہ اپنی نئی کار اور نئے مکان کی خبر لوگوں کو دے سکے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنی اہم خبر کو دوسروں کو سنانے کے لئے بے قرار نہ رہتا ہو۔

آج بے شمار آوازیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی پیغام ہے جس کو وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ مگر سنانے والوں کی بھیڑ میں کوئی آخرت کی خبر سنانے والا نہیں۔ کوئی جنت اور جہنم سے آگاہ کرنے والا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بولنے اور لکھنے والوں کے پاس آخرت کی خبر ہی نہیں۔ ہر ایک کے پاس دنیا کی کوئی نہ کوئی خبر ہے۔ آخرت کی خبر کسی کے پاس موجود ہی نہیں۔ اگر کسی کے پاس آخرت کی خبر ہوتی تو وہ اس کو سنائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بلکہ آخرت کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر اس کا یہ حال ہوتا کہ اس کے لئے کوئی دوسری خبر، خبر نہ ہوتی جس کو سنانے کے لئے وہ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو۔ وہ اپنی ساری طاقت اور سارا وقت بس آخرت کی خبر سنانے میں لگا دیتا، جہنم سے ڈرانے اور جنت کی خوش خبری دینے کے سوا کوئی کام اس کو کام نظر نہ آتا۔

اگر یہ معلوم ہو کہ اگلے چند لمحہ کے بعد بھونچال آنے والا ہے یا آتش فشاں پھٹنے والا ہے تو ہر آدمی اسی کا تذکرہ کرنے میں مشغول ہوگا۔ ہر دوسری بات کو بھول کر لوگ آنے والے ہولناک لمحہ پر بات کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر تقریر کرنے والے تقریریں کر رہے ہیں اور مضامین لکھنے والے مضامین لکھ رہے ہیں مگر یہ سب چیزیں قیامت کے تذکرہ سے اس طرح خالی ہوتی ہیں جیسے کہ لوگوں کو آنے والے ہولناک دن کی خبر ہی نہیں۔

آدمی اکثر اپنے گرد و پیش کے مسائل میں الجھا رہتا ہے، ذاتی یا قومی قسم کے معاشی اور سیاسی اور سماجی واقعات جن کا وہ اپنے آس پاس تجربہ کرتا ہے وہ انھیں کو واقعہ سمجھتا ہے اور انھیں کے چرچے میں مشغول رہتا ہے۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ قیامت کا مسئلہ ہے۔ قیامت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے مگر وہ ہونے والے واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے، وہ تمام واقعات سے زیادہ اس قابل ہے کہ اس کا چرچا کیا جائے۔

ایک پکار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت حق کی ذمہ داری سونپی گئی تو آپ نے مکہ کے باشندوں کو صفا پہاڑی کے پاس جمع کیا اور فرمایا کہ اے لوگو، جس طرح تم سوتے ہو اسی طرح تم مروگے۔ اور جس طرح تم جاگتے ہو اسی طرح تم دوبارہ اٹھائے جاؤگے۔ اس کے بعد یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم یہ سن کر ابولہب نے کہا، تمہارا برا ہو، کیا تم نے ہم کو اسی لئے بلایا تھا (تبا لک، اما جمعتنا الا لهذا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ کے سردار بن کر مدینہ میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی آپ نے اسی قسم کی تقریر فرمائی۔ اس وقت بھی آپ کے پاس کہنے کی جو سب سے بڑی بات تھی وہ یہ تھی کہ اے لوگو اپنے آپ کو آگ کے عذاب سے بچاؤ، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو (اتقوا النار ولو بشق تمرة)

اسلامی مرکز کا مقصد اسی پیغمبرانہ دعوت کو زندہ کرنا ہے۔ لوگ مسائل زندگی کے لیے اٹھتے ہیں۔ ہم مسائل موت کے لئے اٹھے ہیں۔ کیا کوئی ہے جو اس مشن میں ہمارا ساتھ دے۔ لوگوں کو جنگ اور فساد کے شعلے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا کوئی ہے جس کو جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلے دکھائی دیتے ہوں تاکہ وہ ہمارا ساتھ دے کر دنیا والوں کو جہنم کے شعلوں سے ڈرائے۔

لوگوں کو شہروں کی رونقیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہم ان انسانوں کی تلاش میں نکلے ہیں جن کو قبرستان کے ویرانے دکھائی دیں۔ ایسے انسانوں سے دنیا پٹی ہوئی ہے جن کو یہ محرومی بیتاب کئے ہوئے ہے کہ ان کو کسی ادارہ میں داخلہ نہیں ملا۔ ہم کو وہ انسان درکار ہیں جن کو یہ غم بدحواس کردے کہ کہیں وہ جنت کے داخلہ سے محروم نہ ہو جائیں۔ لوگ دنیا کی بربادی کا ماتم کر رہے ہیں۔ ہم ان انسانوں کو ڈھونڈ رہے ہیں جو آخرت کی بربادی کے اندیشے میں دیوانے ہو چکے ہوں۔

خدا کی دنیا میں آج سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر وہی ایک کام نہیں ہو رہا ہے جو خدا کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ یعنی آنے والے ہولناک دن سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔ اگر انسان اس پکار کے لئے نہ اٹھیں تو اسرافیل کا صور اسے پکارے گا۔ مگر آہ، وہ وقت جاگنے کا نہیں ہوگا۔ وہ ہلاکت کا اعلان ہوگا نہ کہ آگاہی کا الارم۔

Regd.R.No.28822/76

APRIL, 1984
ISSUE No. 89

ناکافی تیاری کے ساتھ کیا ہوا اقدام
مسئلہ کو پہلے سے زیادہ سخت بنا دیتا ہے

مئی ۱۹۸۴ء قیمت فی پرچہ — تین روپے، شمارہ ۹۰

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

مئی ۱۹۸۴
شمارہ ۹۰

سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ- نئی دھلی ۱۱۰۰۱۳

اعلان

ادارۂ الرسالہ اور اسلامی مرکز کے لئے ہمارا نیا پتہ نوٹ فرمائیں:

سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ. نئی دھلی ۱۱۰۰۱۳

C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013 (India)

Phone : 611128

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

قرآن محافظ ہے

اللہ تعالیٰ نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے :

یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله یعصمك من الناس	اے رسول، جو کچھ تمھارے اوپر اتارا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دو۔ اور اگر تم نے اس کو نہیں پہنچایا تو تم نے اپنی رسالت نہیں پہنچائی۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔
مائدہ ۶۷	

اس آیت کے مطابق قرآن (اللہ کی اتاری ہوئی کتاب) حاملین قرآن کے بچاؤ کی ضمانت ہے۔ قرآن کے حامل کو صرف قرآن کا حامل بنا ہے۔ اس کے بعد اس کے تمام مسائل میں خدا اس کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔

قرآن بلاشبہہ اس دنیا میں ہمارا محافظ ہے۔ وہ جن وانس کے تمام فتنوں کے مقابلہ میں ہماری حفاظت کرتا ہے۔ مگر قرآن کو اپنا محافظ بنانے کی ایک لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ ہم قرآن کے ساتھ غیر قرآن کو جمع نہ کریں۔ پانی کے ساتھ اگر آپ راکھ کو جمع کرلیں تو ایسا پانی آپ کی پیاس نہیں بجھاتا۔ کھانے کے ساتھ اگر آپ پتھر کو جمع کرلیں تو ایسا کھانا آپ کو سیر نہیں کرتا۔ پھر جس قرآن کے ساتھ غیر قرآن کو جمع کر لیا گیا ہو وہ حقیقی قرآن کے نتائج کس طرح دکھائے گا۔

قرآن چاہتا ہے کہ ہم اس کو تبلیغ کی کتاب بنائیں۔ اس کے برعکس ہم اس کو برکت کی کتاب بنا کر چھوڑ دیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ ہم دوسری اقوام کو اپنا مدعو سمجھیں، اس کے برعکس ہم ان کو اپنا حریف اور رقیب بنا ڈالیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ ہم اس کو اپنی زندگی کے لئے رہنما کتاب بنائیں۔ اس کے برعکس ہم اس کو قومی فخر کی کتاب بنا ڈالیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ ہم لوگوں کے درمیان خدائی اخلاقیات کے ساتھ رہیں۔ اس کے برعکس ہم ان کے درمیان شیطانی اخلاقیات کے ساتھ رہنے لگیں۔

اس قسم کا ہر عمل قرآن کے ساتھ گویا غیر قرآن کو جمع کرنا ہے۔ اور جو لوگ قرآن کے ساتھ غیر قرآن کو جمع کریں۔ قرآن کبھی ان کا محافظ نہیں بن سکتا۔ یہ اعمال تو قرآن کو چھوڑنے کے ہم معنی ہیں۔ پھر جو لوگ قرآن کو چھوڑ چکے ہوں ان کی زندگی میں قرآن کے وہ نتائج کیسے نکل سکتے ہیں جو قرآن کو اپنے ساتھ لینے کی صورت میں نکلتے ہیں۔

اگلا پیراگراف

ایک ناول نگار کا واقعہ ہے۔ اس نے ایک ناول لکھا۔ یہ ناول بہت زیادہ ضخیم تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے ایک دوست نے کہا ——— "اف اتنا لمبا ناول، اس کو لکھتے لکھتے تم اکتا نہیں گئے" ناول نگار نے فوراً جواب دیا:

"ہرگز نہیں۔ میری توجہ ہمیشہ اگلے پیراگراف پر لگی رہتی تھی"

انسانی زندگی بھی اسی قسم کی ایک طویل اکتا دینے والی کہانی ہے جو ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں کے واقعات کے ساتھ ہر آن لکھی جا رہی ہے۔ اس لمبی اور خشک کہانی سے مسلسل دل چسپی باقی رکھنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کی توجہ، ہمیشہ کہانی کے اگلے پیراگراف پر لگی رہے۔

یہی بات آخرت کے اعتبار سے بھی درست ہے۔ ایک شخص یہ فیصلہ کرے کہ وہ موجودہ دنیا میں حق کے مطابق زندگی گزارے گا۔ وہ وہی کرے گا جو کرنا چاہئے اور وہ نہیں کرے گا جو نہیں کرنا چاہئے۔ ایسے شخص کو بہت جلد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے "پانے" کے بجائے "کھونے" کی راہ اختیار کی ہے۔ اس کو موجودہ دنیا میں اپنی محنتوں اور قربانیوں کا صلہ نہیں ملتا۔

جن لوگوں کو اس نے ملانا چاہا تھا وہ شکایتیں لے کر الگ ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو اس نے اپنا ساتھی سمجھا تھا وہ اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ جن لوگوں کی خاطر اس نے اپنی زندگی ویران کر دی تھی ان سے اسے صرف الزامات کے تحفے حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس سے کم محنت کر کے اپنا "محل" کھڑا کر لیتے ہیں اور اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ محنت کرنے کے باوجود اس کا "جھونپڑا" بھی تیار نہیں ہوتا۔

ایسی حالت میں حق کے راستہ پر قائم رہنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنی توجہ آخرت کی طرف لگا لے۔ اس کی نظر کہانی کے "اگلے پیراگراف" پر مرتکز رہے۔

کوئی بڑی کامیابی اسی شخص کے حصہ میں آتی ہے جو "آج" کی محرومی کے بجائے "کل" کی یافت پر نگاہ رکھے۔ جو کچھ کل ملنے والا ہے اس کی خاطر وہ آج کو نظر انداز کر دے۔

خوش فہمیوں کے باوجود

رونالڈ ریگن امریکہ کے سب سے زیادہ معمر صدر ہیں۔ ۷۲ سال کی عمر میں بھی وہ جوانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اعضاء میں کسی قسم کی کمزوری محسوس نہیں ہوتی۔ امریکی عوام کو فخر ہے کہ ان کے وھائٹ ہاؤس کا صدر ایک ایسا شخص ہے جو ۷۲ سال کی عمر میں بھی لوہے کے راڈ کی طرح سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ امریکی میگزین پریڈ (Parade) نے صدر امریکہ سے ایک انٹرویو لیا۔ اس نے صدر امریکہ کی صحت کے اصولوں اور ان کی ورزش کے بارہ میں ان سے سوالات کئے۔ اس سلسلے میں سوال و جواب کا ایک حصہ یہ تھا :

Mr. President, what about the food you eat ? Do you follow any special diet which accounts for your glowing health ?
Well, actually, I don't follow any particular diet, nor do I have fads, but I do confess I have a weakness for desserts.
Desserts ?
Yes, something like the Arabian desert with its oil.

جناب صدر، آپ اپنی غذا کے بارہ میں بتائیں۔ کیا آپ کوئی خصوصی غذا کھاتے ہیں جو آپ کی شاندار صحت کا سبب ہے۔ جواب میں صدر امریکہ نے کہا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں کسی خاص غذا کی پابندی نہیں کرتا۔ اور نہ میری کوئی مرغوب چیز ہے۔ گو میں اعتراف کرتا ہوں کہ صحرا میری کمزوری ہے۔ "صحرا" انٹرویور نے تعجب کے ساتھ کہا۔ صدر امریکہ نے جواب دیا۔ ہاں، عرب جیسا صحرا جس کے ساتھ تیل بھی ہو (ٹائمس آف انڈیا ۳۰ جنوری ۱۹۸۴)

مسلم اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ اکثریتی فرقہ ان کے قبرستانوں کے اوپر اپنی نئی زندگی کی تعمیر کر رہا ہے۔ مگر مذکورہ واقعہ علامتی شکل میں بتاتا ہے کہ مسلم اکثریت کے ممالک کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ان ملکوں میں مسلمانوں کے پاس حکومت ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں پر ان کا قبضہ ہے خدا کی دی ہوئی دولت بھی افراط کے ساتھ ان کے پاس موجود ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ ایک "کافر اور ظالم" حکمراں فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ مسلم ملکوں کی قدرتی دولت کو اپنی خوراک بنانا، یہی میری غیر معمولی صحت کا راز ہے۔

یہ صورت حال مسلمانوں کے لئے زبردست انتباہ ہے۔ کیوں کہ مسلمان جب غیر مسلموں کے استغلال کا شکار ہو جائیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا کی مدد سے محروم ہو چکے ہیں۔

تکرار

"گیتان جلی" رابندرناتھ ٹیگور کی مشہور کتاب ہے۔ اسی کتاب کے انگریزی ترجمہ پر ان کو نوبل انعام ملا تھا۔ یہ کتاب اصلاً بنگلہ زبان میں لکھی گئی تھی اس کے بعد اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہوا۔ اس کی ایک نظم کا دو مصرعہ یہ ہے:

میں تجھ کو چاہتا ہوں، صرف تجھ کو اور کسی کو نہیں۔
میرے دل کو اس آرزو کی تکرار بے نہایت کرنے دے۔

کسی چیز سے جب آدمی کا تعلق دل چسپی اور محبت کے درجہ کا ہو جائے تو وہاں تکرار کا تصور ختم ہو جاتا ہے پھر اس کی ہر تکرار آدمی کو نیا لطف دیتی ہے۔ اس کی تکرار سے آدمی کبھی نہیں اکتاتا۔ اس کی ایک عام مثال سگرٹ ہے۔ آدمی اسی ایک سگرٹ کو بار بار پیتا ہے اور روزانہ پیتا رہتا ہے۔ مگر اس کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ ایک چیز کی تکرار کر رہا ہے۔ حالانکہ اسی شخص کو اگر کوئی غیر مرغوب چیز دی جائے تو دو چار بار کے استعمال کے بعد وہ اس سے اکتا جائے گا اور اس کو تکرار کہہ کر چھوڑ دے گا۔

میں نے کئی بار ایسے نوجوان دیکھے ہیں جنھوں نے ابھی کوئی پکچر دیکھی تھی۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک اس پکچر کو دیکھے ہوئے تھا مگر وہ اس کی کہانی اور اس کے مکالمے اس طرح ایک دوسرے کو سنا رہے تھے جیسے کہ وہ کوئی نئی بات کہہ رہے ہوں اور سننے والے اس کو اس طرح سن رہے تھے جیسے وہ بالکل نئی بات سن رہے ہوں۔ پکچر کے ساتھ ان کی بڑھی ہوئی دل چسپی نے ان کے لئے تکرار کا تصور حذف کر دیا تھا۔

جب کسی کے سامنے کوئی بات کہی جائے اور وہ اس کو "تکرار" کہہ کر بے لطف ہونے لگے تو سمجھ لیجئے کہ یہ بات اس کی زندگی میں دل چسپی بن کر داخل نہیں ہوئی ہے۔ اگر وہ اس کے لئے حقیقی دلچسپی کی چیز ہوتی تو اس کی ہر تکرار اس کو نیا لطف دیتی نہ یہ کہ وہ اس کو بے لطف بنا دے۔

معاشی فراغت

محمد بن جریر الطبری (۲۲۴ - ۳۱۰ ھ) ایک انتہائی مشہور عالم ہیں۔ وہ طبرستان میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے علم کی تحصیل کے لئے رے، کوفہ، بصرہ، شام، مصر، بغداد وغیرہ کے سفر کئے۔ اپنی پوری عمر تحقیق اور تصنیف میں گزار دی۔ ان کے بارے میں ایک مورخ لکھتا ہے:

قیل انه کان یکتب کل یوم ٤٠ صفحة ویتحیرون متی ینام ومتی یاکل ویصلی وذالك لکثرة ما صنفه فی التاریخ والفقه والحدیث والتفسیر والقرأت وعلم الحساب

کہا جاتا ہے کہ وہ روزانہ چالیس صفحات لکھتے تھے اور لوگ حیرت کرتے تھے کہ وہ کب سوتے ہیں اور کب کھاتے ہیں اور کب نماز پڑھتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے تاریخ، فقہ، حدیث، تفسیر، قرأت اور علم حساب میں کثرت سے کتابیں لکھیں۔

ابن جریر طبری کی تفسیر کی کتاب ۳۰ جلدوں میں ہے اور قرآن کے مطالعہ کے لئے بے حد اہم سمجھی جاتی ہے۔ ان کی کتاب تاریخ الرسل والملوک اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ عربی اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ابن جریر طبری کی فارسی دانی ان کے لئے بہت معاون ثابت ہوئی اور انھوں نے فارسی مصادر سے معلومات حاصل کر کے اپنی کتاب میں شامل کیں۔

ابن جریر طبری نے اپنی زندگی کو علم کے لئے وقف کیا اور اہم ترین کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی وجہ ان کی معاشی فراغت تھی:

کان والد الطبری یملك مقاطعة فی طبرستان فنشأ ابن جریر غیر محتاج لکسب. اذ کان والده ینفق علیه واستمر هذا الانفاق یؤدی الیه حتی بعد وفاة ابیه وهو ینتقل بین البلاد

ابن جریر طبری کے والد کی طبرستان میں ایک جائداد تھی۔ اس کی وجہ سے ابن جریر نے کمانے کی محتاجی کے بغیر نشو ونما پائی۔ ان کے والد ان کا خرچ دیتے رہتے تھے۔ یہ معاملہ والد کی وفات کے بعد بھی باقی تھا۔ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے رہتے اور ان کا خرچ انھیں ملتا رہتا۔

کوئی موثر کام کرنے کے لئے معاشی فراغت ضروری ہے۔ اس کی اہمیت دینی کام کے لئے بھی ہے اور دنیوی کام کے لئے بھی۔

دوسرے کا اعتراف

مولانا اقبال احمد سہیل غیر معمولی ذہین اور طباع آدمی تھے۔ وہ اعظم گڈھ میں رہتے تھے۔ ان
کے چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک "ماسٹر صاحب" مقرر تھے۔ وہ رات دن مولانا
کے گھر پر رہتے تھے۔ اور بچوں کو اردو اور انگریزی وغیرہ پڑھاتے تھے۔
ماسٹر صاحب کا کھانا مولانا سہیل کے گھر سے آتا تھا۔ صبح کے ناشتہ میں بعض مرتبہ ایسا ہوا
کہ ان کے لئے سالن کے ساتھ باسی روٹی آئی۔ ماسٹر صاحب نے لڑکوں سے کہا کہ باسی
روٹی مت لایا کرو۔ باسی روٹی کھانے سے دماغ کمزور ہو جاتا ہے۔ لڑکوں نے گھر میں آکر اپنی والدہ
(اہلیہ مولانا اقبال احمد سہیل) سے یہ بات کہی۔ اسی کے ساتھ لڑکوں نے یہ بھی کہا کہ ابا تو باسی روٹی
کھاتے ہیں مگر ان کے دماغ میں کمزوری نہیں آئی۔ اہلیہ نے جواب دیا:
تمہارے ابا کا دماغ بہت بڑا ہے۔ اس میں کچھ کمی آجائے تب بھی فرق نہیں پڑتا۔
ماسٹر صاحب کا دماغ چھوٹا ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر کم ہوا تو ختم ہی ہو جائے گا۔
یہی کچھ معاملہ دوسرے کے اعتراف کا ہے۔ اکثر لوگ دوسرے کی لیاقت کا اعتراف نہیں کرتے۔ اس
کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ دوسرے کی اہمیت کا اقرار کرنے سے اپنی حیثیت گھٹ جائے گی۔
دوسرے کا اعتراف کرنے کے لئے اپنے کو چھوٹا کرنا پڑتا ہے۔ اور کون ہے جو اپنے کو چھوٹا کرنے
پر دوسرے کی حیثیت کا اعتراف کرے۔ صرف دو قسم کے لوگ ہیں جو اپنے کو "چھوٹا" کرنے
پر راضی ہوتے ہیں۔ یا تو وہ لوگ جو اتنے اونچے ہوں کہ کسی کی بڑائی کا اعتراف کرنے سے انھیں
یہ اندیشہ نہ ہو کہ ان کی شخصیت میں کمی آجائے گی۔ دوسرے وہ لوگ اس کی ہمت کرتے ہیں جنھیں اللہ کی عظمت
کے احساس نے پہلے ہی سے اتنا چھوٹا بنا رکھا ہو کہ اب کسی چیز سے انھیں مزید چھوٹا ہونے کا خطرہ
نہ ہو۔

پیغمبر انقلاب

عام اڈیشن ۲۵ روپئے

ڈی لکس اڈیشن ۵۰ روپئے

تخلیق کی حکمت

ہندستان ۸۴ ۱۹ میں روس کے تعاون سے اپنے دو آدمی خلا میں بھیجے گا۔ ان کے نام ہیں :
مسٹر رویش ملہوترا اور مسٹر راکیش شرما۔ ان دونوں ہوابازوں نے ۱۹۸۳ میں دس مہینے روس کے خلائی سنٹر (Star City) میں گزارے ہیں۔ دس مہینہ کی ٹریننگ میں ان کو جو چیزیں سکھائی گئیں ان میں سے ایک روسی زبان بھی تھی۔

بنگلور کی ایک پریس کانفرنس (ہندستان ٹائمس ۲۴ جولائی ۱۹۸۳) میں ان خلابازوں نے خلا کے بارہ میں بعض دلچسپ چیزیں بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ خلائی پرواز کے دوران آدمی تقریباً چھ سنٹی میٹر لمبا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی اصل لمبائی اس وقت واپس آجاتی ہے جب کہ وہ دوبارہ زمین پر اترتا ہے۔ لمبائی کا یہ فرق جسم کے اوپر فضا کے دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے :

One would gain about six centimetres in height during a space flight, but would get back to one's normal height soon after returning to earth with the atmospheric pressure acting on the vertebrate.

خلا میں انسانی جسم کا لمبا ہو جانا بے وزنی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وزن یا بے وزنی دونوں قوت کشش کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہماری زمین بے حد صحیح اندازہ کے مطابق بنائی گئی ہے۔ اس لئے یہاں ہر آدمی کا قامت نہایت متناسب ہوتا ہے، نہ چھوٹا اور نہ بڑا۔ زمین کی جسامت اگر موجودہ جسامت کے مقابلہ میں نصف ہو جائے تو اس کی قوت کشش گھٹ جائے گی۔ اس کے نتیجہ میں انسان غیر متناسب طور پر لمبے قد کے ہونے لگیں گے۔ موجودہ معتدل قد کے انسانوں کے بجائے ہر طرف لمبے لمبے انسان دکھائی دیں گے۔ ایک ایسی دنیا کا تصور کیجئے جہاں موجودہ معتدل قد کے انسانوں کے بجائے ہر طرف اونٹ جیسے انسان کھڑے ہوئے نظر آتے ہوں

اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ زمین کی جسامت موجودہ جسامت کے مقابلہ میں دونا ہو جائے تو اس کی قوت کشش بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جسم کا بڑھنا رک جائے گا۔ شیر کی جسامت گھٹ کر بلی جیسی ہو جائے گی اور انسان کا یہ حال ہوگا کہ وہ اپنے موجودہ خوب صورت قد کو کھو دے گا اور زمین ان چھوٹے چھوٹے انسانوں کی بستی بن جائے گی جن کو ہم بونا کہہ کر مسکراتے ہیں۔

تخلیق خداوندی کی یہی وہ حکمت ہے جس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے ——

وکل شیٔ عندہ بمقدار (الرعد ۸)

اسلام کیا ہے

آغاز اسلام کے ۳۰۰ سال بعد دسویں صدی عیسوی میں یہ حال تھا کہ آباد دنیا کے بیشتر حصہ پر اسلامی حکومت اور اسلامی تہذیب قائم ہو چکی تھی۔ یہ ایک وسیع سلطنت تھی جس کا مذہبی مرکز مکہ اور ثقافتی وسیاسی مرکز بغداد تھا۔ مغرب میں یہ سلطنت پورے شمالی افریقہ اور بحر اوقیانوس کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی، اس کے آگے پورا اسپین (سوائے استوریا کے) اور سسلی اور کریٹ کے جزائر بھی اس میں شامل تھے۔ تبرص تک اس کے اثرات پہنچ چکے تھے۔

اسی طرح جنوبی اٹلی کا شہر باری اسلامی حکومت کے ماتحت تھا اور بعض دوسرے مقامات (مثلاً امالفی) اس کے دائرہ اقتدار میں سمجھے جاتے تھے۔ عرب کے شمال میں شام، آرمینیا اور مشرقی قفقاز اسلام کے مستقل مقبوضات تھے اور مشرق میں پورا عراق، ایران اور پورا افغانستان اس کے حدود میں شامل تھا۔ ان ملکوں کے شمال میں ماوراء النہر، مغرب میں خوارزم کا علاقہ اور مغرب میں فرغانہ کی وادیاں اور پہاڑ بھی مملکت اسلامی کا حصہ تھے۔ مسلمان دریائے سندھ کو آٹھویں صدی عیسوی میں عبور کر چکے تھے اور اس کے تمام زیریں حصے ان کے قبضہ میں تھے۔

اسلام کی یہ فتوحات خدا کی خاص مدد کے ذریعے حاصل ہوئیں۔ ان کے پیچھے خدا کی عظیم مصلحت شامل تھی۔ اور وہ تھی دنیا سے شرک کا خاتمہ اور قرآن کی حفاظت کا انتظام۔ یہ دونوں کام مکمل طور پر انجام پائے۔

تاہم یہی چیز بعد کے مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا فتنہ بن گئی۔ وہ اسلام کو اس کی سیاسی تاریخ کی روشنی میں دیکھنے لگے۔ حالانکہ اسلام کو اس کی ابتدائی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔

آج ایک مسلمان جب اسلام کے احیاء کی بات سوچتا ہے تو اس کے ذہنی سانچہ میں فوراً تاریخ کا احیاء آجاتا ہے۔ وہ "فتوحات" کی تاریخ زندہ کرنے کو اسلام کو زندہ کرنے کے ہم معنی سمجھ لیتا ہے۔ جب کہ اسلام کو زندہ کرنا یہ ہے کہ ایسے افراد تیار کئے جائیں جو خدا کی عظمت وجلال کو محسوس کرنے والے اور اس سے ڈرنے والے ہوں۔ جو دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملہ کریں تو یہ سمجھ کر کریں کہ خدا کے یہاں اس کے بارہ میں ان سے پوچھ ہوگی۔ جو دنیا میں آخرت کی خاطر جئیں جو جہنم سے بچاؤ اور جنت میں داخلہ کو اپنا سب سے بڑا مسئلہ بنالیں۔ اسلام آخرت کا عنوان ہے۔ لیکن اگر ذہن صحیح نہ ہو تو وہ دنیا کا عنوان بن کر رہ جاتا ہے۔

دین فطرت

اگر ایک آدمی کو سمندر میں سفر کرنا ہو تو وہ ایسا نہیں کرتا کہ جس طرح سے وہ خشک زمین پر چلتا ہے اسی طرح وہ اپنے پیروں پر چلتا ہوا سمندر میں داخل ہو جائے۔ بلکہ اس وقت وہ ایک کشتی تیار کرتا ہے اور کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں اپنا سفر جاری کرتا ہے۔

جب ایک آدمی ایسا کرتا ہے تو وہ گویا اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں ہے بلکہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں ہے جس کے خود اپنے قوانین ہیں۔ وہ مجبور ہے کہ خدا کی اس خارجی دنیا سے کامل مطابقت کرے۔ آدمی اگر دنیا کو اپنی بنائی ہوئی دنیا سمجھتا تو وہ سمندر میں بھی اسی طرح چلنے لگتا جس طرح وہ خشکی پر چلتا ہے۔

عالم فطرت سے مطابقت کا یہ طریقہ تمام انسان اپنی زندگی کے "۵۰ فی صد" حصہ میں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ اس سے ذرا بھی انحراف نہیں کرتے۔ مگر زندگی کے بقیہ "۵۰ فی صد" حصہ میں وہ اس کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ اسلام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ یہ دعوت دیتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے دوسرے نصف حصہ میں اسی طریقہ کو اختیار کرلے جس کو وہ اپنی زندگی کے پہلے نصف حصہ میں عملاً اختیار کئے ہوئے ہے۔

انسان کی زندگی کا ایک پہلو طبیعی ہے اور دوسرا پہلو اخلاقی۔ انسان اپنی زندگی کے طبیعی پہلو میں اسی طرح خدا کا مطیع ہے جس طرح بقیہ چیزیں خدا کی پوری طرح مطیع ہیں۔ مگر اپنی زندگی کے اخلاقی پہلو میں وہ خدا کے حکم کو چھوڑ کر اپنی رائے پر چلتا ہے، وہ اطاعت کے بجائے بغاوت کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام کو اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے اس تضاد کو ختم کر دے۔ وہ صد فی صد خدا کا مطیع و فرماں بردار بن جائے۔

مادی دنیا میں قانون فطرت سے انحراف کا نتیجہ چوں کہ فوراً سامنے آجاتا ہے اس لئے آدمی مادی پہلوؤں میں اس سے انحراف نہیں کرتا۔ مگر اخلاقی دنیا میں اس کے حقیقی نتائج فوراً نہیں نکلتے اس لئے یہاں آدمی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ایک کسان فصل بونے کے وقت قانون زراعت کی پیروی نہ کرے تو فصل کاٹنے کے دن وہ محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں جو آدمی اخلاقی قوانین کی پیروی نہ کرے اس کے حصہ میں آخرت کے دن محرومی اور شرمندگی کے سوا کچھ نہ آئے گا۔

بیکار بھاؤ بکوگے

شری ہر دیو سنگھ المست (۱۸۸۳-۱۹۲۷) انگریزی اور پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ وہ اکثر سادہ مثالوں میں بڑی گہری باتیں کیا کرتے تھے۔

شری المست جی نے ایک بار اپنا ایک گیت سنایا۔ یہ گیت پنجابی زبان میں تھا۔ اس گیت میں موٹر کار کے پرزوں کو خطاب کیا گیا تھا۔ شاعر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا کہ اے پرزو، تم اپنے انجن کے ساتھ جڑے رہو۔ اسی میں تمھاری قیمت ہے۔ اگر تم اپنے انجن سے الگ ہو گئے تو یاد رکھو کہ تم اس دنیا میں بے کار لوہے کے بھاؤ بکوگے۔

یہ تمثیل بہت بامعنی ہے۔ ایک مشین کے اندر بہت سے پرزے ہوتے ہیں۔ مگر پرزے کی اہمیت اپنی مشین سے جڑے رہنے میں ہے۔ مشین سے جڑ کر ایک پرزہ انجن کا حصہ ہوتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے وہ انجن کہا جاتا ہے۔ لیکن پرزہ اگر اپنی مشین سے الگ ہو جائے تو وہ اپنی ساری اہمیت کھو دے گا۔ اب وہ کباڑ خانہ کا حصہ ہوگا نہ کہ مشین کا حصہ۔ اب اس کی قیمت "لوہے" کی ہو جائے گی جب کہ اس سے پہلے اس کی قیمت مشین کی تھی۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان اپنے پورے مجموعہ میں شامل ہو تو وہ عظیم تر مجموعہ کا جزء رہے۔ متحد ہونے کی صورت میں ایک فرد کی بھی وہی قیمت ہو جاتی ہے جو پورے مجموعہ کی قیمت ہے۔ مگر جو فرد اتحاد کے بندھن سے الگ ہو جائے وہ بس ایک فرد ہے۔ اس کی مثال اس پرزہ کی سی ہے جو اپنے انجن سے الگ ہو گیا ہو۔ ایسا پرزہ کباڑ خانہ میں جا کر لوہے کے بھاؤ بکتا ہے۔ اسی طرح فرد اپنے مجموعہ سے الگ ہو کر اپنی قیمت کھو دیتا ہے۔

پرزہ کو انجن کا جزء بننے کے لئے اپنی انفرادی ہستی کھو دینی پڑتی ہے۔ اسی طرح فرد کو بھی متحدہ مجموعہ کا جزء بننے کے لئے اپنی انفرادیت کو کھونا پڑتا ہے۔ یقیناً فرد کے لئے یہ ایک بھاری قیمت ہے۔ مگر اس دنیا میں کوئی بھی چیز قیمت دئے بغیر نہیں ملتی۔ فرد کی تسکین کے لئے یہ کافی ہے کہ اس نے اتحاد کی جو قیمت دی تھی اس سے بڑی چیز اس نے اپنے لئے پالی۔

"لوہا" اگر اپنی انفرادیت کو کھو کر "مشین" کا درجہ حاصل کرلے تو یہ اس کے لئے کھونا نہیں ہے بلکہ وہ سب سے بڑی چیز پا لینا ہے جس کی وہ اس دنیا میں تمنا کر سکتا ہے۔

ایک سفر

مارچ ۱۹۸۴ میں الجامعۃ الاسلامیہ کی دعوت پر مدینہ (سعودی عرب) کا سفر ہوا۔ وہاں ایک ہفتہ کے لئے راقم الحروف کے لکچروں کا پروگرام تھا (اس کی تفصیل الگ سفرنامہ میں ملاحظہ فرمائیں) مدینہ سے واپسی میں میں اور مولانا محمد ہاشم القاسمی ۱۲ مارچ کی دوپہر کو ریاض پہنچے۔ ریاض قدیم زمانہ میں ایک گاؤں تھا جس کا نام حجر الیمامہ تھا۔ شہر میں گھومتے ہوئے اب بھی کہیں کہیں کچی اینٹوں کی دیواروں کی صورت میں قدیم بستی کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ تاہم آج کا ریاض پورے معنوں میں ایک جدید شہر ہے جو سعودی عرب کا دار السلطنت ہے۔

ریاض میں پہاڑ دکھائی نہیں دیتے۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑا اور منصوبہ بند شہر ہے۔ اس کا بیشتر حصہ صحرا میں بسایا گیا ہے۔ تشجیر الشوارع کی اسکیموں نے صحرا میں خشک سڑکوں کو ہرا بھرا کر رکھا ہے۔ سڑکیں عام طور پر نہایت عمدہ اور بے حد کشادہ ہیں۔ تاہم یہ شہر ابھی "زیر تعمیر" مرحلہ میں ہے۔ چنانچہ ہر طرف توڑنے اور بنانے کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

۱۴ مارچ ۱۹۸۴ کو سعودی عرب کے سب سے بڑے عالم شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز کو ٹیلی فون پر بتایا گیا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے کہا کہ "شیخ سے میرا سلام کہو اور یہ کہو کہ آج دوپہر کا کھانا وہ میرے ساتھ کھائیں"۔ چنانچہ ہم لوگ ظہر کی نماز کے بعد ان کے مکان پر پہنچے۔

یہ غیر معمولی طور پر ایک بہت بڑا مکان تھا۔ ایک نہایت وسیع ہال میں نشست تھی۔ تقریباً بیس علماء کرسیوں پر موجود تھے۔ مجھ کو شیخ ابن باز کی بالکل قریبی کرسی پر بٹھایا گیا۔ اس کے بعد حسب معمول قہوہ آیا۔ آدمی نے پہلی پیالی شیخ ابن باز کی طرف بڑھائی۔ شیخ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: فَضّل یا شیخ۔ شیخ ابن باز نہایت عزت اور محبت کے ساتھ پیش آئے۔ زیادہ تر مسلم دنیا اور میرے کام کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ کھانا کھانے کے بعد دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

ریاض سے روانگی کے دن دوبارہ شیخ ابن باز سے ان کے دفتر میں ملنے گیا۔ شیخ کا دفتر اتنا بڑا ہے کہ وہ حکومت کا سکریٹریٹ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ ایک بہت بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیوں پر نشست تھی۔ وہ عام طور پر لوگوں کو بیٹھے بیٹھے رخصت کر رہے تھے۔ مگر جب میں سامنے آیا تو شیخ فوراً کھڑے ہو گئے اور دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ مجھ کو رخصت کیا۔

۱۴ مارچ کو دکتور عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ وہ سعودی عرب کی سب سے بڑی یونی ورسٹی جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کے مدیر (Rector) ہیں۔ ان کا دفتر اتنا بڑا ہے جو خود ایک یونی ورسٹی معلوم ہوتا ہے۔ ملاقات کا کمرہ ہندستان کے وزیر اعظم کے کمرہ سے بھی زیادہ وسیع اور شاندار نظر آیا۔ تاہم اس کے اندر جو انسان بیٹھا ہوا تھا وہ سراپا تواضع اور سنجیدگی کی تصویر معلوم ہوتا تھا۔

زیادہ تر ہندستان کے حالات اور اسلامی مرکز (دہلی) کے بارے میں گفتگو رہی۔ آخر میں وہ نماز ظہر کے لئے اٹھے۔ میں یہ سمجھا کہ وہ عقبی کمرہ میں نماز ادا کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ مگر وہ ہمارے ساتھ بیرونی دروازہ کی طرف چلے، یہاں تک کہ ہم لوگ زینہ سے اتر کر قریب کی مسجد میں پہنچے جو مدیر کے دفتر سے متصل بنائی گئی ہے۔ یہاں کافی لوگ نماز کے لئے جمع تھے۔ دکتور ترکی چلتے رہے یہاں تک کہ وہ امام کی جگہ پہنچ گئے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ جو شخص یونی ورسٹی کا ریکٹر ہے وہ یہاں کی مسجد کا امام بھی ہے۔

دکتور عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی نے ایک بڑی عرب شخصیت سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا ——— الشیخ وحید الدین، مدیر المرکز الاسلامی فی الھند، ھو معروف لدینا بنشاطہ وصدق سعیہ۔

سعودی عرب میں دو لاکھ سے زیادہ ہندستانی ہیں۔ ان میں ہندو، مسلمان، اور عیسائی سب شامل ہیں۔ ریاض میں بھی ان کی کافی تعداد ہے۔ ریاض کے زمانۂ قیام میں بعض ہندستانی دوستوں کی خواہش ہوئی کہ ان کے یہاں ایک وقت کا کھانا کھایا جائے۔ اس موقع پر ہندستانی دوستوں کی ایک تعداد جمع ہو گئی۔ قرآن کی بعض آیات کی روشنی میں میں نے دین کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی۔

سعودی عرب میں جو ہندستانی مقیم ہیں وہ عام طور پر خوش ہیں۔ یہاں وہ مسائل مطلق نہیں ہیں جو ہندستان جیسے ملکوں میں ہوتے ہیں۔ البتہ وطن اور خاندان سے دوری کا احساس ہر ایک کو رہتا ہے۔ دوسری بات بچوں کی تعلیم کی ہے۔ اکثر لوگ اس احساس میں مبتلا رہتے ہیں کہ وطن سے دور رہنے کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو ویسی تعلیم نہیں دلا پاتے جیسا وہ چاہتے ہیں۔

دکتور عبد الحلیم عویس جامعۃ الامام میں علوم اجتماعیہ (Social Sciences) کے پروفیسر ہیں۔ ان سے بڑی دلچسپ اور مفید ملاقاتیں رہیں۔ ایک گفتگو میں انھوں نے بڑی عمدہ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ انسان مال بناتا ہے مگر مال انسان نہیں بناتا۔ (الانسان یصنع المال ولکن المال لا یصنع الانسان)

دکتور عبد الحلیم عویس مصری ہیں اور نہایت ذہین ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کئی مصریوں نے اردو پڑھی ہے اور وہ اردو اتنی ہی اچھی جانتے ہیں جتنا کہ اہل زبان (ھم یجیدون الاردیۃ کاھلھا) ان میں سے تین مصری اس وقت جاپان میں ہیں۔ دکتور عبد الحلیم عویس نے اخبار الشرق الاوسط کے لئے میرا انٹرویو لیا۔

ریاض میں ایک سعودی نوجوان عبد اللہ الشویعر سے ملاقات ایک یادگار ملاقات تھی۔ ان کے پاس میری تمام عربی کتابیں کئی کئی تعداد میں موجود ہیں۔ وہ خود پڑھنے کے علاوہ دوسروں کو بھی تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ ایک روز گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ واللہ ہم آپ سے صرف اللہ کی خاطر محبت کرتے ہیں۔ ہم کو تمام اسلامی مصنفین سے محبت ہے اور آپ اس میں چوٹی پر ہیں (وانتم علیٰ قِمّتھا)

ساحل العاج کے ایک نوجوان ابوبکر السامی سے ملاقات ہوئی۔ وہ یہاں جامعۃ الامام میں کلیۃ الشریعۃ کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ساحل العاج کی آبادی ۸ ملین ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس میں سے ۴۵ فی صد مسلمان ہیں۔ تاہم خود مسلمانوں کا خیال ہے کہ ان کی آبادی ۶۵ فی صد سے کم نہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ صدر حکومت مسلمان ہے اور وزارت میں کئی مسلمان شامل ہیں۔

مذکورہ نوجوان سے میں نے پوچھا کہ ساحل العاج میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ مسلمانوں نے یہاں کی یونی ورسٹی میں شاندار مسجد بنا لی ہے۔ ٹیلی ویژن پر ہر جمعہ کو اسلامی پروگرام ہوتا ہے۔ ان کو حکومت ہر طرح کی سہولت دیتی ہے۔ وغیرہ۔ مگر اس کو انھوں نے حکومت کے "تملق" سے تعبیر کیا۔ یہ بھی عجیب ذہن ہے کہ حکومت اگر کچھ کرے تو وہ متملق ہے اور نہ کرے تو ظالم۔

انھوں نے بتایا کہ ساحل العاج میں لوگ کثرت سے مسلمان ہو رہے ہیں۔ ایک مقام پر صرف ایک دن میں چار ہزار آدمی مسلمان ہو گئے۔ میں نے پوچھا کہ کن لوگوں کی کوششوں سے ایسا ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا ——— الفضل یرجع الی اللہ والی الکتب المترجمۃ الی الفرنسیۃ۔

۱۵ مارچ کو دوپہر کا کھانا شیخ ابو عبد الرحمن بن عقیل الظاہری کے یہاں تھا۔ وہ اعلیٰ پایہ کے مصنف اور عالم ہیں۔ مگر ہندستان میں اور عرب میں یہ فرق ہے کہ ہندستان کے علماء بول چال کے موقع پر بھی کتابی زبان بولتے ہیں۔ مگر اکثر عرب علماء لکھتے وقت تو کتابی زبان لکھتے ہیں مگر بولنے کے وقت ان پر عوامی زبان کا اثر آجاتا ہے۔ شلاً ہمارے میزبان نے ایک موقع پر گھر کے ایک لڑکے سے کہا: ایش تبغون (تم کیا چاہتے ہو) اس طرح کی زبان سمجھنا ان لوگوں کے لئے کسی قدر مشکل ہوتا ہے جو صرف کتابی عربی سے واقف ہیں۔

عرب لوگ قہوہ اور چائے بہت پیتے ہیں۔ کھانے کے بعد چائے کا دور شروع ہوا تو میں نے چائے پینے سے معذرت کی۔ انھوں نے باصرار چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا: پیجئے یہ ہضم کے عمل میں آسانی پیدا

کرتا ہے (یسهل عملیة الهضم انشاء اللہ)

ایک صاحب جو محامی (وکیل) ہیں اور یہاں کھانے میں شریک تھے، انھوں نے ایک گفتگو کے درمیان بڑے درد کے ساتھ کہا: الناس کلھم یا اخی متعطشون الی الاسلام (میرے بھائی، آج تمام لوگ اسلام کے پیاسے ہیں)

۱۶ مارچ (بروز جمعہ) ڈاکٹر احمد توتونجی کو ٹیلی فون کیا گیا اور میری ریاض میں آمد کا ذکر کیا گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور فوراً کہا کہ انا احب الشیخ واحرص علی لقائہ۔ مگر انھوں کہا کہ میں آج ہی دوپہر کو برونی (افریقہ) روانہ ہو رہا ہوں۔ تاہم میں نماز جمعہ کے فوراً بعد شیخ کی قیام گاہ پر آکر ان سے ملاقات کروں گا۔

جمعہ کی نماز ہم لوگوں نے مسجد سلیمانیہ میں ادا کی۔ ایک عرب باصرار اپنے ساتھ وہاں لے گئے تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر لوٹے تو دکتور احمد توتونجی یہاں موجود تھے۔ مجھ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ بار بار کہتے رہے کہ ہم آپ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کے کاموں کی ہمارے دل میں بہت قدر ہے۔ آپ ہمارا سرمایہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

وہ ایک خوبصورت قسم کا بند پیکٹ اپنے ساتھ لائے تھے۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔

ھدیۃ الی الشیخ وحید الدین خان سلمہ اللہ تعالیٰ ــــــ شیخ احمد توتونجی سے میں نے کہا کہ یہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ آپ کے لئے ہے۔ میں نے کھولا تو اس کے اندر دو ایسی کتابیں تھیں جو عین میرا مطلوب تھیں۔ ایک قرآن کا جیبی نسخہ جو بائبل پیپر پر چھاپا گیا تھا۔ دوسرا حیات الصحابہ (مولانا محمد یوسف کاندھلوی) کی جلدیں دمشق کی چھپی ہوئی۔ مجھے قرآن کے مذکورہ نسخہ کی عرصہ سے تلاش تھی۔ اسی طرح حیات الصحابہ کا دمشق میں چھپا ہوا نسخہ بھی میں بہت چاہتا تھا۔ الحمد للہ کہ آج ڈاکٹر توتونجی کے ذریعہ دونوں چیزیں مجھے مل گئیں

دکتور احمد توتونجی آج ہی برونی (افریقہ) جا رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دکتور طٰہٰ جابر العلوانی کو مقرر کیا کہ ان کی غیر موجودگی میں وہ مجھ سے ملتے رہیں اور میری جو بھی ضرورت ہو اس میں میری معاونت فرمائیں۔

اصحاب رسول کی زندگیاں اسلام کا زندہ نمونہ ہیں۔ چنانچہ اصحاب رسول کے بارہ میں اسلاف نے کثرت سے کتابیں اور تراجم لکھے ہیں۔ تاہم اس موضوع پر قدیم کتابوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک صحابی کو عنوان بنا کر اس کے تحت ان کے حالات لکھے جاتے ہیں۔ مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کیا کہ عملی عنوانات قائم کر کے اس کے تحت صحابہ کے احوال درج کئے۔ یہ ایک بے حد مشکل کام تھا جو

سالہاسال کی محنت کے بعد تمام ہوا۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن حیدر آباد سے چھاپا گیا تھا تاہم اس میں کثرت سے مطبعی غلطیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دو عرب علما، شیخ نائف العباس اور شیخ محمد علی دولہ کو یہ توفیق دی کہ وہ پوری کتاب کو دوبارہ تصحیح اور تعلیق کے ساتھ شائع کریں۔ وہ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے جگہ جگہ جزئی اضافے بھی کئے ہیں (ونضیف الکلام الذی نسبہ المؤلف اثناء النقل) کتاب کا کاغذ، چھپائی اور جلد ہر چیز نہایت عمدہ ہے اور دیکھتے ہی جی چاہتا ہے کہ اس کو پڑھنا شروع کر دیں۔

ریاض میں ڈاکٹر عبد الرشید صاحب سے ملاقات بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے ایک بڑی عجیب بات کہی۔ وہ قرآن کے مطالعہ کا بے حد ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قرآن اللہ اور بندہ کے درمیان مقام اتصال (Point of contact) ہے۔ اسی طرح انھوں نے کہا کہ بحیثیت ڈاکٹر جب میں انسان کے جسم کو دیکھتا ہوں تو میں خدا کے کمالات میں ڈوب جاتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر وقت خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ گویا ایک ریموٹ کنٹرول کا نظام ہے۔ خدا اگر ریموٹ کنٹرول سے ہارٹ بیٹنگ کو روک دے تو ایک لمحہ میں ہمارا وجود ختم ہو جائے ——— جدید دریافتوں نے اسلامی حقیقتوں کی تفہیم کو کتنا آسان بنا دیا ہے۔

۱۷ مارچ کی شام کو میں نے ریاض سے دہلی ٹیلیفون پر بات کی۔ ریاض اور دہلی کے درمیان ڈائرکٹ ڈائلنگ ہے۔ ٹیلیفون پر حسب ذیل نمبروں پر انگلی رکھی گئی:

0091 - 11 - 611128

اور ایک منٹ کے اندر دہلی میں ہمارے دفتر کے ٹیلیفون پر گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر "ہلو" کہا تو دوسری طرف سے میرے لڑکے ثانی اثنین کی آواز آئی ——— یہ موجودہ زمانہ کی بہت زیادہ عام سہولت ہے۔ مگر کتنے کم ہیں وہ لوگ جو اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اس وقت آدمی اگر خالق کو یاد کرے تو اس کا حال یہ ہوگا کہ بظاہر اگرچہ وہ ٹیلیفون پر کسی آدمی سے بات کرے گا مگر اس کی روح خدا سے ہم کلام ہو رہی ہوگی۔ ٹیلیفونی ربط اس کو خدا سے مربوط کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

سعودی عرب میں مختلف اخبارات نکلتے ہیں۔ اکثر عرب ملکوں کے اخبارات محض پروپگنڈے والی باتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ تاہم سعودی عرب کے اخبارات نسبتاً کافی بہتر نظر آئے۔

یہاں ایک روزنامہ "عرب نیوز" کے نام سے نکلتا ہے جو بیک وقت جدہ اور ریاض سے شائع ہوتا ہے۔ عرب نیوز میں ہر روز آخری صفحہ پر ایک دلچسپ کالم ہوتا ہے۔ ۱۰ جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ (۱۲ مارچ ۱۹۸۴) ایک رپورٹنگ کے ذیل میں حسب ذیل لطیفہ درج تھا۔

لبنان میں ایک چڑیا پائی جاتی ہے جس کو چوہا خور (Mouse eater) کہتے ہیں۔ یہ باز سے کچھ بڑی ہوتی ہے اور عام طور سے بڑے بڑے درختوں کی اوپر کی شاخوں پر بیٹھتی ہے۔

اس چڑیا کے متعلق لبنان میں ایک لطیفہ مشہور ہے۔ صبح کو جب سورج نکلتا ہے تو وہ زمین پر اپنے سایہ کو دیکھتی ہے۔ اس وقت چوں کہ اس کو اپنا سایہ بہت بڑا نظر آتا ہے، وہ منصوبہ بناتی ہے کہ آج میں ایک اونٹ کو اپنی خوراک بناؤں گی۔ مگر جیسے جیسے سورج اونچا اٹھتا ہے اس کا سایہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے وقت اس کا سایہ بالکل چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اب وہ اس پر قناعت کر لیتی ہے کہ ایک چوہا پکڑ کر اس کو کھالے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ہوا ہے۔ فرضی تصور کے تحت اپنے کو "عظیم" سمجھ کر وہ بڑے بڑے منصوبے بناتے ہیں۔ مگر بالآخر ان کے حصہ میں جو چیز آتی ہے وہ صرف ایک "چھوٹا چوہا" ہے۔ اور کبھی چھوٹا چوہا بھی نہیں۔

یہاں کے عربی اخبارات اب کافی ترقی یافتہ ہو چکے ہیں۔ مثلاً وہ ایسی چیزیں چھاپنے کی پوزیشن میں ہوگئے ہیں جو عام طور پر ہمارے اردو اخبارات کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں۔

روزنامہ الشرق الاوسط (ریاض) کی اشاعت ۲۸ جنوری ۱۹۸۴ میں ایک مفصل مضمون نظر سے گزرا جس کا عنوان تھا:

وثائق الخارجیۃ البریطانیۃ السریۃ لعام ۱۹۵۳۔ اس میں سابق برطانی وزیر اعظم سرونسٹن چرچل کے ایک خط کا حوالہ ہے جو ۲۲ اپریل ۱۹۵۳ کو لکھا گیا تھا۔ اس خط کے ایک حصہ کا عربی ترجمہ اخبار میں حسب ذیل الفاظ میں درج تھا:

ان آخر المعلومات السریۃ المتوفرۃ تظهر مدی خطورۃ السماح للامور بالا ستمر ار علی حالها بینما یستخدم محمد نجیب المانا نازیین لتعلیم الجیش المصری والارهابیین التخریب وحرب العصابات

آخری خفیہ اطلاعات بتاتی ہیں کہ یہ کس قدر خطرناک ہوگا کہ حالات کو بدستور جاری رہنے دیا جائے جبکہ محمد نجیب (صدر مصر) نازی جرمنوں کو مصری فوج کی تربیت کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور دہشت پسندوں کو تخریب کاری اور گوریلا جنگ کے لئے تیار کر رہے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۳۰ سال پہلے اسرائیل کے سرپرست عربوں سے کس قدر خوف زدہ تھے۔

روزنامہ الریاض ۲۸ صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ اور اس کی قیمت ایک ریال ہوتی ہے۔ اس میں ہر قسم کی معلومات اور ہر طرح کے مضامین ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ تنقیدی خطوط بھی شائع ہوتے ہیں۔ مثلاً الریاض (۱۳ مارچ ۱۹۸۴) میں علی الدویحی الغامدی (جامعۃ ام القریٰ) کا ایک خط نظر سے گذرا۔ جس میں انھوں نے اخبارات کے مواد پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کو پڑھنے والا ان میں ایسی چیز نہیں پاتا جو اس کی عقل کو اکسائے اور سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کرے (لایجد القاری فیھا مایثیر عقلہ ومایھدیہ الی الصراط المستقیم)

عربی زبان کا ٹائپ اور اس سے متعلق مشینیں اعلیٰ ترین ترقی کے مقام پر پہنچ چکی ہیں۔ عربی اخبارات اور جرائد اور کتابوں کو دیکھ کر خواہش ہوتی ہے کہ کاش اردو والوں نے بھی ٹائپ اختیار کر لیا ہوتا تو آج اردو زبان بھی "ٹائپ" کے دور میں پہنچ چکی ہوتی جس طرح فارسی زبان ایسا کر کے ٹائپ کے دور میں پہنچ چکی ہے۔ اردو زبان ابھی تک ٹائپ کے دور کے فوائد سے محروم ہے اور غیر ضروری طور پر نستعلیق کا ٹائپ بنانے کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے۔ اردو کے لئے اس علیٰحدہ تشخص کی ضرورت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

جن ملکوں میں لوگوں کے پاس دولت آئی ہے ان کے یہاں عجیب عجیب تفریحات اور تعیشات رواج پا گئے ہیں۔ مثلاً خاندانی تقریبات کی فلم تیار کرنا۔ جو لوگ زیادہ دولت مند ہیں ان کے پاس خود اپنی ذاتی مشینیں ہوتی ہیں۔ ورنہ ایسی کمپنیاں ہوتی ہیں جو فلمی تصویر کشی (Video shooting) کا انتظام کرتی ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ پاکستان میں ایک شادی کی فلم پانچ ہزار روپے میں فروخت ہوتی ہے لوگ شادی کی تقریب یا دوسری خاندانی تقریبات کی فلم بنا کر رکھ لیتے ہیں اور پھر تفریح کے طور پر اس کو وی۔ سی۔ آر پر دیکھتے ہیں۔

جدید دنیا کے دوسرے شہروں کی طرح عرب شہروں میں چلتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک عمارتی جنگل میں ہیں۔ جہاں یا تو ٹھہرے ہوئے مکانات ہیں یا دوڑتی ہوئی گاڑیاں۔ انسان اپنے آپ سے اور اسی کے ساتھ قدرت سے اپنے کو دور محسوس کرنے لگتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید تمدن نے انسان سے اس کی اپنی ذات کو بھی چھین لیا ہے۔ اور اس کے خدا کو بھی۔

روزنامہ المدینۃ (۷ جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ) میں دکتور عبد اللہ عمر نصیف کا ایک انٹرویو نظر سے گذرا۔ موصوف اس سے پہلے جامعۃ الملک عبد العزیز (جدہ) میں مدیر تھے۔ اب وہ رابطہ عالم اسلامی کے امین عام ہیں۔ انٹرویو ور نے ان سے جو سوالات کئے ان میں سے ایک سوال دنیا کے مسلمانوں کے بارہ میں

تھا۔ ڈکتور عبداللہ نفیف نے غم ناک انداز میں کہا:

نحن نری حال المسلمین فی کل مکان وضعهم السیئ۔ امکانیاتهم الضعیفة۔ فقرهم جهلهم۔ انتشار الامراض بینهم

ہم ہر مقام کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔ ان کا حال برا ہے۔ ان کے وسائل بہت کم ہیں۔ ان میں غریبی اور جہالت ہے۔ ان کے درمیان بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں۔

۱۸ مارچ کی دوپہر کو ہم وزارت داخلہ کے دفتر میں پہنچے۔ عظیم عمارت کی تیسری منزل کے وسیع ہال سے گذرے تو وہاں بڑے بڑے قالین لپیٹے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ابھی نماز ظہر ادا کی گئی ہے۔ اسی طرح سعودی مملکت کے تمام دفاتر میں نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے اور تمام کارکنان کے لئے لازم ہے کہ وہاں وقت پر آ کر نماز ادا کریں۔

اس کے بعد ہم لوگ نائب وزیر کے دفتر میں داخل ہوئے۔ جدید طرز کے عظیم دفتر میں ایک ایسا شخص بیٹھا ہوا تھا جو بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ کوئی "مولوی" ہے۔ نائب وزیر موصوف نے انتہائی اکرام کے ساتھ ملاقات کی۔ انھوں نے بتایا کہ ہم آپ کی کتابیں پڑھے ہوئے ہیں اور آپ کے بے حد قدرداں ہیں۔ انھوں نے اسی وقت وزیر محترم سے ملاقات کے لئے ٹیلیفون کیا۔ وزیر موصوف اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق نماز ظہر سے فارغ ہو کر عوام کی شکایات سن رہے تھے۔ یہ نماز ظہر کے بعد ان کا روزانہ ایک گھنٹہ کا معمول ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس عوامی ملاقات میں شیخ وحید الدین سے ملنا مناسب نہیں۔ بہتر ہے کہ کل ان سے باقاعدہ ملاقات ہو۔ چنانچہ کل کا وقت طے ہوا۔

اگلے دن ۱۹ مارچ کو وزیر داخلہ (سعودی مملکت) سے ملاقات ہوئی۔ یہ شہزادہ نائف بن عبدالعزیز ہیں جو موجودہ شاہ فہد کے حقیقی بھائی ہیں۔ جتنا عظیم الشان ان کا دفتر ہے اور ان کے گرد جتنے وسیع انتظامات ہیں اس کے لحاظ سے ہمارا سامنا ایک ایسے شخص سے ہونا چاہئے تھا جو کبر کی تصویر بنا ہوا ہو۔ مگر جب ہم ملے تو ہمارے سامنے ایک ایسا شخص تھا جو سراسر تواضع کا نمونہ دکھائی دیتا تھا۔

گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ شہزادہ مذکور مجھ سے اور میرے کام سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے نہایت توجہ سے ہماری دعوتی باتوں کو سنا۔ اور اس پر اپنی طرف سے آیات اور احادیث کا اضافہ کرتے رہے۔ انھوں نے نہ تو اپنے کارناموں کو بیان کیا اور نہ کسی مفروضہ دشمن کے خلاف جوش و غضب کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ یہ کہا کہ ہم سب کو اللہ توفیق دے کہ اتحاد و اتفاق کے ساتھ دین کا کام کر سکیں۔

سعودی عرب کے ذمہ داروں سے ملاقات کے وقت مجھے ایسا ہوا کہ اس علاقہ پر خدا کی خاص

نظر ہے۔ شاید یہ خدا کا منصوبہ ہے کہ دین کی قدریں جب دوسری جگہ مٹ رہی ہوں اس وقت بھی وہ یہاں موجود رہیں۔ شاید یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ ان الدین لیارز الی الحجاز کما تارز الحیۃ الی جحرھا۔

ہندستان کے مسلمانوں کے ذہن پر جس طرح یہاں کا اکثریتی فرقہ چھایا ہوا ہے، اسی طرح عربوں کے ذہن پر یہودیوں اور عیسائیوں کا مسئلہ چھایا ہوا ہے۔ روزنامہ المدینہ (۱۰ جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ) میں ایک مضمون (صفحہ ۹) نظر سے گذرا۔ مضمون نگار اس میں مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

ولم یکن الاستعمار فی العصر الحدیث اقل شراسۃ من الحروب الصلیبیۃ۔ فلا فرق بینہ وبین الحروب الصلیبیۃ الا فی اختلاف الوسیلۃ۔ فاذا کانت وسیلۃ الحرب الصلیبیۃ ھی القھر العسکری فان وسیلۃ الاستعمار الحدیث ھی محو شخصیۃ الشعب والقضاء علی مقوماتھا الاساسیۃ من عقیدۃ ولغۃ وتقالید۔

موجودہ زمانہ کا استعمار صلیبی جنگوں سے کم برا نہیں ہے۔ اس میں اور صلیبی جنگوں میں کوئی فرق نہیں سوا وسائل کے فرق کے۔ صلیبی جنگوں کا وسیلہ اگر فوجی تھا تو جدید استعمار کا وسیلہ قوم کے تشخص کو مٹانا اور اس کی ان بنیادی قدروں کو ختم کرنا ہے جو عقیدہ اور زبان اور روایات سے تعلق رکھتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صلیبی قومیں اپنے مقدس مقامات کو مسلمانوں سے واپس لینے کے جذبہ کے تحت اٹھی تھیں۔ جب کہ موجودہ زمانہ کا استعماری قوتوں کے زور پر ابھرا۔ مسلمانوں نے چوں کہ دونوں کو ایک سمجھا اس لئے انھوں نے جدید "استعمار" کے مقابلہ میں صرف منفی ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ قدیم صلیبی حملوں کی طرح وہ ان کے خلاف لڑنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اگر وہ "استعمار" کی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھتے تو ان کو نظر آتا کہ وہ صرف استعمار نہیں ہے بلکہ وہ جدید امکانات کا ہراول بھی ہے، دعوت اسلامی کے اعتبار سے بھی اور دنیوی ترقی کے اعتبار سے بھی۔

۱۸ مارچ کو ہم موسسۃ الملک فیصل الخیریہ (ریاض) میں گئے۔ اس کی عمارت اتنی عظیم الشان ہے کہ اس کو دیکھ کر شاہی محل کا گمان ہوتا ہے۔ اس ادارہ کی بہت سی دینی اور تعمیری سرگرمیاں ہیں جن میں سے ایک فیصل انعام بھی ہے جو پانچ قسم کے میدان میں کام کرنے والوں کو امتیاز کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ اس کے تحت ایک ذیلی ادارہ بھی ہے جس کا نام مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الاسلامیہ ہے۔

۱۸ مارچ کی شام کو ریاض ٹیلیویژن پر دو انٹرویو ہوئے۔ دونوں آدھ آدھ گھنٹہ کے تھے۔ جب میں اپنے ساتھی دکتور محمد مانع الجمنی (الامین العام المساعد للندوۃ العالمیہ للشباب الاسلامی) کے ساتھ ٹیلی وژن سنٹر پر پہنچا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں "ریاض" میں نہیں ہوں بلکہ امریکہ کے کسی انتہائی جدید قسم کے عالیشان دفتر میں ہوں۔ یہ مغرب کا وقت تھا۔ دکتور مانع الجمنی نے کہا کہ ہم لوگ پہلے نماز پڑھ لیں۔ اس کے بعد ہم پہلی منزل کے ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے تو یہاں مصلّے بچھا ہوا تھا اور بالکل مسجد کا منظر تھا۔ امریکی طرز کی عمارت میں اسلامی طرز کا عبادت خانہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

انٹرویو انگریزی میں تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ دکتور محمد مانع الجمنی سوال کرتے تھے اور میں اس کا جواب دیتا تھا۔ پہلا انٹرویو زیادہ تر میرے بارہ میں اور المرکز الاسلامی کے بارہ میں اور ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں تھا۔ دوسرا انٹرویو زیادہ تر الاسلام یتحدی کے بارہ میں اور جدید چیلنج اور اسلام کی طرف سے اس کے جواب کے بارہ میں تھا۔

۱۹ مارچ کی شام کو ہم ریاض سے جدہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ جہاز (۴۷) جدہ ہوتے ہوئے لندن جارہا تھا۔ جہاز کی روانگی کے ساتھ اعلانات شروع ہوئے۔ سعودی ایر لائنز شاید واحد ایر لائنز ہے جس کے اعلانات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور باذن اللہ تعالیٰ جیسے الفاظ کے ساتھ مسافر کے کانوں میں پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد خالص عرب لہجہ میں قرآن کی آیات اور سفر کی دعا سنائی گئی۔

۲۰ مارچ کی صبح کو ہم جدہ میں تھے۔ دکتور عبد اللہ عمر نصیف سے ٹیلی فون پر وقت لیا گیا تھا اور انھوں نے مکہ میں ۱۱ بجے دن کا وقت دیا تھا۔ مگر ہم لوگ جدہ میں دیر سے پہنچے اور بظاہر ممکن معلوم نہیں ہوا کہ ہم لوگ وقت پر مکہ پہنچ کر ان سے مل سکیں گے۔ میں نے جناب حامد الدین صاحب (جامعہ عبد الملک عبد العزیز) سے کہا تو انھوں نے کہا کہ وہ اس وقت اپنے مکان پر ہوں گے۔ اس لئے ابھی ان سے ٹیلی فون کر کے دوسرا وقت مقرر کر لیا جائے۔ یہ نماز فجر کے بعد کا وقت تھا۔ حامد الدین صاحب نے ٹیلی فون ملایا تو السلام علیکم کے بعد پہلا جملہ یہ کہا: I hope I did not disturb you.

(ڈاکٹر صاحب، مجھے امید ہے کہ میں نے آپ کو خلل نہیں ڈالا ہوگا) میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ انداز خطاب تعلیم سے آتا ہے۔ اگر قوم کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے تو قوم کے تمام مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ کیوں کہ تعلیم قوم کے افراد کو مہذب بھی بناتی ہے اور باشعور بھی۔

اس کے مطابق شام کو نماز عصر کے بعد دکتور عبد اللہ نصیف سے ان کی قیام گاہ (جدہ) پر ملاقات ہوئی۔ نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور اسلامی مرکز کی سرگرمیوں کے بارہ معلومات کرتے رہے۔ انھوں نے خواہش

ظاہر کی کہ ہندستان کے اگلے سفر کے موقع پر اسلامی مرکز کی بھی زیارت کریں۔

جدہ میں ہم نے سرکاری مہمان بننے کے بجائے جناب محمد رفیق قریشی کی میز بانی کو پسند کیا۔ اس کی وجہ سے یہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔

دکتور احمد محمد علی سے ملاقات ہوئی جو اسلامک ڈولپمنٹ بنک کے صدر ہیں۔ مختلف ملاقاتوں کے درمیان میں نے محسوس کیا کہ راقم الحروف نے جو آواز بیس سال پہلے بلند کرنا شروع کیا تھا اس کی اہمیت اب عام طور پر محسوس کی جانے لگی ہے۔ اب سوچنے سمجھنے والا طبقہ عام طور تسلیم کرتا ہے کہ دعوت اسلامی کا کام قومی اور سیاسی جھگڑوں سے الگ ہو کر کرنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ جو بات پچھلے برسوں میں اجنبی بنی ہوئی تھی۔ بہت جلد وہ وقت آرہا ہے جب کہ وہی تمام لوگوں کی بات ہوگی۔

۲۱ مارچ کی صبح کو ہم مولانا عبد الوحید ندوی کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے مکہ پہنچے۔ طواف کعبہ کے دوران بھیڑ نہیں تھی، اس لئے حجر اسود تک پہنچنے کا موقع بھی آسانی سے مل گیا۔ حجر اسود ایک بڑے پیالہ کے مانند نظر آیا۔ عمرہ گویا چھوٹا حج ہے۔ کعبہ کے گرد گھومتے ہوئے اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے جو احساسات ایک مومن پر طاری ہوتے ہیں ان کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

۲۱ مارچ کی شام کو ہم جدہ سے دوبئی کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاز میں مجھے سردی کا احساس ہوا تو اوپر کا خانہ کھولا کہ اس میں سے کمبل نکال کر پیروں پر ڈال لوں۔ مگر وہاں صرف تکیہ رکھا ہوا تھا۔ مجھ کو ٹٹولتے ہوئے دیکھ کر جہاز کا ایک کارکن قریب آیا اور بولا

Can I help you.

(کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں) اردو میں اسی بات کو کہنا ہو تو آدمی کہے گا "آپ کو کیا چیز چاہئے" زبان کا یہ اسلوب دونوں زبان کے بولنے والوں کے مزاج میں بھی منتقل ہوا ہے جس کا مظاہرہ مختلف عملی پہلوؤں سے ہوتا رہتا ہے۔

۲۰ مارچ کی شام کو ہمارا جہاز دوبئی کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ جیسے ہی میں ہوائی جہاز کی سیڑھی سے نیچے اترا، ہوائی اڈہ کا ایک افسر میرے قریب آیا اور سوالیہ انداز میں کہا: "الشیخ وحید الدین" میں نے کہا نعم ۔ اس نے مرحبا کہا اور کہا کہ دکتور سالم عبد اللہ المحمود باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آگے بڑھ کر ہوائی اڈہ کی عمارت میں داخل ہوا۔ تو دوبارہ ہوائی اڈہ کے ایک ذمہ دار آگے بڑھے اور مذکورہ سوال کیا۔ اور پھر ہمارے ساتھ چلنے لگے۔ یہاں تک کہ ہم کو باہر پہنچا دیا جہاں لوگ ہمارے منتظر تھے۔

دکتور سالم عبد اللہ المحمود شارجہ کے ممتاز ترین ڈاکٹر ہیں۔ ان کے والد الشیخ عبد اللہ بن علی المحمود شارجہ کے ایک انتہائی ممتاز شخص تھے۔ یہاں ان کا مکان بجائے خود ایک محل معلوم ہوتا ہے۔ شارجہ میں ہماری آمد ڈاکٹر سالم عبد اللہ المحمود کی دعوت پر ہوئی ہے۔ انھوں نے غیر معمولی کوشش کی۔ ہمارے سعودی مملکت میں قیام کے دوران ان کے درجنوں ٹیلی فون آتے رہے۔ یہاں کے سفر میں، ہمارے لیے مختلف قسم کی شدید رکاوٹیں حائل تھیں مگر انھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے ان تمام رکاوٹوں کو حل کیا۔ یہاں تک کہ شارجہ میں ہمارا داخلہ ممکن ہو سکا۔

شارجہ کا ہوائی اڈہ الگ ہے۔ تاہم ہم دوبئی کے ہوائی اڈہ پر اترے۔ یہاں سے شارجہ ۱۵۔۲۰ منٹ کے فاصلہ پر ہے۔ دوبئی ہوائی اڈہ سے چلے تو دوبئی شہر کے مناظر سامنے تھے۔ اس کی شہری پلاننگ نہایت اعلیٰ ہے۔ غالباً تمام عرب ملکوں میں دوبئی اس اعتبار سے نمبر ایک پر ہے۔ اس کی غیر معمولی طور پر پر رونق دنیا سے گزرتے ہوئے میرے دل نے کہا:

پٹرول کے کرشموں کا یہ حال ہے تو پٹرول کے خالق کے کرشموں کا کیا حال ہوگا۔
عمل کثیف کی امکانیات اتنی زیادہ ہیں تو عمل لطیف کی امکانیات کتنی زیادہ ہوں گی۔

ہماری گاڑی ایک وسیع مکان کے سامنے رکی جو یہاں کی اہم ترین سڑک کے کنارے ہے۔ یہ "مکتبۃ الشیخ عبد اللہ بن علی المحمود" کی عمارت تھی۔ یہ شارقہ (شارجہ) کا سب سے زیادہ سرسبز اور صاف ستھرا علاقہ ہے یہاں بڑے بڑے شیوخ رہتے ہیں۔ سڑکیں نہایت چکنی اور صاف ستھری ہیں۔ اور ان کے دونوں طرف یک منزلہ یا دو منزلہ مکانات پھیلے ہوئے ہیں۔

اسی مکتبہ (لائبریری) کی وسیع عمارت میں میرا قیام تھا۔ اور اس کے وسیع ہال میں تقریر کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ عمارت کے باہر ایک بڑا سا خوبصورت بورڈ نظر آیا جس پر پروگرام کی تفصیل درج تھی۔ اس مضمون کا پوسٹر تیار کر کے پوری عرب امارات میں پھیلا دیا گیا تھا۔ پوسٹر کا مختصر عکس اگلے صفحہ پر درج کیا جا رہا ہے۔

۲۳ مارچ کی شام کو نماز عشاء کے بعد پروگرام تھا۔ لائبریری کا وسیع ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ بازو کے بڑے کمرے میں بھی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور ٹیلیوژن Closed-circuit television کے ذریعہ آواز اور تصویر پہنچانے کا انتظام تھا۔ تاہم کرسیاں ناکافی ثابت ہوئیں اور کثرت سے لوگ کھڑے ہوئے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ پورے عرب امارات سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ صرف میری تقریر سننے کے لیے آیا تھا۔ لائبریری کے ایک کارکن نے بتایا کہ یہاں اکثر اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ مگر اتنی بڑی تعداد میں اس سے پہلے

بسم الله

يلتقي الكاتب والمفكر ا

مجاض

الإسلام في مو

يوم الخميس بعد ص

١٩ جمادي الثانية ١٤٠٤هـ

وذلك بمقر

عبدالله بن علي

الكائن بالشارقة -

والدع

رحيم
دي الشيخ وحيد الدين خان
نوان
هة التحديات العصرية
العشاء مباشرة
فق ٢٢/٣/١٩٨٤م
ة الشيخ
حمود «رحمه الله»
ب دائرة المرور
مة

صرف ایک بار لوگ جمع ہوئے تھے جب کہ لائبریری کا افتتاح تھا اور سلطان شارقہ خود اس کا افتتاح کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔

ابتدائی کارروائی کے بعد میں نے عربی مقالہ "الاسلام والتحدیات العصریۃ" پڑھ کر سنایا۔ لوگ انتہائی خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ مقالہ سے لوگوں کی غیر معمولی دل چسپی کا ایک مظاہرہ یہ ہوا کہ مقالہ ختم ہونے کے بعد بڑی تعداد میں لوگ ہال میں ٹھہرے رہے اور دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ لوگ موضوع کے بارہ میں مزید تفصیل جاننا چاہتے تھے۔ میں نے کہا کہ اس موضوع پر میں ان شاء اللہ ایک جامع کتاب تیار کر رہا ہوں جس کا انگریزی نام God Arises ہوگا۔

اجتماع کے بیشتر شرکاء بے حد خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ مقالہ کو سنتے رہے اور مقالہ سننے کے بعد غور و فکر میں ڈوبے ہوئے نظر آئے۔ مگر چند لوگ جن کا تعلق ایک خاص جماعت سے تھا اور جو سیاسی اسلام کے بارہ میں میری تنقیدوں سے برہم ہیں وہ غیر متعلق سوالات کر کے فضا کو برہم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے سوالات زیادہ تر ایسے تھے جن کا تعلق اصل موضوع سے نہ تھا بلکہ میری ذات کو مطعون کرنا تھا۔ مثلاً آپ نے جہاد کو ساقط کر دیا ہے۔ آپ حدیث کی حجیت کے منکر ہیں۔ آپ اسلام دشمن طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ آپ قادیانیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ظالموں کی حمایت کرتے ہیں۔ وغیرہ

اجتماع کے عام شرکاء کو ان سوالات سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ چند آدمی (خاص طور غالباً دو آدمی) اس سلسلے میں بہت پیش پیش تھے۔ میں نے ابتداءً مختصر جوابات دئے مگر ان کی تیزی اور شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ بہت زور زور سے بولنے لگے۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ اسلامی اصول کے مطابق ان سے اعراض کرنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے مائک پر حسب ذیل الفاظ کہے اور پھر خاموش ہوگیا:

عفواً یا اخی لا فائدۃ فی مثل ہذہ الاسئلۃ والاجوبۃ۔ لان ہذہ الاسئلۃ لیست اسئلۃ بل ہی کلہا جدال۔ و نبینا صلی اللہ علیہ وسلم قد نہانا عن الجدال۔ وانی لا اقول الا ما قال المومنون الاولون عن الجاہلین، سلام علیکم، لانجاہلکم۔ لنا ما نحن علیہ ولکم ما انتم علیہ (یہ آخری قول نجران کے ان مومنین کا تھا جن کا ذکر قرآن کی سورۃ القصص، آیت ۵۵ میں آیا ہے)۔

۲۵ مارچ کی صبح کو محمد رضی نے انٹرویو لیا۔ وہ ایک مصری نوجوان ہیں۔ اور یہاں ماہنامہ الاصلاح (دبئی) سے وابستہ ہیں۔ انٹرویو میں میری ذات سے متعلق سوالات، المرکز الاسلامی کے مقاصد اور سرگرمیاں اور ہندستان اور عالم اسلام کے حالات کے بارہ میں سوالات تھے۔ انٹرویو تقریباً

ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔

نماز ظہر کے فوراً بعد ہم لوگ الشیخ علی المحوتی (رئیس المحکمۃ الشرعیۃ) کی دعوت پر ان کے مکان کے لئے روانہ ہوئے۔ وہ شارقہ (خاص) سے ۸۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر زید میں رہتے ہیں۔ زید یہاں کا نہایت سرسبز اور شاداب علاقہ ہے۔ یہاں شیخ کا وسیع مکان ہے اور اس سے متعلق دور تک پھیلے ہوئے ان کے باغات ہیں۔ جن میں کھجور کے درخت ہیں اور مختلف قسم کی زراعت ہوتی ہے۔

زید جاتے ہوئے طویل فاصلہ صحرا میں طے کرنا پڑا۔ نہایت عمدہ بنی ہوئی سڑک کے دونوں طرف ریتیلے صحرا ہیں جن میں جھاڑیاں نظر آتی ہیں۔ یہ صحرا قدیم ترین زمانہ سے بظاہر "بے قیمت" پڑے ہوئے تھے۔ مگر ان صحراؤں کے نیچے ایک ایسی چیز دفن تھی جو ہر دوسری چیز کی قیمت ادا کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے ظاہر ہو کر قیمت ادا کی اور آج انھیں صحراؤں میں شاندار شہر آباد نظر آتے ہیں۔

صحرا میں دور آگ کے بہت بڑے بڑے شعلے جلتے ہوئے نظر آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ گیس کے فضلات ہیں جو جل رہے ہیں۔ گیس کے یہ فضلات انتہائی قیمتی ہیں۔ ان سے ہزاروں چیزیں بنتی ہیں۔ انھیں سے وہ کوکنگ گیس بنتی ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے ہندستان میں ایک آدمی کو کئی کئی سال تک لائن لگانی پڑتی ہے۔ مگر خلیجی ممالک میں اکثر یہ قیمتی چیز پھینک دی جاتی ہے اور جلتی رہتی ہے۔ اگر ان کو استعمال میں لایا جائے (جیسا کہ ترقی یافتہ ممالک ان کو استعمال میں لا رہے ہیں) تو وہ دولت کا عظیم الشان خزانہ بن جائے۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۴ کو شارقہ میں ایک بڑے شیخ کے یہاں ایک خصوصی نشست تھی۔ اتنے میں ہندستان کے ایک مسلم قائد وسیع کمرہ میں داخل ہوئے۔ ملاقات کے بعد انھوں نے کچھ چھپے ہوئے کاغذات عرب شیوخ کے درمیان تقسیم کرنے شروع کئے۔ میں نے دیکھا تو اس میں ہندستان کے مسلمانوں پر حکومت کے "مظالم" کے خلاف چیخ پکار تھی۔ گفتگو کے دوران قائد موصوف نے کہا:

"ہندستان میں اسلام آزاد نہیں ہے۔ مسجد کے اندر بھی سجدہ کی آزادی نہیں"

یہ سن کر ایک عرب شیخ نے کہا: ہم نے کئی بار ہندستان کی زیارت کی ہے۔ اور وہاں مختلف مقامات پر مسجدوں کے اندر نمازیں پڑھی ہیں۔ ہم نے تو نہیں دیکھا کہ وہاں مسجدوں میں سجدہ کرنے کی "آزادی نہ ہو"

اس موقع پر قائد موصوف نے ایک "پریس اسٹیٹمنٹ" تقسیم کیا جس کے چھ نکات میں سے ایک نکتہ یہ تھا:

A urinal was constructed at the tomb of famous Urdu poet Zauq

۲۶ مارچ ۱۹۸۴ کی صبح کو ہم برٹش ایرویز (۱۴۷) کے ذریعہ دہلی واپس پہنچے۔

ناموافق حالات

سر والٹر اسکاٹ (۱۸۳۲-۱۷۷۱) کا شمار انگریزی ادب کے نامور افراد میں ہوتا ہے۔ مگر اس کو یہ مقام معمولی حیثیت کی قیمت پر ملا۔ اس کی معمولی حیثیت اس کے لئے وہ زینہ بن گئی جس پر چڑھ کر وہ اعلیٰ درجہ کو پہنچے۔

والٹر اسکاٹ اپنی ادھیڑ عمر تک ایک معمولی صلاحیت کا انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس کی حیثیت بس ایک تیسرے درجہ کے شاعر کی تھی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ اس کے اوپر قرضوں کا بوجھ لد گیا۔ اس کی شاعری اس کو اتنی آمدنی نہ دے سکی جس سے وہ اپنے قرضوں کی ادائیگی کر سکے۔

بالآخر اس کے حالات نہایت شدید ہو گئے۔ شدید حالات نے اس کی شخصیت کو آخر حد تک جھنجھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والٹر اسکاٹ کے اندر سے ایک نیا انسان ابھر آیا۔ اس کی ذہنی پرواز نے کام کا نیا میدان تلاش کر لیا۔

اب اس نے نئی نئی کتابیں پڑھیں۔ یہاں تک کہ اس پر کھلا کہ وہ محبت کی تاریخی داستانیں لکھے۔ چنانچہ اس نے محبت کی تاریخی داستانوں کو ناول کے انداز میں قلم بند کرنا شروع کر دیا۔

قرض کی ادائیگی کے جذبہ نے اس کو ابھارا کہ وہ اس میدان میں زبردست محنت کرے۔ اس نے کئی سال تک اس راہ میں اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ اس کو اپنی کہانی بازار میں اچھی قیمت میں فروخت کرنی تھی اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب کہ اس کی کہانیاں اتنی جاندار ہوں کہ قارئین کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ والٹر اسکاٹ کی غیر معمولی محنت اس کی کہانیوں کی مقبولیت کی ضامن بن گئی۔ اس کی لکھی ہوئی کہانیاں اتنی زیادہ فروخت ہوئیں کہ اس کا سارا قرض ادا ہو گیا۔ والٹر اسکاٹ پر اگر یہ آفت نہ آتی تو اس کے اندر وہ زبردست محرک پیدا نہیں ہو سکتا جس نے اس سے وہ کہانیاں لکھوائیں جس نے اس کو انگریزی ادب میں غیر معمولی مقام دے دیا۔

اس کے بعد والٹر اسکاٹ کو سر کے خطاب سے نوازا گیا۔ والٹر اسکاٹ کے لئے قرض کا مسئلہ نہایت جاں گداز مسئلہ تھا۔ لیکن اگر یہ جاں گداز مسئلہ نہ ہوتا تو والٹر اسکاٹ سر والٹر اسکاٹ بھی نہ بنتا۔

اتحاد کا طریقہ

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا یہ قاعدہ ہے کہ باری باری ہر میعاد پر مختلف علاقائی گروہوں (Regional groups) کو صدارت کا موقع دیا جاتا ہے۔ پچھلی میعاد میں لاطینی امریکہ کو صدر مقرر ہونا تھا۔ مگر جب انتخاب کا مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش ہوا تو لاطینی امریکہ کے ممالک کسی ایک ممبر ملک کی صدارت پر متفق نہ ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا ۱۵۸ ممبران کی پوری اسمبلی سے ووٹ لیا گیا اور عمومی ووٹوں کی کثرت سے اس کا فیصلہ کیا گیا۔ یہی صورت اکثر حالات میں پیش آتی ہے۔

موجودہ میعاد میں افریقہ کی باری تھی۔ جب یہ مسئلہ زیر غور آیا تو افریقی ممالک نے اتفاق رائے سے منظور کر لیا کہ زامبیا کے مندوب مسٹر پال لوساکا (Paul Lusaka) ۳۹ ویں جنرل اسمبلی کے صدر ہوں گے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ۳۹ واں سیشن ستمبر ۱۹۸۴ میں شروع ہوگا۔ واضح ہو کہ افریقی ممالک نظریاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ مثلاً لیبیا پر جوش انقلابی ہے۔ مصر معتدل پالیسی پر عامل ہے۔ موزمبیق میں مارکسی حکومت ہے۔ زائر ایک قدامت پرست ملک ہے۔ ان کے درمیان اندرونی معاملات میں کافی اختلافات ہیں۔ اس کے باوجود بین اقوامی انجمن میں انھوں نے نادر اتفاق رائے کا ثبوت دیا ہے۔

یہ انوکھا واقعہ کیسے ظاہر ہوا، اس سلسلے میں نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار رچرڈ برنسٹین (Richard Bernstein) نے بعض ڈپلومیٹ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

African unanimity is only achieved by avoiding potentially contentious issues.

افریقی اتحاد رائے صرف اس طرح حاصل کیا گیا ہے کہ انھوں نے اختلافی باتوں کو پس پشت رکھا (ٹائمس آف انڈیا ۲۹ جنوری ۱۹۸۴)

یہی موجودہ دنیا میں اتحاد و اتفاق کا واحد یقینی راستہ ہے۔ انسانوں کی راہیں ہمیشہ مختلف ہوتی ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہر معاملہ میں تمام لوگ بالکل متفق الرائے ہو جائیں۔ ایسی حالت میں باہمی اتحاد کی صورت صرف یہ ہے کہ اتحاد کی خاطر اختلاف کو بازو میں رکھ دیا جائے۔ اختلاف کو ختم کر کے اتحاد قائم نہیں ہوتا۔ اتحاد ہمیشہ صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ کچھ لوگ اپنے اختلاف کو صبر کے خانہ میں ڈالنے پر راضی ہو جائیں۔
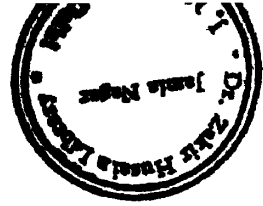
عالی ظرفی

دورِ عباسی کا ایک واقعہ تاریخ کی بعض کتابوں میں ان الفاظ میں آیا ہے:

خطب الخلیفة العباسی المنصور یوماً فی جماعة من الاعراب بالشام، فقال: ایها الناس ینبغی ان تحمدوا الله علیٰ ما وهبکم فیّ۔ فانی منذ ولیتکم ابعد الله عنکم الطاعون الذی کان یفتک بکم۔ فقال له احد المستمعین ان الله اکرم من ان یجمع علینا فی وقت واحد الطاعون والمنصور

خلیفہ منصور عباسی نے ایک روز شام کے اعراب کی ایک جماعت کے سامنے تقریر کی۔ اس نے کہا کہ اے لوگو، تم کو چاہئے کہ تم میرے جیسے خلیفہ کے ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ کیوں کہ جب سے میں خلیفہ ہوا ہوں اللہ نے تم سے طاعون کو دور کر دیا ہے۔

اس کے بعد سننے والوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ اس سے زیادہ کریم ہے کہ وہ ایک وقت میں ہمارے اوپر طاعون اور منصور دونوں کو جمع کر دے۔

اعرابی کا یہ جملہ سخت توہین آمیز تھا۔ عام طریقہ کے مطابق چاہئے تھا کہ خلیفہ منصور عباسی اس کو سن کر بھڑک اٹھے اور مذکورہ شخص کے قتل کا حکم دے دے۔ مگر خلیفہ منصور نہایت بلند حوصلہ آدمی تھا۔ اس نے اعرابی کے جملہ میں گستاخی کا پہلو دیکھنے کے بجائے جرأت اور ذہانت کے پہلو کو دیکھا۔ اس نے اس کی قدر کی اور حکم دیا کہ اس شخص کو خزانۂ خاص سے انعام دیا جائے اور اس کو عزت کے ساتھ اس کے گھر پہنچایا جائے۔

پست اور کمینہ قسم کے لوگ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کہنے والے نے ان کی موافقت میں بات کہی ہے یا ان کی مخالفت میں۔ وہ موافق کو نوازتے ہیں اور مخالف کے دشمن بن جاتے ہیں۔ مگر بلند حوصلہ اور عالی ظرف لوگ موافقت اور مخالفت سے اوپر اٹھ کر سوچتے ہیں۔ وہ اصل بات کو دیکھتے ہیں نہ یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کے موافق ہے یا ان کے خلاف۔

خاموش تعمیر

سوامی ویویکانند (۱۹۰۲-۱۸۶۳) کو سچائی کی تلاش تھی۔ وہ سفر کرتے ہوئے راس کماری کے ساحل پر پہنچے۔ یہاں سمندر کے اندر تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ایک چٹان ہے۔ سوامی ویویکانند سمندر میں کود پڑے اور تیر کر چٹان کے اوپر پہنچے۔ یہاں انھوں نے دھیان گیان کیا اور اس کے بعد واپس آکر ہندو دھرم کے پرچار میں لگ گئے۔

آزادی کے بعد اس چٹان پر "ویویکانند کیندر" قائم کیا گیا ہے۔ تقریباً دو کروڑ روپئے کے خرچ سے ایک بہت بڑا سنٹر بنایا گیا ہے جو ۱۹۷۰ میں مکمل ہوا ہے۔ اس کا خاص مقصد ہے انسان بنانا (Man making) افراد کار کی فراہمی کے لئے اس سنٹر نے اپیل کی تھی، اس کے نتیجہ میں درجنوں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اور سینکڑوں نوجوانوں نے اپنی زندگیاں اس کے لئے وقف کر دیں۔ وہ اس مشن میں تاحیات کارکن (Life worker) بن گئے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۲ جنوری ۱۹۸۴)

انھیں میں سے ایک ڈاکٹر ایچ آر نگیندر ہیں۔ وہ امریکہ میں خلائی پرواز مرکز (Space Flight Centre) میں اعلیٰ عہدہ پر تھے۔ وہ اس کو چھوڑ کر اب ویویکانند کیندر (کنیا کماری) میں معمولی زندگی گزار رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں میں اپنے آپ کو بے جگہ محسوس نہیں کرتا۔ ایک سائنس داں کا کام سچائی کی تلاش ہے۔ اور میری تلاش بدستور جاری ہے۔ پہلے یہ میکانیکل انجینیرنگ کے میدان میں تھی، اب یہ انسانی انجینیرنگ کے میدان میں ہے:

Earlier it was in mechanical engineering, now it is in human engineering.

ویویکانند سنٹر اس وقت خاص طور پر چار میدانوں میں کام کر رہا ہے ——— تعلیم، دیہی ترقی، یوگا ریسرچ اور رسائل اور کتابوں کی اشاعت۔ سیکڑوں لوگ اپنے اعلیٰ عہدے اور آرام کی زندگی کو چھوڑ کر اس کے پروگرام کے تحت مختلف ریاستوں میں خاموشی کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر نگیندر کے الفاظ میں، یہ ان کے لئے ایک بھرپور زندگی ہے، ان کو پورا اطمینان ہے کہ وہ ایک کام میں لگے ہوئے ہیں:

It is indeed a rich life - rich in Job satisfaction.

وہی قوم زندہ قوم ہے جس میں اعلیٰ صلاحیت کے لوگ اس قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔

کوئی معیار نہیں

ٹام آلٹر (Tom Alter) ایک امریکی نژاد ہندستانی ایکٹر ہیں۔ ہندستان میں لمبے قیام کی وجہ سے وہ اردو سے بخوبی واقف ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں اپنے بارہ میں کہا کہ میں رواں اردو بولتا ہوں۔ کیوں کہ میرا گھر مسوری میں ہے اور مسوری میں ہر آدمی اردو بولتا ہے۔ اردو جاننا میرے فلمی پیشہ میں میرے لئے واقعۃً مددگار ثابت ہوا ہے (ہندستان ٹائمس ۵ جنوری ۱۹۸۴)

ٹام آلٹر نے کہا کہ میں امریکہ کے مقابلہ میں ہندستان میں فلمی کام کرنا پسند کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں کوئی فلم اگر فنی حیثیت سے معیار کے مطابق نہیں ہے تو فلم ناکام ہو جائے گی۔ مگر ہندستان میں اگر فلم فنی حیثیت سے خراب ہو تب بھی فلم چل جاتی ہے۔ ایک خراب فلم کے ذریعہ بھی یہاں دولت کمائی جا سکتی ہے:

In America, if the technique is not upto standard, the film flops. But here in India even if the technique is bad, the film runs. A bad film also makes money here.

مغربی ملکوں میں ہر چیز کی معیار بندی (Standardisation) ہو گئی ہے۔ جو چیز معیار سے کم ہو وہ لوگوں کے درمیان قبولیت حاصل نہیں کرتی۔ اس کے برعکس ہندستان اور اس قسم کے دوسرے ملکوں میں معیار بندی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے ان ملکوں میں ہر چیز چل جاتی ہے خواہ وہ معیار کے مطابق ہو یا معیار کے مطابق نہ ہو۔

مسلم دنیا کا حال اس معاملہ میں شاید سب سے زیادہ خراب ہے۔ مسلم دنیا میں تیسرے درجہ کا اخبار نکال کر بھی آپ صحافی بن سکتے ہیں۔ تاریخ کے ردی خانہ میں جانے والی کتابیں چھاپ کر بھی مصنفین کی فہرست میں آپ کا نام درج ہو سکتا ہے۔ بے قیمت شاعری اور بے معنی خطابت کا مظاہرہ کر کے بھی آپ کو مفکر اسلام کا خطاب مل سکتا ہے۔ ایک بے بنیاد جذباتی نعرہ لگا کر بھی آپ قوم کے عظیم معمار کہے جا سکتے ہیں۔

مزید یہ کہ جب آپ کا جذباتی نعرہ قوم کو گڑھے میں دھکیل دے تو آپ نہایت آسانی سے کوئی (Scapegoat) پا جائیں گے جس کے سر سارا الزام لگا کر بدستور اپنے معتقدین کے درمیان قوم کے نجات دہندہ بنے رہیں۔

اسلام برائے فخر

"اسلام" ذمہ داری کا عنوان ہے نہ کہ فخر کا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اسلام کا زبردست چرچا ہے مگر اسلام کی برکتیں ان میں ظاہر نہیں ہو رہی ہیں۔ اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اسلام سے وہ فخر کی غذا لے رہے ہیں۔ وہ اس کو اپنے لئے ذمہ داری کا عنوان نہ بنا سکے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان جن لوگوں کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، وہ وہی اشخاص تھے جنھوں نے مسلمانوں کے لئے ان کی پر فخر نفسیات کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ شاعروں میں علامہ اقبال اس سلسلے میں سب سے چوٹی کے مقام پر ہیں۔

نثر کی دنیا میں جن لوگوں کا نام لیا جا سکتا ہے، ان میں سے ایک علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ علامہ شبلی نے اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں پر کتابیں لکھیں۔ مگر اس سلسلہ تصانیف کے لئے انھیں جو موزوں ترین عنوان ملا وہ تھا ـــــــ "ناموران اسلام"

"الفاروق" علامہ شبلی نعمانی کی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب میں حضرت عمر فاروق کے بہت سے کارناموں کے ساتھ مصنف نے یہ بتایا ہے کہ انھوں نے "صیغۂ جنگ کو جو وسعت دی تھی اس کے لئے کسی قوم اور کسی ملک کی تخصیص نہ تھی۔ یہاں تک کہ مذہب و ملت کی بھی کچھ قید نہ تھی۔ والنٹیر فوج میں تو ہزاروں مجوسی شامل تھے جن کو مسلمانوں کے برابر مشاہرے ملتے تھے"، اس طرح غیر قوموں کے افراد کی فوجی نظام میں شرکت کی بہت سی مثالیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صیغۂ جنگ کی یہ وسعت جس میں تمام قوموں کو داخل کر لیا گیا تھا صرف اسلام کی ایک فیاضی تھی، ورنہ فتوحات ملکی کے لئے عرب کو اپنی تلوار کے سوا اور کسی کا ممنون ہونا نہیں پڑا (حصہ دوم، صفحہ ۹۹)

یہ فقرہ سراسر فخر کے جذبہ سے نکلا ہوا فقرہ ہے۔ اس کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کو پڑھ کر ایک مسلمان خوش ہو سکتا ہے۔ مگر غیر مسلم جب اس کو پڑھے گا تو اسلام کے اس "قومی تصور" سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔

اس قسم کی تمام چیزیں دراصل اس غلطی کی قیمت ہیں کہ ہم نے غیر مسلموں کو صرف حریف کی نظر سے دیکھا۔ ہم ان کو اپنا مدعو نہ بنا سکے۔

استحکام

اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا میں ہر قسم کی عملی مثالیں قائم کر دی ہیں۔ مثلاً اس نے درختوں میں دو قسم کے درخت بنائے۔ ایک بیل، اور دوسرے بڑے بڑے پھل دار درخت۔ بیل مہینوں میں پھیلتی ہے اور پھر مہینوں ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس درخت سالوں میں تیار ہوتا ہے۔ اور پھر سالوں اور بعض اوقات صدیوں تک زمین پر قائم رہتا ہے۔ اس طرح دو مختلف قسم کی مثالیں کھڑی کر کے خدا اپنی خاموش زبان میں یہ کہہ رہا ہے کہ ہم کیا طریقہ اختیار کریں اور کون سا طریقہ اختیار نہ کریں۔

ملت کی تعمیر کے معاملہ میں ہم کو چاہئے کہ ہم بیل کی طرح نہ پھیلیں بلکہ درخت کی طرح بڑھنے کی کوشش کریں۔ بیل کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ آناً فاناً بڑھتی ہے مگر چند ہی مہینوں میں سوکھ کر ختم ہو جاتی ہے۔ ابتدا میں چاہے وہ ایک فرلانگ تک پھیلی ہوئی نظر آئے مگر آخر کار وہ قدموں کے نیچے بھی دکھائی نہیں دیتی۔

اس کے برعکس درخت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ سالہا سال کے انتظار کے بعد تیار ہوتا ہے مگر اس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ وہ جتنا اوپر دکھائی دیتا ہے اتنا ہی وہ زمین کے اندر بھی چھپا ہوتا ہے۔ وہ سطح زمین سے گذر کر اس کی گہرائیوں سے اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے۔ کوئی درخت جب ایک بار تیار ہو جاتا ہے تو پھر وہ سو سال تک لوگوں کو اپنا پھل اور اپنا سایہ دیتا رہتا ہے۔ اس سے لوگوں کو صرف فائدہ ملتا ہے۔ کسی اعتبار سے بھی وہ لوگوں کے لئے نقصان کا سبب نہیں بنتا۔

اسی طرح ملت کی تعمیر میں توسیع سے زیادہ استحکام کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ استحکام کے بغیر توسیع ایسی ہی ہے جیسے بنیاد کے بغیر مکان کی تعمیر۔

جو معاملہ درخت کا ہے وہی انسانی زندگی کا بھی ہے۔ اگر آپ ٹھوس اور دیرپا تعمیر چاہتے ہیں تو اس کے لئے آپ کو صبر آزما انتظار کے مرحلہ سے گذرنا ہوگا۔ اور لمبے عرصہ تک مسلسل محنت کرنی پڑے گی لیکن اگر آپ بچوں کا گھروندا بنانا چاہتے ہوں تو پھر صبح و شام میں ایسا گھروندا بن کر تیار ہو سکتا ہے البتہ ایسی حالت میں آپ کو اس حادثہ کا سامنا کرنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے کہ جتنی دیر میں آپ کا گھروندا بن کر کھڑا ہوا ہے، اس سے بھی کم مدت میں وہ دوبارہ زمین بوس ہو جائے۔

یہ اختلاف

ہفت وار انکشاف (جھانسی) ۲۱ دسمبر ۱۹۸۳ میں ایک مختصر مضمون نظر سے گذرا:

یہ سنیوں کی مسجد ہے۔
یہ شیعوں کی مسجد ہے۔
یہ اہل حدیث کی مسجد ہے۔
یہ بریلویوں کی مسجد ہے۔
یہ دیوبندیوں کی مسجد ہے۔
یہ مسجد بساطیان ہے۔
یہ مسجد منصوریان ہے۔
اس مسجد میں سلام پڑھنا منع ہے۔
اس مسجد میں تبلیغی جماعت قیام نہیں کر سکتی۔

میں ایک نومسلم ہوں۔ قرآن کی تعلیمات سے متاثر ہو کر میں نے اسلام قبول کیا ہے۔ اب کوئی مجھے بتائے کہ میں کس مسجد میں نماز ادا کروں"

یہ ایک چھوٹی سی تصویر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حالت کیا ہے مسلمان ہر طرف جھوٹے نعروں میں الجھے ہوئے ہیں اور خود ساختہ مسائل کی بنیاد پر انھوں نے خدا کے ایک دین کو بہت سے دینوں میں بانٹ رکھا ہے۔

ایک شخص اپنے جسم کے کپڑے کو پھاڑ کر اس کے ۲۰ ٹکڑے کر ڈالے تو لوگ اس کو پاگل کہیں گے۔ مگر جن لوگوں نے خدا کے دین کو متفرق کر کے اس کو ۲۰ ٹکڑوں میں بانٹ رکھا ہے وہ پاگل ہی نہیں بلکہ مجرم ہیں۔ ایسے لوگ دینداری کا انعام نہیں پا سکتے۔ البتہ یہ اندیشہ ہے کہ ان کو خدا کے دین کو بگاڑنے والا قرار دے کر ان پر مقدمہ چلایا جائے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا جو حال ہے وہ اس آیت کا مصداق ہے جو قرآن میں یہودیوں کے بارہ میں آئی تھی ـــــــ انھوں نے دین کو اپنے درمیان ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو ہے وہ اسی پر خوش ہے (فتقطعوا امرهم بينهم زبرا كل حزب بما لديهم فرحون، المومنون ۵۳)

زندگی کی قوت

گھر کے آنگن میں ایک بیل اگی ہوئی تھی۔ مکان کی مرمت ہوئی تو وہ ملبہ کے نیچے دب گئی۔ آنگن کی صفائی کراتے ہوئے مالک مکان نے بیل کو کٹوا دیا۔ دور تک کھود کر اس کی جڑیں بھی نکلوا دی گئیں اس کے بعد پورے صحن میں اینٹ بچھا کر اس کو سمنٹ سے پختہ کر دیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد بیل کی سابق جگہ کے پاس ایک نیا واقعہ ہوا۔ پختہ اینٹیں ایک مقام پر ابھر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے دھکا دے کر انھیں اٹھا دیا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ چوہوں کی کارروائی ہے کسی نے کوئی اور قیاس قائم کرنے کی کوشش کی۔ آخر کار اینٹیں ہٹائی گئیں تو معلوم ہوا کہ بیل کا پودا اس کے نیچے مڑی ہوئی شکل میں موجود ہے۔ بیل کی کچھ جڑیں زمین کے نیچے رہ گئیں۔ وہ بڑھ کر اینٹ تک پہنچیں اور اب اوپر آنے کے لئے زور کر رہی تھیں۔

"یہ پتیاں اور انکھوے جن کو ہاتھ سے مسلا جائے تو وہ آٹے کی طرح پس اٹھیں، ان کے اندر اتنی طاقت ہے کہ اینٹ کے فرش کو توڑ کر اوپر آ جائیں"۔ مالک مکان نے کہا "میں ان کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتا۔ اگر یہ بیل مجھ سے دوبارہ زندگی کا حق مانگ رہی ہے تو میں اس کو زندگی کا حق دوں گا"، چنانچہ انھوں نے چند اینٹیں نکلوا کر اس کے لئے جگہ بنا دی۔ ایک سال بعد ٹھیک اسی مقام پر تقریباً پندرہ فٹ اونچی بیل کھڑی ہوئی تھی جہاں اس کو ختم کر کے اس کے اوپر پختہ اینٹیں جوڑ دی گئی تھیں۔

پہاڑ اپنی ساری وسعت اور عظمت کے باوجود یہ طاقت نہیں رکھتا کہ کسی پتھر کے ٹکڑے کو ادھر سے ادھر کھسکا دے۔ مگر درخت کے ننھے پودے میں اتنا زور ہے کہ وہ پتھر کے فرش کو دھکیل کر باہر آ جاتا ہے۔ یہ طاقت اس کے اندر کہاں سے آئی۔ اس کا سرچشمہ عالم فطرت کا وہ پر اسرار مظہر ہے جس کو زندگی کہا جاتا ہے۔ زندگی اس کائنات کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ زندگی ایک ایسی طاقت ہے جس کو کوئی دبا نہیں سکتا۔ اس کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ اس کو پھیلنے اور بڑھنے کے حق سے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔

زندگی ایک ایسی قوت ہے جو اس دنیا میں اپنا حق وصول کر کے رہتی ہے۔ جب زندگی کی جڑیں تک کھود دی جاتی ہیں، اس وقت بھی وہ کہیں نہ کہیں اپنا وجود رکھتی ہے اور موقع پاتے ہی دوبارہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ جب ظاہری طور پر دیکھنے والے یقین کر لیتے ہیں کہ اس کا خاتمہ کیا جا چکا ہے۔ اس وقت بھی وہ عین اس مقام سے اپنا سر نکال لیتی ہے جہاں اسے توڑا اور مسلا گیا تھا۔

مستقبل کی طرف

ایک مسلم خاندان اجمیر جاتے ہوئے دہلی اترا اور چند روز یہاں رہ کر اجمیر کے لئے روانہ ہوا۔ بچوں کی شکل، ان کے معمولی کپڑے اور ان کی بات چیت سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوئی جاہل اور غریب خاندان ہے۔ بچوں کی ماں کبھی کبھی کسی ضرورت سے ہمارے یہاں آجاتی تھی۔ ۳۰ اگست ۱۹۷۰ کو اجمیر کے لئے روانگی سے پہلے وہ ہمارے یہاں آئی۔ اپنے گھر کے حالات بتاتے ہوئے خاتون نے کہا: "ایک لڑکا ہے۔ میٹرک میں اس کو بیالوجی دلادی تھی۔ اب ڈاکٹری میں داخل کر دیا ہے۔ مسلمان تو آجکل تھکی مچھر ہو رہے ہیں۔ پڑھ لیں تو شاید وہ بھی کسی کام کے ہو جائیں" غریب اور جاہل عورت کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارہ میں تاریخ کا فیصلہ سن رہا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ملک کے حالات نے یہاں کے مسلمانوں کو ایک نئے فیصلہ تک پہنچا دیا ہے، ایسا فیصلہ جو اتنا عام ہے کہ ایک جاہل اور غریب عورت تک اس کا اثر پہنچا ہے۔

اسپرنگ کو آپ جتنا دبائیں اتنی ہی زیادہ طاقت کے ساتھ وہ ابھرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ انسان کا ہے۔ حالات خواہ کتنے ہی سخت ہوں وہ کبھی انسان کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے ہر سختی آدمی کے اندر نیا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ ہر رکاوٹ آدمی کے عمل کے جذبہ کو نئی طاقت کے ساتھ ابھار دیتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ناموافق حالات آدمی کو ختم نہیں کرتے بلکہ اس کو نئی زندگی دے دیتے ہیں۔

یہ درحقیقت شکست نہیں ہے جو آپ کو ناکام بناتی ہے بلکہ یہ صرف آپ کی نااہلی ہے کہ آپ شکست میں رہنمائی اور کامیابی کا محرک نہ پاسکیں۔ شکست کوئی شرم کی بات نہیں۔ وہ ہر اس شخص کی زندگی کے معمولی واقعات ہیں جو کامیابی کی راہ پر بڑھے۔ شکست صرف اس وقت نقصان کی چیز ہے جب کہ احساس ذلت کے بغیر آپ اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں، جب آپ اس کا تجزیہ نہ کرسکیں اور یہ نہ سکیں کہ آپ جو کچھ چاہتے تھے اس کو آپ کیوں نہ حاصل کر سکے۔

کوئی بھی دوسری چیز ہمارے اندر کامیابی حاصل کرنے کا اتنا شدید جذبہ نہیں ابھارتی جتنا شکست۔ شکست آپ کو ہر بار ایک زیادہ بڑی اور نئی قوت عطا کرتی ہے۔ اگر آپ اس قوت کو حاصل کرسکیں جو شکست دیتی ہے تو آپ اس سے زیادہ کامیاب رہ سکتے ہیں جو پرسکون حالات میں آپ کے لئے ممکن تھا۔ شکست اگر آپ کے اندر دوبارہ کامیابی حاصل کرنے کا عزم پیدا کردے تو کوئی بھی چیز آپ کی اگلی جدوجہد کو کامیابی تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔

ایک امکان

جان پاویل (John Enoch Powell) ایک نہایت ذہین اور قابل انگریز تھے۔ وہ برطانی کیبنٹ میں وزیر صحت تھے۔ بعض اصولی اختلاف کی بنا پر انھوں نے وزارت سے استعفا دے دیا۔ وہ یونانی، لاتینی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور انگریزی زبانیں جانتے تھے۔ جان پاویل آزادی سے پہلے ہندستان میں بھی رہ چکے ہیں۔ وہ برطانوی فوج میں ایک افسر تھے۔ ان کے ایک سوانح نگار نے ان کی بابت حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

> Powell spent some years in India as a soldier. He travelled extensively in the country by bicycle and became in his own words "an amateur of Islamic architecture" He learned Urdu and became acquainted with Sanskirt. Of his years in India he wrote later : "I had fallen hopelessly in love with India. If in 1946, there had been a foreseeable future in the Indian army, I would have opted to leave my bones there."

پاویل نے کچھ سال ہندستان میں بطور انگریزی سپاہی کے گزارے۔ انھوں نے بائیسکل کے ذریعہ ملک میں دور دور تک کا سفر کیا۔ وہ اپنے الفاظ میں اسلامی طرز تعمیر کے عاشق ہو گئے۔ انھوں نے اردو سیکھی۔ اُن سنکرت سے واقفیت پیدا کی۔ اپنے ہندستان میں زمانۂ قیام کے بارہ میں انھوں نے بعد کو لکھا کہ میں ہندستان کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اگر ۱۹۴۶ میں ہندستانی فوج کا پیشگی طور پر کوئی مستقبل نظر آتا تو میں اس کو ترجیح دیتا کہ میری ہڈیاں ہندستان ہی میں رہ جائیں (ٹائمس آف انڈیا ۵ فروری ۱۹۸۴)

انگریزی دور حکومت میں اس طرح کے بے شمار انگریز تھے۔ وہ دعوت اسلام کے امکانی مدعو تھے۔ ان کی فطرت پکار رہی تھی کہ "ہمارے سامنے حق کا پیغام پیش کرو، ہم اس پر تعصب سے خالی ہو کر غور کریں گے"، مگر ہمارے قائدین کو یہ امکان نظر نہ آیا۔ کیوں کہ انھوں نے انگریز کو حریف کے روپ میں دیکھا۔ وہ ان کو مدعو کے روپ میں نہ دیکھ سکے۔ انھوں نے ان سے نفرت کی مگر وہ ان سے محبت نہ کر سکے۔ انھوں نے ان کو صرف غیر سمجھا، وہ ان کو اپنا سمجھنے کا ثبوت نہ دے سکے۔ وہ ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے اور مثبت نفسیات پر قائم ہونے والے نہیں بنے۔ حالانکہ یہ وہ وقت تھا کہ وہ اپنا کام اپنی مادری زبان اردو میں کر سکتے تھے۔

یہ غلطی اگر لیڈری کے شوق میں ہوئی تو وہ سب سے بڑا گناہ تھی اور اگر اخلاص سے ہوئی تو سب سے بڑی حماقت۔

دعوتی قوت

مکہ کے آخری دور میں جب قریش کا ظلم مسلمانوں پر بہت بڑھ گیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ مکہ چھوڑ کر حبش چلے جائیں۔ چنانچہ اسّی سے اوپر کچھ لوگ حبش کی طرف ہجرت کر گئے۔ یہ اگرچہ ایک بہت تکلیف دہ واقعہ تھا۔ مگر اس میں اللہ نے خیر کی صورت پیدا فرمادی۔ اس کے ذریعہ اسلام کی دعوت بین اقوامی دائرہ میں داخل ہوگئی۔

حبش کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی زندگی سراپا دعوت تھی۔ ان کی تبلیغ اور عمل سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے چنانچہ حبش سے عیسائیوں کی ایک جماعت تحقیق حال کے لئے مکہ آئی۔ ان کی تعداد تیس سے اوپر تھی۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کی زبان سے اسلام کا پیغام سُنا۔ آپ نے قرآن کے حصے پڑھ کر انھیں سنائے۔ وہ اتنا متاثر ہوئے کہ سب کے سب اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگئے۔

ابوجہل کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو وہ آیا اور ان لوگوں سے کہا:

ما رأینا رکبا احمق منکم۔ ارسلکم قومکم تعلمون خبر ھذا الرجل فلم تطمئن مجالسکم عندہ حتی فارقتم دینکم وصدقتموہ فیما قال فقالوا سلام علیکم لا نجاھلکم لنا ما نحن علیہ ولکم ما انتم علیہ۔

ہم نے تم سے زیادہ احمق کوئی قافلہ نہیں دیکھا تمہاری قوم نے تم کو اس لئے بھیجا کہ تم اس آدمی کی خبر لاؤ۔ مگر تمہارا حال یہ ہوا کہ اس کے ساتھ بیٹھتے ہی تم نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس کا اعتراف کرلیا انھوں نے جواب دیا: تم پر سلامتی ہو، ہم تم سے بحث نہیں کرتے۔ ہمارے لئے وہ ہے جس پر ہم ہیں اور تمہارے لئے وہ ہے جس پر تم ہو۔

حبش کے ان ایمان لانے والوں کا رویہ اللہ کو پسند آیا اور ان کے مطابق سورہ قصص ۵۲-۵۵ اتریں۔

دعوت ایک ایسا قیمتی ہتھیار ہے جو ہر حال میں اپنا کام کرتا رہتا ہے، خواہ داعی غالب ہو یا مغلوب۔ سچے داعی کے خلاف اس کے دشمنوں کی ہر کوشش الٹی پڑتی ہے۔ یہ داعی کا ایسا (Advantage) ہے جو داعیٔ حق کے سوا کسی اور کو میسر نہیں۔

کرنے کا کام

یہ ۱۹۲۰ کا زمانہ ہے جب کہ خلافت اور ترک موالات کی تحریک شروع ہوچکی ہے اور تمام بڑے بڑے مسلمان لیڈر سرگرمیوں کے آسمان پر نظر آتے ہیں۔ اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"مجھے کس قدر حیرت ہوئی جب میں نے رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک آرٹیکل (فلاسفی آف انڈین ہسٹری) دیکھا جو ماڈرن ریویو میں نکلا تھا۔ اس میں وہ اس بات کی مثال دیتے ہوئے کہ مذہب کے بڑے آدمی خود معبود بن گئے ہیں۔ کرشن، مسیح اور چیتن کے ساتھ محمدؐ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ یعنی کرشن اور مسیح کی طرح محمدؐ کی بھی پرستش مسلمانوں کے یہاں ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہندستان کا عظیم الشان شاعر جو امریکہ کی سیاحت سے واپس آرہا ہے اسے ان لوگوں کا ایک مشہور عقیدہ بھی نہیں معلوم جو خود اس کے اپنے گھر میں بستے ہیں۔ مسلمانوں کے اعتقاد میں جو انسان محمدؐ یا کسی اور انسان کو معبود سمجھے وہ مسلمان باقی نہیں رہتا۔ ایک دہقانی مسلمان بھی جانتا ہے کہ اس کا پیغمبر انسان تھا۔ اسلام کا اصل مشن انسانی پرستش کو مٹا دینا ہے۔ اسی طرح جب میں بنکم چندر چٹرجی کے تاریخی ناول دیکھتا ہوں تو ہندستان کی اسلامی تاریخ سے ان کی بے خبری دیکھ کر متعجب ہوکر رہ جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے مذہب اور تاریخ سے ایک ہندو اتنا ہی ناواقف ہے جتنا کہ ایک امریکن۔ (ذکر آزاد۔ از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ٹیگور اور چٹرجی جیسے لوگوں پر تعجب کیا ہے۔ حالانکہ اصل تعجب کے قابل خود مولانا آزاد اور ان کے جیسے دوسرے اکابر ہیں، جو آزادی وطن اور قومی حکومت جیسے مقاصد کے لئے زندگی بھر سرگرم رہے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ اصل کام اسلام کے صحیح تعارف کا ہے نہ کہ آزادی اور قومیت کا جھنڈا بلند کرنے کا

آج کا انسان اس مذہب کی تلاش میں ہے جس میں انسان کو خدا نہ بنایا گیا ہو۔ جس میں خدا کو خدا کی جگہ رکھا گیا ہو اور انسان کو انسان کی جگہ۔ مگر یہی وہ کام ہے جس کو مجاہدین اسلام میں سے کوئی بھی کرنے کے لئے نہیں اٹھتا۔

دنیا اگر خدا کے سچے دین سے بے خبر ہے تو سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کی ذمہ داری کس کے اوپر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر نہیں ہے جو بے خبر ہیں۔ بلکہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جو اس سے باخبر تھے مگر انھوں نے بے خبروں کو خبردار نہ کیا۔

آخرت کی پکار

ایک مسئلہ آدمی کے ذہن پر بہت زیادہ چھایا ہوا ہو تو دوسرے تمام مسائل سے اس کی نظریں ہٹ جاتی ہیں۔ وہ اپنے مخصوص مسئلہ کا اس طرح مبلغ بن جاتا ہے جیسے کہ بس وہی سارا مسئلہ ہے۔ اس کے سوا کسی اور مسئلہ کا کوئی وجود نہیں۔

کارل مارکس کے ذہن پر "معاش" کا مسئلہ چھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب، اخلاق، فلسفہ، ہر دوسری چیز کو اس نے نظر انداز کر دیا۔ ٹالسٹائی کے ذہن پر "انسانیت" کا غلبہ تھا۔ اس نے انسانیت کی باتیں اس طرح بتکرار کہیں گویا دوسرے سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔ ہندستان میں بہت سے لیڈروں پر آزادیٔ وطن کا خیال چھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری تمام چیزیں ان کے یہاں غفلت کے خانہ میں چلی گئیں۔

یہی معاملہ ایک اور صورت میں حق کے داعی کا ہے۔ حق کے داعی کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت آخرت کی ہوتی ہے۔ وہ جہنم سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے اور جنت کا سب سے زیادہ مشتاق ہوتا ہے۔ اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر یہ ہوتا ہے کہ دوسرے تمام مسائل اس کی نظر میں ایسے بن جاتے ہیں جیسے کہ ان کا کوئی وجود نہیں۔

مزدور اور صنعت کار کے معاملات کیا ہیں۔ ملک پر کس شخص یا کس قوم کی حکومت ہے۔ عہدوں کی تقسیم میں کس کو زیادہ حصہ مل رہا ہے اور کس کو کم۔ ایک قوم نے دوسری قوم کے خلاف کیا جارحانہ منصوبے بنا رکھے ہیں۔ اس طرح کی تمام چیزیں داعیٔ حق کی نظر میں غیر اہم ہوتی ہیں۔ دنیا کے مسائل اس کے لئے اسی طرح ناقابل ذکر بن جاتے ہیں جس طرح عام قائدین کے لئے موت اور آخرت کے مسائل ناقابل ذکر بنے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں صرف دو ہی پکاریں ہیں۔ ایک دنیا کی پکار، دوسری آخرت کی پکار۔ آج تمام پکارنے والوں کا یہ حال ہے کہ وہ لوگوں کو دنیا کی طرف بلا رہے ہیں۔ وہ لوگوں کو سیاسی اور معاشی اور سماجی خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ بظاہر ان میں سے کوئی سیکولر اصطلاحوں میں بول رہا ہے اور کوئی مذہب کی اصطلاحوں میں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔ کیوں کہ سب کے سب دنیا کے مسائل کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔

ہمارا المیہ

سرا ینڈریو ہکسلے (Sir Andrew Huxley) ایک نوبل انعام یافتہ سائنس داں ہیں۔ وہ رائل سوسائٹی (لندن) کے صدر ہیں۔ ۷ا جنوری ۱۹۸۴ کو انھوں نے انڈین نیشنل سائنس اکاڈمی (نئی دہلی) میں لکچر دیا۔ اس کا عنوان تھا سائنس اور سیاست (Science and Politics)

انھوں نے کہا کہ سائنس کی تحقیقات میں جو غیر معمولی وسائل درکار ہوتے ہیں وہ اس وقت صرف روس اور امریکہ کو حاصل ہیں۔ برطانیہ میں بھی اس سلسلے میں کافی کام ہو رہا ہے مگر وہ صرف مغربی یورپ کے ساتھ اتحادی پروگرام (Collaborative programme) کے ذریعہ ممکن ہوا ہے نہ کہ ذاتی وسائل کے ذریعہ (ٹائمس آف انڈیا ۱۸ جنوری ۱۹۸۴ء)

انھوں نے بتایا کہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ دردناک حال غیر ترقی یافتہ ممالک کا ہے۔ وہ سائنسی تحقیقات میں سب سے پیچھے ہیں حالانکہ صنعتی ممالک بہترین صلاحیتوں کو انھیں زیر ترقی ممالک سے لے رہے ہیں:

Industrialised countries are drawing the best of the talent from developing countries.

کیسی عجیب بات ہے۔ جن نوجوانوں کے سرپرستوں نے مغربی قوموں سے لڑائی کی تھی کہ وہ ان کے ملکوں کو لوٹ رہے ہیں اور بے پناہ قربانی کے بعد ان کے قبضہ سے آزادی حاصل کی تھی۔ اب انھیں کی بہترین اولاد خود اپنی مرضی سے بھاگ کر ان ملکوں میں جارہی ہے تاکہ وہ ان کی صلاحیتوں کو لوٹیں اور ان کے ذریعہ اپنی عالمی قیادت کو برقرار رکھیں۔

اس دوسری لوٹ سے بچنے کی واحد صورت وہی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں برطانیہ نے اختیار کیا ہے۔ یعنی مختلف ممالک کے مشترکہ وسائل سے اعلیٰ ترین سائنسی تحقیق کا انتظام کرنا تاکہ ان ملکوں کے اعلیٰ سائنسی ذہنوں کو خود اپنے ملک میں کام کے وہی مواقع مل سکیں جس کے لئے وہ مغربی ملکوں میں جاتے ہیں۔ مگر غیر ترقی یافتہ ممالک (تیسری دنیا) میں دو ملک بھی ایسے نہیں ہیں جو حقیقی معنوں میں اتحاد و اشتراک کے ذریعہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تخریب کے عنوان پر لوگوں کو متحد کرنا سب سے زیادہ آسان کام ہے اور تعمیر کے عنوان پر متحد کرنا سب سے زیادہ مشکل کام۔

کیسی عجیب تھی وہ آزادی جو خون کے بہاؤ کے ذریعہ حاصل کی گئی۔ اور کیسی عجیب ہے وہ غلامی جو صلاحیتوں کے بہاؤ (Brain drain) کے ذریعہ دوبارہ ہماری طرف لوٹ آئی ہے۔

قرآن کا کرشمہ

جنوری ۱۹۸۴ میں حیدر آباد میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس کے بعد سی آر پی کے جوان آئے اور گھروں کی تلاشیاں اور گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ مولانا اکبر الدین قاسمی (سلطان شاہی حیدر آباد) کا مکان عین فساد زدہ علاقہ میں تھا۔ ۹ جنوری کو وہ اپنے گھر میں تھے کہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولا تو باہر سی آر پی کے بارہ جوان کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گھر کے اندر گھس آئے اور ایک ایک چیز کو دیکھنا شروع کیا کہ کوئی ہتھیار تو نہیں ہے۔ کوئی فسادی لڑکا تو گھر میں چھپا ہوا نہیں ہے۔

مولانا اکبر الدین قاسمی کے ساتھ اس وقت گھر میں صرف چار خواتین تھیں۔ خواتین کو اندیشہ ہوا کہ اگر انھوں نے مولانا قاسمی کو گرفتار کر لیا تو گھر میں اس کے بعد کوئی مرد نہ رہے گا صرف عورتیں عورتیں رہ جائیں گی۔ سب کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ تلاشی لینے والے سپاہی مختلف چیزوں کو دیکھتے ہوئے بالآخر ایک الماری پر پہنچے۔ وہاں ہاتھ ڈالا تو اس کے اندر ایک مجلد کتاب تھی۔

"کیا یہ قرآن ہے" انھوں نے پوچھا

"ہاں" صاحب خانہ نے جواب دیا۔

"کیا آپ قرآن پڑھتے ہیں" سی آر پی گروہ کے افسر نے دوبارہ سوال کیا۔

"یہی تو ہم لوگوں کا کام ہے۔" ہم تو مدرسہ کے لوگ ہیں۔ ہمارا یہی کام ہے کہ قرآن کو پڑھیں اور قرآن کو پڑھائیں"

اس کے بعد سی آر پی کے افسر کا رخ بالکل بدل گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "یہاں سے چلو، یہاں کچھ نہیں ملے گا۔" اور پھر سب کے سب گھر سے نکل کر باہر چلے گئے۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ مولانا اکبر الدین قاسمی پہلے سی آر پی والوں کے لیے "صاحب مکان" تھے مگر بعد کو وہ ان کی نظر میں "صاحب قرآن" بن گئے۔ یہی فرق ہے جس کی وجہ سے اولاً انھوں نے ان کے اوپر شبہہ کیا اور بعد کو انھیں صحیح وسالم چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

صحیح ردعمل

ابن خلدون نے اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

یحکیٰ فی کتب السیر والتاریخ ان اباموسیٰ الاشعری عاقب جندیا فی جایش العراق۔ فحلق شعر راسہ۔ فجمع الجندی الشعر وسافر بہ من العراق الی المدینۃ بالحجاز۔ ودخل علیٰ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فقذف بالشعر امامہ وقال فی غضب۔ ھکذا یعاملنا رجالک۔ فتھلل وجہ عمر وقال لان یکون الناس کلھم فی مثل شجاعۃ ھذا احب الی من کل ما فتحنا من بلاد

سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے عراقی لشکر کے ایک سپاہی کو سزا دی۔ انھوں نے اس کے سر کے بال منڈوا دئے اس کے بعد سپاہی نے بالوں کو جمع کیا اور اس کو لے کر عراق سے مدینہ آیا۔ وہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق سے ملا۔ اس نے کٹے ہوئے بال حضرت عمر کے آگے ڈال دئے اور غصہ میں کہا۔ تمہارے آدمی اس طرح ہمارے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عمر کا چہرہ چمک اٹھا۔ انھوں نے کہا۔ اگر تمام لوگ اس آدمی کی طرح بہادر ہو جائیں تو وہ مجھ کو تمام ملکوں کی فتوحات سے زیادہ محبوب ہیں۔

حضرت عمر فاروق کے لئے واقعہ کو دیکھنے کے دو رخ تھے۔ ایک یہ کہ سپاہی نے اپنے افسر کی اور خود خلیفہ وقت کی گستاخی کی ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ ایک بہادر انسان ہے۔ اور وقت کے حکمراں کے سامنے کھڑے ہو کر بھی بے باکانہ اظہار خیال سے نہیں ڈرتا۔

حضرت عمر اگر واقعہ کو پہلے رخ سے دیکھتے تو وہ سپاہی کے اوپر بگڑ جاتے۔ وہ اس کو سزا دیتے یا اپنی مجلس سے نکلوا دیتے۔ مگر انھوں نے گستاخی کے پہلو کو نظر انداز کیا۔ انھوں نے صرف یہ دیکھا کہ سپاہی نے میرے سامنے جس جرأت اور حوصلہ کا مظاہرہ کیا ہے، یہ کسی انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے اور یہی کسی آدمی سے بڑے بڑے کام کرواتا ہے۔

اسی طرح ہر واقعہ کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک منفی اور دوسرا مثبت۔ منفی پہلو آدمی کے اندر صرف تخریبی نفسیات کو جگاتا ہے۔ اور مثبت پہلو اس کے اندر تعمیری نفسیات کو جگا کر اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے لئے بھی کارآمد بن سکے اور دوسروں کے لئے بھی۔ اس دنیا میں کوئی بڑا کام وہی لوگ کرتے ہیں جو واقعات کے مثبت پہلو کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

اسلامی مرکز دہلی

اسلامی مرکز (اسلامک سنٹر) ۱۹۷۰ میں قائم ہوا۔ اس کا مقصد خالص غیر سیاسی ہے۔ وہ دعوتی اور تعمیری طریق کار پر یقین رکھتا ہے اور اسی انداز میں خاموشی کے ساتھ پچھلے تقریباً پندرہ سال سے کام کرنے میں مصروف ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اسلامی مرکز کے لئے ایک مستقل عمارت حاصل کرلی گئی ہے۔ یہ عمارت نئی دہلی میں نظام الدین ویسٹ میں واقع ہے۔ یہ مقام تبلیغی مرکز سے بہت قریب ہے۔ مزید معلومات بذریعہ خط حاصل کی جاسکتی ہیں۔

اسلامی مرکز کے شعبے اب تک دہلی کے تین مختلف مقامات پر چھوٹی چھوٹی عمارتوں میں قائم تھے۔ اب وہ مذکورہ عمارت میں یکجا کئے جارہے ہیں۔ اسلامی مرکز کا صدر دفتر، الرسالہ (اردو) الرسالہ (انگریزی) مکتبہ الرسالہ اور دوسرے ضروری دفاتر آئندہ انشاء اللہ اسی عمارت میں کام کریں گے۔

اسلامی مرکز کے ایک بڑے کمرہ میں ہفتہ وار اجتماع کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ اس اجتماع میں مولانا وحید الدین خاں صاحب (صدر اسلامی مرکز) اسلام کے تعارف پر علمی اور دعوتی انداز میں ہر ہفتہ ایک لکچر دیں گے۔ نیز اس اجتماع میں اسلامی مرکز کے مقاصد کے تحت دوسرے ضروری مسائل پر غور و خوض ہوگا۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب سے ملاقات آئندہ اسی نئے مرکز میں ہو سکے گی۔ مولانا موصوف سے ملاقات کا وقت روزانہ عصر اور مغرب کے درمیان ہے۔

سکریٹری اسلامی مرکز
سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی ۱۳
AL-MARKAZ AL-ISLAMI
C-29, Nizamuddin West, New Delhi 110013
Telephone 611128

القرآن الحکیم (الفی)

"پندرھویں صدی ہجری کی آمد پر ساری دُنیا میں مختلف اسلامی تقریبات منائی گئی ہیں
القرآن اکاڈمی (بمبئی، دہلی) نے اِس سلسلے میں طویل کوششوں کے بعد ایک اہم تاریخی پیش کش کی ہے
یہ قرآن کا ایک منفرد نسخہ ہے۔ جس کا نام "القرآن الحکیم الفی" ہے۔

اس قرآن کی خصوصیات یہ ہیں کہ اِس کا عام صفحہ ۲۳ سطری ہے اور ہر سطر الف سے شروع ہوتی ہے۔ ہر پارہ چھ صفحات پر مشتمل ہے اور پورا قرآن ۱۹۶ صفحات میں مکمل ہو گیا ہے۔
اس میں نزولِ قرآن سے لے کر اب تک خطاطی کے مختلف نمونوں کو ہر سورہ کے شروع ہی میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کو ۱۱۳، الگ الگ نمونوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح قرآن کی سات منزلوں میں سات دوروں کا طرزِ کتابت دکھایا گیا ہے۔

القرآن الحکیم الفی کی تیسوں پاروں کی کتابت سات سال میں مکمل ہوئی ہے اور اب تصحیح کے مراحل میں ہے، جس کے لئے عالمی مذہبی تعلیمی اداروں سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔ اُن سے اسنادِ صحت کے حصول کے بعد، سات رنگوں کے نو مختلف حاشیوں سے مزین کر کے آرٹ پیپر پر سنگاپور میں چھپوایا جارہا ہے۔ القرآن الحکیم (الفی) کے اطراف کے اندرونی اَستر کے بعد کے صفحات پر مکتوباتِ نبوی کی تصویر شامل ہے۔ نیز خلافت راشدہ کے زمانے میں ہرن کی جھلّی پر لکھے ہوئے قرآن کے صفحات کو عین اسی انداز سے منعکس کیا گیا ہے۔ اِس طرح القرآن الحکیم (الفی) کو پڑھنے والا قرآن پڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جان لیتا ہے کہ قرآن، دورِ نبوی، خلافتِ راشدہ، دورِ بنو امیہ، دورِ عباسیہ، دورِ فاطمیہ، دورِ عثمانیہ، دورِ سلجوقیہ، خلجیہ، تغلقیہ، غزنویہ اور دورِ مغلیہ وغیرہ میں کس کس رسم الخط میں لکھا جاتا رہا ہے۔

تاریخ انسانی کا سب سے زیادہ انوکھا واقعہ یہ ہے کہ قرآن تقریباً ڈیڑھ ہزار سال گذرنے کے باوجود اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ "القرآن الحکیم الفی" گویا اس حفاظتِ قرآن کی ایک دستاویز ہے "القرآن الحکیم الفی" قرآن بھی ہے اور قرآن کی تاریخ بھی۔ وہ اپنی مختلف خصوصیات کے ساتھ قرآن کا ایک دلآویز نسخہ ہے اور اُسی کے ساتھ قرآن کی تاریخ حفاظت کا ایک خوبصورت مرقع بھی۔

پندرھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے پندرہ کروڑ اور پوری دنیا کے ایک سو پندرہ کروڑ (۱۱۵۰۰۰۰۰۰۰) مسلمانوں کے لئے اعلانِ مسرت

۱۴۰۰ سو برس میں دورِ قدیم سے موجودہ دور تک خطاطی کے ۱۱۴ نمونوں کو القرآن الحکیم (الفی) میں جمع کئے جانے کا تاریخی اہتمام

حمد للہ کہ قرآن مجید کی سات منزلوں کو سات برسوں میں طے کرلیا گیا۔ القرآن اکیڈمی بمبئی و دہلی کے القرآن الحکیم (الفی) کی تکمیل

القرآن الحکیم (الفی)

القرآن اکاڈمی بمبئی و دہلی کے زیرِ اہتمام ۱۳۹۸ھ ۱۹۷۸ء میں ایک ایسے قرآن مجید کی کتابت شروع ہوئی تھی، جس کا ہر صفحہ ۲۳ سطری ہے اور ہر سطر کو اَلِف سے شروع کیا گیا ہے۔

اس قرآنِ حکیم کی یہ بھی تاریخی خصوصیت ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت کی کتابت کے دور سے موجودہ دور کی خطاطی کے شاہکار، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ۱۱۴ طریقے سے کتابت کرکے قرآن کی تاریخی دستاویز تیار کی ہے!

القرآن اکاڈمی بمبئی و دہلی
نگرانِ اعلیٰ
الحاج اکبر خان منشی گل

کاتبِ قرآن
مولوی محمد یوسف قاسمی

تزئین کار
سید احمد رامپوری ثم الدہلوی

پرنٹر و پبلشر
محمود خان اکبر خان

انتظامی امور و طباعت کے نگران
نورالدین آزاد

[القرآ]ن الحکیم (الفی) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہرِ نبوت کے ساتھ تاریخی خطوط، اور ہرن کی جھلی پر کتابت شدہ قرآن مجید کے صفحات کا عکسِ جمیل پیش کیا گیا ہے۔

[القر]آن الحکیم (الفی) قرآن کی سات منزلوں کو ۱۴ سو برس یعنی ۱۔ دورِ خلافت راشدہ، ۲۔ دورِ بنو امیہ، ۳۔ دورِ بنو عباسیہ، ۴۔ دورِ بنو فاطمیہ، ۵۔ دورِ عثمانیہ (ترکیہ)، ۶۔ دورِ سلجوقیہ، خلجیہ، تغلقیہ، غزنویہ اور ۷۔ دورِ مغلیہ کے سلاطین کی کتابتِ قرآنِ مجید کے نمونوں کا تاریخی مرقع ہے۔

[پند]رھویں صدی ہجری کے مبارک موقع پر پیش کیا جانے والا القرآن الحکیم (الفی) جلی قلم [کت]ابت کے باوجود ۱۹۶ صفحات میں مکمل ہے۔ اِس کو سات رنگ کے کئی حاشیوں سے [مزی]ن کرکے آرٹ پیپر پر "سنگاپور" میں چھپوایا جا رہا ہے۔

[ال]قرآن اکاڈمی بمبئی و دہلی نے دنیا کے بیشتر ممالک میں القرآن الحکیم (الفی) کے جشنِ افتتاح کا [پروگ]رام مرتب کیا ہے۔ اِدارہ کی ایسی نورانی پیش کش کی زیارت و تلاوت کا انتظار فرمائیے۔

الرسالہ دہلی، اسلامی مرکز دہلی، وحید آباد کے سربراہ مولانا وحید الدین خان صاحب کا تاثر اسی شمارے میں دیکھئے!

مزید تفصیلات جاننے کے لئے رابطہ قائم کیجئے! مہتمم القرآن اکاڈمی بمبئی: ۱۰۴ - کامبیکر اسٹریٹ، تیسرا منزلہ بمبئی ۳ دہلی: ۲۰۳۴ - قاسم جان اسٹریٹ، ممتاز بلڈنگ دہلی ۶

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہوجاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

جلد اوّل

سورۃ فاتحہ - سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

Regd. D (DN)/No. 532
Regd. R.N. No. 28822/76

May 1984
Issue No. 90

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	15/-
پیغمبر انقلاب	25/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	2/-
منزل کی طرف	3/-
حقیقت حج	2/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی ۔ ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

جہاز بندرگاہ میں زیادہ محفوظ ہوتے ہیں
مگر جہاز بندرگاہ کے لئے نہیں بنائے گئے ہیں

جون ۱۹۸۴ء قیمت فی پرچہ — تین روپے شمارہ ۹۱

تذکیر القرآن

جلد اول

سورۃ فاتحہ - سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ھدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

جون ۱۹۸۴
شمارہ ۹۱

سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

متفقین سے گزارش

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ ایک مشن ہے۔ جو لوگ اس مشن سے متفق ہیں ان سے ہماری درخواست ہے کہ حسب ذیل پروگرام میں شرکت کرکے ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں۔

۱۔ ماہنامہ الرسالہ کی ایجنسی قائم کریں (شرائط ایجنسی آخر میں ملاحظہ فرمائیں)
۲۔ الرسالہ کے ادارہ سے چھپی ہوئی کتابیں لوگوں کے درمیان پھیلائیں۔
۳۔ اجتماعات کے مواقع پر بک اسٹال لگائیں جس میں الرسالہ اور کتابیں رکھی جائیں۔
۴۔ متفقین کو جوڑ کر ہفتہ وار اجتماع کریں۔
۵۔ مساجد اور دوسرے اجتماعی مقامات پر تذکیر القرآن پڑھ کر سنائیں۔
۶۔ مختلف علاقائی زبانوں میں الرسالہ کی مطبوعات کے ترجمے شائع کریں۔

سکریٹری اسلامی مرکز

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

تقویٰ کی علامت

قرآن میں قربانی کے جانور کو شعیرہ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کو ان جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اس کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ (الحج، ۳۷) اگر جانوروں کی قربانی سے سادہ طور پر صرف جانور کی قربانی مراد ہو تو یہاں یہ کہنا بے موقع ہے کہ خدا کو تمہارا ذبح کیا ہوا جانور نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام میں کچھ چیزیں بطور شعیرہ یا علامت (Symbol) مقرر کی گئی ہیں۔ انھیں میں سے ایک قربانی کا جانور بھی ہے۔ شعیرہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی معنوی حقیقت کے لئے ظاہری علامت کا کام دے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ بندے اپنے مخالف اسلام جذبات کو اللہ کی خاطر ذبح کریں۔ یہ ایک نفسیاتی ذبح ہے اور اس نفسیاتی ذبح کی علامت کے طور پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ آدمی ایک جانور کو ذبح کرے۔

جانور کے ذبح کے وقت آدمی اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے: انّ صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العلمین (میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کی قربانی ایک معنوی حقیقت کی ایک ظاہری علامت ہے۔ اسی شخص کی قربانی قربانی ہے جو جانور کو ذبح کرتے ہوئے یہ تصور کرے کہ وہ اپنے پورے وجود کو اللہ کے لئے قربان کر رہا ہے۔ جس کے لئے ذبح کیا ہوا جانور اس کے اپنے جذبات واحساسات کے ذبیحہ کا محسوس پیکر بن جائے۔

روزہ بھی اسی قسم کا ایک شعیرہ (علامت) ہے۔ ترک طعام حقیقۃً ترک معاصی کی علامت کے طور پر مقرر کیا گیا ہے۔ غذا آدمی کی ضروریات کی آخری حد ہے۔ روزہ میں غذا کا ترک بندہ کی طرف سے اس بات کا اظہار ہے کہ —— خدایا، دوسری چیزیں تو درکنار، میں پانی اور کھانا تک کو تیری خاطر چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پانی چھوڑ دے۔ روزہ کی اصل حقیقت غلط کاری سے بچنا ہے۔ جو شخص غلط کاری کو نہ چھوڑے اور وقتی طور پر صرف کھانا اور پینا چھوڑ دے اس نے گویا علامتی عمل کیا اور اصلی عمل کو چھوڑے رکھا۔ ایسی بے روح چیز کی خدا کو کیا ضرورت۔

ایک پکار

اسلامی مرکز کی ابتدا نومبر ۱۹۷۰ میں ہوئی۔ ۱۹۷۶ میں ماہنامہ الرسالہ جاری ہوا۔ اور مکتبہ الرسا
قائم ہوا۔ ان کا خاص مقصد اسلامی تعلیمات کو عصری اسلوب میں پیش کرنا ہے۔

اس مدت میں اللہ تعالیٰ نے اس مشن کو غیر معمولی کامیابی عطا فرمائی۔ الرسالہ آج سب سے زیادہ پ
جانے والا اسلامی رسالہ ہے۔ ہماری مطبوعات سارے عالم اسلامی میں پھیل چکی ہیں۔ ماہنامہ الرسا
انگریزی اڈیشن فروری ۱۹۸۴ سے برابر ہر ماہ نکل رہا ہے۔ مکتبہ الرسالہ کی متعدد کتابیں عربی اور دوسر
زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک کتاب (مذہب اور جدید چیلنج) مختلف عالمی یونیورسٹیوں میں داخل
نصاب ہے۔ دوسری کتاب (پیغمبر انقلاب) کو بین اقوامی مقابلہ سیرت میں اول انعام مل چکا ہے۔ حید
میں اسلامی مرکز کی ایک مکمل شاخ قائم ہو گئی ہے۔ وغیرہ

اب ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ الرسالہ کو عربی اور ہندی زبان میں بھی شائع کیا جائے۔ اسی کے ساتھ م
کی اہم علاقائی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی، تعلیمی و تربیتی ادارہ، مکمل اسلامی لائبریری،
پرنٹنگ پریس اور اس طرح کے دوسرے کام اب اسلامی مرکز کی فوری ضرورت بن چکے ہیں۔

اسلامی مرکز کے کام کو باقی رکھنا اور اس کو ترقی دینا کثیر وسائل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ م
آپ کے خصوصی مالی تعاون کی شدید ضرورت ہے۔

اسلامی مرکز کا مقصد دور جدید میں اسلام کا احیاء اور ملت اسلامی کی تعمیر ہے۔ یہ وقت کا اہم
کام ہے۔ ہم کو پوری امید ہے کہ آپ اس سلسلہ میں ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور اپنے حلقہ تع
میں بھی لوگوں کو اس کار خیر کی طرف متوجہ کریں گے۔

واضح ہو کہ اسلامی مرکز میں مختلف نوعیت کے شعبے ہیں۔ ان کے لئے عام عطیات و تعاون
علاوہ زکوٰۃ و صدقات کی مد کی رقمیں بھی بھیجی جا سکتی ہیں۔ رقم بھیجتے ہوئے براہ کرم اس کی مد کی صراحت

وحید الدین خاں۔ صدر اسلامی مر
سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی د

قدرتی مناظر

مسٹر یادو۔ کے موکھا پادھیائے لندن گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک معمر انگریز سے ہوئی جو پچاس سال پہلے برٹش راج کے زمانہ میں رائل ایرفورس کے افسر کی حیثیت سے ہندستان میں مقیم تھا۔ اس نے مسٹر موکھا پادھیائے سے بہت دل چسپی کے ساتھ ہندستان کے حالات پوچھے۔ اس نے بتایا کہ اس کا قیام زیادہ تر بمبئی اور پونہ میں تھا۔ اس نے عجیب محویت کے انداز میں بتایا کہ بمبئی اور پونہ کے درمیان ٹرین کا سفر اس کو بہت پسند تھا۔ یہ پورا سفر دریاؤں، جنگلوں اور قدرت کے مناظر کے درمیان ہوتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں دوبارہ ہندستان جانا چاہتا ہوں تاکہ ان مناظر کو دیکھ کر خوشی حاصل کروں۔

مزید سوالات کے درمیان مسٹر موکھا پادھیائے نے مذکورہ انگریز کو بتایا کہ اب پونہ پہلے جیسا پونہ نہیں ہے۔ اب وہ پونے کہا جاتا ہے۔ اس کی آبادی دس گنا بڑھ گئی ہے۔ نئی نئی سڑکیں اور روشنیوں کے انتظام نے اس علاقہ میں قدرتی مناظر سے زیادہ مشینی مناظر کا ماحول پیدا کر دیا ہے یہ سن کر اچانک اس انگریز کا سارا شوق ختم ہو گیا۔ اس نے کہا :

No. I don't think I will go to India
My India probably does not exist.

نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ مجھے انڈیا جانا چاہئے۔ میرا انڈیا اب غالباً موجود نہیں (ٹائمس آف انڈیا ۲ فروری ۱۹۸۴)

مشینی مناظر دیکھنے سے "انسان" یاد آتا ہے اور قدرتی مناظر کو دیکھنے سے "خدا" یاد آتا ہے۔ مشینی مناظر میں انسان کی کاریگری کا دھیان آتا ہے اور قدرتی مناظر میں خدا کی کاریگری کا۔ مشینی مناظر انسان کو انسان سے ملاتے ہیں اور قدرتی مناظر انسان کو خدا سے ملاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشینی مناظر میں انسان کو وہ سکون نہیں ملتا جو قدرتی مناظر میں اس کو ملتا ہے ــــــ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

قدرتی مناظر کیا ہیں۔ وہ خدا کی صفات کا آئینہ ہیں۔ آسمان کی وسعت خدا کی بے پایاں ہستی کا تعارف ہے۔ سورج خدا کے سراپا نور ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ دریا کی روانی خدا کے جوش رحمت کی گویا ایک تمثیل ہے۔ پھولوں کی مہک اور خوبصورتی خدا کے حسن کی ایک دور کی جھلک ہے۔ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو اس کو قدرتی مناظر میں خدا کا جلوہ دکھائی دے گا۔

کامیاب سفر

۲۰ جنوری ۱۹۸۴ کی صبح کو تھائی ایرویز کا جہاز (Boeing 747) کراچی سے بمبئی کی طرف اڑا۔ یہ ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑان کر رہا تھا۔ عین اسی وقت انڈین ایر لائنز کا ایک جہاز بمبئی سے دہلی کی طرف جانے والا تھا۔ انڈین ایر لائنز کے جہاز کو بھی ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑنا تھا۔ اس کی روانگی ہونے ہی والی تھی کہ عین وقت پر معلوم ہوا کہ تھائی ایرویز کا جہاز اسی سمت میں آ رہا ہے۔ اگر انڈین ایر لائنز کا پائلٹ اپنے پروگرام کے مطابق اپنا جہاز اڑاتا تو منڈسور (مدھیہ پردیش) کے اوپر دونوں کا ٹکراؤ ہو جاتا۔ تھائی ایرویز کا جہاز بھی اپنے تمام مسافروں کے ساتھ برباد ہو جاتا اور انڈین ایر لائنز کا جہاز بھی (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ جنوری ۱۹۸۴)

ایر ٹرافک کنٹرول کو بالکل آخری وقت میں اس کی اطلاع مل سکی۔ اس نے فوراً انڈین ایر لائنز کے کیپٹن سے کہا کہ تم یا تو تھائی ایرویز کے جہاز سے نیچے (۲۵ ہزار فٹ) کی بلندی پر اڑان کرو یا اگر تم ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنا جہاز اڑانا چاہتے ہو تو پچیس منٹ دیر سے اڑان شروع کرو۔ انڈین ایر لائنز کے کیپٹن نے دوسری تجویز کو پسند کیا اور پچیس منٹ کی دیر کے بعد اپنا جہاز اڑایا۔ اس طرح دو جہاز بین فضائی ٹکراؤ (Mid-air collision) سے بچ گئے۔ انڈین ایر لائنز کا جہاز اپنے ابتدائی پروگرام کے مطابق منڈسور کے اوپر سے صبح سات بجے گذرتا، مگر پروگرام کی تبدیلی کے بعد وہ منڈسور کے اوپر سے صبح ساڑھے سات بجے گذرا۔

انڈین ایر لائنز کے ایک افسر نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک معجزہ تھا جس نے دونوں جہازوں کے مسافروں کو بچا لیا:

It was a miracle which saved passengers on both aircrafts.

یہی وسیع تر اعتبار سے زندگی کا معاملہ بھی ہے۔ اگر آپ "۲۹ ہزار فٹ" کی بلندی پر اڑنا چاہتے ہیں تو اس کو نہ بھولئے کہ یہاں دوسرے لوگ بھی ہیں اور وہ بھی ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑان کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ کے لئے دو ہی صورت ہے۔ یا تو دوسروں کا لحاظ کئے بغیر اپنی اڑان شروع کر دیں اور پھر تباہ ہو کر جھوٹی قربانی کی مثال قائم کریں۔ یا پھر یہ "معجزہ" دکھائیں کہ دوسرے سے نیچے اڑ کر آگے نکل جائیں یا "آدھ گھنٹہ" کی تاخیر سے اپنی اڑان شروع کریں۔ دونوں صورتوں میں آپ کامیاب رہیں گے اور حفاظت کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچیں گے۔

پچپن سال کے بعد

طبیہ کالج (قرول باغ، دہلی) نے ایک بار رات کی کلاسیں شروع کی تھیں تاکہ ملازمت پیشہ لوگ اس میں داخلہ لے کر طبی کورس کریں اور اپنے خالی اوقات میں پریکٹس کر سکیں۔ انھیں داخلہ لینے والوں میں سے ایک مسٹر رمیش دتہ تھے۔ وہ اکاونٹ آفس میں کام کرتے تھے اور اسی کے ساتھ رات کے کلاس میں شریک ہو کر بی آئی ایم ایس (B.I.M.S.) کا کورس کر رہے تھے۔ ۱۹۵۵ کا واقعہ ہے، ان کے استاد ڈاکٹر انوار احمد صاحب نے ایک بار ان سے پوچھا، دتہ جی، آپ تو ایک اچھی ملازمت میں ہیں۔ پھر آپ بی آئی ایم ایس کا کورس کیوں کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا:

"نوکری پچپن سال کی ہے اور زندگی سو سال کی۔ پھر نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد کیا کروں گا"

کہنے والے نے زندگی کی جو تقسیم موجودہ دنیا کے اعتبار سے کی ہے وہی تقسیم وسیع تر معنوں میں دنیا اور آخرت کے اعتبار سے ہے۔ دنیا میں انسان کی عمر کو اگر پچپن سال سمجھیں اور آخرت کی طویل تر زندگی کو علامتی طور پر "سو سال" سمجھیں تو معلوم ہوگا کہ ہر آدمی وسیع تر معنوں میں اسی سوال سے دوچار ہے۔ تاہم ہر آدمی کو صرف اپنے "۵۵" سال کی فکر ہے، کسی کو اپنے "سو سال" کے بارہ میں کوئی پریشانی نہیں۔

دنیا کی "۵۵ سالہ" زندگی کے لئے ہر آدمی سرگرم ہے۔ ہر آدمی اپنی ساری طاقت خرچ کر کے اس کی تعمیر میں لگا ہوا ہے۔ اس معاملہ میں ہر آدمی اتنا زیادہ سنجیدہ ہے کہ وہ فوراً اس کے نشیب و فراز کو سمجھ لیتا ہے۔ وہ اس کے کسی موقع کو کھونا کسی حال میں گوارا نہیں کرتا۔

دوسری طرف "سو سالہ" زندگی جو موت کے بعد شروع ہوتی ہے، اس کی کسی کو پروا نہیں۔ اس معاملہ میں آدمی نہ کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس کرتا اور نہ کچھ کرنے کی۔ یہاں کوئی یہ کہنے والا نہیں ملتا کہ — موت سے پہلے کی زندگی تو صرف "۵۵ سال" کی ہے اور موت کے بعد کی زندگی "سو سال" کی۔ پھر اگر ابھی سے میں نے تیاری نہ کی تو موت کے بعد کی "سو سالہ زندگی" میں میں کیا کروں گا۔ کیسا عجیب ہے وہ انسان جو تھوڑی زندگی کے لئے تو بہت زیادہ کر رہا ہے مگر زیادہ زندگی کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار نہیں (۲۶ جنوری ۱۹۸۴)

غالباً یہی صورت حال ہے جس کی طرف حدیث میں الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے — میں نے جہنم سے زیادہ سخت چیز نہیں دیکھی جس سے بھاگنے والا سو گیا ہو۔ اور میں نے جنت سے زیادہ قیمتی چیز نہیں دیکھی جس کا چاہنے والا سو گیا ہو۔

اتحاد کا راز

چڑیا گھر میں سیکڑوں لوگ موجود تھے۔ کوئی کھلے سبزہ پر بیٹھا ہوا کھا پی رہا تھا۔ کوئی طرح طرح کے جانوروں کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی اِدھر اُدھر بے فکری کے ساتھ گھوم رہا تھا۔

اتنے میں دھاڑنے کی آواز آئی اور اسی کے ساتھ یہ خبر اڑی کہ ایک شیر اپنے کٹہرے سے باہر آگیا ہے۔ یہ سنتے ہی تمام لوگ بیرونی گیٹ کی طرف بھاگے۔ جو لوگ اب تک "مختلف" نظر آرہے تھے، وہ سب کے سب "متحد" ہو کر ایک رخ پر چل پڑے۔ ہر قسم کی مختلف سرگرمیاں ختم ہو کر ایک نقطہ پر مرتکز ہوگئیں۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح شدت خوف رایوں کے تعدد کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسے وقت میں ہر آدمی اسی ایک چیز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو سب سے زیادہ قابل توجہ ہے۔ ہر آدمی اسی ایک چیز سے ڈرنے لگتا ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے کے قابل ہے۔ ہر آدمی کا خیال اسی ایک چیز کی طرف لگ جاتا ہے جس کی طرف دوسرے آدمی کا خیال لگا ہوا تھا۔

آخری قابل لحاظ چیز ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ آخری چیزیں تعدد نہیں۔ لوگوں کے درمیان اختلاف اس لئے ہوتا ہے کہ لوگ آخری چیز پر نہیں ہوتے۔ آدمی کے اوپر جب شدید ترین اندیشہ کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو دوسرے اور تیسرے درجہ کی تمام چیزیں اپنے آپ حذف ہو جاتی ہیں۔ اس وقت لازماً ایسا ہوتا ہے کہ تمام لوگوں کی توجہ "آخری اہم ترین چیز" کی طرف لگ جاتی ہے۔ اس سے کم درجہ کی تمام چیزیں خود بخود حذف ہو جاتی ہیں۔ اور جہاں آخر سے پہلے کی تمام چیزیں حذف ہو جائیں وہاں اتحاد کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

اختلاف اس صورت حال کا نام ہے کہ لوگوں کی نظریں آخری اہم ترین چیز پر لگی ہوئی نہ ہوں۔ اس لئے اتحاد کی واحد کامیاب تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کی نظریں کم اہم یا غیر اہم چیزوں سے ہٹا دی جائیں۔ کسی ملک پر دشمن کے حملہ کے وقت یہی چیز ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسے موقع پر پوری قوم متحد ہو جاتی ہے۔ دشمن کے خطرہ سے زیادہ بڑا خطرہ خدا کی پکڑ کا خطرہ ہے۔ اس لئے جس قوم میں خدا کا ڈر پیدا ہو جائے وہ لازمی طور پر دنیا کی سب سے زیادہ متحد قوم بن جائے گی۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ دشمن کے خطرہ کے وقت جانور بھی متحد ہو جاتے ہیں۔ خطرناک سیلاب میں کتا اور بلی یا نیولا اور سانپ دونوں ایک جگہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ مگر یہ اتحاد کی حیوانی سطح ہے۔ انسانی اتحاد وہ ہے جو خدا کے خوف اور آخرت کے فکر سے پیدا ہو۔ یہ دوسرا اتحاد زیادہ اعلیٰ ہے اور زیادہ پائدار بھی۔

دعوتی ذہن

خلیفہ عمر بن عبد العزیز (۱۰۱ - ۹۹ ھ) کی سلطنت کے حدود سندھ اور بخارا سے لے کر مراکش اور اندلس تک بلکہ فرانس تک پہنچے ہوئے تھے۔ مگر آپ کے اندر ذرا بھی عیش اور گھمنڈ نہ تھا۔ آپ نے خلافت کا کام اتنے عادلانہ انداز سے چلایا کہ مفتوحہ ممالک میں بے شمار لوگ مسلمان ہو گئے۔

آپ کے زمانہ میں جراح بن عبد اللہ خراسان کا گورنر تھا۔ اس کے متعلق آپ کو خبر پہنچی کہ ذمیوں میں سے جو لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں ان سے بھی وہ جزیہ وصول کرتا ہے۔ آپ نے یہ شکایت سن کر جراح بن عبد اللہ کے پاس حکم بھیجا کہ "جو شخص نماز پڑھتا ہو اس سے جزیہ نہ لو"

لوگوں کو جب اس کی خبر معلوم ہوئی تو لوگ تیزی سے اسلام میں داخل ہونے لگے۔ جراح بن عبد اللہ کو خیال ہوا کہ یہ لوگ دل سے اسلام قبول نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ صرف جزیہ سے بچنے کے لئے اسلام کا کلمہ پڑھ لیتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ختنہ کے ذریعہ لوگوں کا امتحان لینا شروع کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ جس شخص نے ختنہ کرایا ہو صرف وہی مسلمان سمجھا جائے گا۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے مذکورہ گورنر کو دوبارہ لکھا:

اللہ نے اپنے پیغمبر کو داعی بنا کر بھیجا ہے، خاتن بنا کر نہیں بھیجا۔

اسی طرح ایک گورنر نے آپ سے یہ شکایت کی کہ مفتوحہ ممالک میں لوگ کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ چونکہ اسلام کے بعد جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لئے لوگوں کے کثرت اسلام سے مملکت کا مالیہ بہت کم ہو گیا ہے۔ یہی حالت رہی تو خزانہ خالی ہو جائے گا۔ آپ نے گورنر کو لکھا کہ تمہاری خرابی ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے، وہ ٹیکس وصول کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ (ویحک ان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم بُعث ہادیا و لم یُبعث جابیا)

آدمی کا رویہ ہمیشہ اس لحاظ سے بنتا ہے کہ اس کے سامنے جو مقصد ہے وہ کیا ہے۔ ایک مسلم حکمران کا مقصد اگر طاقت اور دولت ہو تو وہ اسلامی دعوت کے کام کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ وہ ہر چیز کو اس لحاظ سے دیکھے گا کہ اس سے طاقت اور قوت بڑھانے میں کیا مدد مل سکتی ہے۔

اس کے برعکس حکمراں اگر دعوتی ذہن رکھتا ہو تو وہ دوسرے مفادات کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ وہ ہر دوسرے نقصان کو گوارا کر لے گا مگر دعوت میں کسی بھی قسم کے نقصان کو گوارا نہیں کرے گا۔

ہر معاملہ خدا کا معاملہ

ابو مسعود انصاری مدینہ کے ایک مسلمان تھے۔ ایک روز وہ کسی بات پر اپنے غلام سے بگڑ گئے اور اس کو ڈنڈے سے مارنے لگے۔ عین اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گذر ہوا۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا کہ اے ابو مسعود، جان لو کہ خدا تمھارے اوپر اس سے زیادہ قابو رکھتا ہے جتنا تم اس غلام پر قابو رکھتے ہو (اعلم ابا مسعود لله اقدر علیك منك علیه) یہ سنتے ہی ابو مسعود کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر گر گیا۔ اور انھوں نے کہا کہ آج سے یہ غلام آزاد ہے۔

ابو مسعود پہلے معاملہ کو ایک انسان اور دوسرے انسان کا معاملہ سمجھتے تھے۔ اس وقت انھیں نظر آتا تھا کہ وہ مالک ہیں اور دوسرا آدمی غلام۔ اپنی ذات انھیں اونچی سطح پر نظر آئی اور غلام کی ذات نیچی سطح پر۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تنبیہ کے بعد انھیں نظر آیا کہ سارا معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ اب انھیں اپنا وجود بھی وہیں پڑا ہوا نظر آیا جہاں وہ اپنے غلام کو بٹھائے ہوئے تھے۔ دونوں یکساں طور پر خدا کے آگے عاجز نظر آئے۔ یہی وجہ تھی کہ اٹھا ہوا ڈنڈا ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔

حقیقت یہ ہے کہ سماجی زندگی کی تمام خرابیاں اسی لئے پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی معاملہ کو انسان کی نسبت سے دیکھتا ہے نہ کہ خدا کی نسبت سے۔ ایک آدمی کو دولت مل جائے تو وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں اپنے کو اونچا سمجھنے لگتا ہے جن کے پاس دولت نہیں۔ حالانکہ اگر وہ خدا کی نسبت سے دیکھے تو اس کو نظر آئے گا کہ وہ بھی اتنا ہی مفلس ہے جتنا کوئی دوسرا شخص۔ کسی آدمی کو بڑا عہدہ مل جائے تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں تمام لوگوں سے بڑا ہوں۔ حالانکہ اگر وہ خدا کی نسبت سے دیکھے تو وہ پائے گا کہ وہ بھی اتنا ہی حقیر ہے جتنا کہ دوسرے لوگ۔ ایک آدمی تیز ہے اور دوسرے کے خلاف زبان چلا رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنے مقابلہ میں وہ اس کو کمتر سمجھ رہا ہے۔ اگر وہ خدا کی نسبت سے دیکھے تو اس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جائے کیوں کہ خدا کی نسبت سے وہ بھی اتنا ہی بےزور ہے جتنا کہ دوسرا آدمی۔

لوگ اگر معاملات کو ایک انسان اور دوسرے انسان کا معاملہ نہ سمجھیں بلکہ ایسا معاملہ سمجھیں جو بالآخر خدا کے سامنے پیش ہونے والا ہے تو ہر قسم کی برائی کی جڑ کٹ جائے۔ کسی کے لئے گھمنڈ، حسد، جاہ پسندی اور بےانصافی کا موقع باقی نہ رہے۔

اس کے بعد ہر آدمی کے ہاتھ سے اس کا ڈنڈا اسی طرح چھوٹ کر گر پڑے جس طرح حضرت ابو مسعود انصاری کے ہاتھ سے ان کا ڈنڈا چھوٹ کر گر پڑا تھا۔

اطاعت

غزوۂ موتہ ہجرت کے آٹھویں سال پیش آیا۔ محمد بن جریر الطبری (۳۱۰-۲۲۴ھ) نے اپنی کتاب تاریخ الرسل والملوک میں غزوۂ موتہ کے ذیل میں لکھا ہے:

حدثنا ابو قتادۃ فارس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بعث رسول اللہ جیش الامراء فقال: علیکم زید بن حارثۃ فان اصیب فجعفر بن ابی طالب، فان اصیب جعفر فعبد اللہ بن رواحۃ۔ فوثب جعفر فقال یا رسول اللہ ما کنت اذھب ان تستعمل زیداً علی۔ قال امض، فانک لا تدری ای ذالک خیر۔ فانطلقوا۔

حضرت ابو قتادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موتہ کے لئے لشکر بھیجا۔ آپ نے کہا کہ زید بن حارثہ تمہارے سردار ہیں وہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب سردار ہوں گے۔ اور اگر جعفر شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ سردار ہوں گے۔ یہ سُن کر جعفر جھپٹ کر اٹھے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، میں ایسے لشکر میں نہیں جاؤں گا جس میں آپ نے زید کو میرے اوپر سردار بنایا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ، کیوں کہ تم نہیں جانتے کہ اس میں سے کیا زیادہ بہتر ہے۔ پھر لوگ روانہ ہوئے

مومن فرشتہ نہیں ہوتا۔ مومن بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کے باوجود دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ غیر مومن کے دل میں کوئی غلط خیال یا انحراف کی بات آجائے تو اس کے بعد وہ رکنا نہیں جانتا۔ وہ اپنے اسی خیال پر چل پڑتا ہے، خواہ اس کی غلطی اس پر کتنی ہی زیادہ واضح کی جائے۔ وہ دلیل کی پیروی نہیں کرتا، بلکہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔

اس کے برعکس سچے مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اس کو اس کی غلطی پر ٹوکا جائے اور اس کے انحراف پر اسے متنبہ کیا جائے تو وہ فوراً رک جاتا ہے۔ وہ اپنے خیال کو اپنا عمل نہیں بناتا۔ وہ اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا۔ وہ ہر وقت اپنی اصلاح کے لئے تیار رہتا ہے، خواہ اصلاح کی خاطر اس کو اپنی خواہش کے خلاف چلنا پڑے۔

مومن حق کا پابند ہوتا ہے اور غیر مومن صرف اپنے نفس کا پابند۔

قرآن جامع العلوم ہے

کسی شاعر کا شعر ہے:

جمیع العلم فی القرآن لکن　　تقاصر عنہ افہام الرجال

قرآن میں سارا علم موجود ہے۔ مگر لوگوں کی فہم اس کو پانے سے قاصر ہو رہی ہے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری اس عربی شعر کے متعلق فرماتے تھے کہ یہ کسی غبی کا شعر ہے۔ اور زیادہ جلال آنے پر اس شعر کے کہنے والے کو غبی الاغبیا ر کہتے تھے (حیات انور) مگر قرآن میں خود اس کتاب کو کتاب مفصل (الانعام ۱۱۴) کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ قرآن میں ہر چیز کی تفصیل (یوسف ۱۱۱) موجود ہے۔ ان حالات میں شاعر نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے کہ، قرآن کی بات کو اپنے لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ قرآن میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ مطلق اور عام ہیں۔ مگر تمام محقق علماء اس مطلق کو مقید کرتے ہیں۔ مذکورہ شعر کو بھی اسی معنی میں سمجھنا چاہئے۔ ورنہ قرآن میں تو ساری شریعت بھی موجود نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں سارا علم موجود ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن بجلی یا پیٹرولیم انجینیرنگ کی ٹکسٹ بک ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ علم انسانی کے سرے قرآن میں موجود ہیں۔ وہ تمام اصولی اور اساسی باتیں قرآن میں موجود ہیں جو انسان کے لئے اس کی زندگی کی تعمیر کی بنیاد بن سکتی ہیں۔

قرآن کا اصل اور براہ راست موضوع توحید اور آخرت ہے۔ وہ انسان کے سامنے خالق کا تعارف کراتا ہے اور آنے والی ابدی زندگی کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ تاہم اصل موضوع کی تفصیل کے دوران ضمنی طور پر وہ تمام باتیں بھی مذکور ہو گئی ہیں جو حیات دنیا کی تعمیر کے لئے اساسی اہمیت رکھتی ہیں۔

قرآن میں حضرت موسیٰ کا قصہ نہایت تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ اس قصہ سے اصلاً جو سبق دینا ہے وہ تمام تر توحید اور رسالت اور آخرت کے مسائل ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ اس میں بہت سے ایسے اشارے بھی شامل ہو گئے ہیں جن کا تعلق حیات دنیا کی تعمیر سے ہے۔ مثلاً مدین کے سفر کے دوران حضرت شعیب کی لڑکی کا اپنے والد سے یہ کہنا کہ ان خیر من استاجرت القوی الامین (القصص ۲۶)

یہاں نہایت مختصر لفظوں میں وہ دو اہم ترین خصوصیت بتا دی گئی ہے جو آجر کو اجیر کے تقرر کے وقت سامنے رکھنا چاہئے ایک یہ کہ وہ محنتی ہو اور دوسرے یہ کہ وہ دیانت دار ہو۔ یہ دو الفاظ اتنے جامع ہیں کہ ان پر جو اضافہ بھی کیا جائے گا وہ انھیں دونوں میں سے کسی کے تحت آ جائے گا۔

حق کی دعوت

حضرت موسیٰ کو خدا نے فرعون کے سامنے دعوت حق کے لیے مقرر کیا تو بشری تقاضے کے تحت ان کے اندر کچھ گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ خدا نے فرمایا کہ تم جاؤ، میں تمھارے ساتھ ہوں اور سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں (لا تخافا اننی معکما اسمع و اری) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں ارشاد ہوا ہے کہ تم نے کنکری نہیں پھینکی بلکہ ہم نے پھینکی (وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔ الانفال ۱۷)

اس طرح کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کے داعی کو خدا کی بے حد خصوصی مدد حاصل ہوتی ہے۔ دعوت حق کا کام اتنا مشکل کام ہے کہ کوئی انسان اس کو انجام نہیں دے سکتا۔ وہ اتنا نازک کام ہے کہ کوئی اس کی نزاکتوں کو نبھا نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف خدا ہی کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس کو انجام دے اور یقیناً خدا ہی اس کو اپنی طاقت سے انجام دیتا ہے۔

خدا ہر قسم کے کامل اختیارات کا مالک ہے۔ تاہم یہاں خدا کی ایک "مجبوری" ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان کے درمیان دعوت حق کا کام انسان ہی کے ذریعہ انجام پائے۔ تاکہ غیب کا پردہ باقی رہے۔ ایمان دراصل نام ہے ــــــ انکار کا موقع ہوتے ہوئے اقرار کرنے کا اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب اس کام کو بشری سطح پر انجام دیا گیا ہو۔

یہاں خدا اور بندے کے درمیان ایک خاموش عہد ہے۔ خدا اس بندے کے ساتھ ہے جو خدا کے اس کام کے لئے اٹھے۔ خدا اس بات کا ضامن ہے کہ وہ اس کام کی انجام دہی کے لئے اپنے بندے کی ہر ممکن مدد کرے۔

وہ اس کی نادانیوں کو سنبھالے۔ وہ اس کی غلطیوں کو معاف کر دے۔ وہ اس کے ناموافق حالات کو موافق حالات میں تبدیل کر دے۔ وہ اس کو ہر قسم کے ضروری مواقع فراہم کرتا رہے۔ وہ کسی حال میں اس کو اکیلا نہ چھوڑے۔ شرط صرف یہ ہے کہ بندہ ہر حال میں حق پر قائم رہے، وہ ذرا بھی دائیں یا بائیں نہ جھکے۔

دعوت حق کا کام مکمل طور پر ایک خدائی کام ہے۔ یہاں کرنا سب کچھ خدا کو ہے۔ بندے کو تو صرف کھڑا رہنا ہے۔

حقیقت سے بے خبری

امتحان ہال میں ہر طالب علم کو یکساں طور پر داخل ہونے اور بیٹھنے کے مواقع دئے جاتے ہیں مگر سند کی تقسیم کے وقت سند پانے کی خوشی ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔ یہ خوشی صرف اس طالب علم کا حصہ ہوتی ہے جو محنتی ہو۔ جس نے اپنے سال بھر کے وقت کو ضائع کرنے کے بجائے استعمال کیا ہو۔ ایسا طالب علم کامیابی کے ساتھ تمام سوالات کو حل کرتا ہے اور امتحان میں پاس ہو کر سند کا مستحق بنتا ہے۔

یہی حال وسیع تر معنوں میں زندگی کا بھی ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا بے شمار نعمتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور ہر آدمی اس سے متمتع ہو رہا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں ہر چیز جو آدمی کو مل رہی ہے وہ امتحان کی قیمت میں مل رہی ہے۔ اس کے برعکس آخرت میں ہر چیز آدمی کو عمل کی قیمت میں ملے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں تو ہر آدمی خدا کی نعمتوں میں سے کچھ نہ کچھ اپنے لئے پالیتا ہے۔ مگر آخرت میں صرف وہی لوگ خدا کی نعمتوں کو پائیں گے جو اپنے عمل سے اس کا استحقاق ثابت کریں۔ باقی تمام لوگ اس سے محروم کر کے چھوڑ دئے جائیں گے۔

انسان زمین کے اوپر کس طرح اکڑ کر چلتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ زمین پر چلنا اس کا حق نہیں یہ صرف خدا کی طرف سے امتحان کی مہلت ہے۔ انسان یہاں دھوپ اور ہوا اور پانی اور غذا اور بے شمار دوسری چیزوں کو استعمال کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب چیزیں اس کے لئے ہیں۔ حالانکہ یہ صرف وقفۂ امتحان تک اس کے لئے ہیں۔ اس کے بعد وہ صرف اس شخص کے لئے ہوں گی جس نے ان کا حق ادا کیا ہو۔ باقی تمام لوگوں کے حصہ میں ابدی محرومی کے سوا اور کچھ نہیں آئے گا۔ انسان اختیار و اقتدار پا کر گھمنڈ کرنے لگتا ہے۔ اس کو خبر نہیں کہ یہ اختیار و اقتدار خدا کی امانت ہے۔ اور اس کو پا کر گھمنڈ کرنا خدا کی امانت میں خیانت کرنا ہے۔ جس کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ اس کو دائمی طور پر ہر قسم کے عزت اور اقتدار سے محروم کر دیا جائے۔

یہ ایک بے حد نازک صورت حال ہے۔ ہر آدمی ایک انتہائی بھیانک انجام کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ اس دنیا کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ لوگوں کو اس صورت حال سے باخبر کیا جائے۔

موجودہ دنیا کی چیزوں کو جو لوگ ذاتی چیز سمجھ کر اس میں بے روک ٹوک تصرف کر رہے ہیں ان کا حال آخرت میں وہی ہوگا جو کسی بینک کے اس اکاؤنٹنٹ کا ہوتا ہے جو بینک کی الماری میں بھرے ہوئے نوٹوں کو اپنی ذاتی چیز سمجھ لے۔

عقیدۂ آخرت

جب بارش ہوتی ہے تو اس کا پانی دریاؤں میں بہہ نکلتا ہے۔ یہ پانی اگر حد کے اندر ہو تو اس سے انسان کو مختلف قسم کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر حد سے بڑھ جائے تو سیلاب آجاتا ہے اور نقصانات کا باعث ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے دریاؤں پر بند بنائے جاتے ہیں۔ بند (Dam) کا مقصد یہ ہے کہ دریا کے اندر پانی کے بہاؤ پر روک قائم کی جائے اور جب بھی پانی حد سے بڑھتا ہوا نظر آئے تو اس کے رخ کو موڑ کر دوسری طرف کر دیا جائے تاکہ وہ دریا میں بہنے کے بجائے علیٰحدہ بنے ہوئے عظیم گڑھے میں پہنچ جائے جس کو عام طور پر ذخیرۂ آب (Reservoir) کہا جاتا ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسان کا بھی ہے۔ مختلف انسان جب مل جل کر رہتے ہیں تو بار بار شکایت کی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں تلخیاں ابھرتی ہیں۔ اگر اس شکایت اور تلخی کو بڑھنے دیا جائے تو اختلاف، باہمی عناد اور جنگ و مقابلہ کی نوبت آجاتی ہے۔ انسانی معاشرہ یا انسانی جماعت کا درست طور پر کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ان حالات میں انسان کے لئے بھی ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے جس کی طرف اس کے بڑھے ہوئے منفی جذبات کو موڑا جا سکے۔ خدا اور آخرت کا عقیدہ یہی کام کرتا ہے۔ وہ اجتماعیت کو نقصان پہنچانے والے جذبات کو انسان سے ہٹا کر خدا کی طرف موڑ دیتا ہے۔

حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں نے آپ کو باپ سے جدا کر دیا۔ اس کے بعد آپ کے دوسرے بھائی بن یامین کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ ان واقعات کے بعد قدرتی طور پر حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب کے اندر شدید جذبات پیدا ہوئے۔ آپ اپنے ان جذبات کا نشانہ اگر حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں کو بناتے تو زبردست انتشار اور اختلاف پیدا ہوتا۔ مگر آپ نے سارے جذبات کو خدا کی طرف موڑ دیا۔ آپ نے فرمایا انما اشکو ابثی وحزنی الی اللہ

یہ کسی انسانی معاشرہ کے لئے عقیدۂ آخرت کی بہت بڑی دین ہے۔ آخرت کا عقیدہ ہر آدمی کے پاس ایک Diversion pool رکھ دیتا ہے جس کی طرف وہ اپنے جذبات کے سیلاب کو پھیر سکے۔ اس کو نقصان ہو تو خدا سے حسن تلافی کی امید قائم کر لے۔ اس کو غصہ آئے تو خدا کی خاطر وہ اپنے غصہ کو پی جائے۔ اس کو کسی سے شکایت ہو تو اس کے معاملہ کو خدا کے حوالے کر دے۔

الفاظ ختم نہیں ہوئے

الرسالہ اپریل ۱۹۸۴ (آخری سفر) کے بارہ میں ہم کو کئی خطوط ملے ہیں جن میں شکایت کی گئی ہے کہ اس شمارہ میں "کچھ مضامین دوبارہ چھاپ دئے گئے ہیں" ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ آپ نے ابھی اس شمارہ کو نہیں پڑھا۔ اگر آپ واقعۃً اس کو پڑھتے تو آپ کے ہوش وحواس گم ہو جاتے۔ اس شمارہ میں زندگی کے جس انتہائی سنگین مسئلہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ اگر انسان کی سمجھ میں آجائے تو اس کے اوپر ایسی سراسیمگی طاری ہو کہ اس کو یہ یاد ہی نہ رہے کہ کون سا مضمون پہلی بار چھپا ہے اور کون سا مضمون دوسری بار۔ کون سی بات پہلے کہی جا چکی تھی اور کون سی بات دوبارہ کہی جارہی ہے۔

اگر آپ راستہ چل رہے ہوں اور اچانک کوئی شخص چیخ کر کہے "تمھارے آگے سانپ ہے سانپ" تو کیا اس وقت آپ کو یہ ہوش رہے گا کہ آپ اس شخص سے بحث کریں کہ تم نے سانپ کا لفظ دوبار کیوں کہا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگوں کی بے خبری ہے جس نے انھیں تکرار اور بے تکرار جیسی باتوں میں مشغول کر رکھا ہے۔ اگر انھیں خبر ہو جائے تو "تکرار" کا لفظ وہ اس طرح بھول جائیں جیسے کہ انھوں نے کبھی اس لفظ کو جانا ہی نہ تھا۔

ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ الرسالہ کے قارئین میں ایسے لوگ بھی ہیں جو واقعۃً اس کو پڑھتے ہیں۔ اور اس سے وہ اثر لیتے ہیں جو انھیں لینا چاہئے۔ چنانچہ اگر ہم کو ایک طرف مذکورہ بالا قسم کے خطوط ملے ہیں تو اسی کے ساتھ ہم کو دوسری قسم کے خطوط بھی موصول ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر الرسالہ کے ایک پرانے خریدار اپنے خط مورخہ ۲ اپریل ۱۹۸۴ میں آکولہ سے لکھتے ہیں :

"اپریل کا پرچہ (آخری سفر) ملا۔ پڑھ کر ہوش وحواس گم ہو گئے۔ واقعی اللہ نے آپ کے قلم میں جادو کا اثر رکھا ہے۔ رسالہ پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ رسالہ کی تعریف کے لئے تو میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ صرف دعا کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھ نصیب فرمائے اور آپ کے قلم میں دلوں کو پلٹ دینے کی تاثیر رکھ دیں۔"

آہ، لوگوں کو اپنے "آخری سفر" کی ہولناکی کا اندازہ نہیں۔ اگر انھیں اس کا اندازہ ہو تو ان کی زبان بند ہو جائے۔ حتی کہ ان کے پاس یہ کہنے کے لئے الفاظ نہ رہیں کہ ـــــــ تم نے چھپے ہوئے مضمون کو دوبارہ چھاپ دیا ہے۔

راستہ یہاں ہے

ہندستان کی آریہ سماج نے اپنی ۶۴ سالہ جشن جوبلی کے موقع پر مختلف مقامات پر ہفتہ منانے کا انتظام کیا تھا۔ اس سلسلے میں سیوہارہ (بجنور) میں نومبر ۱۹۵۹ میں ایک آل مذاہب کانفرنس ہوئی۔ اس موقع پر مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے اور مثبت انداز میں اپنے اپنے مذہب کا تعارف پیش کیا۔ راقم الحروف نے اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے ۲۹ نومبر ۱۹۵۹ کو اپنا یہ مقالہ پڑھا۔

۲. ہندستان میں ایک ادارہ ہے۔ اس کا صدر دفتر نئی دہلی میں ہے اور اس کا نام ہے مذاہب کی عالمی انجمن (World Fellowship of Religions) اس ادارہ کی تیسری سالانہ کانفرنس نئی دہلی میں ہوئی۔ اس میں ہندستان کے علاوہ بیرونی ملکوں سے مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس موقع پر ۲۷ فروری ۱۹۶۵ کے اجلاس میں میں نے مذہب اور سائنس کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

۳. آریہ سماج (الہ آباد) نے مئی ۱۹۶۰ میں اپنی گولڈن جوبلی منائی۔ اس سلسلے میں ۲۲ مئی کو الہ آباد میں سرو دھرم سمیلن کا ایک پروگرام ہوا۔ اس سمیلن میں مختلف مذاہب کے علماء نے شریک ہو کر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عنوان یہ تھا:

مانو وکاس کے لئے آپ کے ہی دھرم کو ماننا کیوں آوشیک ہے

راقم الحروف نے اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے اپنا مقالہ (منزل کی طرف) پیش کیا۔

غیر مسلموں کے اجتماع میں اسلام کے تعارف کا مجھے بار بار موقع ملا ہے اور ہر بار یہ تجربہ میرے لئے بہت خوش گوار ثابت ہوا ہے۔ بجنور کے مذکورہ بالا اجتماع میں صدارت کی کرسی پر مرادآباد کے ایک آریہ سماجی وکیل تھے۔ آخر میں جب انہوں نے اپنی صدارتی تقریر کی تو انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے صفائی کے ساتھ کہا کہ یہاں مختلف مذاہب کے نمائندوں نے اپنے اپنے مذہب کو پیش کیا ہے مگر "حقیقت یہ ہے کہ صرف مولانا صاحب تھے جنہوں نے موضوع کا حق ادا کیا" —— یہ اعتراف حقیقۃً کسی شخص کا نہیں بلکہ اسلام کا تھا۔ اسلام کو جب بھی میدان میں لایا جائے گا وہ دوسرے دینوں کے مقابلہ میں ہمیشہ برتر ثابت ہوگا۔

ایک تقابل

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۱۹۴۶ میں پہلی بار حیدرآباد کا سفر کیا تھا۔ اس سفر کی روداد کے ذیل میں موصوف لکھتے ہیں :

" میں چوں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تنخواہ نہیں لیتا تھا، میرے پاس واجبی کپڑے تھے۔ اس سفر میں کوئی شیروانی بھی ساتھ نہیں تھی۔ شیروانی قدیم ریاست حیدرآباد میں شریف انسان کی وردی تھی جس سے اس کے معیار کا اندازہ ہوتا تھا۔ بعض پروفیسر صاحبان سے ایک ہی دوبار ملنے سے اندازہ ہوگیا کہ شیروانی نہ ہونے کی وجہ سے وہ صحیح طریقہ پر ملتفت نہیں ہوئے۔ اس وقت ہمارے دارالعلوم کے ایک پشاوری طالب علم مولوی محمد شریف حیدرآباد میں تھے۔ میں نے اس غرض کے لئے ان کی شیروانی مستعار لی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ نگاہیں بدل گئیں اور لوگ کسی قدر احترام سے ملنے لگے ": کاروان زندگی صفحہ ۳۲۲

اب دوسرا واقعہ دیکھئے۔ حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانہ میں اسلامی فوج کے مختلف نمائندے ایرانی فوج کے سپہ سالار رستم کے دربار میں گئے۔ ان میں سے ایک ربعی بن عامر بھی تھے۔ وہ رستم کے دربار میں پہنچے تو ان کے جسم پر نہایت معمولی کپڑے تھے۔ تاہم ان کے غیر معمولی کلام کو سن کر رستم مرعوب ہوگیا۔ اس وقت رستم اور اس کے درباریوں سے جو گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا :

قال هل رأيتم قط اعز وارجح من كلام هذا الرجل۔ فقالوا معاذ الله ان تميل الى شئ من هذا وتدع دينك الى هذا الكلب۔ اما ترى الى ثيابه فقال ويلكم لا تنظروا الى الثياب وانظروا الى الراى والكلام والسيرة۔ ان العرب يستخفون بالثياب والمأكل ويصونون الاحساب

(حياة الصحابہ جلد اوّل صفحہ ۲۲۱)

رستم نے کہا کیا تم نے اس آدمی کے کلام سے زیادہ مضبوط اور اعلیٰ بات کبھی دیکھی ہے۔ درباریوں نے کہا، خدا کی پناہ کہ آپ اس کی کسی بات کی طرف مائل ہوں اور اپنے دین کو چھوڑ کر اس کتے کے ساتھ ہوجائیں۔ کیا آپ نے اس کے کپڑے کو نہیں دیکھا، رستم نے کہا، تمہارا برا ہو کپڑے کی طرف نہ دیکھو۔ بلکہ رائے اور بات اور کردار کی طرف دیکھو۔ عرب لوگ کپڑے اور کھانے کو ناقابل لحاظ سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ حسب نسب کی حفاظت کرتے ہیں۔

گویا ہمارے مسلم دانشوروں میں وہ حقیقت شناسی بھی نہ تھی جو قدیم زمانہ میں ایران کے پارسی لیڈروں کو حاصل تھی۔

وقت نہیں

ایک شخص کو بمبئی پہنچ کر ایک عرب ملازمت کے لئے انٹرویو دینا تھا۔ اس نے ٹرین میں اپنا رزرویشن کرایا اور مقررہ وقت پر گھر سے اسٹیشن کے لئے روانہ ہوا۔ دہلی کی پرہجوم سڑکوں سے گزرتے ہوئے کسی لڑکے نے اس کے رکشا کے اوپر کنکر پھینکا۔ اس کا دوست یہ دیکھ کر بگڑ گیا۔ اس نے چاہا کہ رکشا سے اتر کر لڑکے کو پکڑے اور اس کو اس کی گستاخی کا سبق دے۔ آدمی نے اپنے دوست کو پکڑ کر روک لیا۔ اس نے کہا ——
"ہمارے پاس اس کا وقت کہاں ہے" اور رکشا کو آگے بڑھا دیا۔

آدمی کا مطلب یہ تھا کہ مجھ کو فوراً اسٹیشن سے ٹرین پکڑنی ہے۔ اور پھر بمبئی پہنچ کر اہم انٹرویو دینا ہے۔ ایسے نازک لمحہ میں میرے پاس اتنا وقت کہاں کہ میں سڑک کے لڑکوں سے الجھوں۔ میں لڑکے کی شرارت پر صبر کروں گا تاکہ میرا بمبئی کا انٹرویو خراب نہ ہونے پائے۔

یہ سنجیدگی جو لوگوں کو دنیا کے بارہ میں ہوتی ہے وہی سنجیدگی مزید اضافہ کے ساتھ مومن کے اندر آخرت کے بارہ میں ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک صحابی کا واقعہ نقل کیا جاتا ہے:

عن انس رضی اللہ عنه قال انطلق رسول الله صلی الله علیه وسلم واصحابه حتی سبقوا المشرکین الی بدر وجاء المشرکون فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا یقدمن احد منکم الی شیء حتی اکون انا دونه فدنا المشرکون فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم قوموا الی جنة عرضها السموٰت والارض قال یقول عمیر بن الحمام الانصاری رضی الله عنه یا رسول الله جنة عرضها السموٰت والارض قال نعم قال بخ بخ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ما یحملك علی قولك بخ بخ قال لا والله یا رسول الله الا رجاء ان اکون من اهلها۔ قال فانك من اهلها۔ فاخرج تمرات

حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب روانہ ہوئے یہاں تک کہ وہ مشرکین سے پہلے بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ پھر مشرکین آئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم میں سے کوئی شخص کسی چیز کی طرف نہ بڑھے جب تک کہ میں نہ کہوں۔ جب مشرکین قریب آگئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ ایسی جنت کی طرف اٹھو جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمیر انصاری نے کہا کہ اے خدا کے رسول، ایسی جنت جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ آپ نے کہا ہاں۔ انھوں نے کہا واہ واہ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم نے واہ واہ کیوں کہا۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا

من قرنه فجعل يأكل منهن ثم قال لئن انا حييتُ حتى آكل تمراتي هذه انها لحياة طويلة فرمى بما كان معه من التمر ثم قاتلهم حتى قتل (رواه مسلم)

کے رسول، صرف اس امید میں کہ شاید میں بھی اہل جنت میں سے ہو جاؤں۔ آپ نے کہا کہ تم انھیں میں سے ہو۔ اب حضرت عمیر نے اپنی نیام سے کچھ کھجوریں نکالیں اور ان میں سے کھانے لگے۔ پھر انھوں نے کہا کہ اگر میں ان کھجوروں کے کھانے تک زندہ رہوں تو یہ بہت لمبی زندگی ہوگی۔ انھوں نے اپنی بقیہ کھجوریں پھینک دیں اور لڑائی میں کود پڑے، یہاں تک کہ قتل کر دیے گئے۔

جو شخص دنیا کے معاملہ میں سنجیدہ ہو اس کے پاس غیر متعلق چیزوں میں الجھنے کا وقت نہیں ہوتا اسی طرح جو شخص آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ ہو وہ ایسی چیزوں میں الجھنا کبھی پسند نہیں کرے گا جو اس کو آخرت کے نشانہ سے دور کر دے " دہلی " سے امرتسر جانے والا کلکتہ کے رخ پر سفر نہیں کرتا۔ اسی طرح آخرت کا مسافر کبھی ان سمتوں میں نہیں دوڑے گا جو اس کو آخرت کی منزل سے دور کر دینے والی ہو۔

سب سے زیادہ خطرناک

شیر کے ڈراؤنے چہرے کو دیکھ کر شکل سے کوئی آدمی یقین کرے گا کہ اس پھاڑ کھانے والے درندہ سے بھی زیادہ خطرناک دشمن کوئی انسان کے لئے ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کا سب سے زیادہ خطرناک دشمن شیر یا بھیڑیا نہیں۔ اس کے سب سے خطرناک دشمن وہ بیکٹیریا ہیں جو اتنے چھوٹے ہیں کہ خالی آنکھ سے نظر نہیں آتے۔ یہ بیکٹیریا اتنی تیزی سے اپنی نسل بڑھاتے ہیں کہ موافق حالات میں صرف دس گھنٹوں کے اندر ایک کیڑا اپنی نسل کے دس ہزار جان دار پیدا کر لیتا ہے۔ شیر یا بھیڑیا کہیں کسی ایک آدمی کو پھاڑتے ہوں گے مگر بیکٹیریا کی زد میں ہر آدمی ہر وقت ہوتا ہے۔

بیکٹیریا کی ہزاروں قسمیں ہیں۔ ہماری خوش قسمتی سے ان کی ۹۹ فی صد تعداد یا تو بے ضرر ہے یا ہمارے لئے مفید ہے۔ مگر ایک فی صد تعداد جو مضر ہے وہ بھی اتنی خطرناک ہے کہ آن کی آن میں آدمی کی جان لے سکتی ہے۔ میڈیکل سائنس کے مطابق تمام مہلک بیماریاں انھیں بیکٹیریا کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ بیکٹیریا انتہائی چھوٹے ہونے کی وجہ سے ایسے راستوں سے انسان کے اندر داخل ہو جاتے ہیں جن کا روکنا عام طور پر آدمی کے بس میں نہیں ہوتا۔

لوگ عام طور پر بڑے بڑے حادثات کو جانتے ہیں اور ان کو اپنی تباہی کا سبب سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے "چھوٹے چھوٹے دشمن" ہم کو اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں جتنا کہ بڑے بڑے دشمن۔ اور ہماری سب سے زیادہ خطرناک دشمن خود ہماری اپنی چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں ہیں جو ہم کو محسوس نہیں ہوتیں مگر وہ ہماری زندگی کو برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔

مثلاً ہر شخص کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے روزانہ اوقات کا ایک حصہ بغیر استعمال کئے ہوئے گذار دیتا ہے۔ ہر شخص روزانہ غیر ضروری مدوں میں کچھ نہ کچھ رقم خرچ کرتا رہتا ہے یہ وقت اور یہ سرمایہ ایک دن کے لحاظ سے تو بہت تھوڑا نظر آتا ہے ، چند گھنٹے یا چند روپیے۔ لیکن اگر پورے سال اور آدمی کی پوری عمر کو ملا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہر شخص اپنی تقریباً نصف عمر اور اپنی نصف کمائی کو بے نتیجہ چیزوں میں برباد کر رہا ہے۔ اس بربادی کو اگر پوری قوم پر پھیلایئے تو یہ نقصان اتنا زیادہ بڑھ جائے گا کہ اس کا شمار بھی ناممکن ہو۔

ایک سفر

۶-۷-۸ مارچ ۱۹۸۳ کو میرا قیام پونا میں تھا۔ اور اس کے بعد ۹-۱۰-۱۱ مارچ ۱۹۸۳ کو بمبئی میں۔ اس دوران میں دونوں مقام پر پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان خطابات کرنے کا موقع ملا۔ کثیر تعداد میں لوگوں سے ملاقات اور گفتگو ہوئی۔

پونا کی آبادی تقریباً ۱۶ لاکھ ہے، جس میں مسلمان، سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک لاکھ ہیں۔ مگر مسلمانوں کا اپنا خیال یہ ہے کہ ان کی آبادی کسی طرح تین لاکھ سے کم نہیں۔ یہی معاملہ بمبئی کا ہے، اور یہی معاملہ دوسرے مقامات کا بھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ یہ کوئی واقعی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی آبادی سرکاری اعداد و شمار میں اصل سے کم دکھائی جاتی ہے، یا ایسا ہے کہ مسلمان اپنی آبادی کا خیالی اضافہ کرکے اپنے احساس حق تلفی کو تسکین دینا چاہتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں آپ جس شہر میں بھی جائیں آپ وہاں دینی اور اسلامی سرگرمیاں ہوتی ہوئی دیکھیں گے۔ ایک آدمی اس کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام سرگرمیاں کھاتے پیتے لوگوں میں سے ایک طبقہ کے درمیان ہیں۔ تقریباً ہر شہر میں کم از کم پچاس فیصد مسلمان ایسے بستے ہیں جو غریبی اور جہالت کا شکار ہیں۔ ان کو بقدر ضرورت بھی زندگی کا سامان میسر نہیں۔ مگر یہ پورا طبقہ ہر جگہ اندھیرے میں پڑا ہوا ہے۔ بہت کم اصلاحی یا اسلامی سرگرمیاں ملیں گی جو اس دوسرے طبقہ کے درمیان جاری ہوں۔

دوسرا مشاہدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شہر موجودہ زمانہ میں دو شہر کا نام ہے۔ ایک قدیم اور دوسرا جدید۔ قدیم شہر میں تنگ سڑکیں اور گھنی آبادیاں ہیں۔ اس کے باشندے زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو غریب اور جاہل ہیں۔ دوسرا جدید شہر۔ یہاں کشادہ سڑکیں، پارک اور کھلے مکانات ہیں۔ یہاں کے رہنے والے وہ لوگ ہیں جو تعلیم یافتہ اور خوش حال ہیں۔ میں نے تقریباً ہر جگہ یہ پایا کہ ہر قسم کا فساد ہمیشہ قدیم شہر میں ہوتا ہے۔ جدید شہر والے حصہ میں کبھی کوئی فساد نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ "فساد" کے مسئلہ کا سب سے زیادہ یقینی حل مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا ہے، جب کہ یہی وہ میدان ہے جہاں ملت کے مجاہدین میں سے کوئی بھی سرگرم عمل نہیں۔

موجودہ سفر میں اور دوسرے سفروں میں مجھے تجربہ ہوا کہ اس وقت قوم کے سنجیدہ طبقہ میں سب سے زیادہ جس چیز کی طلب ہے وہ اتحاد ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ ایسی باتیں کہی جائیں جو اتفاقی ہوں۔ اختلافی باتیں سرے سے ذکر ہی نہ کی جائیں۔ مگر ہر آدمی صرف دوسروں کو متحد کرنا چاہتا ہے نہ کہ اپنے آپ کو۔

پونہ کے سفر کے بعد وہاں کا ایک خط مورخہ ۴ جنوری ۱۹۸۴ موصول ہوا۔ یہ خط یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

عالی جناب مولانا صاحب۔ آپ کو دوبارہ پونہ کا سفر کرنا چاہئے۔ کیوں کہ آپ کے پونہ آنے سے پہلے یہاں الرسالہ صرف ۲۰ کی تعداد میں آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اب الرسالہ ۱۰۰ کی تعداد میں پونہ آرہا ہے۔ دوسری کتابوں کی مانگ بھی کافی ہے۔ چنانچہ اس دوران میں کئی بار میں زیادہ زیادہ کتابیں مکتبہ الرسالہ سے منگا چکا ہوں۔ نیز یہ کہ آپ کی آواز کی ٹیپ کی ضرورت ہے۔ اگر آپ آجائیں تو میں آپ کی تقریروں کے کیسٹ تیار کرلوں گا اور لوگوں کو ایک جگہ جمع کرکے ان کو سنانے کا بندوبست کروں گا۔

پونہ کے مقامی اخبار الانصار میں "پیغمبر انقلاب" کے انعام کی خبر چھپی تھی۔ اسی کے ساتھ آپ کا مضمون " یہ اختلاف کیوں " بھی شائع کرایا تھا۔ اس کو الرسالہ سے نقل کرنے میں غلطی ہوسکتی تھی۔ اس لئے میں نے یہ کیا کہ اس کی ایک فوٹو کاپی نکلوائی اور وہی اخبار کے کاتب کو دے دیا۔

آپ کے جانے کے بعد پونہ میں ہفتہ وار اجتماع برابر ہو رہا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ الرسالہ کو خوب پھیلاؤ۔ الرسالہ کی ایجنسی آخرت کی ایجنسی ہے اور آخرت کی ایجنسی ہر طرح سے بے ضرر اور فائدہ مند ہے۔ جب میرے دل میں یہ تقدس شامل ہوگیا تو اب مجھے کام کرنا آسان ہوگیا۔

ربیع الاول میں پونہ میں ہر سال بڑے پیمانہ پر سیرت النبی کا جلسہ ہوتا ہے اور مختلف تعاریب منائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک نشست میں جس میں غیر مسلم صاحبان بھی موجود تھے میں نے آپ کا ایک مضمون " ظہور اسلام " سے پڑھ کر سنایا۔ اس کے علاوہ ہم نے اسلام کے تعارف پر انگریزی میں ایک دو ورقہ خاص اہتمام سے چھپوایا اور اس کو تقسیم کیا۔ اس دو ورقہ کو ڈاک سے بھی خاص خاص لوگوں کو بھیجا گیا۔ مثلاً گورنر مہاراشٹر، وزیر اعلا مہاراشٹر۔ ضلع پونہ کے سات ممبران پارلیمنٹ ضلع پونہ کے سات ایم ایل سی۔ ضلع پونہ کے چودہ ایم ایل اے۔ پونہ کارپوریشن کے ۷۵ ممبران۔ پونہ کیمپ بورڈ کے ۸ ممبران۔ پونہ کے روزناموں کے اڈیٹر صاحبان۔ پونہ کے محکمہ تعلیمات کے افسران۔ پونہ کے محکمہ پولیس کے افسران۔ پونہ کے تعلیمی اداروں کے سربراہان۔ نیز ضلع پونہ کے مراٹھی دانشور اور اہل فکر حضرات کو مجموعی طور پر چار سو کی تعداد میں روانہ کئے گئے۔ اس کے علاوہ "ٹیچنگ آف اسلام" اور "محمد دی آئیڈیل کیرکٹر" یہ دونوں انگریزی کتابیں بھی غیر مسلم حضرات کو تقسیم کی گئیں۔

عبدالصمد

پونہ کے سفر سے واپسی کے بعد پونہ کے بعض احباب نے وہاں کے ایک انگریزی اخبار کی کٹنگ بھیجی تھی۔ اس کا ذکر بھی پونہ کے سفر کی مناسبت سے یہاں کیا جاتا ہے۔

راجندر جکل، دلیپ سوتر، شانتارام جگتاپ اور منور ہارون شاہ، چاروں دوست تھے۔ انھوں نے اپنی صلاحیت کا استعمال یہ تلاش کیا کہ مجرمانہ کارروائیوں کے ذریعہ رات دن میں کروڑپتی بن جائیں۔

ان نوجوانوں نے دولت کی حرص میں دس آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ انھوں نے پہلا قتل ۱۵ جنوری ۱۹۷۶ کو کیا اور دسواں قتل ۲۳ مارچ ۱۹۷۷ کو۔ اس کے بعد چاروں گرفتار ہوئے ان پر مقدمہ چلا جو سپریم کورٹ تک گیا۔ بالآخر ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۳ کو انھیں یراودا سنٹرل جیل (پونہ) میں پھانسی دے دی گئی۔

اس واقعہ پر پونہ کے انگریزی اخبار مہاراشٹر ہرالڈ (۲۵ اکتوبر ۱۹۸۳) نے مفصل باتصویر رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں ڈبلیو۔ این۔ باپت (اڈیشنل سیشن جج) کا فیصلہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ موصوف کے سامنے مجرمین کی طرف سے جو وکالت کی گئی، اس میں کہا گیا تھا کہ یہ مجرمین چوں کہ کم عمر اور نوجوان ہیں، اس لئے ان کو موت سے کم درجہ کی سزا دی جائے۔ جسٹس موصوف نے اس کو رد کرتے ہوئے اپنے جواب میں لکھا:

> In my opinion, there is really nothing redeeming about the youth of the accused who never saw any meadows but only graves, never saw any stars but saw only mud and learnt very little about life but which about death and murders.

میرے نزدیک، ان مجرمین کی نوعمری اس قابل نہیں کہ انھیں چھوڑ دیا جائے۔ ان نوجوانوں نے دنیا میں کبھی چراگاہ نہیں دیکھی بلکہ صرف قبرستان دیکھی۔ انھوں نے کبھی ستارے نہیں دیکھے بلکہ صرف کیچڑ دیکھی۔ انھوں نے زندگی سے بہت کم سیکھا، انھوں نے جو سیکھا صرف موت اور قتل کے بارہ میں سیکھا۔

رحم دلی بہت اچھی چیز ہے لیکن جرائم فطرت لوگوں کے ساتھ رحم دلی کی جائے تو وہ ظلم بن جاتی ہے۔ اجتماعی زندگی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ افراد کے اندر ایک دوسرے کے لئے احترام، حسن ظن، فیاضی، اعتراف اور حقوق پہچاننے کا مادہ ہو۔ جو لوگ جارحیت کی حد تک منفی ذہنیت کا شکار ہوں وہ اسی قابل ہیں کہ ان کے اور سماج کے درمیان مستقل جدائی کر دی جائے۔ انھیں ان کے مقام عمل سے ہمیشہ کے لئے ہٹا دیا جائے۔

ایک اور خط ۲۹ مارچ ۱۹۸۴ کا لکھا ہوا موصول ہوا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

مولانا محترم، السلام علیکم! حیدرآباد کے سفر کے بعد سے دہلی آپ کو تین مرتبہ فون کیا لیکن آپ کے سفر میں ہونے کی وجہ سے بات نہ ہو سکی۔ قابل ذکر یہ ہے کہ آپ کا ایک مقالہ جو دسمبر ۸۳ء بعنوان "منزل کی طرف" چھپا تھا۔ اس کو آپ نے آریہ سماج الٰہ آباد کے ایک جلسہ میں پیش کیا تھا جو سروودھرم سمیلن کے عنوان سے ۲۲ مئی ۱۹۶۰ کو ہوا تھا۔

یہ مقالہ یہاں پونہ کے کچھ احباب کو بہت پسند آیا۔ جس کا ذکر میں نے آپ سے حیدرآباد کی ملاقات کے وقت بھی کیا تھا۔ اس مقالہ میں دیگر مذاہب کی تعلیمات کے ساتھ اسلام کا تعارف بھی ہے۔ اور عام انسانوں کے لئے دعوت بھی۔ اس بنا پر ہم نے مہاراشٹر کی خاص زبان مراٹھی میں اس کا ترجمہ کیا چھپائی کا انتظام بھی معیاری کرنے کا طے ہوا ہے۔ جو انشاء اللہ آپ کے مزاج کے مطابق ہوگا۔ مقالہ کا ترجمہ ۱۶ سے ۱۸ صفو الرسالہ کی سائز چھپا ہوگا۔ پانچ ہزار کاپی چھاپنا طے کیا گیا ہے۔ جس کا خرچ تقریباً تین ہزار روپیہ آئے گا جو کچھ احباب مل کر اٹھا رہے ہیں۔ اس کی تقسیم اس طرح ہوگی —— اخبار کے ایڈیٹر حضرات، رائٹر، دانشور، تمام مراٹھی لائبریریاں وغیرہ۔ یہ کام پورے مہاراشٹر میں ہوگا۔ یہ تقسیم ہم پوسٹ کے ذریعہ کرنے والے ہیں۔

مقالہ کا ترجمہ ہو چکا ہے لیکن یہاں کے زبان داں حضرات کے سامنے پڑھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ تاکہ ترجمہ کا معیار معلوم ہو سکے۔ آپ کی گراں قدر رائے کا انتظار رہے گا۔"

اس طرح کے خطوط مختلف مقامات سے ہم کو موصول ہو رہے ہیں جن میں یہ خواہش ظاہر کی گئی ہے کہ وہ الرسالہ کے کسی مضمون کا یا یہاں سے چھپے ہوئے کسی کتابچہ کا ترجمہ اپنے علاقہ کی زبان میں کر کے اس کو مقامی طور پر مفت تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ مفت تقسیم کرنا زیادہ مفید نہیں۔ زیادہ مفید صورت یہ ہے کہ ملک کے جس خطہ میں کوئی علیحدہ علاقائی زبان رائج ہے، وہاں حسب استطاعت ایک دارالاشاعت قائم کیا جائے اور علاقہ کی زبان میں کتابیں چھاپ کر کم قیمت میں فروخت کیا جائے۔

اسلامی مرکز کی دعوت کو پھیلانے کا ایک اہم ذریعہ بک اسٹال ہے۔ یعنی مختلف اجتماعات کے موقع پر رسالہ اور کتاب کا اسٹال رکھنا۔ اس کے لئے بھی علاقائی زبانوں میں لٹریچر کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بک اسٹال ایک "پروگرام" ہے اور اسی کے ساتھ دعوت کا ایک اہم ذریعہ بھی۔

اسلامی دعوت اور اتحاد

تمہید

مسلمانوں کا اتحاد مسلمانوں کی سب سے بڑی قوت ہے۔ اور اس اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ دعوت الی اللہ ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے دعوت دین کے کام کے لئے چن لیا ہے۔ پیغمبر نے جو دین ان تک پہنچایا ہے اسی کو انھیں تمام قوموں تک پہنچانا ہے۔ اس ضمن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ یعنی ایک خدا کے گرد سب کے سب متحد ہو جاؤ (لیکون الرسول شہیداً علیکم وتکونوا شہداء علی الناس فاقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ واعتصموا باللہ، الحج ۷۸)

دعوت کے حکم کے ذیل میں اتحاد کی تاکید سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت اور اتحاد میں بہت گہرا باہمی تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت سے باہمی اتحاد پیدا ہوتا ہے اور باہمی اتحاد سے مسلمان اس قابل ہوتے ہیں کہ دعوت کے کام کو موثر طور پر انجام دے سکیں۔

حدیث سے بھی دعوت اور اتحاد کا باہمی تعلق ثابت ہے۔ حضرت مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ نے مجھ کو تمام انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے تو تم میری طرف سے لوگوں تک پہنچا دو اور آپس میں اختلاف نہ کرو جس طرح حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اختلاف کیا (اخرج الطبرانی عن المسور بن مخرمۃ رضی اللہ عنہ قال خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ اصحابہ فقال ان اللہ بعثنی رحمۃ للناس کافۃ فادوا عنی ولا تختلفوا کما اختلف الحواریون علی عیسی بن مریم)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بات فرمائی تو صحابہ نے کہا اے خدا کے رسول، ہم آپ سے کبھی کسی معاملہ میں اختلاف نہ کریں گے۔ آپ ہم کو حکم دیجئے اور ہم کو بھیجئے (یا رسول اللہ، انا لا نختلف علیک فی شیٔ ابداً فمرنا وابعثنا، البدایہ والنہایہ، جلد ۴) صحابہ کو معرفت دین کا جو مرتبہ حاصل تھا اس نے انھیں بتا دیا تھا کہ دعوت الی اللہ کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور اس معاملہ میں انھیں کس قسم کا کردار پیش کرنا چاہئے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت تک باہمی اتحاد واتفاق رہا جب تک وہ دعوت الی اللہ کے کام میں مشغول رہے۔ جیسے ہی وہ اس کام سے ہٹے ان کے درمیان ایسا اختلاف اور ٹکراؤ شروع ہوا جو پھر کبھی ختم نہ ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے دعوت الی اللہ کو بھی کھو دیا جو ان کا فرض منصبی تھا۔

اور باہمی اتحاد کو بھی جو اس دنیا میں کسی گروہ کی سب سے بڑی طاقت ہے (الانفال ۴۶)

قرن اوّل کی مثال

مشہور قول کے مطابق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو ہوئی۔ اس سے صرف دو ہفتہ پہلے کا واقعہ ہے کہ عین مرض الموت کی حالت میں آپ نے خصوصی اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کی ایک فوج تیار کی۔ یہ رومیوں (بازنطینیوں) سے مقابلہ کے لئے تھی۔ اس فوج میں آپ نے تمام بڑے بڑے صحابہ کو شامل کیا۔ ان کے اوپر اُسامہ بن زید بن حارثہ کو سردار بنایا اور ان کو شام کی طرف روانہ کیا جہاں اس سے پہلے موتہ کے مقام پر رومیوں اور مسلمانوں میں جنگ ہوئی تھی۔ ۲۰ سالہ اُسامہ ایک غلام کے لڑکے تھے۔ تاہم وہ اس خاص مہم کی سرداری کے لئے موزوں ترین تھے۔ کیوں کہ اس سے پہلے غزوہ مُوتہ (۸ھ) میں رومیوں نے ان کے والد زید بن حارثہ کو قتل کیا تھا اور اس بنا پر بیٹے کے دل میں اپنے باپ کے قاتلوں سے لڑنے کے لئے آگ لگی ہوئی تھی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کے تحت اسامہ بن زید اس مہم پر روانہ ہوگئے۔ وہ مدینہ سے ایک فرسخ دور جرف کے مقام پر ٹھہرے۔ یہاں لوگ آ آ کر ان کے ساتھ ملنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جرف وہی مقام ہے جہاں مدینہ کی موجودہ جامعہ اسلامیہ قائم ہے۔

اسامہ بن زید اور ان کا لشکر ابھی جرف ہی میں تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ملی۔ اس کو سن کر ان لوگوں نے اپنا سفر ملتوی کر دیا اور آپ کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے مدینہ واپس آگئے۔

اب صحابہ کے اتفاق رائے سے ابو بکر صدیق رضے اللہ عنہ پہلے خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپ کی خلافت کے بعد مسلمانوں کی عام رائے یہ تھی کہ اسامہ کے لشکر کو مدینہ میں روک لیا جائے۔ پیغمبر اسلام کی وفات اور عرب کے اکثر علاقوں میں منافقین کے بڑھتے ہوئے فتنے کی وجہ سے اس وقت ہر طرف غیر یقینی حالت چھائی ہوئی تھی۔ لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ پہلے مدینہ کی نئی اسلامی ریاست کو مضبوط بنایا جائے۔ اس کے بعد باہر کی کسی مہم پر نکلا جائے۔

مگر خلیفہ اول نے عمومی مخالفت کے باوجود اسامہ کے لشکر کی روانگی میں معمولی تاخیر بھی گوارا نہ کی۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں اس گرہ کو نہیں کھولوں گا جس کو اللہ کے رسول نے باندھا۔ خواہ چڑیاں ہم کو اچک لیں اور اطراف کے درندے ہم پر ٹوٹ پڑیں۔ اور خواہ کتے امہات المومنین کے پیروں کو گھسیٹیں۔ میں ہر حال میں اسامہ کے لشکر کو روانہ کروں گا (واللہ لا احل عقدۃ عقدھا

رسول اللہ۔ ولوان الطیر تخطفتنا والسباع من حول المدینۃ۔ ولوان الکلاب جرت بارجل امھات المومنین لاجھزن جیش اسامۃ)

خلیفہ اوّل نے اس معاملہ کی انتہائی اہمیت کو لوگوں پر واضح کرنے کے لئے مزید یہ کیا کہ جب لشکر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا تو آپ مدینہ سے جرف تک اس طرح گئے کہ نوجوان اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور خلیفہ اول ان کو نصیحت اور ہدایت دیتے ہوئے ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ اسامہ کے اصرار کے باوجود وہ سواری پر نہیں بیٹھے (فشیع البعثۃ وھوماش علیٰ قدمیہ فقال اسامۃ یاخلیفۃ رسول اللہ، واللہ لترکبن اولا نزلن۔ فقال واللہ لا تنزل و واللہ لا ارکب۔ وماعلیّ ان اغبر قدمی فی سبیل اللہ ساعۃ)

پیغمبر اسلام اور خلیفہ اول کا یہ اقدام نہایت اہم مصلحت پر مبنی تھا۔ یہ مصلحت تھی ——— مسلمانوں کے جذبہ جہاد کے لئے عرب کے باہر میدان عمل فراہم کرنا۔ "جہاد" حقیقۃً خارجی دائرہ میں اسلام کی توسیع واشاعت کے لئے جدوجہد کا عنوان ہے۔ لیکن اگر خارجی نشانہ مسلمانوں سے اوجھل ہوجائے تو وہ داخلی لڑائی میں مصروف ہوجاتے ہیں اور اس کو جائز ثابت کرنے کے لئے غلط طور اس کو جہاد کا نام دے دیتے ہیں۔

خارجی نشانہ

پیغمبر کی تحریک کے نتیجہ میں عرب کے لوگ جب اسلام لائے تو ان کے اندر زبردست اسلامی جوش پیدا ہوگیا۔ انھوں نے چاہا کہ جس دین کو انھوں نے سب سے بڑی سچائی پاکر اختیار کیا ہے اس دین کو تمام لوگوں کا دین بنا دیں۔ اس جوش کو اپنے اظہار کے لئے کوئی وسیع میدان درکار تھا۔ اسامہ کے لشکر کی بروقت روانگی کا مقصد مسلمانوں کے لئے یہی میدان کار فراہم کرنا تھا۔ پیغمبر اسلام نے رومیوں کی جارحیت کو فوراً استعمال کیا اور اپنے آخر وقت میں ان کے ساتھ مڈبھیڑ کرکے یہ کیا کہ مسلمانوں کے جوش کو غیر مسلم اقوام میں اسلامی دعوت کی طرف موڑ دیا۔ اس طرح یہ ہوا کہ جو طاقت داخلی لڑائیوں میں ضائع ہوتی وہ خارجی عمل میں استعمال ہونے لگی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو عرب کے مسلمان ایک دوسرے کی اصلاح کے نام پر آپس میں لڑنا شروع کردیتے۔ جیسا کہ آج کل ہم تمام مسلم ملکوں میں دیکھ رہے ہیں۔

پیغمبر اسلام اگر عین وقت پر مسلمانوں کے جذبۂ عمل کو خارج کی طرف نہ موڑتے تو اس کے بعد ان کے درمیان جو داخلی لڑائیاں شروع ہوتیں ان کا انجام صرف یہ نکلتا کہ اسلام کی تاریخ جہاں بننا شروع ہوئی تھی وہیں وہ بننے سے پہلے ختم ہوجاتی۔ تاریخ آج جن شاندار اسلامی کرداروں کے تذکرے سے بھری ہوئی ہے وہ ان کے مرثیہ سے زیادہ اور کچھ نہ ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ مقصد میں مشغول ہونا اعلیٰ کردار

کی سب سے بڑی ضمانت ہے، اور دعوت الی اللہ کے محاذ سے ہٹنے کے بعد مسلمان یہی اعلیٰ ترین چیز کھو دیتے ہیں۔

خلیفہ اول کے زمانہ میں اس عمل کا رخ پہلے رومیوں کی طرف پھیر اگیا تھا۔ جلد ہی بعد فارسیوں (ساسانیوں) کی جارحیت کی بنا پر فارس سے بھی مسلمانوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ اس طرح مسلمانوں کے نئے اسلامی عمل کا آغاز وسیع میدان ہاتھ آگیا جو ایشیا سے لے کر افریقہ اور یورپ تک چلا گیا۔ کیوں کہ اس زمانہ میں یہی دونوں سلطنتیں (روم اور فارس) دنیا کے اکثر آباد حصہ پر چھائی ہوئی تھیں۔

رومیوں اور ایرانیوں کی طرف مسلمانوں کا یہ اقدام حقیقۃً کسی سیاسی مقصد یا ملکی توسیع کے لئے نہ تھا، بلکہ تمام تر اسلامی دعوت کے لئے تھا۔ یہ مسلمان اس ربانی جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی سرحدوں سے نکلے تھے کہ اللہ کے بندوں کو انسان کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کے دائرہ میں لے آئیں (لنخرج عباد اللہ من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ) واقعات ثابت کرتے ہیں کہ روم اور فارس مسلمانوں کے لئے اصلاً دعوت حق کا موضوع تھے۔ مگر ان قوموں کی طرف سے جارحیت کی بنا پر ان کے درمیان جنگ کی نوبت آگئی۔ ورنہ جن قوموں نے جنگ نہیں کی ان کے درمیان اسلام کسی لڑائی بھڑائی کے بغیر پھیلتا رہا۔ مثلاً حبش، مالدیپ، ملیشیا، انڈونیشیا وغیرہ

قدیم غیر مسلم اقوام تک اسلام کی توسیع و اشاعت کا عمل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد شروع ہوا۔ تقریباً ۳۰ سال تک وہ پوری کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ اس پوری مدت میں مسلمان متحد اور متفق ہو کر دوسری قوموں میں اسلام کی اشاعت کرتے رہے۔ اسی کا ایک نتیجہ وہ عظیم مسلم جغرافیہ ہے جس کو آج عرب دنیا کہا جاتا ہے۔

عام الجماعت (اتحاد کا سال)

خلیفہ ثالث عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے آخری زمانہ میں یہ تسلسل ٹوٹتا ہے۔ مسلمانوں نے "داخلی جہاد" کے جوش میں اپنے عمل کا رخ باہر سے اندر کی طرف موڑ دیا۔ اصلاح سیاست کے نام پر وہ خود اپنے حکمرانوں سے لڑنے لگے۔ یہ باہمی ٹکراؤ یہاں تک بڑھا کہ مسلمانوں میں سے ایک طبقہ نے اپنے خلیفہ کو قتل کر ڈالا۔

تاہم خلیفہ کے قتل پر بھی مسئلہ ختم نہ ہوا۔ اب خون عثمان کے قصاص کے نام پر مسلمانوں میں دو گروہ بن گئے۔ اس طرح آپس میں ایسی لڑائیاں شروع ہوئیں جو مسلسل دس سال تک نہایت خونریزی کے ساتھ جاری رہیں۔ اسلام کی عمومی دعوت کے محاذ سے ہٹنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک طرف اسلام کی توسیع و اشاعت کا کام بالکل رک گیا اور دوسری طرف مسلمانوں کی طاقت خود مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونے لگی۔

[illegible] سلطنت سے باہم بہت بڑے بڑے گروہ اسلام کے نام پر مصروف اور مشغول ہو کر رہ گئے۔

تقریباً دس سال کے اختلاف اور انتشار کے بعد مسلمان دوبارہ ۴۱ھ میں متحد ہوئے۔ اس بنا پر اس سال کو اسلامی تاریخ میں عام الجماعت (اتحاد کا سال) کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں دوبارہ اتحاد کا یہ واقعہ حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے ذریعے پیش آیا جن کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اللہ ان کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا (ان ابنی ھذا سید ولعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین، رواہ البخاری)

حضرت حسن اپنے والد کے بعد اسلام کے پانچویں خلیفہ مقرر ہوئے تھے۔ مگر انھوں نے دیکھا کہ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے باہمی جنگ کا سبب بن گیا ہے۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کے اختلاف کو ختم کرنے کے لئے یک طرفہ طور پر اپنے حق سے دست بردار ہو گئے۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مسلمان دو متحارب گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک کے سردار حضرت حسن تھے اور دوسرے کے سردار حضرت معاویہ۔ حضرت حسن نے جب خلافت کے حق سے دست بردار ہو کر داخلی محاذ کو بند کیا تو اس کے بعد بالکل فطری طور پر یہ ہوا کہ مسلمانوں کی سرگرمیوں کا رخ دوبارہ اسلام کی توسیع و اشاعت کی طرف مڑ گیا۔ اسلام کا بڑھتا ہوا قافلہ جو دس سال سے رکا ہوا تھا، وہ دوبارہ خدا کے دین کی عمومی اشاعت کے میدان میں سرگرم ہو گیا۔ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ۲۰ سالوں (۴۰ - ۶۰ھ) میں اسلام کی اشاعت اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی جس کی مثال بعد کی صدیوں میں نہیں ملتی۔ ان کے زمانہ میں اسلام کا قافلہ ایک طرف سمرقند، دوسری طرف افغانستان اور تیسری طرف تیونس تک پہنچ گیا۔ چوتھی طرف مسلمان آبنائے باسفورس کو پار کر کے جزیرہ روڈس پر قابض ہو گئے جو گویا قسطنطنیہ میں داخلہ کا پہلا زینہ تھا۔ اس طرح ان کے عہد خلافت میں مشرق و مغرب اور شمال و جنوب ہر طرف اسلام کی توسیع ہوئی۔ اسلام کا قافلہ خشکی سے گذر کر سمندروں میں سفر کرنے لگا۔

ایک تاریخی سبق

معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر کچھ لوگوں نے اعتراضات کئے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ معاویہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام کے اندر ملوکیت کی بنیاد رکھی۔ مگر اس سے قطع نظر، معاویہ رضی اللہ عنہ کے ۲۰ سالہ خلافت کی تاریخ ایک بہت بڑا سبق دیتی ہے۔ وہ سبق یہ ہے مسلمانوں کو اگر کسی طرح باہمی لڑائی سے ہٹایا جا سکے، خواہ یہ سیاسی ادارہ میں ملوکیت کو برداشت

کرنے کی قیمت پر کیوں نہ ہو، تو اسلام کے حق میں اس کا نتیجہ نہایت مفید شکل میں نکلتا ہے۔ باہمی لڑائی کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ افراد کا جوش اسلامی آپس کی تخریب پر صرف ہونے لگتا ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کو باہمی لڑائی کے محاذ سے ہٹا دیا جائے تو ان کا جوش عمل اسلام کی توسیع و اشاعت کے میدان میں اپنا نکاس ڈھونڈ لے گا۔

مسلمانوں کا دو گروہ بن کر آپس میں لڑنا سراسر حرام ہے۔ تاہم جب مسلمانوں کو باہمی لڑائی سے بچایا جاتا ہے تو صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک فعل حرام کے ارتکاب سے بچ جاتے ہیں۔ بلکہ اس کا ایک مثبت فائدہ بھی اپنے آپ حاصل ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا جوش اسلامی اس کے بعد رکا نہیں رہتا بلکہ وہ اپنے اظہار کے لئے دوسرا میدان ——— اسلام کی توسیع و اشاعت کا میدان ——— تلاش کر لیتا ہے۔ اس طرح یہ ہوتا ہے کہ جو قوت باہمی تخریب میں ضائع ہوتی وہ اسلام کی ترقی اور استحکام میں استعمال ہونے لگتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ مدعا بھی اسی سے اپنے آپ حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے وہ ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے تھے۔ یعنی مسلمانوں کی اصلاح اور ان میں اعلیٰ اسلامی صفات کا پیدا ہونا۔

مسلمانوں کا جوش جہاد اگر اسی طرح خارج کی طرف عمل کرتا رہتا جس طرح وہ ابتدائی زمانہ میں عمل کر رہا تھا تو آج دنیا کی تاریخ دوسری ہوتی جس طرح عرب ملکوں کی تاریخ ہمیشہ کے لئے دوسری ہو چکی ہے۔

دعوت کے ذریعہ اتحاد

دعوت الی اللہ یا تبلیغ اسلام ہی امت مسلمہ کا منصبی مشن ہے۔ اس مشن سے مراد اصلاً یہ ہے کہ خدا کے دین کو غیر مسلم اقوام تک پہنچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو جو مستقل مشن دیا ہے وہ یہی مشن ہے جس کا دوسرا نام شہادت علی الناس ہے (الحج ۷۸)۔ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ اب مسلمانوں کو دعوت الی اللہ کا وہ کام انجام دینا ہے جس کے لئے اس سے پہلے رسول آیا کرتے تھے۔

یہ عمل جو امت مسلمہ کا اصل مشن ہے، اسی کی ادائیگی سے خدا کی نصرت ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اسی سے امت کے اندر وہ اہم ترین چیز پیدا ہوتی ہے جس کا نام اتحاد اور اتفاق ہے۔

دعوت (غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت) ایک ایسا کام ہے جو آدمی کے لئے خارج میں عمل کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اپنے عمل حوصلہ کی تکمیل کے لئے وہ اندر کے بجائے باہر کا میدان کھولتا ہے۔ اس طرح لوگوں کو اپنے جذبہ جہاد یا جوش اسلامی کے استعمال کے لئے اپنی صفوں سے باہر کی دنیا میں نشانہ مل جاتا ہے۔ لوگ داخلی مقابلہ آرائی سے ہٹ کر خارج میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں لگ جاتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اسلام کی تاریخ اس کا زبردست ثبوت فراہم کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی وفات کے بعد ۲۰ سال تک مسلمان خارجی میدان میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں مصروف تھے تو ان کی اندرونی صفوں میں مکمل اتحاد قائم رہا۔ حضرت عثمان کے آخری زمانہ میں "داخلی جہاد" کا آغاز ہوا تو اس قدر باہمی لڑائیاں پیش آئیں کہ دس سال تک کے لئے اسلام کی توسیع کا عمل رُک گیا۔ یہ عمل دوبارہ اس وقت شروع ہوا جب حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دست بر داری کے نتیجہ میں داخلی مقابلہ آرائی ختم ہوئی۔ اب دوبارہ ۲۰ سال تک مسلسل اسلام کی توسیع ہوتی رہی۔ امیر معاویہ کی وفات (۶۰ھ) کے بعد بنو امیہ اور بنو ہاشم میں "اصلاح سیاست" کے عنوان پر ٹکراؤ شروع ہوا تو دوبارہ اسلام کی توسیع کا کام رک گیا جو پھر کبھی پہلے کی طرح جاری نہ ہو سکا۔ اسلام کی توسیع اور اس کی اشاعت عام کو چھوڑنے کی قیمت مسلمانوں کو یہ دینی پڑ رہی ہے کہ پچھلے ہزار سال سے ان کی طاقتیں آپس کے ٹکراؤ اور اختلاف میں ضائع ہو رہی ہیں، وہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ یہ داخلی ٹکراؤ اگرچہ بظاہر اسلام کے نام پر ہو رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا کی دنیا میں اس سے زیادہ غیر اسلامی کام اور کوئی نہیں۔

۲۔ دعوت الی اللہ اصلاً اس اسلامی کام کا عنوان ہے جو غیر مسلموں تک خدا کا پیغام پہنچانے کے لئے انجام دیا جاتا ہے (مسلمانوں کے درمیان کام کا اصطلاحی نام اصلاح ہے، الحجرات ۱۰) جب آپ غیر مسلم کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کر رہے ہوں تو ایسا نہیں ہوگا کہ آپ اس کے سامنے آمین بالسر یا آمین بالجہر کے مسائل بیان کریں۔ یا ان دوسرے فروعی مسائل کو چھیڑیں جن کے بارہ میں مسلم فرقوں کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ہر مسلمان یہ کرے گا کہ وہ مخاطب کے سامنے توحید، رسالت، آخرت اور مساوات انسانی جیسی بنیادی تعلیمات پیش کرے گا۔ گویا اسلام کی عمومی دعوت کا کام ایک ایسا کام ہے جو بالکل فطری طور پر بنیادی تعلیمات دین کو بحث و گفتگو کا موضوع بنا دیتا ہے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ دین کی بنیادی تعلیمات میں کوئی اختلاف نہیں۔ وہ سب کی سب متفق علیہ ہیں۔ اس کے برعکس دین کے فروعی (فقہی) احکام میں کافی اختلافات ہیں۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جب دعوتی اسلام لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے تو لازمی طور پر اسلام کے بنیادی پہلو، بالفاظ دیگر متفق علیہ پہلو زیادہ سے زیادہ زیر بحث آتے ہیں۔ اور اس کے فروعی، دوسرے لفظوں میں اختلافی پہلو پس پردہ چلے جاتے ہیں۔

اس طرح قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ملت جب دعوتی عمل میں مصروف ہو تو اس کے

اندر اتفاق و اتحاد کے اسباب پرورش پاتے ہیں۔ اسلام کے اساسی اور اتفاقی امور لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اسلام کے فروعی مسائل کو لے کر اٹھیے تو مسلمانوں کے اندر اختلافات جنم لیں گے۔ اس کے برعکس اسلام کے بنیادی مسائل کو لے کر اٹھیے تو لوگوں کے ذہن زیادہ سے زیادہ متفق علیہ امور پر کام کریں گے۔ ملت کے اندر اختلاف کی جڑ کٹے گی اور ہر طرف اتحاد کی فضا وجود میں آئے گی۔

فروعی مسائل اختلاف کا ماحول پیدا کرتے ہیں اور بنیادی مسائل اتفاق کا ماحول۔

انسانوں کے درمیان ہمیشہ اختلافات موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ اتحاد جب کبھی وجود میں آتا ہے تو وہ اس طرح وجود میں نہیں آتا کہ لوگوں میں سرے سے کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا نام اتحاد ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر متحد ہونے کا۔

"اختلاف کے باوجود متحد ہونا"، بظاہر ایک لفظ ہے۔ مگر یہ سب سے بڑی قربانی ہے جو موجودہ دنیا میں کوئی آدمی پیش کرتا ہے۔ اس قربانی کے لئے وہ فیاضی درکار ہے جب کہ آدمی دوسرے کے فائدہ کی خاطر اپنے نقصان کو برداشت کرلے۔ اس کے لئے وہ بلند ہمتی درکار ہے جب کہ ذاتی شکایت کے باوجود وہ دوسرے کے فضل وکمال کا اعتراف کر سکے۔ اس کے لئے وہ بے نفسی درکار ہے جب کہ آدمی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا ہوتا ہوا دیکھے، پھر بھی وہ منفی نفسیات کا شکار نہ ہو۔ اس کے لئے وہ اعلیٰ ظرفی درکار ہے جب کہ آدمی اپنی رائے کو بطور خود اہم سمجھتے ہوئے دوسرے کی رائے کے مقابلہ میں اس کو واپس لے لے۔ اس کے لئے وہ حوصلہ درکار ہے جب کہ آدمی دوسرے کو اگلی سیٹ پر بٹھا کر خود پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے راضی ہو جائے۔

اجتماعی اتحاد فرد کی سب سے بڑی قربانی ہے۔ آدمی کسی چیز کو اس وقت چھوڑتا ہے جب کہ اس کو اس سے بڑی کوئی چیز مل جائے۔ دعوت الی اللہ کا مشن یہی سب سے بڑی چیز ہے۔ دعوت و شہادت گویا موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندگی ہے۔ آخرت میں سب سے بڑا انعام داعیان حق کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا کوئی کام اس دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت میں مصروف ہونے والے لوگ اس عظیم قربانی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جو کسی اور طریقہ سے ممکن نہیں۔

دعوت الی اللہ کا مشن کسی انسان کے لئے سب سے بڑی چیز ہے۔ اس کے مقابلہ میں تمام چیزیں چھوٹی ہیں۔ ملت کے موجودہ اختلافات اسی لئے ہیں کہ ملت کے افراد کے سامنے کوئی بڑا مقصد نہیں۔ اگر ان کے سامنے بڑا مقصد آجائے تو وہ خود بخود چھوٹی چھوٹی چیزوں کو چھوڑنے پر راضی ہو جائیں گے۔ اور بلاشبہ بڑے مقصد کی خاطر چھوٹی چیزوں کو چھوڑنے کے نتیجہ ہی کا دوسرا نام اتحاد ہے۔

دورِ جدید میں اسلامی دعوت

موجودہ زمانہ میں ایک عجیب رجحان یہ پیدا ہوا ہے کہ مسلمان اپنی قومی جدوجہد کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں ان سب کو آجکل "اسلامی دعوت" کہہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ اس لفظ کا بالکل غلط استعمال ہے۔ دعوت (دعوت الی اللہ) حقیقۃً غیر مسلم اقوام تک خدا کے سچے دین کا پیغام پہنچانے کا عنوان ہے۔ یہ پیغمبر کی وراثت ہے جو ختم نبوت کے بعد مسلمانوں کے حصہ میں آئی ہے۔ اس لفظ کو اپنی قومی جدوجہد کے لئے استعمال کرنا اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے، کجا کہ اس کی وجہ سے خدا کی موعود نصرتیں ہمارے اوپر نازل ہوں۔

امت مسلمہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں دعوت الی اللہ کے کام سے وابستہ کر دی ہیں۔ ایک طرف قرآن کے مطابق دعوت الی اللہ میں عصمت من الناس کا راز چھپا ہوا ہے (المائدہ ۶۷) دوسری طرف یہی وہ کام ہے جس کی ادائگی کے نتیجہ میں اہل ایمان آخرت میں خدا کی گواہی کے بلند مقام پر کھڑے کئے جائیں گے جس کو قرآن میں اصحاب اعراف (الاعراف ۴۶) کہا گیا ہے۔ یہ آخرت کا سب سے بڑا اعزاز ہے جو داعیان حق کو دیا جائے گا۔

تاہم دعوت الی اللہ کا کام کوئی سادہ یا آسان کام نہیں۔ یہ رسول اور اصحاب رسول کی تاریخ کو ازسرنو دہرانا ہے۔ یہ خدا کے بندوں کے سامنے خدا کا نمائندہ بننا ہے۔ یہ دنیا میں خدا کی حمد اور کبریائی کا نغمہ چھیڑنا ہے۔ یہ غیبی حقیقت کو لوگوں کے لئے مشہود حقیقت بنانا ہے۔ جو کچھ اس سے پہلے پیغمبرانہ سطح پر ہوتا رہا ہے اس کو غیر پیغمبرانہ سطح پر انجام دینا ہے۔ دعوت کی اصل نوعیت آدمی کے سامنے نہ ہو تو وہ دعوت کے نام پر ایک ایسا کام کرے گا جس کا دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔

عالمی فضا کی تبدیلی

اس سلسلہ میں پہلی بات جس کو جاننا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہ کون سے حالات ہیں جن کے درمیان ہم کو دعوت حق کا کام انجام دینا ہے۔ مختصر لفظوں میں اس کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے اسلاف کے لئے دعوت الی اللہ کا مطلب دورِ شرک کو ختم کرنا تھا۔ اب ہمارے لئے دعوت الی اللہ کا مطلب دورِ الحاد کو ختم کرنا ہے۔ ہمارے اسلاف دورِ شرک کو ختم کر کے دورِ توحید لے آئے۔ اس کے بعد دنیا میں ایک نئی تاریخ وجود میں آئی۔ یہ تاریخ ہزار سال تک کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔ یہاں تک کہ سولہویں صدی عیسوی میں مغربی سائنس کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد دنیا کی ایک نئی تاریخ بننا شروع ہوئی۔ بیسویں صدی میں آکر یہ تاریخ اپنے کمال پر پہنچ گئی ہے۔ اب دوبارہ یہ حال ہوگیا ہے کہ ظہور ر

اسلام سے پہلے جس طرح فکر وعمل کے تمام شعبوں پر شرک کا غلبہ تھا، اسی طرح اب فکر وعمل کے تمام شعبوں پر الحاد کا غلبہ ہو چکا ہے۔ حتی کہ آج مذہب بھی علمی طور پر الحاد کا ضمیمہ بن چکا ہے۔ اس سے الگ اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔

یہاں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے جو موجودہ زمانہ میں مذہب کی صورت کو بہت اچھی طرح واضح کرتا ہے۔ جرمن مفکر ای۔ ایف شوماخر نے اپنا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

> On a visit to Leningrad some years ago (August 1968) I consulted a map to find out where I was, but I could not make it out. I could see several enormous churches, yet there was no trace of them on my map. When finally an interpreter came to help me, he said: "We don't show churches on our maps."
>
> E.F. Schumacher,
> *A Guide for the Perplexed*, London, 1981, p. [illegible]

اگست ۱۹۶۸ میں میں روس کے شہر لینن گراڈ گیا۔ وہاں ایک دن میں ایک نقشہ دیکھ رہا تھا تاکہ میں جانوں کہ میں کہاں ہوں۔ مگر میں اس کو جان نہ سکا۔ میری نظروں کے سامنے کئی بڑے بڑے چرچ تھے۔ مگر میرے نقشہ میں ان کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ بالآخر ایک ترجمان نے میری مدد کی۔ اس نے کہا: "ہم اپنے نقشوں میں چرچ کو نہیں دکھاتے"۔

یہ جزئی واقعہ اس پوری صورت حال کی تصویر ہے جو موجودہ زمانہ میں پیش آئی ہے۔ جدید انسان نے خدا کو اپنے تمام علمی اور فکری نقشوں سے نکال دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جغرافیہ، تاریخ، طبیعیات، نباتات، حیوانات، فلکیات وغیرہ تمام علوم نہایت تفصیل کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں۔ مگر ان علوم میں کہیں بھی خدا کا ذکر نہیں۔ ایک شخص جس کو نظر حاصل ہو، جب وہ آنکھ اٹھا کر کائنات کو دیکھتا ہے تو ہر طرف اس کو خدا کا نشان نمایاں نظر آتا ہے، مگر مدوّن علوم میں خدا ہر جگہ ایک غیر موجود چیز ہے۔ ان علوم کو پڑھنے والا کہیں بھی خدا کا کوئی حوالہ نہیں پاتا۔

ان حالات میں دعوت توحید کا کام گویا خدا کو ازسرنو فکر انسانی کے نقشہ پر لکھنا ہے۔ عالمی سطح پر ایک ایسا فکری انقلاب لانا ہے کہ انسان دوبارہ خدائی اصطلاحوں میں سوچنے کے قابل ہو سکے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ توحید اور آخرت کی بات آدمی کی سمجھ میں آئے اور اس کو وہ حقیقت سمجھ کر قبول کر سکے۔ ہمارے اسلاف نے انسانی فکر کی دنیا میں شاکلۂ شرک کو توڑ کر شاکلۂ توحید کو قائم کیا تھا۔ اب ہم کو دوبارہ شاکلۂ [illegible] شاکلۂ توحید پر انسانی فکر کا نظام قائم کرنا ہے۔ دعوت کے مسئلہ کا اس سے کم تصور دعوت کے [illegible] تخمینہ (Underestimation) ہے جس کی کوئی قیمت نہ بندوں کے نزدیک ہے اور نہ خدا کے نزدیک۔

داعی اور مدعو کا تعلق

دوسرا اہم مسئلہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال کرنا ہے۔ امت مسلمہ کی حیثیت سے مسلمان خدا کے دین کے داعی ہیں اور بقیہ تمام قومیں ان کے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی ہے کہ انھوں نے دوسری قوموں کو اپنا قومی حریف اور مادی رقیب بنالیا ہے۔ ان قوموں سے وہ ساری دنیا میں معاشی اور سیاسی جھگڑے چھیڑے ہوئے ہیں۔ قرآن میں داعی کا کلمہ لا اسئلکم علیہ من اجر بتایا گیا ہے۔ ایسی حالت میں حقوق طلبی کے یہ تمام ہنگامے اپنی دعوتی حیثیت کی نفی کے ہم معنی ہیں۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے یہاں ہم کو خدا کے گواہ کا مقام حاصل ہو تو ہم کو یہ قربانی دینی ہوگی کہ دوسری اقوام سے ہمارے دنیوی جھگڑے خواہ وہ بظاہر درست کیوں نہ ہوں، ان کو ہم یک طرفہ طور پر ختم کردیں تاکہ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم ہو، ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان وہ معتدل فضا وجود میں آئے جس میں ان کے سامنے توحید اور آخرت کی دعوت پیش کی جائے اور وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرسکیں۔

صلح حدیبیہ (۶ھ) میں مسلمانوں نے یک طرفہ طور پر مخالفین اسلام کے تمام معاشی اور قومی مطالبات مان لئے تھے۔ انھوں نے اپنے حقوق سے دستبرداری پر خود اپنے ہاتھ سے دستخط کردئے تھے۔ مگر جب مسلمان یہ معاہدہ کرکے لوٹے تو خدا کی طرف سے یہ آیت اتری ـــــــ انا فتحنا لك فتحاً مبینا (الفتح ۱) بظاہر شکست کے معاہدہ کو خدا نے فتح کا معاہدہ کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس معاہدہ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مقابلہ کے میدان کو بدل دیا تھا۔ اب اسلام اور غیر اسلام کا مقابلہ ایک ایسے میدان میں منتقل ہوگیا تھا جہاں اسلام واضح طور پر زیادہ بہتر حیثیت (Advantageous position) میں تھا۔

غیر مسلموں کی جارحیت کی وجہ سے اس وقت اسلام اور غیر اسلام کا مقابلہ جنگ کے میدان میں ہو رہا تھا۔ غیر مسلموں کے پاس ہر قسم کے زیادہ بہتر جنگی وسائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے بعد مسلسل غزوات کے باوجود معاملہ کا فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ اب حدیبیہ میں غیر مسلموں کے تمام قومی مطالبات مان کر ان سے یہ عہد لے لیا گیا کہ دونوں فریقوں کے درمیان دس سال تک براہ راست یا بالواسطہ کوئی جنگ نہیں ہوگی۔

مسلسل جنگی حالات کی وجہ سے اسلام کا دعوتی کام رکا ہوا تھا۔ جنگ بند ہوتے ہی دعوت کا کام

پوری قوت کے ساتھ ہونے لگا۔ جنگی میدان میں اس وقت اسلام کمزور تھا۔ مگر جب مقابلہ پرامن تبلیغ کے میدان میں آگیا تو یہاں شرک کے پاس کچھ نہ تھا جس سے وہ توحید کی حقانیت کا مقابلہ کرسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے قبائل اتنی کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے کہ کفر کا زور بالکل ٹوٹ گیا اور معاہدہ کے صرف دو سال کے اندر مکہ فتح ہوگیا۔

موجودہ زمانہ میں بھی اسی طرح کے ایک "معاہدہ حدیبیہ" کی ضرورت ہے۔ مسلمان دوسری قوموں سے ہر جگہ مادی لڑائی لڑرہے ہیں۔ مسلمان چونکہ اپنی غفلت کی وجہ سے مادی پہلو سے دوسری قوموں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہوگئے ہیں وہ ہر محاذ پر ان سے شکست کھا رہے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ یک طرفہ قربانی کے ذریعے ان محاذوں کو بند کرکے میدان مقابلہ کو بدل دیا جائے۔ ان قوموں کو مادی مقابلہ کے میدان سے ہٹاکر فکری مقابلہ کے میدان میں لایا جائے۔ قدیم زمانہ میں میدان مقابلہ کی یہ تبدیلی جنگ کو یک طرفہ طور پر ختم کرکے حاصل کی گئی تھی، آج یہ تبدیلی قومی حقوق کی مہم کو یک طرفہ طور پر ختم کرکے حاصل ہوگی۔

قومی مفادات کی یہ قربانی بلاشبہ ایک نہایت مشکل کام ہے مگر اسی کھونے میں پانے کا سارا راز چھپا ہوا ہے۔ مسلمان جس دن ایسا کریں گے اسی دن فتح اسلام کا آغاز ہو جائے گا۔ کیوں کہ فکری میدان میں کسی اور کے پاس کوئی چیز موجود ہی نہیں۔ مادی مقابلہ کے میدان میں مسلمانوں کے پاس "روایتی ہتھیار" ہیں اور دوسری قوموں کے پاس "جدید ہتھیار"۔ جب کہ فکری میدان میں مسلمانوں کے پاس حقیقت ہے اور دوسری قوموں کے پاس تعصب، اور حقیقت کے مقابلہ میں تعصب دیر تک ٹھہر نہیں سکتا۔

لٹریچر کی تیاری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے قلم کے ذریعہ انسان کو تعلیم دی (علّم بالقلم، العلق) اس سے اسلامی دعوت کے لئے لٹریچر کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

مگر اسلامی لٹریچر کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام کے نام پر کچھ کتابیں لکھی جائیں اور ان کو کسی نہ کسی طرح مختلف زبانوں میں چھاپ کر تقسیم کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ بشری سطح پر قرآن کا بدل فراہم کرنا ہے۔

خدا نے اپنا کلام عربی زبان میں اتارا ہے۔ مگر اس کی تبلیغ دوسری زبان والوں تک بھی کرنی ہے، اور جیسا کہ ثابت ہے، مدعو کی اپنی زبان میں کرنی ہے (ابراہیم ۴) اس لحاظ سے اگر علّم بالقلم کو وقتی نہ سمجھا جائے بلکہ اس کو ابدی پس منظر (Perspective) میں رکھ کر دیکھا جائے تو یقینی طور پر انسان بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ دوسری زبانوں میں تعلیم بالقلم کا فریضہ انسان ہی کو ادا کرنا ہے۔

گویا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خدا عربی زبان میں معلّم بالقلم بنا تھا، اب ہم کو دوسری زبانوں میں معلم بالقلم بنا ہے۔ مشہور عرب شاعر لبید نے قرآن کو سن کر شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے کہا کہ تم اب شاعری کیوں نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا، کیا قرآن کے بعد بھی (ا بعد القرآن) اس کا مطلب یہ ہے قرآن نے اپنے زمانہ کے افراد کو ذہنی طور پر مفتوح کر لیا تھا۔ اسی طرح آج دوبارہ ایسا اسلامی لٹریچر درکار ہے جو لوگوں کو ذہنی طور پر مفتوح کر لے۔

بظاہر یہ بات ناممکن دکھائی دیتی ہے۔ مگر اس ناممکن کو خود خدا نے ہمارے لئے ممکن بنا دیا ہے۔ خدا نے حق کے داعیوں کی مدد کے لئے انسانی تاریخ میں ایک نیا انقلاب برپا کیا۔ یہاں میری مراد سائنسی انقلاب سے ہے۔ سائنسی انقلاب کے ذریعہ نئے استدلالی امکانات انسان کی دسترس میں آگئے۔ حتی کہ بلا تشبیہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج ہمارے لئے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ مخاطب کے سامنے دین کے حق میں وہ اعجازی استدلال پیش کر سکیں جو پہلے صرف خدا کے پیغمبروں کی دسترس میں ہوتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات ایک عظیم الشان خدائی معجزہ ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے خالق کی ذات وصفات کے حق میں معجزاتی دلیل ہے۔ تاہم قدیم زمانہ میں یہ خدائی معجزہ ابھی تک غیر دریافت شدہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس لئے خدا نے قدیم زمانہ میں پیغمبروں کو مخصوص طور پر خارق عادت معجزے دئے۔

مگر پیغمبر اسلام کے مخاطبین کے مسلسل مطالبہ کے باوجود انھیں مذکورہ قسم کا کوئی معجزہ نہیں دکھایا گیا۔ بلکہ قرآن میں کائنات کا حوالہ دیا گیا۔ کہا گیا کہ کائنات میں خدا کی آیات موجود ہیں ان کو دیکھو۔ وہی تمھارے یقین کے لئے کافی ہیں۔ چوں کہ قرآن دور سائنس کے آغاز میں آیا اس لئے قرآن میں کائنات کی نشانیوں کا حوالہ دینا کافی سمجھا گیا۔ ابدی پس منظر میں، قرآن کا مخاطب وہ انسان تھا جو دور سائنس میں جی رہا ہو۔ اور دور سائنس کے انسان کو خدا اور اس کی باتوں پر یقین کرنے کے لئے کسی خارق عادت معجزہ کی ضرورت نہیں۔

معجزہ سے کیا مطلوب ہے۔ معجزہ سے مطلوب محض کوئی حیران کن کرشمہ دکھانا نہیں بلکہ دعوت حق کو مخاطب کے لئے آخری طور پر ثابت شدہ بنانا ہے۔ دعوت کی موافقت میں ایسے دلائل جمع کرنا ہے جس کے بعد مخاطب کے لئے انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ قدیم زمانہ میں اسی مقصد کے لئے خارق عادت معجزہ دکھایا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں یہی کام رموز فطرت کو منکشف کرکے سائنس نے انجام دے دیا ہے۔ واضح ہو کہ قرآن میں پیغمبرانہ معجزوں اور کائناتی نشانیوں کے لئے ایک ہی مشترک لفظ استعمال ہوا

ہے اور وہ آیت (نشانی) ہے۔

خدا کے دین کی دعوت اتمام حجت کی حد تک مطلوب ہے (النساء ۱۶۵) اسی اتمام حجت کے لئے قدیم زمانہ میں پیغمبروں کے ذریعہ معجزے دکھائے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ آج کی قوموں کے لئے بھی یہی مطلوب ہے کہ دین کی دعوت ان کے سامنے اتمام حجت کی حد تک پیش کی جائے۔ پھر موجودہ زمانہ میں اس کا ذریعہ کیا ہے جب کہ پیغمبروں کی آمد اب ختم ہو چکی ہے۔

جدید سائنسی انقلاب اسی سوال کا جواب ہے۔ جدید سائنسی انقلاب کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ دین حق کی تعلیمات کو عین اس معیار پر ثابت کیا جا سکے جو انسان کا اپنا تسلیم شدہ معیار ہے۔ اس سلسلے میں پہلی اہم ترین بات وہ ہے جو طریق استدلال (Methodology) سے تعلق رکھتی ہے۔ جدید سائنس نے مختلف میدانوں میں اپنی تحقیقات کے نتیجہ میں اس بات کا قطعی اقرار کیا ہے کہ استنباطی استدلال (Inferential Argument) اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا ہی معقول (Valid) ہے جتنا کہ براہ راست استدلال۔ یہی قرآن کا طرز استدلال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں علم انسانی نے قرآن کے طرز استدلال کو عین وہی درجہ دے دیا ہے جو علوم دینیہ سے باہر خود انسان کا تسلیم شدہ طرز استدلال ہے۔

جدید سائنس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ جو چیز پہلے صرف خارجی اطلاع کی حیثیت رکھتی تھی وہ اب خود انسانی دریافت بن چکی ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ انسان اپنی محدودیت (Limitations) کی وجہ سے کلی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی رہنمائی کے لئے وحی کی ضرورت ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ کائنات میں تحکمی نظام (Arbitrary System) ہے اس سے واضح طور پر خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ موجودہ دنیا کے ساتھ ایک اور غیر مرئی متوازی دنیا موجود ہے جس کا سائنسی نام اینٹی ورلڈ (Antiworld) ہے۔ اس سے واضح طور پر عالم آخرت کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ وغیرہ

اسی طرح مقناطیسی میدان (Magnetic Field) اور حرکت (Motion) کی یکجائی سے بجلی کی روشنی کا پیدا ہو نا ویسا ہی ایک حیرت ناک خدائی معجزہ ہے جیسا ہاتھ کو بغل میں رکھ کر نکالنے سے ہاتھ کا غیر معمولی طور پر چمک اٹھنا، بڑے بڑے جہازوں کا اتھاہ سمندروں اور نا قابل عبور فضاؤں میں انسان کو لے کر دوڑنا ویسا ہی دہشت خیز خدائی معجزہ ہے جیسا دریا کا پھٹ کر انسانوں کو پار ہونے کا راستہ دینا۔ مادہ سے متحرک مشینوں کا وجود میں آنا ویسا ہی عجیب خدائی معجزہ ہے جیسا لاٹھی کا سانپ بن کر چلنے لگنا۔

واقعہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کو جو معجزے دئے گئے وہ سب باعتبار مواد استدلال خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات میں وسیع پیمانہ پر موجود ہیں۔ مگر قدیم زمانہ میں چونکہ وہ انسان کے علم میں نہیں آئے تھے اس لئے خدا نے لوگوں کو خارق عادت معجزے دکھلائے۔ آج سائنسی تحقیقات نے فطرت کی پنہائیاں کھول دی ہیں اس لئے آج کے انسان کے یقین و ایمان کے لئے وہی کافی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سائنسی انقلاب خدا کے معجزہ کا ظہور ہے۔ اس کے ذریعہ خدا کی تمام باتیں اعجازی سطح پر ثابت ہو رہی ہیں۔ اگر ان سے گہری واقفیت حاصل کی جائے اور ان کو دعوت حق کی حمایت میں استعمال کیا جائے تو یہ دعوت کے ساتھ معجزہ کو جمع کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آج ہم حقیقی معنوں میں سائنسی دلائل کے ساتھ دین کی دعوت پیش کر سکیں تو زمین پر دوبارہ یہ واقعہ ظہور میں آئے گا کہ وقت کا لبید یہ کہہ دے کہ ـــــ کیا حقیقت کے اس طرح ثابت ہو جانے کے بعد بھی۔

سائنسی استدلال موجودہ زمانہ میں معجزاتی استدلال کا بدل ہے۔ جدید سائنس نے تمام دینی تعلیمات کو علمی طور پر ثابت شدہ یا کم از کم قابل فہم (Understandable) بنا دیا ہے۔ تاہم اسلام کے داعیوں نے ابھی تک اس کو واقعی معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ راقم الحروف نے اس موضوع پر دس سالہ مطالعہ کے بعد ۱۹۶۴ میں ایک کتاب مذہب اور جدید چیلنج) لکھی تھی جو عربی زبان میں الاسلام یتحدی کے نام سے شائع ہو چکی ہے، تاہم پچھلے ۲۰ سال میں علم کا دریا بہت آگے جا چکا ہے۔ چنانچہ اب میں اس موضوع پر انشاء اللہ دوسری جامع تر کتاب تیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جس کا انگریزی نام God Arises ہوگا۔ وبیداللہ التوفیق۔

موافق امکانات

دعوت دین کا کام انتہائی مشکل کام ہے۔ مگر اللہ نے اپنی خصوصی رحمت سے اس کو ہمارے لئے آسان بنا دیا ہے۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں کیں جس نے ہمارے لئے نئے مواقع کھول دئے۔ موجودہ زمانہ میں یہ تاریخی عمل اپنی آخری حد کو پہنچ گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ جو کام پہلے "خون" کے ذریعے کرنا پڑتا تھا، اس کو اب قلم کی سیاہی کے ذریعے انجام دیا جا سکے۔

اس عمل تیسیر کے تین خاص پہلو ہیں جن کی طرف قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں۔

۱۔ قرآن میں اہل ایمان کو یہ دعا تلقین کی گئی کہ ربنا ولا تحمل علینا اصراً کما حملتہ علی الذین من قبلنا (خدایا، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلی امتوں پر ڈالا تھا)

اگر الفاظ بدل کر اس آیت کی تفسیر کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت توحید کا جو کام پچھلے داعیوں کو پابندی رائے کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا، اس کو ہمیں آزادی رائے کے ماحول میں کرنے کا موقع عطا فرما۔ پہلے زمانہ میں یہ صورت حال تھی کہ توحید کا اعلان کرنے والے کو پتھر مارے جاتے۔ اس کو آگ میں ڈال دیا جاتا۔ اس کے جسم کو آرے سے چیر دیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے زمانہ میں حکومت کی بنیاد شرک پر قائم تھی۔ پچھلے زمانہ کے بادشاہ مفروضہ دیوتاؤں کے نمائندہ بن کر حکومت کرتے تھے۔ اس لئے جب کوئی شخص شرک کو بے بنیاد قرار دیتا تو اس زمانہ کے بادشاہوں کو محسوس ہوتا کہ وہ نظریاتی بنیاد ختم ہو رہی ہے جس پر انھوں نے اپنی حکومت کو قائم کر رکھا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا اس نے شرک کی اجتماعی حیثیت کو ختم کر کے اس کو ایک ذاتی عقیدہ بنا دیا۔ اب شرک الگ ہو گیا اور سیاسی ادارہ الگ۔ اس طرح وہ دور ختم ہو گیا جب کہ شرک لوگوں کے لئے اعلان توحید کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے ـــــ وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے جب توہم پرستی اور شخصی تقدس کا خاتمہ کیا تو نسلی بادشاہت کی بنیادیں بھی ہل گئیں۔ چنانچہ انسانی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جو بالآخر یورپ پہنچ کر جمہوریت (Democracy) کی صورت میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد شخصی حاکمیت کے بجائے عوامی حاکمیت کا اصول دنیا میں رائج ہوا اور آزادئ رائے کو ہر آدمی کا مقدس حق تسلیم کر لیا گیا۔ اس عالمی فکری انقلاب نے داعیان حق کے لئے یہ عظیم امکان کھول دیا کہ وہ غیر ضروری رکاوٹوں سے بے خوف ہو کر ساری دنیا میں حق کے اعلان کا کام انجام دے سکیں۔

۲. قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق (ہم عنقریب آفاق میں اور انفس میں ایسی نشانیاں دکھائیں گے جس سے کھل جائے کہ یہ سراسر حق ہے) قرآن کی اس آیت میں اس انقلاب کی طرف اشارہ ہے جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی دلیل ہے۔ تمام مخلوقات اپنے خالق کی صفات کا اظہار کر رہی ہیں۔ گویا کائنات قرآن کی دلیل ہے۔ تاہم یہ دلیل سائنسی انقلاب سے پہلے بڑی حد تک غیر دریافت شدہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ اس دریافت کے لئے ضروری تھا کہ چیزوں کی گہرائی کے ساتھ

تحقیق کی جائے۔ مگر شرک کا عقیدہ اس تحقیق کی راہ میں حائل تھا۔ مشرک انسان کائنات کے مظاہر کو پرستش کی چیز سمجھے ہوئے تھا۔ پھر وہ اس کو تحقیق کی چیز کیسے بناتا۔

توحید کے عمومی انقلاب نے اس رکاوٹ کو ختم کر دیا۔ اسلامی انقلاب کے بعد کائنات کے تقدس کا ذہن ختم ہو گیا۔ اب کائنات کے مظاہر پر آزادانہ غور و فکر شروع ہو گیا۔ یہ کام صدیوں تک عالمی سطح پر جاری رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ یورپ پہنچا۔ یورپ میں اس کو موزوں زمین ملی۔ یہاں اس نے تیزی سے ترقی کی۔ یہاں وہ عظیم فکری انقلاب ظہور میں آیا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

سائنسی تحقیق کے ذریعے کائنات کے جو حقائق معلوم ہوئے ہیں وہ قرآن کی دعوت کو قطعیات کی سطح پر ثابت کر رہے ہیں۔ اس کی تفصیل راقم الحروف نے اپنی کتاب مذہب اور جدید چیلنج (الاسلام یتحدی) میں کی ہے۔ جو لوگ زیادہ تفصیل کے خواہش مند ہوں وہ اس کتاب میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

۳۔ اس سلسلے میں تیسری چیز وہ ہے جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے —

عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً (قریب ہے کہ اللہ تم کو ایک مقام محمود پر کھڑا کرے)

محمود کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ تعریف دراصل تسلیم و اعتراف کی آخری صورت ہے۔ کسی کو ماننے والا جب اس کو ماننے کی آخری حد پر پہنچتا ہے تو وہ اس کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تسلیم شدہ نبوت کے مقام پر کھڑا کرے۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں بھی محمود تھے اور آخرت میں بھی محمود۔ شفاعت کبریٰ جس کا ذکر حدیث میں ہے وہ آخرت میں آپ کا مقام محمود ہے اور آپ کا تاریخی طور پر مسلم اور معترف ہونا دنیا میں آپ کا مقام محمود۔

خدا کی طرف سے ہر دور میں اور ہر قوم میں پیغمبر آئے۔ یہ سب سچے پیغمبر تھے۔ ان سب کا پیغام بھی ایک تھا۔ مگر مختلف اسباب سے ان پیغمبروں کو تاریخی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق آج کے انسان کے لئے ان پیغمبروں کی حیثیت نزاعی نبوت کی ہے نہ کہ مسلّمہ نبوت کی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت تاریخی طور پر ایک ثابت شدہ نبوت ہے۔ جب کہ دوسرے نبیوں کی نبوت تاریخی طور پر ثابت شدہ نہیں۔ اس بنا پر آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم تسلیم شدہ (Established) نبوت کی سطح پر دین کی دعوت دے سکیں۔ جب کہ اس سے پہلے ہمیشہ متنازعہ (Controversial) نبوت کی سطح پر دین کی دعوت دینی پڑتی تھی۔

ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیائے (اسلامی نام: محمد عزیز الدین) ہندستان کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو تھے۔ وہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر چٹو پادھیائے کو حق کی تلاش ہوئی۔ اس غرض سے انھوں نے ہندی، انگریزی، جرمن، فرانسیسی وغیرہ زبانیں سیکھیں۔ انھوں نے تمام مذاہب کا مطالعہ کیا۔ مگر وہ کسی پر مطمئن نہ ہوسکے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے پایا کہ یہ تمام مذاہب تاریخی معیار پر ثابت نہیں ہوتے۔ پھر کس طرح ان کی واقعیت پر یقین کیا جائے اور ان کو مستند سمجھا جائے۔

آخر میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اسلام کی تعلیمات آج بھی اپنی اصل صورت میں پوری طرح محفوظ ہیں۔ اسلام کی شخصیات مکمل طور پر تاریخی شخصیات ہیں نہ کہ دیو مالائی شخصیات۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے پایا کہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں کوئی چیز مبہم اور دھندلی نہیں۔ اور نہ پراسرار یا دیومالائی ہے، جیساکہ مثال کے طور پر، زرتشت اور شری کرشن کے یہاں، حتی کہ بدھا اور مسیح کے یہاں ہے۔ دیگر پیغمبروں کے وجود تک کے بارہ میں اہل علم نے شبہ کیا ہے۔ حتی کہ انکار کیا ہے مگر جہاں تک میں جانتا ہوں، پیغمبر اسلام کے بارہ میں کوئی یہ جرأت نہ کرسکا کہ ان کو توہماتی عقیدہ یا پریوں کی کہانی کہہ سکے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیائے کہتے ہیں:

Oh, what a relief to find, after all,
a truly historical Prophet to believe in.

اُف، کیسا عجیب تسکین کا سامان ہے کہ بالآخر آدمی واقعی معنوں میں ایک تاریخی پیغمبر کو پالے جس پر وہ ایمان لاسکے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں مقام محمود (الاسراء ۷۹) کہا گیا ہے۔ نبوت تاریخی ہی کا دوسرا نام نبوت محمودی ہے۔ پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود پر کھڑا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسرے پیغمبروں کی طرح، تاریخی طور پر کوئی نامعلوم شخصیت یا غیر ثابت شدہ شخصیت نہیں ہوں گے، بلکہ آپ تمام انسانوں کے لئے پوری طرح ایک معلوم اور مسلّم شخصیت ہوں گے۔ آپ کی سیرت بھی ایک محفوظ سیرت ہوگی اور آپ کی تعلیم بھی ایک محفوظ تعلیم۔

یہ داعیان اسلام کے لئے موجودہ زمانہ میں بہت بڑا Advantage ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کے میدان میں وہ بلا مقابلہ کامیابی حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔

انسان پیدائشی طور پر اپنی فطرت میں خدا کی طلب لے کر پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کو سچائی کی تلاش
ہے۔ وہ انسانی علوم میں اپنی طلب کا جواب دریافت کرنا چاہتا ہے مگر وہ دریافت نہیں کر پاتا۔ پھر وہ
ب کا مطالعہ کرتا ہے تو پاتا ہے کہ موجودہ تمام مذاہب تاریخی پہلو سے غیر محفوظ ہیں۔ ان کو تاریخی
ریت (Historical credibility) کا درجہ حاصل نہیں۔ یہاں ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ
ناسے کہہ سکیں کہ تم جس چیز کی تلاش میں ہو وہ محفوظ اور مستند حالت میں ہمارے یہاں موجود ہے۔
روں کے پاس صرف غیر تاریخی پیغمبر ہیں جن کو وہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔ مگر اسلام کا پیغمبر مکمل
پر ایک تاریخی پیغمبر ہے۔ تاریخ کے مسلّمہ معیار کے مطابق آپ کے بارہ میں کسی قسم کا شک کرنے کی
ش نہیں۔ دوسروں کے پاس متنازعہ نبوت ہے اور اسلام کے پاس مسلّمہ نبوت۔

یہ اللہ تعالیٰ کی انتہائی عظیم نعمت ہے۔ اس نے ممکن بنا دیا ہے کہ خدا کے دین کی دعوت آج مسلّمہ
کی سطح پر دی جائے، جب کہ اس سے پہلے وہ صرف متنازعہ نبوت کی سطح پر دی جا سکتی تھی۔

مخالفانہ عمل کو ختم کرنا

موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کا کام دراصل جدید اقوام پر اتمام حجت کے ہم معنی ہے۔ یہ ایک
شان کام ہے۔ جس کے لئے عظیم الشان وسائل اور غیر معمولی موافق حالات درکار ہیں۔ یہ وسائل اور
ن مسلم ملکوں میں یقینی طور پر مل سکتے ہیں۔ مگر وہ اسی وقت مل سکتے ہیں جب کہ مسلم حکومتوں کو اسلامی
ن کا حریف نہ بنایا جائے۔

۱۸۹۱ کا واقعہ ہے کہ جاپان کے شہنشاہ میجی (۱۹۱۲ - ۱۸۶۸) کا ایک خط ترکی کے سلطان عبد الحمید
ملا۔ اس خط میں سلطان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مسلم مبلغین کو جاپان بھیجے تاکہ وہ وہاں کے لوگوں کو
سے واقف کرائیں۔ سلطان عبد الحمید نے اس اہم کام کے لئے سید جمال الدین افغانی کا انتخاب کیا
ن کو ہر طرح کے سرکاری تعاون کا یقین دلایا۔

مگر یہی سید جمال الدین افغانی جن کو سلطان عبد الحمید نے اس قدر احترام اور تعاون کا مستحق
ا، بعد کو اسی سلطان نے سید جمال الدین افغانی کو جیل میں بند کر دیا۔ حتی کہ جیل خانہ ہی میں ان کا انتقال
۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان کو معلوم ہوا کہ سید جمال الدین افغانی اس کے خلاف سیاسی سازش میں
ہیں۔ جمال الدین افغانی سلطان کو مغربی استعمار کا ایجنٹ سمجھتے تھے اور اس کو تخت سے بے دخل کر دینا
تھے۔ جو شخص جاپان میں اسلام کی تاریخ کا آغاز کرنے والا بن سکتا تھا وہ صرف جیل کے رجسٹر میں
ام کا اضافہ کر کے رہ گیا۔

یہی تمام مسلم حکمرانوں کا حال ہے۔ اگر آپ اسلامی دعوت کے کام میں مشغول ہوں تو وہ ہر طرح کا اعلیٰ تر
تعاون آپ کو دیں گے۔ لیکن اگر آپ ان کے خلاف سیاسی مہم چلائیں تو وہ آپ کو برداشت کرنے کے لیے تیار
نہیں ہوتے۔
بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں مسلسل سید جمال الدین افغانی کے اسوہ کو دہرایا جا رہا ہے۔ مسلما
کہیں ایک عنوان سے اور کہیں دوسرے عنوان سے، اپنے حکمرانوں کے خلاف سیاسی لڑائی میں مشغول ہ
حتی کہ آج "اسلامی دعوت" کا لفظ مسلم حکمرانوں کے لیے سیاسی اپوزیشن کے ہم معنی بن کر رہ گیا ہ
اس کی وجہ سے نہ صرف یہ نقصان ہوا ہے کہ اسلامی دعوت کی مہم میں مسلم حکومتوں کا بھرپور تعاو
حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ اگر کوئی شخص حکومت سے بے نیاز ہو کر ذاتی طور پر اس ذمہ داری کو ا
کرنا چاہے تو حکومت اس کو شبہہ کی نظر سے دیکھنے لگتی ہے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتی ہے
ضرورت ہے کہ مسلم حکمرانوں سے سیاسی منازعت کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے، خواہ وہ اسلام
نام پر ہو یا کسی اور نام پر۔ تاکہ ہر مسلم ملک میں اسلامی کارکنوں کو ان کی قومی حکومتوں کا تعاو
حاصل ہو اور اسلام کے احیاء کا کام بڑے پیمانہ پر شروع کیا جا سکے، غیر مسلموں میں اسلام کا پیغ
پہنچانے کے لئے بھی اور خود مسلمانوں کی اپنی تعمیر و اصلاح کے لئے بھی۔

افراد کار کی فراہمی

دعوت اسلامی کی ذمہ داری کو ادا کرنے اور موجودہ مواقع کو استعمال کرنے کے لئے افراد کار کی
ہے۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ منتخب لوگ مخصوص تربیت کے ذریعہ اس م
کے لیے تیار کئے جائیں۔ وہ دین میں تفقہ حاصل کر کے مختلف قوموں میں جائیں اور ان کو توحید کی تعلیم
اور آخرت سے آگاہ کریں (فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولین
قومھم اذا رجعوا الیھم، التوبہ ۱۲۲)
آج دنیا میں مسلمانوں کے بے شمار مدرسے اور تعلیم کے ادارے ہیں مگر ساری دنی
کوئی ایک مدرسہ بھی خاص اس مقصد کے لئے موجود نہیں جہاں خالص دعوتی ضرورت کے تح
لوگوں کی تعلیم و تربیت کی جائے تاکہ وہ وقت کی ضرورت کے مطابق تیار ہو کر موثر انداز میں
کے اوپر دعوت الی اللہ اور انذار آخرت کا کام کریں۔ آج کی ناگزیر ضرورت ہے کہ ایسی ایک تع
قائم کی جائے اور اس کو معیار کے مطابق بنانے کے لئے ہر وہ قیمت ادا کی جائے جو موجودہ حالا
ضروری ہے۔

افراد کار کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کو صرف " باعلم " نہیں بلکہ " بامقصد " ہونا
ہئے۔ مقصد کے بغیر علم صرف معلومات ہے۔ مگر علم جب مقصد کے ساتھ ہو تو وہ معرفت بن جاتا ہے۔ اگر ایک
تعلیم گاہ قائم ہو جہاں ڈگری یافتہ اساتذہ کے ذریعے لوگوں کو قدیم و جدید علوم پڑھا دیے جائیں تو
اس بنا پر وہ مطلوبہ داعی نہیں بن جائیں گے۔ ضروری ہے کہ ان کے سینہ میں مقصد کی آگ لگی ہوئی ہو۔
ں کہ مقصد ہی لوگوں کے اندر وہ اعلیٰ فکر اور اعلیٰ کردار پیدا کرتا ہے جس کے ذریعے وہ دعوت
میدان میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں۔

خواہ کوئی دنیوی مقصد ہو یا دینی مقصد، دونوں ہی کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو ایک
مقصد کی خاطر ہر قسم کی ضروری قربانی دے سکیں۔

ٹائمس (The Times) لندن کا ایک قدیم اخبار ہے۔ اس اخبار میں ۱۹۰۰ میں ایک اشتہار
۔ اس اشتہار کے ساتھ نہ عورتوں کی تصویریں تھیں نہ کسی قسم کے بناوٹی تماشے۔ اس میں ایک چھوٹے
ر کھٹے میں حسب ذیل الفاظ درج تھے ——— ایک جوکھم کے سفر کے لئے آدمی درکار ہیں۔ معمولی رقم،
سردی، مکمل تاریکی کے لمبے مہینے، مسلسل خطرہ، محفوظ واپسی مشتبہ۔ کامیابی کی صورت میں عزت
عتراف :

Men wanted for Hazardous Journey. Small wages, bitter cold, long months of complete darkness, constant danger, safe return doubtful. Honour and recognition in case of success.

—Sir Ernest Shackleton

ہار قطب جنوبی کی مہم کے لئے تھا۔ اس کے جواب میں اتنی زیادہ درخواستیں آئیں کہ ذمہ داروں کو ان میں سے
ب کرنا پڑا۔ اسی قسم کے بلند ہمت لوگ تھے جو مغرب میں سائنسی انقلاب لاتے اور اہل مغرب کے
عالمی قیادت کی راہ ہموار کی۔

مذکورہ بالا مثال ایک دنیوی مثال تھی۔ یہی معاملہ ان لوگوں کا بھی ہے جنھوں نے اسلام کی تاریخ
۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصار مدینہ کے نمائندہ افراد سے رسول اللہ صلے اللہ کی گفتگو اس کی
یاں مثال پیش کرتی ہے۔ یہاں ہم سیرۃ ابن ہشام کا ایک حصہ نقل کرتے ہیں :

کعب ثم خرجنا الی الحج و واعدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العقبۃ من اوسط ایام
التشریق فلما فرغنا من الحج وکانت اللیلۃ التی واعدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکنا
من معنا من قومنا من المشرکین امرنا... قال فنمنا تلک اللیلۃ مع قومنا فی رحالنا حتی اذا
ثلث اللیل خرجنا من رحالنا لمیعاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نتسلل تسلل القطا

مستخفين حتى اجتمعنا فى الشعب عند العقبة ونحن ثلاثة وسبعون رجلا ومعنا امرأتان من نسائنا ۴۹

قال ابن اسحاق وحدثنى عاصم بن عمر بن قتادة ان القوم لما اجتمعوا لبيعة رسول الله صلى الله عليه وسلم قال العباس بن عبادة بن نضلة الانصارى يا معشر الخزرج هل تدرون علام تبايعون هذا الرجل قالوا نعم قال انكم تبايعونه على حرب الاحمر والاسود من الناس فان كنتم ترون انكم اذا نهكت اموالكم مصيبة واشرافكم قتل اسلمتموه فمن الآن فهو والله ان فعلتم خزى الدنيا والآخرة وان كنتم ترون انكم وافون له بما دعوتموه اليه على نهكة الاموال وقتل الاشراف فخذوه فهو والله خير الدنيا والآخرة قالوا فانا ناخذه على مصيبة الاموال وقتل الاشراف فما لنا بذلك يا رسول الله ان نحن وفينا قال الجنة قالوا ابسط يدك فبسط يده فبايعوه (۵۵) سيرة النبى لابى محمد عبد الملك بن هشام الجزء الثانى ..

اسی قسم کے باشعور اور باہمت اصحاب تھے جنہوں نے تاریخ میں شرک کے تسلسل کو ختم کیا اور انسانی تاریخ کا رخ کو بدل دیا۔ آج دوبارہ تاریخ کو وہی حرکت دینے کی ضرورت ہے جو ہمارے اسلاف نے اپنے زمانہ میں دیا تھا۔ انھوں نے شرک کا دور ختم کر کے توحید کا دور شروع کیا۔ اب ہم کو الحاد کا دور ختم کر کے دوبارہ توحید کا دور انسانی تاریخ میں لانا ہے۔ یہ ایک بہت اعلیٰ کام ہے۔ اور اس کے لئے اعلیٰ افراد انتہائی طور پر ضروری ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جہاں تعلیم و تربیت کے ذریعہ ایسے افراد تیار کئے جائیں۔ ڈاکٹر فلپ۔ کے ہٹی کے الفاظ میں، آج اسلام کو دوبارہ ایک ہیروؤں کی نرسری (Nursery of heroes) درکار ہے۔ اس کے بغیر یہ اہم کام انجام نہیں پا سکتا۔ مذکورہ درسگاہ گویا اسی قسم کی ایک نرسری ہوگی جہاں دعوت اسلامی کے ہیرو تیار کئے جائیں۔

دعوتی مرکز کا قیام

اوپر میں نے ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیا (اسلامی نام محمد عزیز الدین) کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ۱۹۰۴ کے لکچر میں قدیم حیدرآباد میں کہا تھا:

I feel sure, that if a comprehensive Islamic mission were started in Hyderabad (India) to preach the simple and sublime truths of Islam to the people of Europe, America and Japan, there would be such rapid and enormous accession to its ranks as has not been witnessed again ever since the first centuries of the Hejira. Will you,. therefore, organise a grand central Islamic Mission here in Hyderabad and open branches in Europe, America and in Japan? *Why have I Accepted Islam*, Dr Nishikanta Chattopadhya.

مجھ کو یقین ہے کہ اگر حیدر آباد میں ایک مکمل اسلامی مشن شروع کیا جائے جس کا مقصد اسلام کی صاف اور سادہ سچائیوں کی تبلیغ ہو اور اس کو یورپ، امریکہ اور جاپان کے لوگوں تک پہنچایا جائے تو اسلام اتنی تیز اور عظیم سطح سے نفوذ کرے گا جس کی مثال پہلی صدی ہجری کے بعد دوبارہ نہیں دیکھی گئی۔

کیا آپ لوگ اسلامی مشن کا ایک عظیم مرکز حیدر آباد (ہندستان) میں بنائیں گے جس کی شاخیں یورپ امریکہ اور جاپان میں ہوں۔ (واضح ہو کہ حیدر آباد کا لفظ یہاں محض اتفاقی ہے۔ اس سے مراد کوئی بھی مناسب شہر ہے نہ کہ صرف حیدر آباد)

ایک سعید مسلم روح نے ۸۰ سال پہلے یہ بات کہی تھی۔ مگر بد قسمتی سے ابھی تک یہ واقعہ نہ بن سکی۔ آج سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسا عظیم دعوتی مرکز قائم کیا جائے جو تمام جدید وسائل سے لیس ہو۔ جہاں ہر قسم کے ضروری دعوتی اور تربیتی شعبے قائم ہوں۔ اور اسی کے ساتھ وہ ہر قسم کی سیاست اور ہر قسم کے قومی جھگڑوں سے الگ ہو کر کام کرے۔ ایک اعلیٰ دعوتی مرکز کے ساتھ اگر یہ چیزیں جمع کر دی جائیں تو یقینی ہے کہ اسلام کی وہ نئی تاریخ دوبارہ بننا شروع ہو جائے گی جس کا ہم مدت سے انتظار کر رہے ہیں مگر وہ ابھی تک ظہور میں نہ آسکی۔

نوٹ : یہ مقالہ (عربی زبان میں) الجامعۃ الاسلامیہ (مدینہ منورہ) کے قاعۃ الکبریٰ میں ۲ مارچ ۱۹۸۴ کو پڑھ کر سنایا گیا۔

ایجنسی: ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

'Introduction to Islam' Series

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. The first pamphlet shows that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet is an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of Paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to Hell-fire.

Price per set: Rs 24.00

Maktaba Al-Risala

C-29 Nizamuddin West New Delhi 110013

Issue No. 71

AL-RISALA MONTHLY
C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	15/-
پیغمبر انقلاب	25/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
آخری سفر	3/-
حقیقت حج	2/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

بلند مقام ہمیشہ اپنے آپ کو بلند کرنے سے ملتا ہے
نہ کہ نعرے اور جھنڈے کو بلند کرنے سے

اگست ۱۹۸۴ء قیمت فی پرچہ — تین روپے شمارہ ۹۳

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ھدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

سی - ۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان ·
اُردو، انگریزی میں شائع ہوتا ہے

اگست ۱۹۸۴ء ▢ . شمارہ ۹۳

زرِ تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی 'AL-RISALA MONTHLY' لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

فہرست

کہاں بولے گی	۲
قدرت کا قانون	۳
کائنات کو پڑھئے	۴
ہر چیز عجیب	۵
کوئی بچا نہ سکے گا	۶
زوال کی علامت	۷
ترقی کا راز	۸
قدرت کی مثال	۹
کہاں سے کہاں تک	۱۰
اپنے ذہن کا قصور	۱۱
غیر مشرکین کا شرک	۱۲
خدا کا داعی	۱۴
گروہ بندی	۱۵
ایک اور لفظ	۱۶
کیسا عجیب	۱۸
سبق آموز	۱۹
اختلافات	۲۱
اپنی غلطی	۲۳
کامیابی اپنے ہاتھ میں	۲۴
ائمہ کے اقوال	۲۸
الفاظ کا فتنہ	۲۹
اسلامی انقلاب	۳۰
حیوانیت کی سطح پر	۳۵

کھال بولے گی

ڈاکٹر آرلین کارنی (Arlene Carney) امریکہ کی الینائز یونیورسٹی میں سمعیات کے ماہر ہیں ان کی تحقیق یہ ہے کہ انسان کے گرد و پیش جو آوازیں بلند ہوتی ہیں وہ انسان کی کھال پر اسی طرح نقش ہوتی رہتی ہیں جس طرح ریکارڈ کے اوپر آواز نقش ہو جاتی ہے۔ پروفیسر موصوف نے تجربات کے بعد بتایا ہے کہ مخصوص آلات کے ذریعہ کھال پر منقوش لہروں کو دہرایا جاسکتا ہے ٹھیک اسی طرح جیسے ریکارڈ کی آواز کو گراموفون میں دہرایا جاتا ہے۔

پروفیسر موصوف نے اس کو کھال کی آواز (Skin speech) کا نام دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کے کان کا پردہ خراب ہو گیا ہو اور وہ آوازوں کو صحیح طور پر پکڑ نہ پاتا ہو وہ مخصوص الکٹرانک آلات کے ذریعہ اپنی کھال کو اپنے کان کا بدل بنا سکتے ہیں اور کھال پر مرتسم آواز کی لہروں کے ذریعہ اسی طرح بات کو سن سکتے ہیں جس طرح کان کے ذریعے کوئی شخص سنتا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ مئی ۱۹۸۴)

اس تحقیق کو سامنے رکھئے اور پھر قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ کی ان آیتوں کو پڑھئے جن میں بتایا گیا ہے کہ:

" اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف لائے جائیں گے۔ پھر جب وہ آجائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں سب ان کے اعمال کی گواہی دیں گی۔ وہ لوگ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے کیوں ہمارے خلاف گواہی دی۔ وہ جواب دیں گی کہ اللہ نے ہم کو گویائی دی ہے جس طرح اس نے ہر چیز کو گویائی دی ہے۔ اور اسی نے تم کو پہلی بار پیدا کیا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور تم دنیا میں اپنے آپ کو اس سے چھپا نہ سکتے تھے کہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں تمہارے خلاف گواہی نہ دیں مگر تم نے گمان کیا کہ اللہ کو اس کی خبر ہی نہیں جو تم کرتے ہو۔ اور تمہارے اسی گمان نے جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تم کو برباد کیا، پھر تم گھاٹا اٹھانے والوں میں ہو گئے (حم السجدہ ۲۳ - ۲۰)

امریکی پروفیسر کی مذکورہ تحقیق نے آج کے انسان کے لئے اس بات کو قابل فہم بنا دیا ہے کہ کس طرح انسان کی کھال اس کے اعمال کا ریکارڈ ہے اور وہ قیامت کے دن انسان کے خلاف ایسی گواہ بن جائے گی جس کو جھٹلانا کسی طرح ممکن نہ ہو۔

یہ دریافت ایک طرف قرآن کے کتاب خداوندی ہونے کا ایک حیرت انگیز ثبوت ہے۔ دوسری طرف یہ ایسی سنگین حقیقت ہے کہ اگر وہ کسی کے دل میں بیٹھ جائے تو اس سے ظلم اور سرکشی کا مزاج چھین لے۔

قدرت کا قانون

ہیری ایمرسن فاسڈک نے زندگی کی ایک حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ــــ کوئی بھاپ یا گیس اس وقت تک کسی چیز کو نہیں چلاتی جب تک اس کو مقید نہ کیا جائے۔ کوئی نیاگرا اس وقت تک روشنی اور طاقت میں تبدیل نہیں ہوتا جب تک اس کو سرنگ میں داخل نہ کیا جائے۔ کوئی زندگی اس وقت تک ترقی نہیں کرتی جب تک اس کو رخ پر نہ لگایا جائے، اس کو وقف نہ کیا جائے اس کو منظم نہ کیا جائے۔

No steam or gas ever drives anything until it is confined. No Niagara is ever turned into light and power until it is tunnelled. No life ever grows until it is focused, dedicated, disciplined.
Harry Emerson Fosdick, *Living Under Tension*

قدرت کا ایک ہی قانون ہے جو زندہ چیزوں میں بھی رائج ہے اور غیر زندہ چیزوں میں بھی وہ یہ کہ ہر مطلوب چیز کو حاصل کرنے کی ایک قیمت ہے، جب تک وہ قیمت ادا نہ کی جائے مطلوب چیز حاصل نہیں ہوتی۔

یہاں ابھرنے کے لئے پہلے دبنا پڑتا ہے۔ یہاں ترقی کے درجہ تک پہنچنے کے لئے بے ترقی پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ یہاں دوسروں کے اوپر غلبہ حاصل کرنے کے لئے دوسروں سے مغلوبیت کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔

ایک بات بظاہر سادہ سی ہے مگر انسان اپنی عملی زندگی میں اکثر اسے بھول جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم اپنی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں ہیں بلکہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں ہیں۔ جب صورت حال یہ ہے کہ یہ دنیا خدا کی دنیا ہے تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم خدا کے بنائے ہوئے قوانین کو جانیں اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کریں۔ اس کے سوا کسی اور تدبیر سے یہاں ہم اپنے لئے جگہ حاصل نہیں کر سکتے۔

جو لوگ چاہتے ہوں کہ ان پر یہ مراحل نہ گزریں اور اس کے بغیر وہ ترقی اور کامیابی کے مقام کو پالیں ان کو اپنی پسند کے مطابق دوسری دنیا بنانی پڑے گی۔ کیوں کہ خدا نے جو دنیا بنائی ہے اس میں تو ایسا ہونا ممکن نہیں۔

کائنات کو پڑھئے

قرآن کتاب کائنات کی ڈکشنری ہے۔ یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے یدبر الامر یفصل الآیات (الرعد ۲) یعنی خدا کائنات کا انتظام کر رہا ہے اور قرآنی آیتوں کے ذریعہ اس کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

ایک شخص کائنات کو دیکھتا ہے۔ وہ اپنی نافہمی سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ کائنات ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے۔ یہاں قرآن اس کو بتاتا ہے کہ نہیں، کائنات ایک صاحب ارادہ کے ارادی منصوبہ کے تحت وجود میں آئی ہے۔

ایک شخص دیکھتا ہے کہ کائنات بظاہر کچھ اسباب کے تحت چل رہی ہے۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ کائنات ایک عظیم خود چالو مشین ہے۔ یہاں قرآن اس کو بتاتا ہے کہ نہیں، کائنات کو خدا کے فرشتے خدا کے حکم سے چلا رہے ہیں

ایک شخص انواع حیات کے بعض ظاہری پہلوؤں کی بنا پر یہ رائے قائم کرلیتا ہے کہ زندگی کی تمام قسمیں سلسلۂ ارتقاء کے تحت وجود میں آئی ہیں۔ یہاں قرآن اس کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کو بتاتا ہے کہ نہیں۔ زندگی کی مختلف قسمیں ایک خالق کی تخلیق سے ظہور میں آئی ہیں۔

کائنات کو دیکھئے تو یہاں آرٹ اور کمال کے حیرت انگیز نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ایٹم رقص کر رہے ہیں۔ یہاں دو بے جان مادے باہم مل کر تیسری نئی چیزیں ڈھل جاتے ہیں۔ یہاں بے شمار ستارے سفر کر رہے ہیں اور ان کی رفتار میں ایک سکنڈ کا بھی فرق نہیں ہوتا۔ یہاں ایک بیج سرسبز درخت کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ یہاں زندگی کا سیلاب چاروں طرف رواں دواں نظر آتا ہے۔ اس قسم کے بے شمار عمل یہاں جاری ہیں مگر تمام عمل خاموشی کے ساتھ انجام پا رہے ہیں۔ کائنات کا کوئی کردار اپنا تعارف نہیں کراتا، وہ انسان سے ہم کلام ہو کر اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔

آدمی یہ دیکھ کر سوچنے لگتا ہے کہ کائنات شاید گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ ہے۔ یہاں قرآن اس کو بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا کے ہنگامے بے مقصد نہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ دنیا کی معنویت پوری طرح ظاہر ہوگی۔ اس وقت تمام چیزیں بول پڑیں گی جس طرح خاموش ریکارڈ گراموفون کی سوئی کے نیچے آتے ہی بولنے لگتا ہے۔ اس دن ان تمام کمیوں کی تلافی ہوگی جو موجودہ دنیا میں نظر آتی ہیں۔ انسان اپنے تمام سوالات کا جواب پالے گا۔ ہر انسان اپنے اس انجام کو پہنچ جائے گا جہاں باعتبار حقیقت اسے پہنچنا چاہئے۔

ہر چیز عجیب

موجودہ قسم کی چھتری لندن میں سب سے پہلے ۱۷۴۹ میں بنائی گئی۔ اس وقت اس کا تعارف ایک شخص نے ان الفاظ میں کرایا تھا: (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ مئی ۱۹۸۴)

> When opened it was like a small tent, and when shut it was all curiously jointed and would fold up to the length of a man's hand.

جب اس کو کھولا جائے تو وہ ایک چھوٹے خیمہ کی مانند ہو جاتی ہے اور جب اس کو بند کیا جائے تو حیرت انگیز طور پر وہ ساری سمٹ جاتی ہے اور لمبائی میں ایک آدمی کے ہاتھ کے برابر ہو جاتی ہے۔

موجودہ صدی کی ابتدا میں ہندستان کے ایک دیہات میں ایک زمین دار کے یہاں پہلی بار ہینڈ پمپ لگایا گیا۔ جب اس کو چلایا گیا اور زمین کے نیچے سے وہ پانی کھینچ کر نکالنے لگا تو ایک دیہاتی عورت نے اس کو دیکھ کر کہا: "آدمی صرف موت سے ہارا ہے"

یعنی آدمی سب کچھ کر سکتا ہے۔ صرف ایک موت ایسی چیز ہے جس پر قابو پانا اس کے اختیار میں نہیں۔

دو سو سال پہلے چھتری اور ہینڈ پمپ آدمی کو انتہائی عجیب معلوم ہوتے تھے۔ مگر آج آدمی چھتری اور ہینڈ پمپ کو دیکھتا ہے اور اس کے اندر کوئی استعجاب پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو دیکھتے دیکھتے اب وہ اس کا عادی بن چکا ہے۔ کوئی چیز جب بار بار آدمی کے سامنے آتی ہے تو وہ اپنا انوکھا پن کھو دیتی ہے۔ اس کے بعد انتہائی عجیب چیز بھی اس کے لئے غیر عجیب بن کر رہ جاتی ہے۔

یہی معاملہ خدا کی تخلیقات کا ہے۔ موجودہ دنیا میں جو چیز بھی ہے نہایت عجیب ہے۔ خواہ وہ ایک چھوٹی پتی ہو یا عظیم سمندر ہو، ایک بے نور ذرہ ہو یا روشن آفتاب ہو۔ مگر آدمی پیدا ہوتے ہی ان کو دیکھتا ہے اور ساری زندگی ہر روز دیکھتا رہتا ہے۔ اس طرح برابر دیکھتے رہنے کی وجہ سے ان کا عجوبہ پن اس کی نظر میں ختم ہو جاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر آدمی کے اندر استعجاب پیدا نہیں ہوتا۔ اگر انھیں چیزوں میں سے کسی چیز کو وہ اچانک ایک روز دیکھے تو وہ احساس حیرت میں ڈوب جائے۔

یہی موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان ہے۔ اس کو ایک درخت کو اس طرح دیکھنا ہے جیسے کہ وہ پہلی بار اچانک اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ہو۔ اس کو ایک سورج کو اس طرح دیکھنا ہے جیسے کہ وہ بالکل پہلی بار اس کے سامنے چمک اٹھا ہو۔ ایک چڑیا کے نغمہ کو اسے اس طرح سننا ہے جیسے کہ اس کے کان پہلی بار اس کے چہچہے سے آشنا ہوئے ہوں۔

کوئی بچا نہ سکے گا

مغربی ملکوں کے لوگ عام طور پر گائے کا گوشت کھانا بہت پسند کرتے ہیں۔ آجکل کے زمانہ میں مغرب کے لوگ کثرت سے ہندستان آتے ہیں۔ یہ لوگ جب یہاں کسی "فائیو اسٹار ہوٹل" میں ٹھہرتے ہیں تو وہ توقع رکھتے ہیں کہ ہوٹل کی طرف سے ان کو ان کی تمام مطلوب چیزیں فراہم کی جائیں گی جن میں اپنی پسند کی غذا بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ چنانچہ ہوٹل والے اپنے بیرونی گاہکوں کے سامنے جو مینو کارڈ پیش کرتے ہیں ان کی غذائی فہرست میں گائے کا گوشت (Beef steak) کا لفظ بھی شامل رہتا ہے۔

چوں کہ ہندستان میں گائے کا گوشت ممنوع ہے، اس کی خبر اخبار میں چھپی تو اس پر سخت تنقید ہوئی۔ ایک ایم پی نے پارلمنٹ میں اس پر سوال کر دیا۔ حکومت ہند نے اس سلسلے میں ہوٹل والوں سے باز پرس کی۔ ہوٹل والوں کا جواب یہ تھا کہ ہم اپنے گاہکوں کو "بیف" دیتے ہیں اور بیف انگریزی ڈکشنری کے مطابق گائے اور بھینس دونوں کے گوشت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اخباری رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۵ مئی ۱۹۸۴) کے مطابق حکومت ہند کے وزیر سیاحت نے ۴ مئی ۱۹۸۴ کو پارلمنٹ میں بیان دیا۔ انھوں نے آکسفرڈ ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی پڑھ کر سنائے جس میں بھینس کا گوشت بھی شامل تھا نہ کہ صرف گائے یا بیل کا گوشت:

> The minister read out the Oxford dictionary meaning of "beef", which included the flesh of buffalo as well, and not merely that of cow or ox.

اس خبر پر اخبار نے یہ سرخی لگائی ہے: "ڈکشنری نے فائیو اسٹار ہوٹل کو بچا لیا" موجودہ دنیا میں اس قسم کے واقعات دیکھ کر آدمی غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ موت کے بعد کی دنیا بھی ویسی ہی ایک دنیا ہوگی جیسی موت سے پہلے کی دنیا۔ جس طرح "ڈکشنری" موجودہ دنیا میں ہم کو بچالیتی ہے، اسی طرح وہاں بھی ہم کوئی نہ کوئی ڈکشنری پالیں گے جو ہم کو وہاں کی آفتوں سے بچالے۔ مگر اس سے بڑی بھول اور کوئی نہیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی کا معاملہ اپنے جیسے انسان سے ہے اس لئے وہ لفظی کرتب دکھا کر اس سے بچ جاتا ہے۔ مگر آخرت میں اس کا معاملہ مالک کائنات سے ہوگا۔ اور مالک کائنات کے سامنے کسی قسم کا کوئی کرتب کام آنے والا نہیں۔

آخرت کی دنیا میں حقیقی تدبیر آدمی کو بچائے گی نہ کہ کوئی لفظی تدبیر۔

زوال کی علامت

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ انھوں نے ایک قبیلہ کو دیکھا کہ اس کے افراد اکثر دبلے اور کمزور نظر آتے ہیں۔ آپ نے قبیلہ کے کچھ لوگوں سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ تم لوگ اتنے لاغر دکھائی دیتے ہو (ما لکم ضویتم)

انھوں نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین، اس کا سبب ہماری ماؤں کا ہمارے باپوں سے قریب ہونا ہے (قرب امہاتنا من آبائنا یا امیر المومنین) یعنی ہمارے قبیلہ کے لوگ عرصہ دراز سے یہ کر رہے ہیں کہ وہ صرف آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہماری نسلیں کمزور ہوگئی ہیں۔

حضرت عمر نے یہ سن کر فرمایا کہ اجنبیوں میں رشتہ کرو اور شریف بنو۔ (اغربوا انجبوا) یعنی دور دور شادیاں کرو تو تمہارے یہاں طاقت ور اولاد پیدا ہوگی۔

مسلمانوں میں بعد کے زمانہ میں نسب کی حفاظت کا جو ذہن پیدا ہوا اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا مثلاً سادات صرف سادات میں شادیاں کرنے لگے۔ اگر اس کی کوئی اہمیت ہوتی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس پر عمل فرماتے۔ حالاں کہ معلوم ہے کہ آپ نے مختلف قبائل اور مختلف نسل کے لوگوں سے نکاح کئے۔ پچھلے انبیاء کے یہاں بھی اس کا اہتمام نہیں ملتا۔ مثلاً حضرت ابراہیم اور آپ کے صاحبزادہ نے خاندان سے باہر شادیاں کیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نسب کی حفاظت کا یہ تصور سراسر قومی تصور ہے اور جھوٹے فخر کی پیداوار ہے۔ جب حقیقت باقی نہیں رہتی تو آدمی ظاہر کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ دور زوال کی علامت ہے۔ دور زوال میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ حقیقت کے بجائے ظاہری چیزوں کو اہم سمجھ لیتے ہیں اور اسی کی حفاظت میں لگ جاتے ہیں۔

کسی شخص یا قوم کی ناکامی کا سبب ہمیشہ یا تو یہ ہوتا ہے کہ اس نے بیرونی حالات و مشکلات کا کمتر اندازہ کر کے اقدام کر دیا تھا یا اس نے اپنے حصہ کی ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا نہیں کیا۔ ان دونوں میں سے کوئی سبب ایسا نہیں جس کا تعلق آدمی کی اپنی ذات کے سوا کسی اور سے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ناکامی کے بعد اپنے سے باہر اس کی وجہ تلاش کرنا ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہے۔ یہ اس وقت کو مزید ضائع کرنا ہے جس کا ایک حصہ پہلے ہی اپنی نادانی سے ضائع ہو چکا ہے۔

ترقی کا راز

ابن بطوطہ (۷۷۹-۷۰۳ھ) چودھویں صدی عیسوی کا مشہور عرب سیاح ہے۔ اس کا پورا نام شمس الدین محمد بن عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم اللواتی ہے۔ وہ مغرب کے شہر طنجہ میں پیدا ہوا۔ اس نے تین بار دنیا کے سفر کئے جن کی مجموعی مدت ۲۹ سال ہے۔ وہ جن ملکوں میں گیا ان میں مغرب، الجزائر، تونس، مصر، شام، فلسطین، حجاز، عراق، فارس، یمن، ایشیا مائنر، ترکی، خوارزم، بخارا، افغانستان سیلان، ملایا، انڈونیشیا، ہندستان، چین، جاوا، اندلس، جبرالٹر، مشرقی و مغربی افریقہ، سوڈان وغیرہ شامل ہیں۔

ابن بطوطہ نے ۱۳۲۵ء سے ۱۳۵۲ء کے دوران تین عالمی سفر کئے۔ ان سفروں کی مجموعی مسافت تقریباً ۷۵۰۰۰ میل ہے۔ ابن خلدون (۸۰۸-۷۳۲ھ) ابن بطوطہ کا ہم زمانہ تھا۔ اس نے اپنے مقدمہ میں مختصر طور پر ابن بطوطہ کا ذکر کیا ہے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفر کے حالات پر کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار۔ تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق یہ اہم کتاب آج اپنے موضوع پر انتہائی مشہور کتاب بن چکی ہے۔ تاہم ابتدائی پانچ سو سال تک وہ محض ایک مخطوطہ کی صورت میں الجزائر کے ایک کتب خانہ میں پڑی رہی۔ انیسویں صدی عیسوی میں جب فرانسیسیوں نے الجزائر پر قبضہ کیا تو وہ اس کتاب کو حاصل کر کے پیرس لے گئے۔ وہاں اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا گیا جو پہلی بار ۱۸۵۳ء میں حواشی کے ساتھ شائع ہوا۔

ابن بطوطہ کا سفرنامہ اصل عربی زبان میں پہلی ۱۸۷۱ میں قاہرہ سے شائع ہوا اور دوسری بار ۱۹۰۴ء میں۔ بعد کو اس کا ترجمہ روسی زبان میں اور یورپ کی اکثر زبانوں میں شائع کیا گیا۔
(الفیصل مئی ۱۹۸۴)

مغربی قوموں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حکومتوں کو مٹانے کے لئے ہر قسم کی کوشش کی۔ مگر عین اسی زمانہ میں انھوں نے مسلم کتب خانوں میں پڑی ہوئی بے شمار کتابوں کو اہتمام کے ساتھ چھاپا اور ان کے ترجمے کئے۔ انھوں نے سیاست کے معاملہ کو الگ رکھا اور علم کے معاملہ کو الگ۔ یہی کسی قوم کی زندگی کی پہچان ہے اور اسی میں قومی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

قدرت کی مثال

شکاریات کے ایک ماہر نے لکھا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ مئی ۱۹۸۴) کہ شیر اکثر اس وقت مردم خور بن جاتے ہیں جب کہ وہ اتنے بوڑھے ہو جائیں کہ وحشی جانوروں کو نہ پکڑ سکیں۔ مگر دس میں سے ۹ مردم خور شیر وہ ہیں جن کو غلط شکاری زخمی کر دیتے ہیں:

The big cats turn into man-eaters often when they are too old to hunt and trap wild animals. But nine times out of ten, they do so because a poacher has wounded them.

شیر اپنی فطرت کے اعتبار سے مردم خور نہیں۔ مگر وہ تمام جانوروں میں سب سے زیادہ "دشمن خور" ہے۔ شیر جس کو اپنا دشمن سمجھ لے اس کو وہ کسی حال میں نہیں بخشتا۔ عام حالات میں شیر کسی انسان کو دیکھتا ہے تو وہ کترا کر نکل جاتا ہے۔ لیکن ایسے شکاری جن کے پاس اچھے ہتھیار نہ ہوں اور اناڑی پن کے ساتھ شیر پر فائر کریں، وہ اکثر اس کو مار نہیں پاتے بلکہ زخمی کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی وہ شیر ہیں جو مردم خور بن جاتے ہیں، وہ "انسان" کو اپنا دشمن سمجھ لیتے ہیں اور جب بھی انسانی صورت میں کسی شخص کو دیکھ لیتے ہیں تو اس کو ختم کئے بغیر نہیں رہتے۔

یہ زندگی کا ایک قانون ہے۔ وہ جس طرح شیر اور انسان کے لئے درست ہے اسی طرح وہ انسان اور انسان کے لئے بھی درست ہے۔ ایک انسان کا معاملہ ہو یا ایک قوم کا معاملہ، دونوں حالتوں میں دنیا کا اصول یہی ہے۔ جس دشمن کو آپ ہلاک نہیں کر سکتے اس کو زخمی بھی نہ کیجئے۔ کیوں کہ زخمی دشمن آپ کے لئے پہلے سے بھی زیادہ بڑا دشمن ہوتا ہے۔

ایک شخص آپ کا دشمن ہو اور آپ کافی تیاری کے بغیر اس پر وار کریں تو یہ اپنی قبر خود اپنے ہاتھ سے کھودنا ہے۔ اس قسم کے اقدام کے پیچھے بے صبری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ وہ سوچ سمجھ کر منصوبہ بنائیں اور خاموش جدوجہد کے ذریعہ اپنے آپ کو مضبوط اقدام کے قابل بنائیں وہی وہ لوگ ہیں جو دشمن پر سطحی وار کر کے دشمن کو اور زیادہ اپنا دشمن بنا لیتے ہیں اور بعد کو شکایت اور احتجاج کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ حالاں کہ اس دنیا میں نہ جھوٹے اقدام کی کوئی قیمت ہے اور نہ جھوٹی شکایتوں کی۔

کہاں سے کہاں تک

۵ رمضان ۱۴۰۴ھ کو میں دہلی کے ایک جنازہ میں شریک ہوا۔ موت کے بعد مرنے والے شخص کو نہلایا گیا۔ اس کو نئے کپڑے کا کفن پہنایا گیا۔ لوگوں نے کھڑے ہو کر اس کی نماز جنازہ پڑھی اور پھر میت کو اپنے کاندھوں پر لے کر چلے۔ یہاں تک کہ قبر میں احترام کے ساتھ لٹا کر اس کو ڈھک دیا گیا۔

میں نے سوچا کہ ایک مردہ جسم کے ساتھ اتنے زیادہ اہتمام کا حکم اسلام نے کیوں دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم مٹی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، مگر اس کو عام مٹی کی طرح اِدھر اُدھر پھینک نہیں دیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ باقاعدہ انسان کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ "مٹی" کے ساتھ "انسان" جیسا معاملہ کرنے کا حکم مرنے والے کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ زندہ رہنے والے کے اعتبار سے ہے۔ مردہ انسان کے ذریعہ زندہ انسانوں کو سبق دیا جاتا ہے کہ بالآخر ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ زندہ لوگ مرنے والے کے روپ میں خود اپنے آپ کو دیکھیں۔ وہ موت سے پہلے موت کا تجربہ کریں۔

یہ تجربہ اس طرح بھی ممکن تھا کہ ایک مقرر دن کو کاغذ کا انسانی پتلا بنایا جائے اور اس کے ساتھ تمام رسوم ادا کر کے اس کو مٹی کے گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ اسلام نے اس تجربہ کو حقیقی بنانے کے لیے حقیقی انسان کے مردہ جسم کو استعمال کیا۔

ایک انسان ہماری طرح ایک زندہ انسان تھا۔ چلتے چلتے اس کے قدم جواب دے گئے۔ بولتے بولتے اس کی زبان بند ہو گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ لوگوں کے نزدیک اس کی جو قیمت تھی وہ سب اچانک ختم ہو گئی۔ اب خدا اس واقعہ کو استعمال کرتا ہے تاکہ اپنے جیسے ایک انسان کے ذریعہ لوگوں کو زندگی کا سبق یاد دلا دے۔

لوگ اس کو اہتمام کے ساتھ تیار کرتے ہیں اور پھر لے کر چلتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری مرحلہ میں پہنچ کر جب اس کو قبر کے گڑھے میں لٹا دیا جاتا ہے تو ہر آدمی یہ کرتا ہے کہ تین بار اپنے ہاتھ میں مٹی لے کر قبر میں ڈالتا ہے۔ پہلی بار مٹی ڈالتے ہوئے وہ کہتا ہے منہا خلقناکم (اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا) جب وہ دوسری بار مٹی ڈالتا ہے تو کہتا ہے وفیہا نعیدکم (اسی میں ہم تم کو دوبارہ ڈالیں گے) اور پھر تیسری بار مٹی ڈالتے ہوئے وہ کہتا ہے ومنہا نخرجکم تارۃ اخری (اور اسی سے ہم تم کو دوبارہ نکالیں گے)

یہ تین بار مٹی ڈالنا اس پورے قصہ کا کلائمکس ہے۔ اس طرح ایک زندہ واقعہ کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ انسان کیا ہے اور اس کا آخری انجام کیا۔

اپنے ذہن کا قصور

قرآن کی سورہ نمبر ۴ کی ایک آیت حسب ذیل ہے:

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا	کیا لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اور اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے
النساء ۸۲	

مولانا محمود حسن دیوبندی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جو تدبر اور فہم سے کام نہ لے وہ قرآن میں شبہات اور اختلافات کا وہم چلا سکتا ہے۔ مگر فہیم ایسا نہیں کر سکتا۔ دیکھو، جو اسی مقام میں تدبر نہ کرے وہ کہہ سکتا ہے کہ اول تو فرمایا قل کل من عند اللہ (کہو کہ سب اللہ کی طرف سے ہے) اور پھر فرما دیا وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک (اور تجھ کو جو برائی پہنچے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے) سو یہ تو تناقض اور اختلاف ہو گیا"

تفسیر قرآن، صفحہ ۱۱۷

انسان کا علم محدود ہے۔ اس لئے اکثر اوقات وہ ایسی رائے قائم کر لیتا ہے جو صرف اس کے ذہن میں ہوتی ہے۔ اس کے اپنے ذہن کے باہر اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اس لئے سنجیدگی اور ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ آدمی پوری طرح سمجھے بغیر کوئی رائے قائم نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ کوئی خبر معلوم ہو تو پہلے اس کی تحقیق کرو۔ جب بھی کسی کے بارہ میں کوئی ایسی بات سامنے آئے جس سے اس کی ذات یا اس کے کام کے متعلق بری رائے قائم ہوتی ہو تو محض ایک بار سن کر اس کو مان لینا صحیح نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ یا تو اس کے بارہ میں چپ رہے یا قابل اعتماد ذرائع سے اس کی تحقیق کرے۔ جب تحقیق سے بات پوری طرح ثابت ہو جائے اس کے بعد اس کو حق پہنچتا ہے کہ اس کو مانے یا اس کو بیان کرے۔

ضروری تحقیق کے بغیر کسی کے متعلق بری رائے قائم کرنا اللہ کے نزدیک گناہ ہے۔ اور دنیا میں اس کا نقصان یہ ہے کہ سماج کے اندر ایک دوسرے کے خلاف بے بنیاد غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ غیر ضروری شکایتیں وجود میں آتی ہیں۔ لوگوں کے دل ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں اور آپس میں ایسا اختلاف پیدا ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

غیر مشرکین کا شرک

قدیم زمانہ میں اللہ کے جو پیغمبر اٹھے ان سب کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ہر ایک کو ان کے مخاطبین نے رد کر دیا۔ ان کو گھیر جاتا، ان کی مخالفت میں ہر وہ جارحانہ کارروائی کی جو وہ کر سکتے تھے۔

یہ مخالفت اس قسم کی نہیں تھی جو موجودہ زمانہ میں ان ملکوں کی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ دکھائی دیتی ہے جہاں کوئی ڈکٹیٹر حکومت کے تخت پر قابض ہو۔ اس مخالفت کی وجہ سیاسی نہیں بلکہ تمام تر نفسیاتی تھی۔ لوگوں نے غیر خدا کے ساتھ اپنے قلبی جذبات کو وابستہ کر لیا تھا۔ وہ کسی غیر خدا کو عظمت اور تقدس کا مقام دئے ہوئے تھے۔ جب پیغمبر ایک خدا کی معبودیت کا اعلان کرتا اور دوسرے تمام معبودوں کو بے حقیقت قرار دیتا تو اس سے لوگوں کے دل پر چوٹ پڑتی، وہ اپنے بت کو لوٹتا ہوا دیکھ کر لڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔

قرآن سے یہ ثابت ہے کہ خدا کے جتنے پیغمبر آئے سب کا مشترک پیغام یہ تھا کہ اے لوگو، ایک خدا کو اپنا الٰہ بناؤ اور اسی کی عبادت کرو (اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ) یہ واضح طور پر ایک غیر سیاسی تعلیم تھی۔ اس سے مراد یہ تھا کہ آدمی صرف ایک خدا سے ڈرے اور اسی سے محبت کرے۔ صرف ایک خدا کو وہ اپنی عقیدت اور توجہ کا مرکز بنالے۔

کسی انسان کی زندگی میں اصل اہمیت کی چیز یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے سوچ اور جذبات کا مرکز کس کو بناتا ہے۔ جس ہستی کو آدمی اس طرح اپنا مرکز توجہ بنائے وہی اس کا معبود ہے۔ پیغمبر یہ بتانے کے لئے آئے کہ موجودہ دنیا میں جو شخص اپنی توجہات کا مرکز خدا کو بناتا ہے وہی ہدایت پر ہے اور موت کے بعد کی زندگی میں وہی کامیاب ہوگا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنی توجہات کا مرکز کسی اور کو بنائے وہی وہ شخص ہے جو راہ سے بے راہ ہو گیا۔ اس کے لئے آخرت میں خدا کا انعام پانا مقدر نہیں۔

خدا کے سوا جن چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنایا جاتا ہے وہ عام طور پر چند ہیں۔

۱۔ فطرت کے نمایاں مظاہر، مثلاً سورج، چاند، ستارے وغیرہ

۲۔ قوم کے اکابر۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو تاریخی اسباب کے تحت "بڑا" سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور پھر ان کے گرد عظمت و تقدس کی فرضی داستانیں جمع ہونے لگتی ہیں، یہاں تک کہ لوگوں کے ذہنوں میں ان کی ایک افسانوی تصویر بن جاتی ہے، جس کا ابتدائی حقیقی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

یہی معاملہ کبھی قومی تاریخ کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جن لوگوں کا ماضی شاندار رہا ہو، وہ بعد کے دور میں عام طور پر اپنی تاریخ کی پرستش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے ان کی قومی تاریخ حرکت کا سرچشمہ (Source of inspiration) بن جاتی ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے سچے مومن کے لیے اس کا عقیدۂ خدا اس کے لیے حرکت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

اس قسم کی تمام صورتیں شرک کی صورتیں ہیں۔ پیغمبر چونکہ غیر خدا کی پرستش کے تمام طریقوں کو غلط قرار دیتے ہیں اور ان کو بے بنیاد ثابت کرتے ہیں، اس لیے لوگ ان سے بگڑ جاتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کی مخالفت حقیقۃً اسی قسم کے جھوٹے معبودوں پر تنقید کی بنا پر ہوتی تھی نہ کہ کسی سیاسی وجہ سے۔
آج بھی یہ منظر ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ آج اگرچہ مظاہر فطرت کی پرستش کم ہو گئی ہے تاہم بقیہ دونوں پرستشیں پورے عروج پر ہیں۔ کہیں اپنے اکابر کی اور کہیں قومی تاریخ کی۔ آج بھی بے شمار لوگ مشرکانہ نفسیات میں مبتلا ہیں۔ خواہ بظاہر وہ اپنے آپ کو مشرک نہ مانتے ہوں۔
کسی شخص کا معبود کیا ہے، اس کی خاص پہچان یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ سب سے زیادہ کس کا تذکرہ کرتا ہے۔ ایک شخص سب سے زیادہ جس چیز کا تذکرہ کرتا ہو، جس کو بڑا بنا کر کے اسے لذت ملتی ہو، جس کی یاد سے اس کی روح غذا پاتی ہو، وہی اس کا معبود ہے۔ جس شخص کی زندگی میں یہ مقام خدا کو حاصل ہو وہ موحد ہے اور جس کی زندگی میں خدا کے سوا کوئی اور یہ مقام حاصل کر لے وہ مشرک۔
لوگ خدا کے سوا جس کو اپنا معبود بنالیں اس کے خلاف وہ کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے وہ اس وقت تک بالکل ٹھیک دکھائی دیتے ہیں جب تک ان کے مفروضہ معبودوں کو کچھ نہ کہا گیا ہو مگر جیسے ہی ان کی محبوب شخصیت پر تنقید کی جائے یا ان کی پرفخر تاریخ پر کوئی اظہار رائے کیا جائے، وہ فوراً بھڑ اٹھتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں پتھر کے بت ہوا کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں لوگوں نے نفسیاتی بت بنا لئے ہیں۔ آج کا انسان اپنے نفسیاتی بت کے ٹوٹنے پر اسی طرح شدید ردعمل کا اظہار کرتا ہے جس طرح قدیم زمانہ کے مشرک اپنے پتھر کے بتوں کے ٹوٹنے پر شدید ردعمل ظاہر کرتے تھے۔
جب آدمی دوسری چیزوں سے اس طرح محبت کرے جس طرح خدا سے محبت کرنا چاہئے، جب دوسری شخصیتوں سے اس کو وہ قلبی وابستگی ہو جائے جس کا حقدار صرف اس کا خدا ہے تو یہی غیر خدا کو اپنا خدا بنانا ہے۔ ایسے تمام لوگ خدا کے نزدیک شرک کے مجرم ہیں، خواہ دنیا میں بظاہر وہ دین اور توحید کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہوں۔

خدا کا داعی

داعی بننا خدا کا پیغام بر بننا ہے۔ خدا کا پیغام بر وہی بن سکتا ہے جو خدا سے پاکر بولے اور خدا سے سن کر کلام کرے۔

خدا ملفوظ کلام میں بھی بولتا ہے اور غیر ملفوظ کلام میں بھی۔ خدا کا ملفوظ کلام رسولوں کے لئے خاص ہے اور وہ آخری رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) پر ختم ہو گیا۔ موجودہ دنیا میں اب خدا کسی سے ملفوظ زبان میں کلام کرنے والا نہیں۔

مگر خدا کا غیر ملفوظ کلام بدستور جاری ہے۔ جس طرح کسی شخص کے پیغمبر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو خدا کا ملفوظ کلام پہنچے۔ اسی طرح داعی وہی شخص بن سکتا ہے جو خدا کے غیر ملفوظ کلام کا آخذ (Recipient) ہو۔ جس کو خدا کا غیر ملفوظ کلام مسلسل مل رہا ہو۔ کوئی شخص وحی کے بغیر پیغمبر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح کوئی شخص خدا کا داعی نہیں بن سکتا جب تک اس کی رسائی خدا کے غیر ملفوظ کلام تک نہ ہو جائے۔

خدا ہواؤں کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتا ہے۔ خدا چڑیوں کی صورت میں اپنا نغمہ بکھیرتا ہے۔ خدا دریا کے تموج کے ذریعہ آواز دیتا ہے اور سورج کی روشنی کے ذریعہ اپنی مرضی سے مطلع کرتا ہے۔ وہی شخص داعی ہے جو خدا کے ان اعلانات کو سن کر اسے دوسروں کو سنانے کے لئے اٹھے۔ جو شخص اس کے بغیر خدا کا داعی بن کر کھڑا ہو جائے وہ خدا کا مجرم ہے نہ کہ خدا کا داعی۔

داعی حقیقۃً وہ ہے جس کے بارہ میں خدا کے فرشتے گواہی دیں کہ خدایا تیرا یہ بندہ وہ ہے جو دوسروں کو وہ چیز دینے کے لئے اٹھا جس کو اس نے تجھ سے پایا تھا۔ تو آسمانوں کے ذریعہ جس حقیقت کا اعلان کر رہا تھا اس کو اس نے سنا اور تیرے بندوں کو اسے سنایا۔ تو نے سورج اور چاند کے ذریعہ جس ہدایت کو کھولا اس کو تیرے اس بندے نے پڑھا اور لوگوں کو اسے پڑھوایا۔ تو درختوں اور پہاڑوں کے ذریعہ اپنی جس مرضی کو ممثل کر رہا تھا اس کو اس نے پہچانا اور لوگوں کو اس سے آگاہ کیا۔

دعوت کا عمل ایک انتہائی زندہ عمل ہے۔ داعی کو ہر روز نئی چیز دریافت کرنا چاہئے۔ اس کو ہر روز خدا کا نیا فیضان ملنا چاہئے۔ ساری کائنات کو اس کے لئے نہ ختم ہونے والا دستر خوان بن جانا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہو تو داعی جمود کا شکار ہو جائے گا۔ اور جو شخص جمود کا شکار ہو جائے وہ خود موت سے دوچار ہو چکا ہے۔ وہ دوسروں کو زندگی کا پیغام کیا دے گا۔

گروہ بندی

ائمہ اربعہ نے ضرورت کے احساس کے تحت بہت سے نئے مسائل وضع کئے۔ مگر وہ کتاب اور سنت ہی کو دین کا اصل مرجع سمجھتے تھے۔ ان کو کبھی گمان نہ تھا کہ ان کے وضع کردہ مسائل دین کا مقام حاصل کر لیں گے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتویٰ دے بغیر اس کے کہ اس کو ہماری دلیل کا علم حاصل ہو (لا یجوز لاحد ان یقول قولنا من غیر ان یعرف دلیلنا)

مگر بعد کے زمانہ میں یہ صورت باقی نہ رہی حتیٰ کہ وہ وقت آیا کہ لوگ بس اپنے امام کے قول کو سب کچھ سمجھنے لگے۔ انسانی فقہ نے خدائی شریعت کی جگہ لے لی۔ اب امام کرخی کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ ہر آیت یا حدیث جو اس سے ٹکراتی ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو قابل تاویل ہے یا منسوخ ہو چکی ہے۔ (کل آیۃ او حدیث یخالف ما علیہ اصحابنا فھو مؤول او منسوخ، فقہ السنۃ، جلد اوّل، صفحۃ ۱۳)

جب قوم پر گراوٹ کا یہ دور آتا ہے اسی وقت اس کے اندر تحزب پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر ایک اپنے مسلک کو اصل دین سمجھنے لگتا ہے۔ قوم مختلف قسم کے متحارب فرقوں میں بٹ جاتی ہے۔ دین کا اصل سرا لوگوں کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ ہر ایک کا وہ حال ہو جاتا ہے جو قرآن کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: وتقطعوا امرھم بینھم زبراً کل حزب بما لدیھم فرحون)

مشن میں شرکت

اگر آپ الرسالہ کے پیغام سے متفق ہیں اور پھر بھی آپ نے ابھی تک الرسالہ کی ایجنسی نہیں لی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ——— آپ نے اس مشن میں اپنے آپ کو شامل نہیں کیا۔ جو شخص بھی الرسالہ کے مشن سے اتفاق رکھتا ہو اس کے اتفاق کا کم سے کم تقاضا ہے کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی لے۔

ادارہ الرسالہ

ایک اور لفظ

ایک صاحب الرسالہ کے دفتر میں آئے۔ لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔ انھوں نے الرسالہ مئی ۱۹۸۴ کا صفحہ ۳ کھولا اور فرمایا " دیکھئے، یہ آپ نے غلط ترجمہ کیا ہے " اس کے بعد انھوں نے مذکورہ صفحہ میں انگریزی لفظ Dessert پر انگلی رکھتے ہوئے کہا کہ اس کا ترجمہ آپ نے صحرا کر دیا ہے۔ حالاں کہ یہ لفظ انگریزی زبان میں مٹھائی پھل وغیرہ کے لئے بولا جاتا ہے جو کھانے کے بعد کھائے جاتی ہیں۔ صحرا کے لئے انگریزی میں جو لفظ ہے وہ Desert ہے (پہلے لفظ میں دو ایس اور دوسرے لفظ میں ایک ایس)

میں نے کہا کہ جناب، آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں خود ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم بتائیں کہ کیا آپ انگریزی لفظ Pun سے واقف ہیں۔ وہ چپ ہو گئے۔ دوبارہ پوچھنے پر بتایا کہ میں Pun کے معنی نہیں جانتا۔ میں نے کہا کہ مذکورہ عبارت میں Dessert اور Desert کے ترجمہ کے معاملہ کو سمجھنے کے لئے اس دوسرے لفظ (پن) کو جاننا ضروری ہے۔

پھر میں نے کہا کہ صدر ریگن کے مذکورہ فقرہ میں در اصل وہ ادبی اسلوب استعمال ہوا ہے جس کو انگریزی میں Pun اور اردو میں ایہام کہتے ہیں۔ اس سے مراد ایسے الفاظ کا مزاحیہ استعمال ہے جو بولنے میں مشابہ ہوں مگر معنی میں مختلف ہوں۔ جیسے ایک شیعہ مصنف نے اورنگ زیب کی افواج کے بارہ میں یہ جملہ لکھا ہے ——" مردان بطالت شعار" بطالت کے ایک معنی شجاعت کے ہیں، مگر اس لفظ کا دوسرا مفہوم بھی ہے جو باطل کے ہم معنی ہے۔ اس طرح مصنف نے بظاہر ایک اچھا لفظ بول کر توریہ کے انداز میں فوجیوں کی تنقیص بھی کر دی۔

صدر ریگن کے مذکورہ فقرہ میں یہی ادبی اسلوب پایا جاتا ہے۔ ریگن نے اپنی خوراک سے متعلق سوال کے ذیل میں ڈزرٹ (میٹھی چیزوں) کا لفظ استعمال کیا۔ ایک بوڑھے آدمی کی زبان سے یہ بات بظاہر عجیب تھی۔ چنانچہ انٹرویو لینے والے نے دوبارہ سوال کیا۔ اب ریگن نے صوتی اشتراک سے فائدہ اٹھایا اور ایہام کے اصول پر مسکرا کر کہا ہاں ڈزرٹ Dessert مگر عرب جیسا ڈزرٹ جہاں تیل پایا جاتا ہو۔

اس قسم کی لفظی صنعت ہمیشہ اس خاص زبان کے اعتبار سے ہوتی ہے جس میں وہ استعمال ہوئی ہے۔ اب اگر اس انگریزی فقرہ کا اردو میں بالکل لفظی ترجمہ کر دیا جائے تو مطلب خبط ہو جائے گا۔ دوسری

صورت یہ ہے کہ لفظی ترجمہ کر کے اس کے ساتھ ایک تشریحی نوٹ کا اضافہ کیا جائے۔ دونوں صورتیں غیر احسن ہیں۔ کیوں کہ ان سے کلام کی لطافت مجروح ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ترجمہ میں مفہوم کی رعایت کی گئی۔

کبھی ایک "لفظ" کی حقیقت جاننے کے لئے ایک اور "لفظ" کو جاننا ضروری ہوتا ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو سمجھتے ہوں۔

یہاں دوسری نوعیت کی ایک مثال لیجئے۔

۱۸۵۷ میں انگریزوں کے خلاف ہندستانیوں کی بغاوت ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد انگریزوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے مقامی باشندوں پر سختی شروع کی۔ جس شخص کے متعلق ذرا بھی مخالف انگریز ہونے کا شبہہ ہوا اس کو فوراً پکڑ کر سخت ترین سزا دی گئی۔

اس زمانہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ کچھ مسلم علماء کو صرف اس بنا پر سزائیں دی گئیں کہ انھوں نے انگریزوں کو "نصاریٰ" کہا یا لکھا تھا۔ اس زمانہ کے انگریز حکمرانوں نے بعض مسلمانوں کی تحریروں میں اپنی بابت "نصاریٰ" کا لفظ دیکھا تو سمجھا کہ یہ ان کو حقیر کرنے کے لئے ہے۔ دور قدیم کے یہودی حضرت عیسیٰ کو حقارت سے ناصری کہتے تھے۔ یعنی ناصرہ نامی گاؤں کا رہنے والا۔ انھوں نے سمجھا کہ اسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں کو "نصاریٰ" کہنا شروع کیا ہے۔ وہ ناصری اور نصاریٰ کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ یہ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ سرسید نے ایک کتابچہ شائع کیا جس کا نام تھا "تحقیق لفظ نصاریٰ"۔ انھوں نے اس کتابچہ کو اردو کے علاوہ انگریزی میں چھپوا کر برطانی حکمرانوں تک پہنچایا۔

انگریزوں کا یہ خیال سراسر غلط فہمی پر مبنی تھا۔ ناصری قریہ ناصرہ کی طرف نسبت کر کے بنا ہے جب کہ نصاریٰ کا تعلق انصار سے ہے۔ یعنی مدد کرنے والا۔ حضرت مسیح کے زمانہ میں قوم یہود کے جو چند افراد حضرت مسیح کی نصرت کے لئے اٹھے ان کو انصار یا انصاری کہا گیا۔ اسی سے لفظ نصاریٰ بنا ہے۔

یہ ایک آفاقی حقیقت ہے جو زندگی کے ہر معاملہ میں چسپاں ہوتی ہے۔ ہر معاملہ میں یہ صورت حال ہے کہ ایک بات کو سمجھنے کے لئے دوسری کئی باتوں کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ ایک لفظ کے معنی آدمی اسی وقت بخوبی طور پر سمجھ پاتا ہے جب کہ وہ دوسرے بہت سے الفاظ سے واقفیت رکھتا ہو۔ جو لوگ جزئی واقفیت کی بنیاد پر اپنے کو جاننے والا سمجھتے ہیں یا چند باتوں کو سن کر نازک امور میں بڑے بڑے بیان دینے لگتے ہیں ان کے بارہ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ یا تو غیر سنجیدہ ہیں یا غیر عاقل۔ اس کی کوئی تیسری توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔

کیسا عجیب

ایئر انڈیا کا ایک جہاز ۲ جون ۱۹۸۴ کو بنکاک سے بمبئی کے لیے اڑا۔ یہ بوئنگ ۷۴۷ تھا۔ اس میں چار انجن نصب تھے اور عملے کے علاوہ ۱۵۲ مسافر سوار تھے۔ جہاز ابھی فضا میں پہنچا تھا کہ اس کے ایک انجن میں آگ لگ گئی۔ تاہم کیپٹن ورمانے ہوشیاری کی اور جہاز کو قریب کے ہوائی اڈہ ڈون موانگ Don Muang پر اتار لیا۔ اڑنے کے ۲۰ منٹ بعد جہاز دوبارہ زمین پر تھا۔

پائلٹ کی ہوشیاری سے جہاز حفاظت کے ساتھ رن وے پر اتر گیا جہاں ریڈیائی اطلاع پاکر پہلے سے آگ بجھانے والے انجن موجود تھے۔ تاہم بہت سے مسافر زخمی ہوگئے اور انھیں فوری طور پر اسپتال پہنچایا گیا۔ اس کی وجہ جہاز کا حادثہ نہیں تھا۔ بلکہ اخباری رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۴ جون ۱۹۸۴) کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی:

Most of the injuries were due to passengers rushing for the emergency exit from where they descended through a chute.

یعنی بیشتر زخموں کی وجہ مسافروں کا آپس کا ٹکراؤ تھا۔ کیوں کہ جب جہاز اترا تو مسافر تیزی سے دروازہ کی طرف دوڑ پڑے جہاں انھیں ایک ڈھلوان گاڑی سے نیچے اترنا تھا۔

جہاز کی آگ نے ابھی کسی کو پکڑا نہیں تھا۔ صرف یہ اندیشہ تھا کہ شاید پکڑ لے اور آدمی جل کر مر جائے۔ تاہم اس اندیشہ نے لوگوں کو اتنا بدحواس کر دیا کہ وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ ان میں سے ہر شخص یہ چاہنے لگا کہ سب سے پہلے وہ بھاگ کر آگے نکل جائے۔

مگر ایک اس سے زیادہ ہولناک خطرہ آدمی کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ موت اور اس کے بعد قیامت کا خطرہ ہے۔ لیکن کسی کو اس کے اندیشہ سے بدحواسی نہیں۔ کوئی اس سے بھاگنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کس قدر سچ فرمایا پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے جہنم کی آگ سے خوفناک چیز نہیں دیکھی جس سے بھاگنے والا بے خبر سو گیا ہو (ما رأیت مثل النار نام ھاربھا)

آدمی کو موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ جو چیز متحرک کرتی ہے وہ "خوف" ہے۔ خوف کی نفسیات عمل کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ آخرت کا خوف تمام خوفوں میں سب سے بڑا خوف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آخرت کا خوف واقعی معنوں میں کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ آدمی کی پوری شخصیت کو جگا دے گا۔ وہ اس کی تمام قوتوں کو متحرک کر دے گا۔

سبق آموز

فتح پور سیکری شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) کا دارالسلطنت تھا۔ یہ آگرہ سے ۴۵ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں دوسری بہت سی عمارتوں کے ساتھ ایک شاہی "عبادت خانہ" بھی تھا۔ یہ عبادت خانہ اکبر کے بعد زمین کے نیچے دب گیا اور اس کے اوپر گھاس اور درخت اگ آئے۔ حال میں حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے مشترک منصوبہ کے تحت اس کی کھدائی کی گئی ہے اور اس کو باہر نکالا گیا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۸ جون ۱۹۸۴)

اس عبادت خانہ میں شہنشاہ اکبر علماء کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ اور ان سے مذہب کے موضوعات پر گفتگو کرتا تھا۔ یہیں اس نے اپنا مشہور "دین الٰہی" وضع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بستے ہیں۔ اس لئے کسی ایک مذہب کی بنیاد پر یہاں سیاسی استحکام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اس نے یہ رائے قائم کی کہ اس ملک میں مغل سلطنت کی بنیاد اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک یہاں کے لوگوں کا مذہب ایک نہ ہو جائے۔ تبلیغ کے ذریعہ مذہب کو بدلنا اس کو مشکل نظر آیا۔ چنانچہ اس نے ایک نیا مذہب (دین الٰہی) ایجاد کیا۔ جس میں بزعم خود اس نے تمام مذاہب کی خصوصیات جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ نیا مذہب اپنی مشترک خصوصیات کی بنا پر ملک کے تمام باشندوں کے لئے قابل قبول ہو جائے گا۔

دین الٰہی کی تصنیف کے دوران اس کو عیسائی مذہب کے بارے میں جاننے کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے پرتگال کے عیسائی بادشاہ کو خط لکھا کہ اس کو انجیل کے فارسی ترجمے کی ضرورت ہے۔ شاہ پرتگال نے یہ فارسی ترجمہ بھیج دیا۔ تاہم اس کا مطالعہ اکبر کے لئے کافی نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اکبر نے پوپ (روم) کو لکھا کہ مسیحیت کی تعلیم کے لئے اس کے پاس معلم بھیجے جائیں۔ پوپ نے فوراً دو تربیت یافتہ افراد ہندستان روانہ کر دئے۔

ایک فادر اکوا ویوا (Fr. Acquaviva) اور دوسرا فادر مانسریٹ (Fr. Monserrate) یہ دونوں صاحبان ۲۸ فروری ۱۵۹۰ء کو فتح پور سیکری پہنچے۔ "اکبر نامہ" کی ایک پینٹنگ میں اکبر ان عیسائی معلمین سے محو گفتگو نظر آتا ہے۔

اکبر نے ان دونوں عیسائی معلمین کو شاہی عبادت خانہ کے پاس "خوشبو خانہ" میں ٹھہرایا۔ مگر یہ دونوں مسیحی صرف "معلم" نہ تھے بلکہ وہ اپنے مذہب کے تربیت یافتہ مبلغ تھے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ خوشبو خانہ کو گرجا گھر میں تبدیل کر دیا۔ یہ شمالی ہند کا پہلا گرجا گھر تھا جو اکبر کے زمانہ میں قائم ہوا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فادر اکواویوا نے پوپ کو جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں اس نے لکھا کہ میرا احساس یہ ہے کہ اکبر ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو رہا ہے کہ وہ مسیحیت کو قبول کر لے۔ مگر اس سے اکبر کا اصل مقصد (سلطنت کا استحکام) حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اکبر ایسے اقدام سے باز رہا۔

اس واقعہ میں دو بڑے سبق ہیں۔ ایک سبق یہ کہ دولت اور اقتدار کا حصول اکثر عقل سے محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ کسی آدمی کو جب دولت اور اقتدار مل جاتا ہے تو اکثر اس کو وہ ایسے کاموں میں ضائع کرتا ہے جس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ شہنشاہ اکبر نے سیاسی خوش خیالی تحت "دین الٰہی" وضع کیا تھا۔ اس پر اس نے سلطنت کے بے پناہ وسائل خرچ کئے۔ حالاں کہ اس کا انجام بالآخر یہ ہونا تھا کہ وہ تاریخ کے ملبہ کے نیچے دب کر رہ جائے اور آثار قدیمہ کے طالب علموں کے سوا کسی اور کو اس سے دلچسپی نہ رہے۔

دوسرا سبق دعوتی ہے۔ اکبر نے پوپ سے مسیحی معلم مانگے اور اس نے فوراً دو تیار شدہ افراد اس کے پاس بھیج دئے۔ جب کہ مسلمانوں سے جدید دور میں بار بار یہی تقاضا کیا گیا ہے مگر وہ اس تقاضے کو کبھی پورا نہ کر سکے۔ مسیحی ادارے اپنی مشنری اسپرٹ کی وجہ سے سیکڑوں سال سے اس پوزیشن میں ہیں کہ مشرق و مغرب میں اپنے تربیت یافتہ افراد بھیج سکیں۔ جب کہ مشنری اسپرٹ سے محروم ہو کر مسلمانوں کا یہ حال ہو رہا ہے کہ ان کے پاس نہ مشرقی ضرورت کے مطابق خدا کے دین کے مبلغ موجود ہیں اور نہ مغربی ضرورت کے مطابق۔

دور جدید میں مسلمانوں کی بربادی کا واحد سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت خدا کے گواہ کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی عملی سرگرمیوں کا اصل نشانہ صرف ایک ہے اور وہ دعوت ہے۔ جن لوگوں کی نظریں اس نشانہ پر جمی ہوتی ہوں وہ اپنے لئے عمل کا صحیح میدان پالیں گے اور جب نظریں اس نشانہ سے ہٹ جائیں تو تمام قوتیں منتشر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک ایسی قوم بن جاتے ہیں جس کا کوئی [illegible] ہو۔ وہ ایسا گروہ بن جاتے ہیں جس کا کوئی اقدام نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔

اختلافات

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات میں اپنے رب کو دیکھا یا نہیں دیکھا، اس کے بارے میں صحابہ کے درمیان دو رائیں ہیں۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس اور اکثر صحابہ رویت کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ معراج کی رات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو اسی طرح دیکھا جیسے کوئی شخص کسی چیز کو دیکھتا ہے۔

مگر حضرت عائشہ کا خیال اس کے برعکس تھا۔ مسروق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ کیا رسول خدا نے معراج میں اپنے رب کو دیکھا تھا۔ حضرت عائشہ نے کہا۔ تم نے ایسی بات اپنے منھ سے نکالی ہے کہ میرے سر کے بال کھڑے ہوگئے۔ تین باتیں ایسی ہیں کہ جو بھی ان کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔ جو تم سے کہے کہ محمد نے اپنے رب کو دیکھا اس نے جھوٹ کہا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لا تدرکہ الابصار وھو یدرك الابصار (الانعام ۱۰۳)

اتنے نازک معاملہ میں اتنے بڑے اختلاف کے باوجود صحابہ کے درمیان نہ جھگڑے پیدا ہوئے اور نہ فرقے بنے۔ ان کا اختلاف اظہار رائے کے دائرے میں رہا، اس سے آگے نہ جا سکا۔ مگر بعد کے زمانہ میں اسی رویت باری کے مسئلے پر زبردست معرکہ آرائیاں ہوئیں اور مسلمان مستقل طور پر دو فرقوں میں بٹ گئے۔ جن میں سے ایک معتزلہ کہلائے اور دوسرا وہ جس کو اہل سنت کہا جاتا ہے۔ اہل سنت نے اپنے اقتدار سے فائدہ اٹھا کر اگرچہ معتزلہ کو ختم کر دیا تاہم تاریخ اور درسیات میں ان کا غلغلہ ابھی تک جاری ہے۔

قرآن میں ایک آیت ہے کہ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی جزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہوگی۔ (النساء ۹۳) اس آیت کی بنیاد پر حضرت عبد اللہ ابن عباس حضرت زید ابن ثابت اور حضرت عبد اللہ ابن مسعود کا خیال تھا کہ جو شخص بالارادہ کسی مومن کو قتل کر دے اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ سعید ابن جبیر تابعی کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ ابن عباس سے پوچھا کہ جو شخص کسی مومن کو بالقصد قتل کر دے اس کی توبہ قبول ہوگی یا نہیں۔ عبد اللہ ابن عباس نے جواب دیا کہ نہیں۔ سعید ابن جبیر نے سورہ فرقان کی آیت نمبر ۷۰ - ۶۸ سے استدلال کرتے ہوئے اس رائے سے اختلاف کیا۔ اس کے جواب میں حضرت عبد اللہ ابن عباس نے کہا، یہ آیت مکی ہے جس کو مدنی آیت نے منسوخ کر دیا۔

تاہم صحابہ کی اکثریت کا یہ خیال تھا کہ قاتل کے لئے بھی توبہ کی گنجائش ہے کیوں کہ قتل بہرحال

کفر سے زیادہ سخت جرم نہیں۔ پھر جب کفر معاف ہو سکتا ہے تو قتل کیوں نہیں معاف ہو سکتا جب کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے اگر وہ باز آجائیں تو ان کا پچھلا سب کچھ معاف کر دیا جائے گا۔ (انفال ۳۸)

انسانوں کے درمیان اختلافات ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ لوگ خواہ کتنے ہی صالح اور نیک نیت کیوں نہ ہوں، ان کے درمیان اختلافات ہوں گے۔ اختلافات کو ختم کرنا مطلوب نہیں ہے۔ البتہ جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ اختلافات کا اثر آدمی کے اخلاق اور برتاؤ پر نہ پڑے۔

صحابہ کے درمیان بہت سے بڑے بڑے اختلافات تھے جن کی چند مثال اوپر نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود ان کے درمیان آپس میں کدورت پیدا نہیں ہوئی۔ مگر یہی وہ اختلافات تھے جن کی بنیاد پر بعد کے زمانہ میں ایسے فرقے بنے جو کبھی ختم نہ ہو سکے۔

ایک اختلاف اور دوسرے اختلاف میں اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام زندہ لوگ تھے اور ان کے بعد ان کا نام لینے والے مردہ لوگ۔ صحابہ کرام کا ایمان شعوری ایمان تھا اور بعد کے لوگوں کا ایمان صرف وراثتی ایمان۔ صحابہ کرام اختلاف اور اتفاق کے حدود کو جانتے تھے۔ اور بعد کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اختلاف کے حدود سے بھی ناواقف ہیں اور اتفاق کے حدود سے بھی ناواقف۔

ایک انسان اور دوسرے انسان میں مختلف اعتبار سے اتنا زیادہ فرق ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اختلافات کا پیدا ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ اب ایک طرف یہ مسئلہ ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں اجتماعیت ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ پھر اختلاف کے باوجود اجتماعی اتحاد کے مقصد کو کس طرح حاصل کیا جائے۔

اس کی ایک ہی قابل عمل صورت ہے۔ وہ یہ کہ ہر آدمی اختلاف کے باوجود متحد ہونے پر راضی ہو جائے۔ ہر آدمی شعوری طور پر یہ طے کرلے کہ وہ اختلاف کو صرف ذہنی اختلاف کے درجہ میں رکھے گا۔ اس کو عملی رکاوٹ یا قلبی بدمزگی تک نہیں جانے دے گا۔

یہ وہ اصول ہے جس پر ہر آدمی اپنے گھر اور خاندان کے اندر رواداری رہتا ہے۔ اسی فطری اصول کو گھر سے باہر کی زندگی میں اختیار کر لینے کا نام اتحاد ہے۔ آدمی اپنے گھر کے نظم کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس لئے وہ گھر کے اندر "اختلاف کے باوجود اتحاد" کے اصول پر کاربند رہتا ہے۔ یہی جذبہ گھر کے باہر کے لئے پیدا ہو جائے تو یہاں بھی وہ اختلاف کے باوجود اتحاد پر قائم رہے گا۔

اپنی غلطی

پروفیسر فریڈرش وان ہایک (پیدائش ۱۸۹۹) ایک برطانی مفکر ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں مغربی تہذیب کی ناکامی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم اپنی تہذیب کے موجودہ بحران کی تقریباً ہر توجیہہ قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، سوا ایک توجیہہ کے: یہ کہ دنیا کی موجودہ حالت خود ہماری اپنی واقعی غلطی کا نتیجہ ہو سکتی ہے اور یہ کہ اپنے کچھ بہت محبوب مقاصد کی طرف ہماری دوڑ نے بظاہر اس سے مختلف نتیجہ پیدا کیا ہے جس کی ہم اس سے امید کر رہے تھے۔

We are ready to accept almost any explanation of the present crisis of our civilisation except one: that the present state of the world may be the result of genuine error on our part, and that the pursuit of some of our most cherished ideals has apparently produced results different from those which we expected.

Friedrich Von Hayek, *The Road to Serfdom*, London, 1944

یہ کمزوری جس کی طرف برطانی پروفیسر نے اشارہ کیا ہے، یہ اقوام عالم کی عام کمزوری ہے۔ اور خود موجودہ مسلمانوں میں یہ کمزوری بہت بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے۔ (۲۴ جون ۱۹۸۴)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے احیار کے لئے بے شمار بہت بڑی بڑی تحریکیں چلائیں۔ یہ تمام تحریکیں پرشور ہنگاموں کے باوجود اپنے اصل مقصد میں سراسر ناکام رہیں۔ جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان "عظیم الشان تحریکوں" کی ناکامی کا سبب کیا ہے تو مسلمان ہمیشہ کچھ بیرونی دشمن یا خارجی اسباب پالیتے ہیں جن کو وہ اپنی ناکامی کا ذمہ دار قرار دے سکیں۔ یہ بات کسی طرح ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ خود ان کے قائدین کا غلط تجزیہ یا ناقص منصوبہ بندی ان کی ناکامیوں کا اصل سبب ہو سکتا ہے۔

کسی واقعہ کا سبب اگر اپنے اندر ہو اور اس کو آپ باہر ڈھونڈنے لگیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے سر درد کے اسباب کو ہوا میں تلاش کرنے لگے۔

کامیابی اپنے ہاتھ میں

تھامس فلر کا قول ہے "پرندے اپنے پاؤں کے سبب جال میں پھنستے ہیں اور انسان اپنی زبان کے سبب سے" انسان کی زبان اگرچہ بظاہر اس کے جسم کا بہت کمزور حصہ ہے مگر زندگی میں اس کا رول بے حد اہم ہے۔ زبان سے بولے ہوئے چند الفاظ آدمی کو مصیبت میں پھنسا دیتے ہیں اور زبان سے بولے ہوئے دوسرے قسم کے کچھ الفاظ اس کو مصیبت سے بچا لیتے ہیں۔

ایک شخص ایک کارخانہ میں کام کرتا تھا۔ کارخانہ کا مالک اس کو بہت مانتا تھا۔ وہ اس کی صلاحیتوں کا بہت قدرداں تھا۔ ایک بار کارخانہ میں پیسہ کی کمی پڑ گئی۔ مالک نے بڑی مشکل سے کارکنوں کی تنخواہیں دیں۔ تاہم اس نے مذکورہ شخص کی تنخواہ روک لی۔ کئی مہینے اسی طرح ہوا۔ اس "امتیازی سلوک" پر وہ شخص بگڑ گیا۔ ایک روز مالک سے مل کر اس کو سخت سخت باتیں سنائیں۔

یہ بر ہمی اس شخص کے حق میں الٹی ثابت ہوئی۔ مالک نے اس کو اپنا سمجھ کر ایسا کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پیسہ آنے پر وہ نہ صرف اس شخص کو پوری تنخواہ دے گا بلکہ اس میں اضافہ کر دے گا۔ مگر زبان کے غلط استعمال نے دونوں کے درمیان نفرت پیدا کر دی۔ محبت دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ مالک نے اس کی زبان درازی کی یہ سزا دی کہ اس کی تنخواہ مزید روک دی اور کارخانہ سے بھی اس کو نکال دیا۔ اس کے بعد کئی سالوں تک دونوں کے درمیان مقدمہ بازی ہوتی رہی۔ اگر وہ چپ رہتا تو وہ فائدہ میں رہتا مگر بول کر اس نے صرف نقصان اٹھایا۔

اس آدمی کو یہ غیر ضروری نقصان صرف اس لئے ہوا کہ وہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک مغربی کہاوت ہے کہ "دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی کو اپنے لئے پسند کر لو" زندگی میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کامل برائی اور کامل بھلائی کے درمیان انتخاب کا موقع ہو۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو ایک برائی اور دوسری برائی کے درمیان انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ مذکورہ آدمی کے سامنے ایک طرف وقتی مسئلہ تھا اور دوسری طرف مستقل مسئلہ۔ اس نے وقتی مسئلہ کو برداشت نہیں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو مستقل نقصان برداشت کرنے پر راضی ہونا پڑا۔

ایک ہندی شاعر نے کہا ہے "چوٹ ہے جو شبد کی وائے گرو میں داس" لفظ کی چوٹ میں نہ خون بہتا اور نہ پاؤں ٹوٹتا مگر آدمی کے لئے وہ لاٹھی اور بھالے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اکثر آدمیوں کا حال یہ ہے کہ وہ لفظ کی نفسیاتی چوٹ کو سہہ نہیں پاتے۔ اس لئے انھیں بڑے بڑے عملی نقصانات سہنے پڑتے ہیں۔

آدمی اگر لفظ کی چوٹ برداشت کرلے تو وہ نارمل حالت میں رہتا ہے، وہ اپنی حاضر دماغی کو نہیں کھوتا۔ اس بنا پر وہ اس پوزیشن میں رہتا ہے کہ وہ زیادہ بہتر طور پر اپنے مسئلہ کے حل کی تدبیر سوچ سکے۔ وہ لفظ کی چوٹ سہہ کر زیادہ کامیابی کے ساتھ وہ چیز حاصل کرلیتا ہے جس کو وہ لفظ کی چوٹ نہ سہہ کر حاصل کرنا چاہتا تھا مگر وہ حاصل نہ کرسکا۔

بوکر واشنگٹن امریکہ کا مشہور نیگرو گزرا ہے۔ ایک روز اس کو ایک ٹرین پکڑنی تھی۔ اس کو گھر سے نکلنے میں دیر ہوگئی وہ تیزی سے سڑک پر آیا تاکہ کسی سواری کے ذریعہ جلد از جلد اسٹیشن پہنچ سکے۔ وہ ایک گھوڑا گاڑی کے پاس آیا اور ڈرائیور سے کہا کہ میرے پاس وقت کم ہے تم مجھ کو فوراً اسٹیشن تک پہنچا دو۔ ڈرائیور نے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں نے آج تک کسی کالے آدمی کے لئے اپنی گاڑی نہیں چلائی میں تم کو نہیں لے جا سکتا۔

بوکر واشنگٹن نے کہا: "ٹھیک ہے۔ تم پچھلی سیٹ پر چلے جاؤ، میں گاڑی چلانے کا کام کروں گا" یہ سن کر ڈرائیور حیرانی میں پڑ گیا۔ وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بوکر واشنگٹن گھوڑے کو ہانکتا ہوا اسٹیشن لے گیا اور گاڑی پکڑ لی۔

زرتشت نے کہا ہے کہ "بھلائی کرنا فرض نہیں فائدہ ہے کیوں کہ بھلائی تمھارے سکو میں اضافہ کرتی ہے" یہ ایک حقیقت ہے کہ بھلائی کرکے آدمی خود اپنے آپ کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ بوکر واشنگٹن اگر برے الفاظ کے جواب میں برے الفاظ بولتا تو وہ اپنے مسئلہ کو اور زیادہ مشکل بنا لیتا۔ کیوں کہ اس کے برے الفاظ گاڑی والے کو برہم کر دیتے اور وہ زیادہ شدت کے ساتھ اس کو اسٹیشن لے جانے سے انکار کر دیتا مگر بوکر واشنگٹن نے جب برے الفاظ کا جواب بھلے الفاظ سے دیا تو دوسرا آدمی بھی نرم پڑ گیا۔ پہلے اس کا دل جس خدمت کے لئے تیار نہ تھا اب اس نے اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے آمادہ پایا۔

پاؤں ٹوٹنے کے بعد بھی

"جو آدمی ارادہ کرسکتا ہے اس کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں" ایمرسن کا یہ قول زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کو بتاتا ہے وہ یہ کہ موجودہ دنیا میں انسان کے لئے امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اگر آدمی کے اندر سچے ارادہ کی طاقت ہو تو وہ ہر مشکل کو آسان کرلے گا۔ راستے کی ہر رکاوٹ اس کے لئے اپنی منزل تک پہنچنے کا زینہ بن جائے گی۔

امکان کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی مثالیں پوری انسانی تاریخ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں ہم ایک تازہ اور جیتی جاگتی مثال پیش کریں گے۔

سودھا چندرن جنوبی ہند کی ایک رقاصہ ہے۔ وہ سولہ سال کی تھی کہ ۲ مئی ۱۹۸۱ کو ایک حادثہ میں اس کا دایاں پاؤں ٹوٹ گیا۔ وہ فوری طور پر ایک مقامی اسپتال میں داخل کر دی گئی۔ وہاں ڈاکٹروں سے غلطی ہوئی کہ اینٹی ٹیٹنس انجکشن اور دوسری ضروری احتیاطوں کے بغیر اس کے پاؤں پر پلاسٹر باندھ دیا گیا۔ چند دن بعد تکلیف بڑھی تو اس کے والدین اس کو مدراس لے گئے اور ایک بڑے اسپتال میں داخل کیا وہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کو ٹیٹنس کا اثر ہو چکا ہے۔ کافی کوشش کے باوجود افاقہ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اس کا پاؤں پنڈلی کے نیچے سے کاٹ دیا گیا۔

کسی کا قول ہے "محبت ہر رکاوٹ کو دور کر دیتی ہے" یہ قول سودھا چندرن کے معاملہ میں لفظ بلفظ صحیح ثابت ہوا۔ اس کو رقص سے بے پناہ محبت تھی۔ پاؤں کٹنے کے بعد اس کا یہ حال ہوا کہ وہ روتی تھی اور کہتی تھی کہ میں تو رقص کرنا چاہتی ہوں، کیا میں دوبارہ رقص کر سکوں گی:

I want to dance. Will I dance again?

اس کے بعد اسپتال میں اس کے ساتھ بھی وہی کیا گیا جو ہر ایسے مریض کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا پاؤں پنڈلی کے پاس سے کاٹ دیا گیا اور اس کی جگہ جدید طرز کا مصنوعی پاؤں (جے پور فوٹ) لگا دیا گیا۔ ڈاکٹر پی کے سیٹھی (جنھوں نے جے پور فوٹ ایجاد کیا ہے) کی ملاقات سودھا چندرن کے استاد سے ہوئی۔ انھوں نے ڈاکٹر سیٹھی سے اپنے شاگرد کے شوق کا حال بتایا۔ انھوں نے جواب دیا کہ سودھا کے اندر اگر واقعۃً خواہش ہے تو وہ ایک عام آدمی کی طرح رقص کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ اس کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ کچھ زیادہ محنت کرے اور ابتدائی تکلیف کو برداشت کر لے:

> **Sudha would be able to dance like any one with normal limbs. Only one had to be tough to put in the extra effort and bear initial pain.**

یہاں دوبارہ سودھا چندرن کے لئے کسی مفکر کا یہ قول صحیح ثابت ہوا ـــــــ "تکلیف ہماری خوشیوں کی قیمت ہے۔ جو شخص تکلیف کو برداشت کر لے وہ خوشی کو بھی ضرور پا کر رہے گا"

سودھا چندرن کو ڈاکٹر سیٹھی کی بات بتائی گئی تو وہ فوراً اس کے لئے تیار ہو گئی کہ وہ "ابتدائی تکلیف" کو برداشت کرے گی۔ اس نے کوشش شروع کر دی۔ وہ اپنے مصنوعی پاؤں پر مشق کرتی رہی یہاں تک کہ وہ دوبارہ کامل رقاصہ بن گئی۔

سودھا چندرن نے یکم اپریل ۱۹۸۴ کو بمبئی میں اپنے رقص کا مظاہرہ کیا۔ وہاں رقص کے ماہرین موجود تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ سودھا چندرن نے اتنا کامیاب رقص کیا کہ ان کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ

[illegible] (ٹائمز آف انڈیا ۲۲ اپریل ۱۹۸۴) ـــــــــ رقص جیسے حقیر مقصد کے لئے ایک عورت نے اتنی غیر معمولی جدوجہد کی۔ پھر جو لوگ حق و صداقت جیسی برتر چیز کو اپنا مقصد بنائیں ان کے لئے ان کی جدوجہد تو اس سے بھی زیادہ ہونی چاہئے۔

"زبان و دشواری کو حل کرنے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ زیادہ محنت ہے" کسی کا یہ قول محض قول نہیں بلکہ زندگی کی ایک سادہ حقیقت ہے۔

جو شخص زندگی میں کسی رکاوٹ سے دوچار ہو جائے وہ بھی اسی طرح کامیاب زندگی حاصل کر سکتا ہے جیسے بے رکاوٹ والے لوگ حاصل کرتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ عام حالات سے کچھ زیادہ محنت کے لئے تیار ہو جائے اور ابتدائی مشقتوں کو برداشت کرلے۔

حالات سے مطابقت

ہربرٹ نکولس (Herbert L. Nicholas) نے لکھا ہے کہ میں نے کسی کتاب میں ایک بار ایک بوڑھے آدمی کا قصہ پڑھا جو ساری زندگی مسلسل سخت تکلیفوں میں مبتلا رہا۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ خوش اور مطمئن رہتا تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ تمہارے سکون و اطمینان کا راز کیا ہے تو اس نے جواب دیا:

I learned to cooperate with the inevitable

میں نے ان چیزوں سے موافقت کرنا سیکھ لیا جن سے بچنا ممکن نہیں۔

زندگی میں بہت سی ایسی چیزیں پیش آتی ہیں جو ہمارے اختیار سے باہر ہوتی ہیں۔ ایسی چیزوں سے مقابلہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے مقابلہ نہ کیا جائے۔ اس طرح ہم غیر ضروری الجھن اور ذہنی تناؤ (Tension) سے بچ سکتے ہیں۔ یہ طریقہ ہم کو اس قابل بناتا ہے کہ ہم اپنی قوتوں کو وہاں خرچ کریں جہاں کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اپنی قوتوں کو وہاں ضائع نہ کریں جہاں بالآخر وہ صرف بے نتیجہ ہو کر رہ جانے والی ہیں۔

یہی موجودہ دنیا میں زندگی کا اصول ہے۔ یہ اصول کسی ایک شخص کے لئے بھی کارآمد ہے اور پوری قوم کے لئے بھی۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۵-۱۶ مئی ۱۹۸۴ کو نشر کیا گیا۔

ائمہ کے اقوال

ما منا الا من یخطئ ویرد علیہ الا المعصوم صلی اللہ علیہ وسلم (الامام مالک)

ہم میں سے ہر شخص غلطی کرتا ہے اور ہم میں سے ہر شخص کی کوئی بات قابل رد ہو سکتی ہے۔ سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو کہ معصوم ہیں۔

اذا صح الحدیث فھو مذھبی۔ واضربوا بقولی عرض الحائط (الامام الشافعی)

جب حدیث سے ثابت ہوجائے تو وہی میرا مسلک ہے۔ اس کے بعد میرے قول کو دیوار پر مار دو۔

لا حجۃ فی قول احد دون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الامام الشافعی)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کا قول حجت نہیں۔

لا ینبغی لمن لا یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی (فکان اذا افتی یقول) ھذا رای النعمان بن ثابت وھو احسن ما قدرنا علیہ فمن جاء باحسن منہ فھو اولی بالصواب (الامام ابوحنیفہ)

جو شخص میری دلیل کو نہ جانے اس کے لئے درست نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتویٰ دے۔ ابوحنیفہ جب کسی مسئلہ میں فتویٰ دیتے تو کہتے کہ یہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے۔ ہمارے علم کے مطابق یہ احسن ہے۔ جو شخص اس سے زیادہ احسن کو پائے تو اس کے بعد وہی زیادہ احسن ہے۔

لا تقلدنی ولا تقلد مالکا ولا الشافعی ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا غیرھم (الامام احمد بن حنبل)

تم میری تقلید نہ کرو اور نہ مالک اور شافعی اور اوزاعی اور نخعی یا کسی اور کی تقلید کرو۔

منار الاسلام صفر ۱۴۰۳ھ (نومبر، دسمبر ۱۹۸۲)

ائمہ اربعہ کے ان اقوال سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اصل چیز قرآن اور سنت تھی۔ وہ اس کو سراسر غلط سمجھتے تھے کہ کوئی شخص ان کا مقلد بن جائے اور کتاب وسنت سے براہ راست دین اخذ نہ کرے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعد کے دور میں جو تقلید رائج ہوئی اس کا خود ائمہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

موجودہ روایتی تقلید کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ قرآن وسنت کے ساتھ آدمی کا زندہ رشتہ قائم نہیں رہتا۔ قرآن وسنت مومن کی غذائیں ہیں۔ مگر موجودہ تقلید کے بعد قرآن وسنت یا تو کسی تقلیدی مسلک کو صحیح ثابت کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں یا برکت اور تقدس حاصل کرنے کے لئے۔ قرآن وسنت کے نام پر آدمی قرآن وسنت سے دور ہوجاتا ہے۔

الفاظ کا فتنہ

ابو الطیب احمد بن حسین عرف متنبی (۳۰۳-۳۵۴ھ) کے متعلق دو رائیں ہیں۔ ایک طبقہ کا کہنا ہے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اس بنا پر امیر حمص نے اس کو قید خانہ میں بند کر دیا تھا۔ دوسرا طبقہ اس کا منکر ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ممکن ہے کہ متنبی کے دل میں کبھی اس کا ارادہ پیدا ہو مگر اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔

متنبی ایک ذہین اور باکمال شاعر تھا۔ اس کا کچھ کلام کتابوں میں نقل ہوا ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن کے جواب میں کہا تھا مثلاً:

النجم السیار والفلك الدوار واللیل والنهار

ان الکافر لفی اخطار

جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ کلام اتنا سطحی ہے کہ کوئی جاہل یا عجمی آدمی ہی اس کو قرآن کے مقابلہ میں رکھ سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ متنبی سے پوچھا گیا کہ تم محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ کیوں کہ آپ نے تو صاف طور پر کہا ہے کہ لا نبی بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں) اس نے کہا کہ تم لوگوں نے اس حدیث کا مطلب نہیں سمجھا۔ اس حدیث میں تو میری نبوت کی بشارت ہے۔ اس میں لا حرف نفی نہیں ہے بلکہ یہ نام ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ "لا" نام کا نبی میرے بعد ہوگا۔ کیوں کہ آسمانوں پر میرا نام "لا" ہے۔

ایک برطانی شہری کو کسٹم والوں نے پکڑا۔ وہ اپنے جوتے میں ۵۹۸ ملی گرام ہیروئن لئے ہوئے تھا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۹ جون ۱۹۸۴) سوالات کے دوران اس نے کہا کہ اس نے صرف اس لئے ایسا کیا تھا کہ اپنی عادت کو ٹھوکر مار کر پھینک دے۔

He was only trying to kick the habit.

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لفظی تاویل کا میدان کتنا زیادہ وسیع ہے۔ لفظی تاویل ایک ایسا ہتھیار ہے جو سفید کو سیاہ کر دے۔ جو قائل کے کلام سے اس کے منشا کے برعکس مفہوم ثابت کر دے۔ لفظی تاویل آدمی کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ ہر بات سے اپنا نظریہ نکال لے خواہ وہ بات اصلاً اس کے نظریہ کے بالکل برعکس مفہوم کیوں نہ رکھتی ہو۔ آدمی حقیقت کی تردید الفاظ کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ خدا کی دنیا میں ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔

اسلامی انقلاب

حضرت آدم پہلے انسان تھے اور اسی کے ساتھ پہلے پیغمبر بھی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت آدم کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک آپ کی نسل توحید اور دین حق پر قائم رہی۔ اس کے بعد ملت آدم میں شرک کا غلبہ ہو گیا (البقرہ ۲۱۳) حضرت نوح اسی ملت آدم کی اصلاح کے لئے آئے جو اس وقت دجلہ اور فرات کے سرسبز علاقہ میں آباد تھی۔

تاہم حضرت نوح کی طویل کوششوں کے باوجود ملت آدم دوبارہ مشرکانہ دین کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ ان میں سے صرف چند آدمی تھے جو حضرت نوح پر ایمان لائے۔ چنانچہ عظیم طوفان آیا اور چند مومنین کو چھوڑ کر باقی تمام لوگ غرق کر دئے گئے۔ اس کے بعد ملت نوح کے ذریعہ دوبارہ انسانی نسل چلی۔ لیکن دوبارہ وہی قصہ پیش آیا جو اس سے پہلے پیش آچکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بیشتر لوگ دین توحید کو چھوڑ کر دین شرک پر چل پڑے۔ یہی قصہ ہزاروں سال تک بار بار پیش آتا رہا۔ خدا نے لگاتار پیغمبر بھیجے (المومنون ۴۴) مگر انسان ان سے نصیحت قبول کرنے پر تیار نہ ہوا۔ حتی کہ تمام پیغمبروں کو استہزاء کا موضوع بنا لیا گیا (یٰسین ۳۰)

یہ سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اس زمانہ کے انسانی معاشروں میں جو شخص بھی پیدا ہوتا وہ اپنے ماحول کی ہر چیز سے شرک کا سبق لیتا۔ مذہبی رسموں، سماجی تقریبات قومی میلے اور حکومتی نظام تک ہر چیز مشرکانہ عقائد پر قائم ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو انسان بھی پیدا ہو وہ شرک کی فضا میں آنکھ کھولے اور شرک ہی کے ماحول میں اس کا خاتمہ ہو جائے۔ اسی چیز کو میں نے تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہو جانے سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت نوح کی دعا میں ان الفاظ میں ملتی ہے: **ولا یلدوا الا فاجراً کفاراً** (نوح ۲۷)

اب تاریخ حضرت ابراہیم تک پہنچ چکی تھی جن کا زمانہ ۲۱۰۰ قبل مسیح ہے۔ خود حضرت ابراہیم نے قدیم عراق میں جو اصلاحی کوششیں کیں ان کا بھی وہی انجام ہوا جو آپ سے پہلے دوسرے نبیوں کا ہوا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے نیا منصوبہ بنایا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ خصوصی اہتمام کے ذریعہ ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پائے۔ اپنی فطری حالت پر قائم رہنے کی وجہ سے اس کے لئے توحید کو قبول کرنا آسان ہو جائے۔ پھر اسی گروہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے کہ وہ تاریخ میں جاری ہونے والے شرک کے تسلسل کو توڑے۔

اس وقت حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ عراق اور شام اور مصر اور فلسطین جیسے آباد علاقوں کو چھوڑ کر

قدیم مکہ کے غیر آباد علاقہ میں جا بسیں۔ اور وہاں اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے اسماعیل کو بسا دیا۔ یہ علاقہ وادی غیر ذی زرع ہونے کی وجہ سے اس زمانہ میں بالکل غیر آباد تھا۔ اس بنا پر وہ قدیم مشرکانہ تہذیب سے پوری طرح پاک تھا۔ حضرت ابراہیم کی دعا (ابراہیم ۳۷) میں عند بیتك المحرم سے یہی چیز مراد ہے۔ یعنی ایک ایسا مقام جو شرک کی پہنچ سے دور ہو۔ حضرت ابراہیم کی اس دعا کا مطلب یہ تھا کہ خدایا، میں نے اپنی اولاد کو ایک بالکل غیر آباد علاقہ میں بسا دیا ہے۔ جہاں مشرکانہ تہذیبوں کے اثرات ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔ ایسا میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ وہاں ایک ایسی نسل پیدا ہو جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پائے اور حقیقی معنوں میں توحید کی پرستار بن سکے۔

کسی تہذیبی تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پانا کیا معنی رکھتا ہے، اس کی وضاحت ایک جزئی مثال سے ہوتی ہے، راقم الحروف ایک ایسے علاقہ کا رہنے والا ہے جس کی زبان اردو ہے۔ میرے باپ اردو بولتے تھے۔ میں بھی اردو بولتا ہوں اور میرے بچوں کی زبان بھی اردو ہے۔ اب یہ ہوا کہ میرے ایک لڑکے نے لندن میں ایک ایسے علاقہ میں رہائش اختیار کر لی جہاں صرف انگریزی بولنے والے لوگ رہتے ہیں اور ہر طرف انگریزی زبان کا ماحول ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے اس لڑکے کے بچے اب صرف انگریزی زبان جانتے ہیں۔ وہ اردو میں اظہار خیال کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ میں لندن گیا تو اپنے ان پوتوں سے مجھے انگریزی زبان میں بات کرنی پڑی۔

میرے ان پوتوں کا یہ حال اس لئے ہوا کہ اردو کے تسلسل سے منقطع ہو کر ان کی پرورش ہوئی۔ اگر وہ میرے ساتھ دہلی میں ہوتے تو ان بچوں کا یہ معاملہ کبھی نہ ہوتا۔

ذبح اسماعیل کے واقعہ کی حقیقت بھی یہی ہے۔ حضرت ابراہیم کو جو خواب (الصافات ۱۰۲) دکھایا گیا وہ ایک تمثیلی خواب تھا۔ اگرچہ حضرت ابراہیم اپنی انتہائی وفاداری کی بنا پر اس کی حقیقی تعمیل کے لئے آمادہ ہو گئے۔ قدیم مکہ میں نہ پانی تھا، نہ سبزہ اور نہ زندگی کا کوئی سامان۔ ایسی حالت میں اپنی اولاد کو وہاں بسانا یقیناً ان کو ذبح کرنے کے ہم معنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کو جیتے جی موت کے حوالے کر دیا جائے۔ شرک کے تسلسل سے منقطع کر کے نئی نسل پیدا کرنے کا منصوبہ کسی ایسے مقام پر ہی زیر عمل لایا جا سکتا تھا جہاں اسباب حیات نہ ہوں اور اس بنا پر وہ انسانی آبادی سے خالی ہو۔ حضرت ابراہیم کے خواب کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو معاشی اور سماجی حیثیت سے ذبح کر کے مذکورہ نسل تیار کرنے میں خدائی منصوبہ کا ساتھ دیں۔

یہ منصوبہ چونکہ اسباب کے دائرہ میں زیر عمل لانا تھا اس لئے اس کی باقاعدہ نگرانی بھی ضروری

حضرت ابراہیم خود فلسطین میں مقیم تھے۔ مگر وہ کبھی کبھی اس کی جانچ کے لئے مکہ جاتے رہتے تھے۔

ابتداءً اس مقام پر صرف ہاجرہ اور اسماعیل تھے۔ بعد کو جب وہاں زمزم کا پانی نکل آیا تو قبیلہ جرہم کے بکھرے ہوئے خانہ بدوش افراد یہاں آکر آباد ہوگئے۔ حضرت اسماعیل بڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلہ جرہم کی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم ایک بار فلسطین سے چل کر مکہ پہنچے تو اس وقت حضرت اسماعیل گھر پر موجود نہ تھے۔ حضرت ابراہیم نے ان کی بیوی سے حال دریافت کیا۔ بیوی نے کہا کہ ہم بہت برے حال میں ہیں، اور زندگی مصیبتوں میں گزر رہی ہے۔ حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہوگئے کہ جب اسماعیل آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دو (غیّر عتبة بابك) حضرت اسماعیل جب لوٹے اور بیوی سے یہ روداد سنی تو وہ سمجھ گئے کہ یہ میرے والد تھے اور ان کا پیغام تمثیل کی زبان میں یہ ہے کہ میں موجودہ عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے رشتہ کرلوں۔ چنانچہ انھوں نے اس کو طلاق دے دی اور قبیلہ کی دوسری عورت سے شادی کرلی۔ حضرت ابراہیم کی نظر میں وہ عورت اس قابل نہ تھی کہ وہ زیر تیاری نسل کی ماں بن سکے۔

کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیم دوبارہ مکہ آئے۔ اب بھی حضرت اسماعیل گھر پر نہ تھے۔ البتہ ان کی دوسری بیوی وہاں موجود تھیں۔ اس سے حال پوچھا تو اس نے قناعت اور شکر کی باتیں کیں اور کہا کہ ہم بہت اچھے حال میں ہیں۔ حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہوگئے کہ جب اسماعیل آئیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور یہ پیغام دے دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ باقی رکھو (ثبت عتبة بابك) حضرت اسماعیل جب واپس آئے اور روداد سنی تو سمجھ گئے کہ یہ میرے والد تھے اور ان کے پیغام کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ پیش نظر منصوبہ سے مطابقت کرکے رہ سکے اور پھر اس سے وہ نسل تیار ہو جس کا یہاں تیار کرنا اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے (تفسیر ابن کثیر)

اس طرح صحرائے عرب کے الگ تھلگ ماحول میں ایک نسل بننا شروع ہوئی۔ اس نسل کی خصوصیات کیا تھیں، اس کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نسل بیک وقت دو خصوصیات کی حامل تھی۔ ایک الفطرة اور دوسرے المروءة۔

صحرائے عرب کے ماحول میں فطرت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی جو انسان کو متاثر کرے۔ کھلے بیابان اونچے پہاڑ، رات کے وقت وسیع آسمان میں جگمگاتے ہوئے تارے وغیرہ۔ اس قسم کے قدرتی مناظر چاروں طرف سے انسان کو توحید کا سبق دے رہے تھے۔ وہ ہر وقت اس کو خدا کی عظمت اور [illegible] یاد دلاتے تھے۔ اسی خالص ربانی ماحول میں پرورش پاکر وہ قوم تیار ہوئی جو حضرت ابراہیم

کے الفاظ میں اس بات کی صلاحیت رکھتی تھی کہ وہ حقیقی معنوں میں امت مسلمہ (البقرہ ۱۲۸) بن سکے۔ یعنی اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے سپرد کر دینے والی قوم۔ یہ ایک ایسی قوم تھی جس کی فطرت اپنی ابتدائی حالت میں محفوظ تھی، اسی لئے وہ دین فطرت کو قبول کرنے کی پوری استعداد رکھتی تھی۔

اسی کے ساتھ دوسری چیز جس کو پیدا کرنے کے لئے یہ ماحول خصوصی طور پر موزوں تھا وہ وہی ہے جس کو عربی زبان میں المروءۃ (مردانگی) کہتے ہیں۔ قدیم حجاز کے سنگلاخ ماحول میں زندگی نہایت مشکل تھی۔ وہاں خارجی اسباب سے زیادہ انسانی اوصاف کار آمد ہو سکتے تھے۔ وہاں بیرونی ماحول میں وہ چیزیں موجود نہ تھیں جن پر انسان بھروسہ کرتا ہے۔ وہاں انسان کے پاس ایک ہی چیز تھی، اور وہ اس کا اپنا وجود تھا۔ ایسے ماحول میں قدرتی طور پر ایسا ہوتا تھا کہ انسان کے اندرونی اوصاف زیادہ سے زیادہ اجاگر ہوں۔ اس طرح دو ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ قوم بن کر تیار ہوئی جس کے اندر حیرت انگیز طور پر اعلیٰ مردانہ اوصاف تھے۔ پروفیسر فلپ ہٹی کے الفاظ میں پورا عرب ہیروؤں کی ایک ایسی نرسری (Nursery of heroes) میں تبدیل ہو گیا جس کی مثال نہ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی پائی گئی اور نہ اس کے بعد۔

ساتویں صدی عیسوی میں وہ وقت آگیا تھا کہ تاریخ میں شرک کے تسلسل کو توڑنے کا منصوبہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ بنو اسماعیل کے اندر پیغمبر آخر الزماں (حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم) پیدا کئے گئے۔ جن کے بارہ میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولوکرہ المشرکون (الصف) یہ آیت بتاتی ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کا خاص مشن یہ تھا کہ دین شرک کو غلبہ کے مقام سے ہٹا دیں اور دین توحید کو غالب دین کی حیثیت سے دنیا میں قائم کر دیں۔ اس غلبہ سے مراد اصلاً فکری اور نظریاتی غلبہ ہے۔ یعنی تقریباً اسی قسم کا غلبہ جیسا کہ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم کو روایتی علوم کے اوپر حاصل ہوا ہے۔

یہ غلبہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اس کا کچھ اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ قدیم روایتی علوم کو اگر جدید سائنسی علوم پر غالب کرنے کی مہم چلائی جائے تو وہ کس قدر دشوار ہوگی۔ اسی طرح ساتویں صدی عیسوی میں یہ بے حد مشکل کام تھا کہ مشرکانہ تہذیب کو مغلوب کیا جائے اور اس کی جگہ توحید کو غالب فکر کا مقام عطا کیا جائے۔ کسی نظام کے فکری غلبہ کو ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی درخت کو اس کی تمام جڑوں سمیت اکھاڑ پھینکنا۔ اس قسم کا کام ہمیشہ بے حد مشکل کام ہوتا ہے جو نہایت گہری منصوبہ بندی اور زبردست جد وجہد کے بعد ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کو دو خاص امدادی چیزیں فراہم کی گئیں۔ ایک وہ جس کا ذکر کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (آل عمران ۱۱۰) میں ہے۔ دو ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں ایک ایسا گروہ تیار کیا گیا جو وقت کا بہترین گروہ تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک طرف وہ اپنی تخلیقی فطرت پر قائم تھا۔ دوسری طرف وہ چیز اس کے اندر کمال درجہ میں موجود تھی جس کو عربی زبان میں المروءۃ (مردانگی) کہا جاتا ہے۔ اسی گروہ کے بہترین منتخب افراد، قبول اسلام کے بعد وہ لوگ بنے جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

دوسری خصوصی مدد وہ تھی جس کی طرف سورہ الروم کی ابتدائی آیات میں اشارہ ملتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا میں دو بڑی مشرکانہ سلطنتیں تھیں۔ ایک رومی (بازنطینی) سلطنت، دوسرے ایرانی (ساسانی) سلطنت۔ اس وقت کی آباد دنیا کا اکثر حصہ، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، انھیں دونوں سلطنتوں کے زیر قبضہ تھا۔ توحید کو وسیع تر دنیا میں غالب کرنے کے لئے ان دونوں مشرک سلطنتوں سے سابقہ پیش آنا لازمی تھا۔ خدا نے یہ کیا کہ عین اسی زمانہ میں دونوں سلطنتوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا۔ ان کی یہ لڑائی نسلوں تک جاری رہی۔ ایک بار ایرانی اٹھے اور رومیوں کی طاقت کو تہس نہس کر کے ان کی مملکت کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ دوسری بار رومی اٹھے اور انھوں نے ایرانیوں کی طاقت کو بالکل توڑ ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ بنو اسماعیل (اصحاب رسول) جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تحت منظم ہو کر اٹھے تو انھوں نے بے حد کم عرصہ میں ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ کو فتح کر ڈالا اور ہر طرف شرک کو مغلوب اور توحید کو غالب کر دیا۔

اس سلسلے میں یہاں پروفیسر ہٹی کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

> The enfeebled condition of the rival Byzantines and Sasanids who had conducted internecine against each other for many generations, the heavy taxes, consequent upon these wars, imposed on the citizens of both empires and undermining their sense of loyalty., ——— all these paved the way for the surprisingly rapid progress of Arabian arms.
>
> Philip K. Hitti, *History of the Arabs,* London 1970, p. 142–43

رومی اور ایرانی سلطنتوں کی باہمی رقابت نے دونوں کو شدید طور پر کمزور کر دیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہلاکت خیز جنگیں چھیڑ رکھی تھیں۔ یہ سلسلہ کئی نسل تک جاری رہا۔ اس کا خرچ پورا کرنے کے لئے رعایا پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ جس کے نتیجے میں رعایا کی وفاداری اپنی حکومتوں کے ساتھ باقی نہ رہی۔ اس قسم کی چیزیں تھیں جنھوں نے عرب ہتھیاروں کو موقع دیا کہ وہ رومی اور

ایرانی علاقوں میں تعجب خیز حد تک تیز کامیابی حاصل کر سکیں۔

مورخین نے عام طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ تاہم وہ اس کو ایک عام طبعی واقعہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غیر معمولی واقعہ ایک خدائی منصوبہ تھا جو خاتم النبیین کی تائید کے لئے خصوصی طور پر ظاہر کیا گیا۔

ایک امریکی انسائیکلو پیڈیا میں "اسلام" کے عنوان سے جو مقالہ ہے اس میں عیسائی مقالہ نگار نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

Its advent changed the course of human history.

یہ ایک حقیقت ہے کہ صدر اول کے اسلامی انقلاب کے بعد انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ اور ان تمام تبدیلیوں کی اصل یہ تھی کہ دنیا میں شرک کا تسلسل ختم ہو کر توحید کا تسلسل جاری ہوا۔ شرک تمام برائیوں کی جڑ ہے اور توحید تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے جب یہ بنیادی واقعہ ہوا تو اسی کے ساتھ انسان کے اوپر تمام خوبیوں کا دروازہ بھی کھل گیا جو شرک کے غلبہ کے سبب سے اب تک اس کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

اب توہماتی دور ختم ہو کر علمی دور کا آغاز ہوا۔ انسانی امتیاز کی بنیاد ڈھ گئی اور اس کے بجائے انسانی مساوات کا زمانہ شروع ہوا۔ نسلی حکمرانی کی جگہ جمہوری حکمرانی کی بنیادیں پڑیں۔ مظاہر فطرت جو تمام دنیا میں پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے، پہلی بار تحقیق اور تسخیر کا موضوع قرار پائے، اور اس طرح حقائق فطرت کے کھلنے کا آغاز ہوا۔ یہ دراصل توحید ہی کا انقلاب تھا جس سے ان تمام انقلابات کی بنیاد پڑی جو بالآخر اس مشہور واقعہ کو پیدا کرنے کا سبب بنے جس کو جدید ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تھی کہ خدایا مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ خدایا، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا (ابراہیم ۳۶)

سوال یہ ہے کہ بتوں نے کس طرح لوگوں کو گمراہ کیا۔ بتوں (اصنام) میں وہ کون سی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کا راز اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں وہ کون سے بت تھے جن کی بابت آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔

یہ بت سورج، چاند اور ستارے تھے۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں جو مہذب دنیا تھی اس میں ہر جگہ آسمان کے ان روشن اجرام کی پرستش ہوتی تھی جن کو سورج، چاند اور ستارے کہا جاتا ہے۔ اسی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ بت کیوں کر لوگوں کو گمراہ کر پاتے تھے۔

خدا اگرچہ سب سے بڑی حقیقت ہے مگر وہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس

سورج، چاند اور ستارے ہر آنکھ کو جگمگاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اسی جگمگاہٹ کی بنا پر لوگ ان کے فریب میں آگئے اور ان سے متاثر ہو کر ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ ان روشن اجسام کا غلبہ انسان کے ذہن پر اتنا زیادہ ہوا کہ وہی پوری انسانی فکر پر چھا گیا۔ حتی کہ حکومتیں بھی انھیں کی بنیاد پر قائم ہونے لگیں۔ اس زمانہ کے بادشاہ اپنے آپ کو سورج کی اولاد اور چاند کی اولاد بتا کر لوگوں کے اوپر حکومت کرنے لگے۔

پیغمبر آخر الزماں کے ذریعہ توحید کو غالب کر کے اس دور کو ختم کیا گیا۔ اس وقت غلبۂ توحید کا جو منصوبہ بنایا گیا اس کے دو خاص مرحلے تھے۔ پہلا مرحلہ وہ تھا جس کو قرآن میں قاتلوهم حتى لا تكون فتنة و يكون الدين كله لله (الانفال ۳۹) کہا گیا ہے۔ اس آیت میں "فتنہ" سے مراد شرک جارح ہے۔ قدیم زمانہ میں شرک کو جارحیت کا موقع اس لئے حاصل تھا کہ اس زمانہ میں حکومت کی بنیاد شرک پر قائم ہوگئی تھی۔ شرک کو مکمل طور پر حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایسی حالت میں جب توحید کی دعوت دی جاتی تو وقت کے حکمرانوں کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ یہ دعوت ان کے حق حکمرانی کو مشتبہ کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ توحید کے داعیوں کو کچلنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ قدیم زمانہ میں اعتقادی جارحیت کا اصل سبب یہی تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو یہ حکم ہوا کہ علم برداران شرک سے لڑو اور شرک کی اس حیثیت کا خاتمہ کر دو کہ وہ داعیان توحید کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنا سکیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ شرک کا رشتہ سیاست سے کاٹ دیا جائے۔ شرک اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ رسول اور آپ کے اصحاب نے یہ مہم پوری طاقت کے ساتھ شروع کی۔ ان کی کوششوں سے پہلے عرب میں شرک کا زور ٹوٹا۔ اس کے بعد قدیم آباد دنیا کے بیشتر علاقہ میں مشرکانہ نظام کو مغلوب کر کے ہمیشہ کے لئے شرک کی جارحانہ حیثیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اب ہمیشہ کے لئے شرک الگ ہو گیا اور سیاسی اقتدار الگ۔

شرک کے اوپر توحید کے غلبہ کی مہم کا دوسرا مرحلہ وہ تھا جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے:
سنريهم آياتنا في الآفاق وفي انفسهم حتى يتبين لهم انه الحق (حم السجدہ ۵۳) پہلے مرحلہ کا مطلب مظاہر فطرت سے سیاسی نظریہ اخذ کرنے کو ختم کرنا تھا۔ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پوری طرح انجام پا گیا۔ دوسرے مرحلہ کا مطلب یہ تھا کہ مظاہر فطرت سے توہمات کے پردہ کو ہٹا دیا جائے اور اس کو علمی روشنی میں لایا جائے۔ اس دوسرے مرحلہ کا آغاز دور نبوت سے ہوا اور اس کے بعد وہ موجودہ سائنسی انقلاب کی صورت میں تکمیل کو پہنچا۔

موجودہ دنیا خدا کی صفات کا ایک اظہار ہے۔ یہاں مخلوقات کے آئینہ میں آدمی اس کے

خالق کو پاتا ہے۔ وہ اس پر غور کرکے خدا کی قدرت اور عظمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ مگر قدیم مشرکانہ افکار نے دنیا کی چیزوں کو پر اسرار طور پر مقدس بنا رکھا تھا۔ ہر چیز کے بارہ میں کچھ توہماتی عقائد بن گئے تھے اور یہ عقائد ان چیزوں کی تحقیق و جستجو میں مانع تھے۔ توحید کے انقلاب کے بعد جب تمام دنیا خدا کی مخلوق قرار پائی تو اس کے بارہ میں تقدس کا ذہن ختم ہو گیا۔ اب دنیا کی ہر چیز کا بے لاگ مطالعہ کیا جانے لگا اور اس کی تحقیق شروع ہو گئی۔

اس تحقیق اور مطالعہ کے نتیجہ میں چیزوں کی حقیقتیں کھلنے لگیں۔ دنیا کے اندر قدرت کا جو مخفی نظام کارفرما ہے وہ انسان کے سامنے آنے لگا۔ یہاں تک کہ جدید سائنسی انقلاب کی صورت میں وہ پیشین گوئی کامل صورت میں پوری ہو گئی جس کا ذکر اوپر کی آیت (حم السجدہ ۵۳) میں ہے۔

جدید سائنسی مطالعہ نے کائنات کے جو حقائق انسان پر کھولے ہیں انھوں نے ہمیشہ کے لئے توہماتی دور کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ان دریافت شدہ حقائق سے بیک وقت دو فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ دینی عقائد اب محض مدعیانہ عقائد نہیں رہے بلکہ خود علم انسانی کے ذریعہ ان کا برحق ہونا ایک ثابت شدہ چیز بن گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ معلومات ایک مومن کے لئے اضافۂ ایمان کا بے پناہ خزانہ ہیں۔ ان کے ذریعہ کائنات کے بارہ میں جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ اگرچہ بہت جزئی ہے تاہم وہ اتنا زیادہ حیرت ناک ہے کہ اس کو پڑھ کر اور جان کر آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوں۔ اس کا ذہن معرفت رب کی روشنی حاصل کرے۔ اس کی آنکھیں خدا کی عظمت اور خوف سے آنسو بہانے لگیں۔ وہ آدمی کو اس درجۂ احسان تک پہنچا دے جس کو حدیث میں تعبد اللہ کانک تراہ (اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو) کہا گیا ہے۔

دور جدید میں احیاء اسلام

موجودہ زمانہ میں تاریخ دوبارہ وہیں پہنچ گئی ہے جہاں وہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں پہنچی تھی۔ قدیم زمانہ میں انسان کے اوپر شرک کا غلبہ اس طرح ہوا کہ تاریخ میں اس کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر شخص جو انسانی نسل میں پیدا ہوتا وہ مشرک پیدا ہوتا۔ اب پچھلے چند سو سال کے عمل کے نتیجہ میں ملحدانہ افکار انسان کے اوپر غالب آ گئے ہیں۔ علم و عمل کے ہر شعبہ میں الحادی طرز فکر اس طرح چھا گیا ہے کہ دوبارہ تاریخ انسانی میں الحاد کا تسلسل قائم ہو گیا ہے۔ اب ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں پیدا ہو، وہ ملحدانہ افکار کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے۔ الحاد آج کا غالب دین ہے۔ اور اسلام کا احیاء موجودہ زمانہ میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک الحاد کو فکری غلبہ کے مقام سے ہٹایا نہ جائے۔

موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کو ممکن بنانے کے لئے دوبارہ وہی دونوں طریقے اختیار کرنے ہیں جو پہلے ظہور کے وقت اختیار کئے گئے تھے۔ یعنی افراد کی تیاری۔ اور مخالفین حق کی مغلوبیت۔
پہلا کام ہم کو خود اپنے وسائل کے تحت انجام دینا ہے۔ جہاں تک دوسرے کام کا تعلق ہے، اس کو موجودہ زمانہ میں دوبارہ خدا نے اسی طرح بہت بڑے پیمانہ پر انجام دے دیا ہے جس طرح اس نے دور اول میں انجام دیا تھا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان پیدا شدہ مواقع کو استعمال کیا جائے۔
۱۔ موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے سب سے پہلے افراد کار کی ضرورت ہے۔ گویا اب دوبارہ ایک نئے انداز سے وہی چیز درکار ہے جو حضرت ابراہیم کے منصوبہ میں مطلوب تھی۔ یعنی حقیقی معنوں میں ایک مسلم گروہ کی تیاری۔
موجودہ زمانہ میں اسلامی احیاء کی مہم چلانے کے لئے جو افراد درکار ہیں وہ عام قسم کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگ ہیں جن کے لئے اسلام ایک دریافت (Discovery) بن گیا ہو۔ وہ واقعہ جو سب سے زیادہ کسی انسان کو متحرک کرتا ہے وہ یہی دریافت کا واقعہ ہے۔ جب آدمی کسی چیز کو دریافت کے درجہ میں پائے تو اچانک اس کے اندر ایک نئی شخصیت ابھر آتی ہے۔ یقین، حوصلہ، عزم، مردانگی، فیاضی، قربانی، اتحاد، غرض وہ تمام اوصاف جو کوئی بڑا کام کرنے کے لئے درکار ہیں وہ سب دریافت کی زمین پر پیدا ہوتے ہیں۔
موجودہ زمانہ میں مغربی اقوام میں جو اعلیٰ اوصاف پائے جاتے ہیں وہ سب اسی دریافت کا نتیجہ ہیں۔ مغربی قوموں نے روایتی دنیا کے مقابلہ میں سائنسی دنیا کو دریافت کیا ہے۔ یہی دریافت کا احساس ہے جس نے مغربی قوموں میں وہ اعلیٰ اوصاف پیدا کر دئے ہیں جو آج ان کے اندر پائے جاتے ہیں۔
قرن اول میں اصحاب رسول کا معاملہ بھی یہی تھا۔ ان کو خدا کا دین بطور دریافت کے ملا تھا۔ انھوں نے جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام کو پایا تھا۔ انھوں نے شرک کے مقابلہ میں توحید کو دریافت کیا تھا۔ ان پر دنیا کے مقابلہ میں آخرت کا انکشاف ہوا تھا۔ یہی چیز تھی جس نے ان کے اندر وہ غیر معمولی اوصاف پیدا کر دئے جن کو آج ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ آج اگر اسلامی احیاء کی مہم کو موثر طور پر چلانا ہے تو دوبارہ ایسے انسان پیدا کرنے ہوں گے جنھیں اسلام دریافت کے طور پر ملا ہو نہ کہ محض نسلی وراثت کے طور پر۔
۲۔ اسلام چودہ سو سال پہلے شروع ہوا۔ اس کے بعد اس کی ایک تاریخ بنی، تمدنی عظمت اور سیاسی فتوحات کی تاریخ۔ آج جو لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں وہ اسی تاریخ کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ جس قوم کی بھی یہ صورت حال ہو وہ ہمیشہ قریبی تاریخ میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ وہ تاریخ سے گذر کر ابتدائی اصل تک نہیں پہنچتی۔ یہی معاملہ آج مسلمانوں کا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان

شعوری یا غیر شعوری طور پر، اپنا دین تاریخ سے اخذ کر رہے ہیں نہ کہ حقیقۃً قرآن اور سنت رسول سے۔
یہی وجہ ہے کہ اسلام آج کے مسلمانوں کے لئے فخر کی چیز بنا ہوا ہے نہ کہ ذمہ داری کی چیز۔ ان کے افکار و اعمال میں یہ نفسیات اس قدر رچ بس گئی ہے کہ ہر جگہ اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کو قرآن وسنت میں دیکھئے تو وہ سراسر ذمہ داری اور مسئولیت کی چیز نظر آئے گا۔ اس کے برعکس اسلام کو جب اس کی تمدنی تاریخ اور سیاسی واقعات کے آئینہ میں دیکھا جائے تو وہ فخر اور عظمت کی چیز معلوم ہونے لگتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی انقلابی تحریکیں اسی جذبۂ فخر کے تحت اٹھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقتی ہنگامے پیدا کر کے ختم ہو گئیں۔ کیوں کہ فخر کا جذبہ نمائش اور ہنگامے کی طرف لے جاتا ہے۔ اور مسئولیت کا جذبہ حقیقی اور سنجیدہ عمل کی طرف۔

اسلامی احیاء کی مہم کو موثر طور پر چلانے کے لئے وہ افراد درکار ہیں جنھوں نے اسلام کو قرآن وحدیث کی ابتدائی تعلیمات سے اخذ کیا ہو نہ کہ بعد کو بننے والی تمدنی اور سیاسی تاریخ سے۔ قرآن وحدیث سے دین کو اخذ کرنے والے لوگ ہی سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے تحت کوئی حقیقی مہم چلا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ تاریخ سے اپنا دین اخذ کریں وہ صرف اپنے فخر کا جھنڈا بلند کریں گے، وہ کسی نتیجہ خیز عمل کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

مسلمان موجودہ زمانہ میں ایک شکست خوردہ قوم بنے ہوئے ہیں۔ پوری مسلم دنیا پر ایک قسم کا احساس مظلومی (Persecution complex) چھایا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی تاریخ سے دین کو اخذ کرنا ہے۔ ہم نے تاریخی عظمت کو دین سمجھا۔ ہم نے "لال قلعہ" اور "فتح پور سیکری" میں اپنی اسلامیت کا تشخص دریافت کیا۔ چوں کہ موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں نے ہم سے یہ چیزیں چھین لیں، اس لئے ہم فریاد و ماتم میں مشغول ہو گئے۔ اگر ہم ہدایت ربانی کو دین سمجھتے تو ہم کبھی احساس محرومی کا شکار نہ ہوتے۔ کیوں کہ وہ ایسی چیز ہے جس کو کوئی طاقت ہم سے کبھی چھین نہیں سکتی۔ ہم نے چھن جانے والی چیزوں کو اسلام سمجھا اس لئے جب وہ چھن گئی تو ہم شکایت اور محرومی کا پیکر بن کر رہ گئے۔ اگر ہم نہ چھننے والی چیز کو اسلام سمجھتے تو ہمارا کبھی وہ حال نہ ہوتا جو آج ہر طرف نظر آرہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جو چیز ہمارے پاس ابھی تک بغیر چھنی ہوئی محفوظ ہے اس کا ہمیں شعور نہیں۔ اور جو چیز ہم سے چھن گئی ہے اس کے لئے ہم شکایت اور احتجاج میں مصروف ہیں۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان دوسری قوموں سے لڑائی جھگڑے میں مصروف ہیں۔ وہ اسلام کو اپنی قومی عظمت کا نشان سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ انھیں اس عظمت کو چھینتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے

خلاف نفرت انگیز مظاہرے کر رہے ہیں۔ کہیں یہ لڑائی الفاظ کے ذریعہ ہو رہی ہے اور کہیں ہتھیاروں کے ذریعہ۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کے پورے رویہ کو منفی بنا دیا ہے۔ اسلام اگر ان کو ربانی ہدایت کے طور پر ملتا تو وہ محسوس کرتے کہ ان کے پاس دوسری قوموں کو دینے کے لئے کوئی چیز ہے۔ وہ اپنے کو دینے والا سمجھتے اور دوسرے کو لینے والا۔ جب کہ موجودہ حالت میں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ چھنے ہوئے لوگ ہیں اور دوسرے چھیننے والے لوگ۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان حقیقی رشتہ داعی اور مدعو کا رشتہ ہے مگر تاریخی اسلام کو اسلام سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دوسری قومیں ہمارے لئے صرف حریف اور رقیب بن کر رہ گئی ہیں۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان جب تک یہ حریفانہ فضا باقی ہے، اسلامی احیاء کا کوئی حقیقی کام شروع نہیں کیا جا سکتا۔

پہلے ہی مرحلہ میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمام مسلمانوں کو حریفانہ نفسیات سے پاک کر دیا جائے۔ مگر کم سے کم ایک ایسی ٹیم کا ہونا ضروری ہے جس کے افراد اپنی حد تک اس ذہنی فضا سے نکل چکے ہوں۔ جن کے اندر ایسی فکری تبدیلی آ چکی ہو کہ دوسری قوموں کو وہ اپنا مدعو سمجھیں نہ کہ مادی حریف اور قومی رقیب۔ یہ بظاہر سادہ سی بات انتہائی مشکل بات ہے۔ اس کے لئے اپنے آپ کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ ہم یک طرفہ طور پر تمام شکایتوں کو بھلا دیں۔ ہر قسم کے مادی نقصانات کو گوارا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ داعی اور مدعو کا رشتہ داعی کی طرف سے یک طرفہ قربانی پر قائم ہوتا ہے۔ اور موجودہ دنیا میں بلاشبہ یہ سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے اوصاف ہیں جو ان لوگوں میں ہونا ضروری ہیں جو موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی مہم کے لئے اٹھیں۔ ایسے افراد تیار کرنے کے لئے موجودہ زمانہ میں دوبارہ اسی قسم کا ایک منصوبہ درکار ہے جو دور اول میں خیر امت کے اخراج (آل عمران ۱۱۰) کے لئے زیر عمل لایا گیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج یہ ضرورت ہے کہ جدید طرز کی ایک اعلیٰ تربیت گاہ قائم کی جائے۔ یہ تربیت گاہ تمدنی ماحول سے الگ قدرت کی بے آمیز فضا میں قائم ہونی چاہئے۔ یہ تربیت گاہ گویا دوبارہ قوم کے کچھ اعلیٰ افراد کو وادی غیر ذی زرع میں بسانے کے ہم معنی ہوگی۔

مذکورہ تربیت گاہ کو کامیاب طور پر چلانے کے لئے کچھ ایسے ابراہیمی والدین درکار ہیں جو اپنی اولاد کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ اس پر راضی ہو جائیں کہ ان کی ذہین اولاد کو وقت

کے اہل معاشی مواقع سے محروم کرکے ایک ایسے ماحول میں ڈال دیا جائے جہاں سب کچھ دے کر بھی تعلق باللہ اور فکر آخرت کے سوا کوئی اور چیز نہ ملتی ہو۔ اس طرح کی ایک تربیت گاہ، فلپ ہٹی کے مذکورہ الفاظ میں، دوبارہ ایک قسم کی "نرسری آف ہیروز" بنانے کے ہم معنی ہوگی۔ جب تک اس قسم کے افراد کی ایک قابل لحاظ ٹیم تیار نہ ہو جائے، احیاء اسلام کی جانب کوئی حقیقی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔

اس قسم کی تربیت گاہ کا قیام گویا جدید زمانہ کے لحاظ سے اس آیت قرآنی کی تعمیل ہوگی ——

ولولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون۔ یعنی قوم کے کچھ ذہین افراد کو عام ماحول سے الگ کرکے ایک علیحدہ ماحول میں لایا جائے اور وہاں متعین مدت تک خصوصی تعلیم و تربیت کے ذریعہ انھیں اس کے لئے تیار کیا جائے کہ وہ موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلا سکیں۔ وہ اہل عالم کے لئے منذر اور مبشر بن سکیں۔

دور اول میں اسلامی انقلاب کو ممکن بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اہتمام یہ کیا کہ ایران اور روم کی سلطنتیں جو اس زمانہ میں دین توحید کی سب سے بڑی حریف تھیں، ان کو باہم ٹکرا کر اتنا کمزور کر دیا کہ اہل اسلام کے لئے ان کو مغلوب کرنا آسان ہوگیا۔

خدا کی یہی مدد موجودہ زمانہ کے اہل ایمان کے لئے ایک اور شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور وہ ہے کائنات کے بارہ میں ایسی معلومات کا سامنے آنا جو دینی حقیقتوں کو معجزاتی سطح پر ثابت کر رہی ہیں۔ قدیم زمانہ میں توہماتی طرز فکر کا غلبہ تھا، اس بنا پر عالم کائنات کے بارہ میں انسان نے عجیب عجیب بے بنیاد رائیں قائم کر رکھی تھیں۔ کائنات کو قرآن میں آلاء رب (کرشمۂ خدا) خدا کہا گیا ہے۔ مگر یہ خدائی کرشمہ توہماتی مفروضوں کے پردہ میں چھپا ہوا تھا۔ دور اول کے اسلامی انقلاب کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ مظاہر فطرت جو اس سے پہلے پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے وہ انسان کے لئے تحقیق و تسخیر کا موضوع بن گئے۔ اس طرح تاریخ انسانی میں پہلی بار واقعات فطرت کو خالص علمی انداز میں جاننے کا ذہن پیدا ہوا۔ یہ ذہن مسلسل بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ یورپ پہنچا۔ یہاں ترقی پاکر وہ اس انقلاب کا سبب بنا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

سائنس نے گویا توہماتی پردہ کو ہٹا کر کرشمۂ خدا کا کرشمہ خدا ہونا ثابت کر دیا۔ اس نے مظاہر فطرت کو "معبود" کے مقام سے ہٹا کر "مخلوق" کے مقام پر رکھ دیا۔ حتی کہ یہ نوبت آئی کہ چاند، جس کو قدیم انسان معبود سمجھ کر پوجتا تھا، اس پر اس نے اپنے پاؤں رکھ دئے اور وہاں اپنی مشینیں

اتار دیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سائنس نے جو نئے دلائل فراہم کئے ہیں ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو دین توحید کی دعوت کو اس برتر سطح پر پیش کیا جاسکتا ہے جس کے لئے اس سے پہلے معجزات ظاہر کئے جاتے تھے۔

زمین و آسمان میں جو چیزیں ہیں وہ اس لئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر آدمی خدا کو یاد کرے۔ مگر انسان نے خود انھیں چیزوں کو خدا سمجھ لیا۔ یہ ایک قسم کا انحراف تھا۔ اسی قسم کا انحراف موجودہ زمانہ میں سائنسی معلومات کے بارہ میں پیش آرہا ہے۔ سائنسی تحقیق سے جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ سب خدا کی خدائی کا ثبوت ہیں۔ وہ انسان کو خدا کی یاد دلانے والے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے ملحد مفکرین نے دوبارہ ایک انحراف کیا۔ انھوں نے سائنسی حقیقتوں کو غلط رخ دے کر یہ کیا کہ جس چیز سے خدا کا ثبوت نکل رہا تھا اس کو انھوں نے اس بات کا ثبوت بنادیا کہ یہاں کوئی خدا نہیں ہے۔ بلکہ سارا نظام ایک مشینی عمل کے تحت اپنے آپ چلا جارہا ہے۔

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے وہ ایک حد درجہ بامعنی اور بامقصد کائنات ہے۔ جدید دریافتوں نے ثابت کیا ہے کہ ہماری دنیا منتشر مادہ کا بےمعنی انبار نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا منظم کارخانہ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں بے حد ہم آہنگی کے ساتھ ایک ایسے رخ پر سفر کرتی ہیں جو ہمیشہ بامقصد نتائج پیدا کرنے والے ہوں۔ کائنات میں نظم اور مقصدیت کی دریافت واضح طور پر ناظم کی موجودگی کا اقرار ہے۔ وہ کائنات کے پیچھے خدائی کارفرمائی کا یقینی ثبوت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے بے خدا مفکرین نے یہ کیا کہ اس سائنسی دریافت کا رخ الحاد کی طرف موڑ دیا۔ انھوں نے کہا کہ جو کچھ ثابت ہوا ہے وہ بجائے خود واقعہ ہے۔ مگر اس کا کیا ثبوت کہ وہ کوئی نتیجہ (End) ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ محض ایک اثر (Effect) ہو۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ یہاں کوئی ذہن ہو جو شعور اور ارادہ کے تحت بالقصد واقعات کو ایک خاص انجام کی طرف لے جارہا ہو۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ واقعات کے بےشعور عمل کے اثر سے اپنے آپ ایک چیز برآمد ہو رہی ہو جو اتفاق سے بامعنی بھی ہو —— یہ بےمعنی توجیہ خود ایک ارادہ کے تحت وجود میں آئی ہے۔ پھر کیسی عجیب بات ہے کہ بامعنی کائنات کو بلا ارادہ کارفرمائی مان لیا جائے۔

ایک طرف سائنس کے ظہور کے بعد ملحد مفکرین نے بہت بڑے پیمانہ پر سائنس کو الحاد کا رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف اس کے مقابلہ میں مذہبی مفکرین کی کوششیں اتنی ہی کم ہیں۔ پچھلے سو سال کے اندر ایک طرف ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ علمی کتابیں چھپی ہیں جن کے

ذریعہ سائنس سے غلط طور پر الحاد کو برآمد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری طرف دینی منکرین کی صف میں چند ہی قابل ذکر علمی کوششوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک قابل قدر کتاب سر جیمز جینز کی پراسرار کائنات (The Mysterious Universe) ہے۔ اس کتاب میں لائق مصنف نے نظریۂ تعلیل (Principle of Causation) کو خالص سائنسی استدلال کے ذریعہ منہدم کر دیا ہے جس کو موجودہ زمانہ میں خدا کا مشینی بدل سمجھ لیا گیا تھا۔

موجودہ صدی کے نصف آخر میں بے شمار نئے حقائق انسان کے علم میں آئے ہیں جو نہایت برتر سطح پر دینی عقائد کی حقانیت کو ثابت کر رہے ہیں۔ مگر ابھی تک کوئی ایسا دینی مفکر سامنے نہیں آیا جو ان سائنسی معلومات کو دینی صداقتوں کے اثبات کے طور پر مدون کرے۔ اگر یہ کام اعلیٰ سطح پر ہو سکے تو وہ دعوت توحید کے حق میں ایک علمی معجزہ ظاہر کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں جتنے پیغمبر آئے سب کی پیغمبری پر ان کے ہم عصر مخاطبین نے شک کیا (ہود ۶۲) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ابتداءً یہی صورت پیش آئی کہ آپ کے مخاطبین اول آپ کی نبوت پر شک کرتے رہے (ص ۸) تاہم اسی کے ساتھ قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کیا جائے گا (عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا) اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی نبوت شک کے مرحلہ سے گذر کر ایک ایسے مرحلہ میں پہنچے گی جب وہ مکمل طور پر تسلیم شدہ نبوت بن جائے۔ محمود (قابل تعریف) ہونا تسلیم واعتراف کا آخری درجہ ہے۔

ہر نبی جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کے اندر ایک ایسی شخصیت ہوتا ہے جس کو لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ "معلوم نہیں یہ واقعۃً پیغمبر ہیں یا صرف دعویٰ کر رہے ہیں" اس طرح کے خیالات لوگوں کے ذہن میں گھومتے ہیں اور آخر وقت تک ختم نہیں ہو پاتے۔ پیغمبری اپنے ابتدائی دور میں صرف دعویٰ ہوتی ہے۔ وہ اپنے دعویٰ کا ایسا ثبوت نہیں ہوتی جس کو ماننے پر لوگ مجبور ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر آیا وہ اپنی قوم کی نظر میں ایک نزاعی شخصیت بن گیا۔ کیونکہ پیغمبر کی صداقت کو جاننے کے لئے لوگوں کے پاس اس وقت اس کا صرف دعویٰ تھا۔ اس کے حق میں مسلمہ تاریخی دلائل ابھی جمع نہیں ہوئے تھے۔ اس قسم کے دلائل ہمیشہ بعد کو وجود میں آتے ہیں۔ مگر عام طور پر انبیاء کا معاملہ اس بعد کے مرحلہ تک پہنچ نہ سکا۔

دوسرے پیغمبر نزاعی دور میں شروع ہوئے اور نزاعی دور ہی میں ان کا اختتام ہو گیا۔ کیوں کہ ان کے بعد ان کے پیغام کی پشت پر ایسا گروہ جمع نہ ہو سکا جو ان کی سیرت اور ان کے کلام

کو مکمل طور پر محفوظ نہ رکھ سکے۔ دوسرے انبیاء اپنے زمانہ میں لوگوں کے لئے اس لئے نزاعی تھے کہ وہ ابھی اپنی تاریخ کے آغاز میں تھے، بعد کے دور میں وہ دوبارہ نزاعی ہو گئے۔ کیوں کہ بعد کو ان کی جو تاریخ بنی وہ انسانی علم کے معیار پر تسلیم شدہ نہ تھی۔

نبیوں کی فہرست میں اس اعتبار سے صرف پیغمبر آخر الزماں کا استثناء ہے۔ آپ نے اگرچہ دوسرے نبیوں کی طرح، اپنی نبوت کا آغاز نزاعی دور سے کیا۔ مگر بعد کے دور میں آپ کو اتنی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ زمین کے بڑے حصہ میں آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا اقتدار قائم ہو گیا ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں آپ کے دین نے ایشیا اور افریقہ کی بڑی طاقتوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔

پیغمبر آخر الزماں کو جتنے چیلنج پیش آئے سب میں وہ فاتح رہے۔ آپ نے جتنی پیشین گوئیاں کیں سب مکمل طور پر پوری ہوئیں۔ جو طاقت بھی آپ سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو گئی۔ آپ کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آئے جن کی بنا پر معاصر تاریخ میں آپ کا ریکارڈ قائم ہو گیا۔ ساری تاریخ انبیاء میں آپ کو یہ غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ کی نبوت نزاعی مرحلہ سے نکل کر محمودی مرحلہ میں پہنچ گئی۔ آپ کا کلام اور آپ کا کارنامہ دونوں اس طرح محفوظ حالت میں باقی رہے کہ کسی کے لئے آپ کے بارہ میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

موجودہ زمانہ میں دین حق کے داعیوں کو ایک ایسا خصوصی موقع (Advantage) حاصل ہے جو تاریخ کے پچھلے ادوار میں کسی داعی گروہ کو حاصل نہ تھا۔ وہ یہ کہ ہم آج اس حیثیت میں ہیں کہ توحید کی دعوت کو مسلمہ (Established) نبوت کی سطح پر پیش کر سکیں۔ جب کہ اس سے پہلے توحید کی دعوت صرف نزاعی (Controversial) نبوت کی سطح پر پیش کی جا سکتی تھی۔

دوسری امتیں اگر نبوت نزاعی کی وارث تھیں تو ہم نبوت محمودی کے وارث ہیں۔ مسلمانوں کو اقوام عالم کے سامنے شہادت حق کا جو کام انجام دینا ہے اس کے لئے خدا نے آج ہر قسم کے موافق مواقع مکمل طور پر کھول دئے ہیں۔ اس کے باوجود اگر مسلمان اس کار شہادت کو انجام نہ دیں۔ یا شہادت دین کے نام پر قومی جھگڑے کھڑے کرنے لگیں تو مجھے نہیں معلوم کہ قیامت کے دن وہ رب العلمین کے سامنے کیوں کر بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔

نومبر ۱۹۸۳ کے آخری ہفتہ میں لاہور میں قرآنی سیمنار ہوا۔ اس موقع پر راقم الحروف کو ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ زیر نظر مقالہ اسی سیمنار میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا گیا۔

حیوانیت کی سطح پر

حضرت سلیمانؑ کے زمانہ حکومت (۳، ۹-۱۰۱۳ ق م) میں بحر قلزم کی مشرقی شاخ کے کنارے ایلات (Elath) کے مقام پر یہودیوں کی آبادی تھی۔ انھوں نے قانون سبت کی خلاف ورزی کی۔ ان کی شریعت سبت (سنیچر) کے دن معاشی سرگرمیاں ممنوع تھیں۔ مگر وہ اس دن مچھلی کا شکار کرنے لگے۔ سنیچر کے دن ہاں کثرت سے دریا میں آتی تھیں اور بقیہ دنوں میں پانی کے نیچے چلی جاتی تھیں۔ یہود نے یہ شرعی تدبیر دریا کے کنارے گڑھے بناتے۔ وہ دریا کا پانی کاٹ کر گڑھے میں ملا دیتے۔ سنیچر کے دن جب مچھلیاں ے میں آجاتیں تو وہ نکلنے کا راستہ بند کر دیتے۔ اگلے دن اتوار کو وہ ان مچھلیوں کو پکڑ لیتے۔

یہ تدبیر وہ اس لئے کرتے تھے تاکہ ان پر یہ بات صادق نہ آئے کہ وہ سبت کے دن شکار کرتے ہیں کے نام پر یہ بے دینی اللہ کو اتنی زیادہ ناپسند ہوئی کہ ان پر اللہ کی لعنت ہوئی۔ وہ بندر اور سور بنا دئے گئے (مائدہ ۶۰) ـــــ عملاً یہی حالت اگرچہ پوری قوم یہود کی تھی۔ تاہم ایک خاص مقام کے دیوں کے باطن کو غالباً ظاہری طور پر بھی مجسم کر دیا گیا تاکہ دوسروں کے لئے عبرت ہو (بقرہ ۶۶)

بندر اور سور بنانے سے کیا مراد ہے، اس بارہ میں مفسرین کی دو رائیں ہیں۔ اکثریت نے الفاظ پر قیاس کرتے ہوئے یہ مراد لیا ہے کہ مذکورہ گروہ حقیقی معنوں میں بندر اور بنا دئے گئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، اس سے کوئی واضح بات ثابت نہیں۔ حدیث صرف اتنا ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کہ موجودہ بندر اور سور کیا قدیم مسخ شدہ اقوام نسلیں ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ یہ حیوانات ہمیشہ سے اسی طرح ہیں (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی

مجاہد کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ بندر کی صورت میں تبدیل نہیں کئے گئے بلکہ ان کے مسخ کر دئے گئے (قال مسخت قلوبهم ولم يمسخوا قردة۔ وانما هو مثل ضربه الله مثل الحمار يحمل اسفارا) ابو العالیہ کا قول ہے کہ کونوا قردة خاسئين سے مراد یہ ہے کہ وہ ت اور حقیر بنا دئے گئے (یعنی اذلة صاغرين) یہی رائے قتادہ اور ربیع اور ابو مالک کی بھی (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۱۰۶-۱۰۵) موجودہ زمانہ کے مفسرین میں شیخ رشید رضا نے اسی کو اختیار کیا ہے (المنار)

سور کی خصوصیت کیا ہے۔ ستھری چیز کو چھوڑ کر، گندی چیز کو اپنی خوراک بنانا، اس کی ایک رت وہ ہے جو کمائی اور لین دین میں ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی حلال ذرائع پر قانع نہ رہ کر حرام سے اپنا پیٹ

بھڑنے لگتا ہے (مائدہ۔ ۶۴)۔ دوسری صورت وہ ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے :
اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ بنالیں (اعراف ۱۴۶)

ایسے لوگوں کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ مثبت چیزوں کے بجائے منفی چیزوں کی طرف دوڑنے لگتے ہیں، ان کو اصلاح کے کاموں کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ البتہ ایسے کاموں کی طرف وہ تیزی سے لپکتے ہیں جن کا نتیجہ نسلوں اور کھیتیوں کی ہلاکت ہو۔

ان کے سامنے تعمیری کام کے مواقع کھلے ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان کو چھوڑ کر تخریب کے راستوں میں تیزی دکھاتے ہیں۔ ابناء نوع کے لئے نفع بخش بننے کا شوق ان میں نہیں ابھرتا۔ البتہ ان کو نقصان پہنچانے کے نعرہ پر وہ بآسانی جمع ہو جاتے ہیں۔ خاموش خدمت میں ان کے لئے اپیل نہیں ہوتی البتہ نمائشی ہنگاموں میں وہ خوب دل چسپی دکھاتے ہیں۔ حقیقی فائدہ کے منصوبوں میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں ہوتی۔ البتہ بے فائدہ مشغلوں میں وہ اپنا وقت اور مال خوب خرچ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ان کو خدائے واحد کی پرستش کی طرف بلائیے تو وہ لبیک نہ کہیں گے البتہ زندہ یا مردہ شخصیتوں کی پوجا کے نام پر وہ جوق در جوق اکٹھا ہو جائیں گے۔

بے دینی کو دین کے نام پر کرنا بدترین جرم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے آدمی کے اندر سے صحیح اور غلط کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وہ ایک بے حس انسان بن جاتا ہے۔ دین اور بے دینی دونوں اس کو یکساں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ نوبت آتی ہے جب کہ اس میں بندر اور سور کی اخلاقیات پیدا ہو جاتی ہیں۔

بندر کی خصوصیت کیا ہے۔ فساد اور بے حیائی۔ کسی مکان میں بندروں کا غول داخل ہو جائے تو وہ فوراً بے معنی اچھل کود اور توڑ پھوڑ شروع کر دے گا۔ ایسا ہی کچھ حال اس قوم کا ہو جاتا ہے۔ وہ زبان سے خدا کا انکار نہیں کرتی۔ تاہم عملاً وہ خدا کی زمین پر اس طرح رہنے لگتی ہے جیسے اس زمین کا کوئی مالک نہیں ہے۔ جیسے نہ کبھی خدا سے اس کا سامنا ہونا ہے اور نہ اپنے کئے کا حساب دینا ہے ——
بدنظمی، غیر ذمہ دارانہ زندگی، بے معنی کارروائیاں، آپس کی چھین جھپٹ، ایک دوسرے پر غرانا، ہمدردی اور انصاف کے بجائے ظلم و فساد کو اپنا شیوہ بنالینا، یہ اس کی عام زندگی ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ بظاہر انسان مگر عملاً بندر صفت ہو جاتے ہیں۔ وہ انسانوں کی آبادی میں اس طرح رہنے لگتے ہیں جیسے بندر جنگلوں کی آبادی میں۔

یہ خوش اخلاقی

خوش اخلاقی کی سب سے زیادہ عام قسم وہ ہے جو بداخلاقی کی بدترین قسم ہے۔ اس کی ایک صورت وہ ہے جس کو تاجرانہ اخلاق کہا جا سکتا ہے۔ ایک کامیاب دکاندار اپنے ہر گاہک سے انتہائی خوش اخلاقی کا معاملہ کرتا ہے۔ مگر اس خوش اخلاقی کے پیچھے ذاتی مفاد کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ دکان پر آنے والا گاہک اگر اپنا لبادہ اتار کر چندہ مانگنے والا آدمی بن جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ دکاندار کی خوش اخلاقی کی حقیقت کیا تھی۔

خوش اخلاقی کی ایک قسم وہ ہے جس کو "تہذیب" کہا جا سکتا ہے۔ یہ قسم خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان رائج ہے۔ یہ لوگ جب باہم ملیں گے تو وہ نہایت ترشے ہوئے الفاظ میں بات کریں گے۔ ایک بے معنی رائے کو بھی خوبصورت علمی الفاظ میں بیان کریں گے۔ آتشیں موضوعات پر بھی وہ اس طرح بولیں گے جیسے کہ وہ برف کے موضوع پر بول رہے ہیں۔ اپنے مخالف سے بات کرتے ہوئے ایسا رویہ اختیار کریں گے جیسے ان کا اختلاف سراسر علمی اختلاف ہے۔ اس کو ذاتی مفاد سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی حقیقت مصنوعی اخلاقیات سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ان کا اول و آخر مقصد سماج میں مہذب انسان کہلایا جانا ہے نہ کہ فی الواقع اخلاقی اصولوں پر عمل کرنا۔

خوش اخلاقی کی ایک اور قسم وہ ہے جو "بڑوں" کے یہاں پائی جاتی ہے۔ جو لوگ ان سے چھوٹے بن کر ملیں ان سے وہ پوری طرح خوش اخلاق بنے رہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ مسلم طور پر بڑائی کا مقام حاصل کر چکے ہوں ان کے ساتھ بھی ان کا رویہ ہمیشہ خوش اخلاقی کا ہوتا ہے۔ مگر ان دونوں کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ اول الذکر کے ساتھ ان کی خوش اخلاقی دراصل ان کے اس عمل کی قیمت ہوتی ہے کہ انھوں نے ان کی متکبرانہ نفسیات کے لئے غذا فراہم کی۔ ثانی الذکر کے ساتھ ان کی خوش اخلاقی اس لئے ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ اپنے کو منسوب کرنا عوام کی نظر میں ان کی یہ تصویر بناتا ہے کہ وہ بھی بڑوں کی فہرست میں شامل ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہ "بڑے" اس وقت اپنی خوش اخلاقی کھو دیتے ہیں جب کہ کوئی آدمی ان کی بڑائی کو چیلنج کرے، جب وہ کوئی ایسی بات کہہ دے جس سے ان کی متکبرانہ نفسیات پر زد پڑتی ہو۔ ایسے شخص کے مقابلہ میں وہ فوراً اپنا لبادہ اتار دیتے ہیں۔ ان کی خوش اخلاقی اچانک بدترین بداخلاقی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں ، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں ۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں ۔

" ایجنسی " اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی ۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے ۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں ۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے ۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے ۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے ۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے ۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک " بڑی قربانی " دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں ۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں ۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں ۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے ۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ـــــــ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے ۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے ۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں ۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں ۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے ۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا ، بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں ۔

دوسری صورت ـــــــ الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے ۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں ۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں ، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں ۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں ۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd. D (DN)/No.532
Regd. R.N. No. 28822/76

August 1984
Issue No 93

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	15/-
پیغمبر انقلاب	25/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
آخری سفر	3/-
حقیقت حج	2/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

تمام کامیابیوں کا سب سے بڑا راز صبر ہے
اور تمام ناکامیوں کا سب سے بڑا راز بے صبری

ستمبر ۱۹۸۴ء
شمارہ ۹۴

جلد اول

سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

حل یہاں ہے

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

مطبوعات اسلامی مرکز

سال اشاعت ۱۹۸۴

قیمت تین روپیہ

ناشر : مکتبہ الرسالہ

سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

طابع

جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی

فہرست

		صفحہ
۱	آغاز کلام	۴
۲	یک طرفہ کارروائی کی ضرورت	۶
۳	بنیادی بات	۹
۴	بھیونڈی : ایک مثال	۱۲
۵	قرآنی حل	۱۹
۶	قول میں کچھ اور عمل میں کچھ	۲۳
۷	ایک چھوڑی ہوئی سنت	۲۷
۸	سابق حاملین کتاب	۳۲
۹	آزمودہ حل	۳۶
۱۰	ایک مثال	۳۸
۱۱	داعی اور مدعو کا معاملہ	۴۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق حکومت سے اور اکثریتی طبقہ سے ہے۔ اور دوسرا پہلو وہ جس کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فسادات میں سیکڑوں آدمی مارے جاتے ہیں۔ کروڑوں روپئے کی جائدادیں لوٹی اور جلائی جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے واضح طور پر یہ امن ونظم کا مسئلہ ہے۔ مگر اتنے بڑے پیمانہ پر جان و مال کا نقصان ہوتا ہے۔ اور کبھی نقصان کرنے والوں کو کوئی سزا نہیں ملتی۔ ملک کے قانون میں ان جرائم کے لئے باقاعدہ سزائیں مقرر ہیں۔ مگر یہ قانون کاغذ پر پڑا رہتا ہے اور فساد کے مجرمین پر ان کو نافذ نہیں کیا جاتا۔

جس حکومت کی نااہلی کا یہ حال ہو کہ اس کے دائرۂ اختیار میں مسلسل اتنے سنگین جرائم کئے جائیں پھر بھی وہ مجرمین کو سزا دینے میں ناکام رہے، وہ ایسا کر کے خود اپنی موت کے محضر نامہ پر دستخط کر رہی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جو لوگ اتنی بڑی نااہلی دکھائیں وہ ہمیشہ اقتدار سے محروم کر دئے جاتے ہیں۔ زیادہ دیر تک انتظام دنیا کے منصب پر باقی رہنا ان کے لئے مقدر نہیں۔

اکثریتی طبقہ کے پہلو سے سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ کیا وجہ کہ دو غیر مسلمان باہم آپس میں لڑیں تو کبھی فساد نہیں ہوتا۔ لیکن اگر لڑنے والوں میں ایک مسلمان اور ایک غیر مسلمان ہو تو فوراً فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ یہاں کسی معاملہ کو حق اور ناحق کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ معاملہ اپنے فرقہ کا ہے یا دوسرے فرقہ کا۔ یہ مزاج کسی گروہ کے لئے قاتل ہے۔ قانون قدرت کے مطابق اس قسم کے ظالمانہ مزاج کی سزا ضرور بھگتنی پڑتی ہے، خواہ ایک صورت میں بھگتنی پڑے یا دوسری صورت میں۔

حکومت میں یا اکثریتی فرقہ میں اگر کچھ ایسے لوگ ہوں جو یہ سمجھتے ہوں کہ وہ اس طرح مسلمانوں کو مٹا دیں گے تو یقینی طور پر اس سے زیادہ بڑی بھول اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دس کروڑ ہے۔ تاریخ میں کوئی مثال نہیں کہ اتنی بڑی تعداد کو ظلم وفساد کے ذریعہ مٹا دیا گیا ہو۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے فساد مسلمانوں کی زندگی کی سب سے بڑی ضمانت ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں دبنے کے بعد

اور زیادہ ابھرنے کا اصول رائج ہے۔ ان تخریب کاروں کی بدقسمتی یہ ہے کہ قانون قدرت ان کی راہ میں حائل ہے۔

آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی کتاب (اسٹڈی آف ہسٹری) میں دنیا کی ۲۱ تہذیبوں کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ تہذیبوں کو وجود میں لانے والی ہمیشہ وہ قومیں تھیں جو شکست اور محرومی سے دوچار کی گئیں (مثال کے طور پر مغرب کی مسیحی قومیں صلیبی جنگوں میں ذلت آمیز شکست کے بعد جدید صنعتی تہذیب کی خالق بنیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو محرومی اور شکست میں مبتلا کر کے ان کے خاتمہ کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ ایک ایسے نتیجہ کا انتظار کر رہے ہیں جو قانون قدرت کے مطابق ان کے اندازوں کے سراسر خلاف بالکل برعکس صورت میں ظاہر ہونے والا ہے۔

تاہم زیر نظر مجموعہ میں ہمارا خطاب نہ حکومت سے ہے اور نہ اکثریتی فرقہ سے۔ ہمارا خطاب یہاں تمام تر مسلمانوں سے ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اس تمام معاملہ کا ذمہ دار صرف اپنے آپ کو قرار دیں۔ وہ خود یہ ذمہ داری لیں کہ وہ اس ناگوار صورت حال کو یک طرفہ طور پر ختم کریں گے۔ اور یقیناً بہادر انسانوں کا طریقہ ہمیشہ یہی رہا ہے۔

فسادات کو روکنے کی جو تدبیر اس کتابچہ میں درج ہے، راقم الحروف اس کو پچھلے بیس سال سے پیش کر رہا ہے۔ ۶۶-۱۹۶۵ میں ہفت روزہ ندائے ملت (لکھنو) کے کالموں میں۔ ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۴ تک ہفت روزہ الجمعیۃ (دہلی) میں اور ۱۹۷۶ سے باقاعدہ طور پر ماہنامہ الرسالہ (نئی دہلی) میں۔ زیر نظر کتابچہ اسی ذیل کی ایک مزید کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔

وحید الدین

۲۰ جولائی ۱۹۸۴ء

یکطرفہ کارروائی کی ضرورت

ہندستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا سبب ، خواہ کسی کے نزدیک جو بھی ہو ، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ فسادات اگر بند ہوں گے تو صرف اس وقت بند ہوں گے جب کہ مسلمان اپنے حصہ کا فساد بند کریں۔ مسلمان اپنے حصہ کا سبب ختم کرکے دوسرے کو آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے حصہ کا سبب ختم کرے۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات صرف یک طرفہ کارروائی سے بند ہو سکتے ہیں۔ اور یہ یک طرفہ کارروائی بہرحال مسلمانوں کو کرنی ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں یک طرفہ کارروائی پر راضی ہو کر قریش کی فسادانگیزیوں کا سلسلہ ختم کیا تھا۔ اسی طرح ہمیں بھی یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو پابند بنالینا ہے۔ اگر ہم دوسرے فریق کی طرف سے بندش کی کارروائی کا انتظار کریں تو ایسا انتظار کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

مسلمان فساد کو بند کرنے کے لئے کیا کریں ، اس کا جواب صرف ایک ہے ——— اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہونا۔ تمام فسادات کا مشترک سبب یہ ہے کہ مسلمان اس راز کو نہیں جانتے کہ زندگی میں کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ جس چیز کو نظر انداز کرنا چاہئے اس پر مسلمان بھڑک اٹھتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ فساد ہوتا ہے۔

"ہندوستان" بالفرض "مسلستان" ہوتا تب بھی ہم کو یہی کرنا پڑتا۔ کچھ چیزیں ہر ماحول میں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں الجھنے کے بجائے ان کو نظر انداز کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ان سے الجھنا ان کو اور بڑھانے کے ہم معنی ہے۔ یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ اس سے کسی حال میں بچنا ممکن نہیں۔ اسی لئے قرآن میں صبر و اعراض کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

نظر انداز کرنے کے قابل باتوں کو نظر انداز نہ کرنا ، یہ وہ غلطی ہے جس میں ہندستان کے مسلمان بھی مبتلا ہیں اور پاکستان کے مسلمان بھی۔ اس کی قیمت دونوں جگہ کے مسلمان شدید ترین صورت میں بھگت رہے ہیں۔ ہندستان کے مسلمان فرقہ وارانہ فساد کی صورت میں اس کی قیمت ادا کر رہے ہیں اور پاکستان کے مسلمان غیر مستحکم سیاسی نظام کی صورت میں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے فسادات کا واحد توڑ یہی اعراض ہے۔ مسلمان اگر اس توڑ کو استعمال کریں تو ایک دن میں تمام فسادات بند ہو جائیں۔ اور اگر مسلمان اس طریقہ پر راضی نہ ہوں

تو موجودہ تدبیروں سے آئندہ پچاس سال تک بھی فسادات بند نہ ہوں گے جس طرح پچھلے پچاس سال میں اس قسم کی تدبیروں کے باوجود فسادات بند نہیں ہوئے ہیں۔

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات پر جب کوئی مسلمان بات کرتا ہے تو وہ ہمیشہ ایک ہی چیز کی کوشش کرتا ہے ـــــ خالص قانونی اور منطقی جائزہ لے کر یہ دیکھنا کہ کون فریق حق پر ہے اور کون فریق ناحق پر۔ یہ طریقہ سراسر غلط ہے۔ کیوں کہ بعض امور وہ ہوتے ہیں جن میں حق اور ناحق نہیں دیکھا جاتا بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا واقعی حل کیا ہے۔

حدیبیہ کے مقام پر جب مسلمانوں اور قریش کے درمیان صلح کا معاہدہ لکھا جا رہا تھا تو آپ نے اس کا مضمون املا کراتے ہوئے کاتب سے کہا:

اکتب ھذا ما قاضیٰ علیہ محمد رسول اللّٰہ ۔۔۔

(لکھو کہ یہ وہ ہے جو محمد اللہ کے رسول نے فیصلہ کیا) قریش کے نمائندہ (سہیل بن عمرو) نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ آپ صرف محمد بن عبد اللہ لکھئے۔ کیوں کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے۔ آپ نے فوراً کاتب سے کہا کہ اکتب محمد بن عبد اللّٰہ (محمد بن عبد اللہ لکھو)۔

اگر آپ اس کو حق اور ناحق کا معاملہ بناتے تو کبھی اس مطالبہ کو ماننے پر راضی نہ ہوتے خواہ سارے مسلمان وہیں کٹ کر مر جائیں۔ مگر آپ نے اس کو حق اور ناحق کا مسئلہ نہیں بنایا بلکہ صرف اس کے عملی پہلو کو دیکھا۔ چوں کہ اس وقت عملی طور پر اس کے سوا کوئی حل نہیں تھا اس لئے رسول اللہ کا لفظ چھوڑ کر صرف محمد بن عبد اللہ کا لفظ لکھنے پر راضی ہو گئے۔

فسادات کا مسئلہ بھی یقینی طور پر اسی قسم کے مسائل میں سے ہے۔ مذکورہ بالا سنت رسول کے مطابق ہمارے اوپر لازم ہے کہ اس میں حق اور ناحق کی بحث نہ کریں بلکہ صرف یہ دیکھیں کہ اس کا عملی حل کیا ہے۔ اور عملی طور پر اس کا جو ممکن حل ہے اس کو اختیار کر لیں۔ اگر مسلمان اس معاملہ میں حق اور ناحق کی بحث نہ چھوڑیں تو یقینی طور پر یہ ان کی نفسانیت کا ثبوت ہوگا نہ کہ حق پرستی کا۔ کیوں کہ حق پرستی خدا کے رسول کی سنت کو اختیار کرنے میں ہے نہ کہ کسی دوسرے طریقہ کو اختیار کرنے میں۔

مسلمان موجودہ زمانہ میں ہر جگہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑ کر برباد ہوتے رہے ہیں۔ ایسا کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جہاد کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کے واقعات صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے سامنے کوئی بڑا مقصد نہیں۔ جس کے سامنے بڑا مقصد ہو وہ ہمیشہ چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ مسلمانوں نے چونکہ مقصدیت کھو دی ہے اس لئے وہ برداشت بھی کھوئے ہوئے ہیں۔ بے مقصد گروہ بن جانے کی بنا پر

اب ان کے اندر یہ طاقت باقی نہیں رہی کہ وہ چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کو بھلا دیں تاکہ وہ بڑے نشانہ کے لئے اپنی کوششوں کو جاری رکھ سکیں۔

ہندستان کے فسادات مسلمانوں کے دینی بگاڑ کی قیمت ہیں۔ خدا کا بھیجا ہوا دین اگرچہ ایک ہے مگر مسلمانوں کی عملی زندگی میں آکر اسلام کی دو قسمیں بن جاتی ہیں۔ ایک فخر والا اسلام۔ دوسرا، تواضع والا اسلام۔ دینی بگاڑ دراصل اسی فخر والے اسلام کا دوسرا نام ہے۔

مسلمان جب سچے اسلام پر ہوتے ہیں تو ان کے اندر تواضع والا اسلام پرورش پاتا ہے۔ اللہ کا ڈر ان سے بڑائی کا مزاج چھین لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کے غیر ضروری ٹکراؤ اپنے آپ ختم ہو جاتے ہیں۔ دوسری قومیں جب قرآن کے الفاظ میں، حمیۃ جاہلیہ کا مظاہرہ کرتی ہیں تو ان کا تقویٰ انھیں سراپا تواضع بنا دیتا ہے۔ حمیت جاہلیۃ کی آگ کے لئے مسلمانوں کا تقویٰ پانی کا کام کرتا ہے اور فساد ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس جب مسلمانوں کے اندر سے تقویٰ رخصت ہو جائے تو ان کے اندر فخر والا دین ابھرتا ہے۔ فخر والا اسلام آدمی کے اندر بڑائی کی نفسیات پیدا کرتا ہے۔ اسی نفسیات کا نتیجہ وہ تمام اختلافات ہیں جو آج مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ جب ہر آدمی اپنے کو بڑا سمجھنے لگے تو اتحاد ممکن نہیں۔ اتحاد کا واحد راز یہ ہے کہ کچھ لوگ اپنے آپ کو چھوٹا کرنے پر راضی ہو جائیں۔ مگر جہاں ہر آدمی اپنے کو بڑا سمجھ رہا ہو وہاں اتحاد کیسے پیدا ہوگا۔

یہی فخر اور بڑائی کی نفسیات جب دوسری قوموں کے مقابلہ میں آتی ہے تو وہ فساد کا سبب بن جاتی ہے۔ دوسری قوموں کے لئے ان کا مذہب یا ان کی قومی تہذیب ہمیشہ فخر ہی کی چیز ہوتی ہے۔ اب اگر مسلمانوں کے لئے بھی ان کا دین فخر کی چیز بن جائے تو دونوں کا نباہ مشکل ہو جائے گا۔ کیوں کہ دو فخر کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ آپ آگ کو پانی سے ٹھنڈا کر سکتے ہیں مگر آگ کو آگ سے ٹھنڈا نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمانوں سے اگر باہمی اختلاف اور دوسری قوموں سے فساد کو ختم کرنا ہے تو مسلمانوں کے اندر سے فخر والا اسلام ختم کرنا ہوگا۔ اور اس کے بجائے ان کے اندر تواضع والا اسلام لانا ہوگا۔ اگر مسلمان اس پر راضی نہیں ہیں تو انھیں دوسروں کو ملزم ٹھہرانے کا سلسلہ بھی ختم کر دینا چاہئے کیوں کہ دوسروں کی طرف سے ان کے ساتھ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ اسی بگڑے ہوئے دین کی قیمت ہے جس پر وہ اپنے دور زوال میں آج قائم ہیں۔

بنیادی بات

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تم کو جو بھی دکھ پیش آتا ہے وہ خود تمہارے سبب سے ہوتا ہے (وما اصابك من سيئة فمن نفسك، النساء ۷۹) دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ تم کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ خود تمہارے ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے (وما اصابكم من مصيبة فبما كسبت ايديكم، الشوریٰ ۳۰)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کا نظام خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کسی کو دوسرے کے اوپر کوئی اختیار نہیں۔ یہاں ہر آدمی یا ہر گروہ خود اپنے ہی عمل کا انجام بھگتتا ہے۔ آدمی پر جب بھی کوئی مصیبت پڑے تو اس کو چاہئے کہ اس کا سبب وہ باہر نہ تلاش کرے۔ بلکہ خود اپنے اندر ڈھونڈ کر نکالے۔ کیوں کہ اس کا سبب یقینی طور پر خود اس کے اپنے اندر موجود ہوگا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی دو واضح مثالیں موجود ہیں۔ ایک غزوۂ احد (۳ھ) کی شکست اور دوسرے غزوہ حنین (۸ھ) میں پیش آنے والا زبردست نقصان۔ قرآن میں ان دونوں غزوات کا ذکر ہے اور دونوں میں یہ انداز ہے کہ اسلام دشمنوں کے خلاف احتجاج کرنے کے بجائے خود مسلمانوں پر اس کی پوری ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔

احد کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ تمہاری کمزوری، تمہارا آپس کا اختلاف اور تمہارا مرکزی قیادت کی نافرمانی کرنا، یہ اسباب تھے جنھوں نے تم کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں شکست سے دوچار کیا (آل عمران ۱۵۲) اسی طرح حنین کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اس موقع پر تم کو جس بربادی سے سابقہ پیش آیا اس کی وجہ یہ تھی کہ تمہارے اندر گھمنڈ پیدا ہوگیا۔ یہاں بھی سبب مسلمانوں کے اپنے اندر بتایا گیا نہ کہ ان کے باہر (التوبہ ۲۵)

ان دونوں حادثات میں پوری طرح یہ ممکن تھا کہ ان کی ساری ذمہ داری قریش پر ڈالی جائے اور ان کو یک طرفہ طور پر برا بھلا کہا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جب ان حادثات پر تبصرہ کیا تو ان کی ساری ذمہ داری صرف مسلمانوں کے اوپر ڈال دی۔ یہ مثال ہمیشہ کے لئے بتا رہی ہے کہ اس طرح کے معاملات میں مسلمانوں کا ذہن کیا ہونا چاہئے۔ یہ کہ وہ دوسروں کی سازشوں کا انکشاف کرنے کے بجائے خود اپنا احتساب کریں۔ وہ اپنی کمزوریوں کو دور کرکے اپنے حریف کے اوپر فتح حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے یہاں ہم خلیفہ عمر بن عبد العزیز کا ایک مکتوب نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے ایک ماتحت افسر کے نام روانہ کیا تھا:

یروی ان عمر بن عبد العزیز بعث برسالة الی منصور بن غالب حین بعثه علی قتال اهل الحرب جاء فیها: هذا ما عهد به عبد الله (عمر بن عبد العزیز) امیر المومنین الی منصور بن غالب حین بعثه الی قتال اهل الحرب۔ امره فی ذالك بتقوی الله علی کل حال نزل به من امر الله تعالی فان تقوی الله من افضل العدة وابلغ المکیدة واقوی القوة وامره الا یکون من شئ من عدو اشد احتراسا منه لنفسه ومن معه من معاصی الله فان الذنوب اخوف عندی علی الناس من مکیدة عدوهم وانما نعادی عدونا ونتصر علیهم بمعصیتهم ولولا ذالك لم یکن لنا قوة بهم لان عددنا لیس کعددهم ولا عدتنا کعدتهم فلو استوینا نحن وهم فی المعصیة کانوا افضل منا فی القوة والعدد فان لا ننصر علیهم بحقنا لا نغلبهم بقوتنا ولا تکونوا لعداوة احد من الناس احذر منکم لذنوبکم۔

روایت ہے کہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے منصور بن غالب کے نام ایک خط روانہ کیا جب کہ انھوں نے ان کو اہل حرب کے مقابلہ کے لئے بھیجا تھا۔ اس میں لکھا کہ تم ہر حال میں تقویٰ پر قائم رہو۔ کیونکہ اللہ کا تقویٰ (ڈر) سب سے بہتر تیاری اور سب سے کامیاب تدبیر ہے اور سب سے بڑی قوت ہے۔ دشمن سے بچنے کے لئے سب سے زیادہ اہم چیز اپنے گناہوں سے بچنا ہے۔ کیوں کہ گناہ میرے نزدیک دشمن کی چالوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ہم دشمنوں پر ان کی گنہ گاری کی وجہ سے کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم کو کوئی قوت ان کے اوپر نہ ہے۔ کیوں کہ ان کی تعداد اور ان کی تیاری ہم سے زیادہ ہے۔ پھر اگر ہم اور وہ دونوں گنہ گاری میں برابر ہو جائیں تو وہ ہم سے طاقت اور تعداد میں برتر ہو جائیں گے۔ ایسی حالت میں ہم اپنی موجودہ قوت کے ساتھ ان پر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اور تم کسی کی عداوت سے جتنا ڈرتے ہو اس سے بھی زیادہ خود اپنے گناہ سے ڈرو۔

خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز کی ان نصیحتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی ناکامی کا سبب ہمیشہ اس کے اپنے اندر ہوتا ہے نہ کہ اس کے باہر۔

بنیادی بات یہ ہے کہ یہ دنیا خدا کی دنیا ہے نہ کہ انسان کی دنیا۔ یہاں انسان کو صرف اپنے آپ پر اختیار حاصل ہے۔ کسی بھی فرد یا قوم کو کسی دوسرے فرد یا قوم کے اوپر کوئی اختیار حاصل نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں جب بھی کسی کو کچھ ملتا ہے تو وہ اس کو خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ خواہ بظاہر وہ کسی اور کے ذریعہ اسے پہنچا ہو۔ اسی طرح یہاں جب بھی کسی سے کچھ چھنتا ہے تو وہ خدا کی طرف سے چھنتا ہے، خواہ بظاہر اس کا چھیننے والا کوئی دوسرا دکھائی دیتا ہو۔ اس لئے عقلمند وہ ہے جو دونوں حالتوں

میں خدا کی طرف رجوع کرے۔

مسلمانوں کو موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں سے جس ظلم کا تجربہ ہو رہا ہے اس کے سلسلے میں عام طور پر وہ ایک ہی کام کرنے میں مشغول ہیں۔ اور وہ ہے "ظالم قوموں" کے خلاف چیخ و پکار۔ یہ سراسر غیر اسلامی طریقہ ہے۔ جب ہر ہونے والا واقعہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے تو یقیناً یہ واقعہ بھی خدا کی طرف سے پیش آرہا ہے۔ اس لئے اس کا تاثر صرف یہ ہونا چاہئے کہ مسلمان اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کریں کہ خدا کے معاملہ میں ان سے کون سی کوتاہی ہوئی ہے جس کی انھیں یہ سزا مل رہی ہے۔ تاکہ اپنی کوتاہی کی اصلاح کرکے وہ دوبارہ اپنے آپ کو خدا کی عنایات کا مستحق بنا سکیں۔

اگر آپ پر پتھر اوپر کی طرف سے آرہے ہوں اور آپ اس کا سبب نیچے کی طرف تلاش کرنے لگیں تو آپ کبھی بھی اپنے آپ کو پتھر کی بارش سے بچانے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

بھیونڈی: ایک مثال

مئی ۱۹۸۴ میں بھیونڈی میں اور بمبئی کے علاقہ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس کی شدت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ٹائمس آف انڈیا (۲۱ مئی ۱۹۸۴) نے اپنے صفحۂ اول کے اداریہ میں لکھا کہ یہ زمین کے اوپر جہنم بنانے کے ہم معنی ہے:

It is materialisation of hell on earth.

بیان واقعہ

مہاراشٹر کی ایک انتہا پسند تنظیم ہے جس کا نام شیو سینا ہے۔ اس کے لیڈر مسٹر بال ٹھاکرے نے ۲۱ اپریل ۱۹۸۴ کو بمبئی میں چوپاٹی کے مقام پر ایک تقریر کی۔ ملک کی کسی نیوز ایجنسی نے اس تقریر کو نشر نہیں کیا۔ اور نہ کسی بڑے اخبار نے اس کی رپورٹ شائع کی۔ بعض مقامی نوعیت کے مرہٹی اخبارات میں اس کی رپورٹنگ ہوئی۔ تاہم یہ بھی زیادہ اشتعال انگیز نہ تھی۔ البتہ بنگلور کے اردو اخبار نشیمن (۵ مئی ۱۹۸۴) نے اس کی جو رپورٹ شائع کی وہ مسلمانوں کے لئے کافی اشتعال انگیز ثابت ہوئی۔ بعد کو بمبئی کے اخبار عالم (۱۳ مئی ۱۹۸۴) نے اس کو تیز و تند سرخیوں کے ساتھ نقل کیا۔ اس کے بعد حسب عادت اردو اخبارات میں اس پر پرشور تبصرے شائع ہونا شروع ہوئے۔ اردو اخبارات کا کہنا تھا کہ بال ٹھاکرے نے قرآن اور پیغمبر اسلام پر توہین آمیز بیانات دئے ہیں جن کو مسلمان برداشت نہیں کر سکتے۔

اس درمیان میں ۳ مئی ۱۹۸۴ کو بھیونڈی میں شیو جینتی کا جلوس نکلا۔ یہ جلوس ۱۹۷۰ میں بھیونڈی کے فساد کے بعد بند کر دیا گیا تھا۔ ۱۴ سال کے بعد شیو سینا کے لیڈروں نے حکومت سے اجازت لینے میں کامیابی حاصل کر لی اور ۳ مئی کو اس کا جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس پر مسلمانوں کو اعتراض تھا۔ تاہم حکومت نے اس موقع پر پولیس کا زبردست انتظام کیا اور جلوس خیریت کے ساتھ ختم ہو گیا۔

مسلمانوں کے اندر برہمی کی فضا نے موقع پیدا کیا۔ اب ایک مسلمان لیڈر مسٹر اے آر خان اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی قیادت میں ۱۱ مئی ۱۹۸۴ کو مسلمانوں کا ایک غصہ میں بھرا ہوا جلوس نکلا۔ شیو سینا کے خلاف یہ جلوس پربھنی میں نکالا گیا۔ اس موقع پر جوشیلی تقریریں ہوئیں۔ مزید یہ کہ شیو سینا کے لیڈر مسٹر بال ٹھاکرے کی مورت بنا کر اس پر پرانے چپلوں کا ہار پہنایا گیا۔

اسی فضا میں شب برات (۱۶ مئی) کو مسلمانوں نے اسلام کی عظمت کے دن کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ بھیونڈی کی سڑکیں اور گلیاں جن کی گندگی کو ختم کرنے کے لئے مسلمانوں میں کبھی جوش پیدا نہیں ہوا تھا

ان کو سبز جھنڈوں سے پاٹنے کے لئے ان کا اسلامی جوش ابھر آیا۔ جھنڈے کا ہادیہاں تک پہنچا کہ پرجوش مسلمانوں نے بھیونڈی میں شیوسینا کے دفتر کی عمارت سے اس کا جھنڈا اتار دیا اور وہاں سبز جھنڈا (اسلامی جھنڈا) لہرا دیا۔

اسی اشتعال کی فضا میں شیوسینا کے لیڈروں نے ۱۶ مئی ۱۹۸۴ کو "بمبئی بندھ" منایا۔ بمبئی بندھ نے اشتعال کو آخری حد تک پہنچا دیا اور ۱۷ مئی ۱۹۸۴ کو بھیونڈی میں فساد پھوٹ پڑا جو بالآخر تھانہ اور بمبئی وغیرہ کے علاقوں تک پھیل گیا (ضمیمہ ٹائمس آف انڈیا ۳ جون ۱۹۸۴ اور دوسرے اخبارات)

یہ فساد اتنا شدید تھا کہ اندازہ ہے کہ چند دنوں کے اندر ایک ارب روپیہ سے بھی زیادہ کا مالی نقصان ہو گیا۔ جانی نقصان اس کے علاوہ ہے۔ وہ صرف اس وقت رکا جب کہ فوج نے آکر مداخلت کی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس فساد کا نقصان زیادہ تر یک طرفہ تھا۔ حدیث میں مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایسا اقدام نہیں کرتا جس سے نکلنے کی اس کے اندر طاقت نہ ہو اور بالآخر خود ذلیل ہونا پڑے (لیس المومن ان یذل نفسہ ، ای یعرضھا من البلاء مالا طاقۃ لہ بہ) مگر یہاں مسلمانوں نے ایسا اقدام کیا جس میں وہ چھری کے مقابلہ میں خربوزہ ثابت ہوئے۔ جو مسلمان اس قسم کے غیر مسلمانہ افعال میں مبتلا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی اسلامیت کو کس خانہ میں رکھا جائے۔

فساد کا جائزہ

اس فساد کا جائزہ لینے کے دو طریقے ہیں۔ ایک قومی طریقہ اور دوسرا اسلامی طریقہ۔ قومی طریقہ وہی ہے جس کا مظاہرہ مسلمانوں کے تمام اصاغر و اکابر ایسے مواقع پر کرتے ہیں اور اس بار بھی کر رہے ہیں۔ اس حادثہ کے بعد مسلمانوں کی تمام زبانیں ایک ہی بات بول رہی ہیں اور ان کے تمام قلم ایک ہی بات لکھ رہے ہیں۔ اور وہ ہے شیوسینا کو (یا انتظامیہ کو) یک طرفہ طور پر تمام بربادیوں کا ذمہ دار قرار دینا۔ قومی طریقہ یہ نہیں دیکھتا کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ وہ صرف اپنی قوم اور غیر قوم دیکھتا ہے۔ اور جب بھی اس قسم کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اپنی قوم کا ساتھ دیتے ہوئے دوسری قوم کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے جس کو حدیث میں عصبیت کہا گیا ہے اور عصبیت سراسر باطل ہے۔

دوسرا طریقہ اسلام کا طریقہ ہے۔ اسلام کا طریقہ اصولی ہے نہ کہ قومی۔ اسلامی طریقہ کو جب ہم اس واقعہ پر استعمال کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی شکایت تھی جس پر برہم ہو کر مسلمانوں نے ہنگامہ کیا اور شیوسینا کے لیڈر کی مورت بنا کر اس کو پرانے چپلوں کا ہار پہنایا۔ وہ شکایت مسلمانوں کے بیان کے مطابق، یہ تھی کہ شیوسینا کے لیڈر نے قرآن کو بند کرنے کا مطالبہ کیا اور پیغمبر اسلام

کی شان میں گستاخی کی۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ یہ الزام سراسر غلط تھا۔ بال ٹھاکرے نے ایسی بات سرے سے کہی نہیں۔

شیوسینا کا لیڈر بمبئی میں موجود تھا۔ مگر نہ مسلمانوں کا کوئی وفد فساد سے پہلے اس سے تحقیق کی غرض سے ملا۔ نہ کسی نے ٹیلیفون کر کے دریافت کیا۔ مسلمانوں کے وہ نام نہاد لیڈر جو فساد کے بعد خوب متحرک ہو جاتے ہیں وہ فساد سے پہلے اس کی تحقیق کے لئے بالکل متحرک نہیں ہوئے۔ جو ہوا وہ صرف یہ کہ بمبئی کی یہ خبر بنگلور کے ایک اردو اخبار میں شائع ہوئی جو سستی صحافت اور سنسنی خیزی کے لئے مشہور ہے۔ بس اس کا اردو اخبار میں چھپنا تھا کہ مسلمانوں نے اس کو بڑھا چڑھا کر نقل کرنا شروع کر دیا اور چند دنوں کے اندر فضا اس قدر گرم ہو گئی جس کا دوسرا نتیجہ لازماً فساد تھا۔

بال ٹھاکرے کا انٹرویو

فساد کے بعد دہلی کے انگریزی میگزین لنک (LINK) کے نمائندے نے مسٹر بال ٹھاکرے سے ملاقات کی اور ان سے ایک انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹیپ کی مدد سے میگزین مذکور کی ۳ جون ۱۹۸۴ کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو کا ضروری حصہ یہاں ایک صفحہ پر اصل الفاظ میں دیا جا رہا ہے۔

اس انٹرویو میں مسٹر بال ٹھاکرے نے مذکورہ دونوں الزامات کی صحت سے قطعی انکار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ سراسر غلط ہے کہ میں نے قرآن کو بند کرنے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے اس سے بھی انکار کیا کہ انھوں نے پیغمبر اسلام کی شان میں توہین آمیز کلمات کہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری تقریر کا مکمل ٹیپ موجود ہے۔ کوئی بھی شخص اس کو سن سکتا ہے۔

مسٹر بال ٹھاکرے نے بتایا کہ انھوں نے پیغمبر اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔ اس کے برعکس میں نے پیغمبر صاحب کی تعریف کی اور ان کا ایک واقعہ بیان کیا۔

اس موقع پر مسٹر ٹھاکرے نے جو بات کہی وہ ان کے الفاظ میں یہ تھی ——— میری تقریر کا ٹیپ موجود ہے۔ اس میں ایک لفظ بھی پیغمبر اسلام کے خلاف نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان کی ایک مثال پیش کی تھی۔ وہ یہ کہ ایک بار پیغمبر صاحب اپنے شاگردوں کے ساتھ اپنی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک ہندو وہاں آیا اور مسجد کی ایک دیوار پر تھوک دیا۔ شاگرد چلائے کہ "مارو مارو" مگر پیغمبر صاحب نے ان کو غصہ ہونے سے روکا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک بالٹی پانی لے کر دھو دیا۔ ہندو یہ دیکھ کر شرمندہ ہوا۔ پیغمبر صاحب نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ دیکھو، یہ طریقہ ہے جس کے ذریعے سے ہمیں لوگوں کے اوپر فتح حاصل کرنا چاہئے۔ مگر آج مسلمانوں میں اس قسم کی برداشت کہاں ہے"

Q. Some of the Urdu papers have alleged that you have demanded a ban on Quran.

A. No, this is totally incorrect. I am not anti-Muslim.

Q. It is said that you used derogatory words against Prophet Mohammad.

A. This is another blatant lie. My speeches were tape recorded. There was not a word against the Prophet. Actually I gave his example. This is what I said in my speech: Once the Prophet was sitting in his mosque with his disciples. A Hindu came there and spit on one of the walls of the mosque. The disciples shouted, "Maro, Maro". But the Prophet stopped them from becoming violent. Then he washed the wall with a bucket full of water. The Hindu felt ashamed. And that is how we should win people, he told his disciples. But where is that kind of tolerance in this community now.

Q. It is said that the speeches that you made were inflammatory.

A. It's a matter of interpretation. I wanted to ventilate my grievances Hindu grievances. If we want to organise a meeting or want to take out a procession, it is prohibited. The Shiv Jayanti procession (in Bhiwandi) was allowed after 14 years . Everyone cares for their (Muslims) feeling. What about our sentiments? As if we don't have any emotions; we are not human beings. As if we are not supposed to discuss our religion. Treat all religions at par. Why mosques alone should have special permission to use loudspeakers? Which religion preaches to disturb somebody? Hindu temples don't use loudspeakers.

Now they (Muslims) are asking for more concessions. It is indeed disturbing. After all this country belongs to us. Whoever wants to stay here can stay as brothers. We're not going to put any restrictions. But to call them minorities and give them special concessions will spoil the very unity of the country. I am not telling anything to my followers. I am not asking them to burn or hate this community. But the way they are working is generating hatred.

Q. How do you think the communal riots can be stopped?

A. Ask them (Muslims) not to attack us. And there will be no retaliation. We do not attack; we only retaliate. We will retaliate if they attack.

Excerpts from interview with the Shiv Sena leader, Bal Thackeray, appeared in the weekly link June 3, 1984

شیوسینا کے لیڈر نے جو واقعہ بیان کیا، وہ اصلاً ایک صحیح واقعہ ہے۔ البتہ اس کو بیان کرنے میں ان سے کچھ جزئی غلطیاں ہوگئی ہیں۔ ان غلطیوں کو گستاخی نہیں کہا جاسکتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ واقعہ کی صحیح روایت بتا کر ان کی تصحیح کر دیں۔ ذیل میں ہم واقعہ کی اصل روایت درج کرتے ہیں۔

عن ابی ھریرۃ قال: بال اعرابیٌّ فی المسجد فقام الناس الیہ لیقعوا فیہ۔ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: دَعُوہ واریقوا علی بولہ سجلاً من ماءٍ او ذَنوباً من ماءٍ فانما بعثتم مُیَسّرِینَ ولم تبعثوا معسّرین (رواہ البخاری فی کتاب الوضوء)

امام بخاری حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا۔ لوگ یہ دیکھ کر اس کی طرف دوڑ پڑے۔ تب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر پانی کا ایک ڈول (یا چند ڈول) ڈال دو۔ کیوں کہ تم آسانی پیدا کرنے کے لئے بھیجے گئے ہو، تم مشکل پیدا کرنے کے لئے نہیں بھیجے گئے۔

مسٹر بال ٹھاکرے کا انٹرویو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی بات کہنے میں منافقت کا طریقہ نہیں اختیار کیا ہے بلکہ اپنا خیال صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ ان کو یہ شکایت ہے کہ مسلمان ان کے جلوس پر کیوں اعتراض کرتے ہیں جس کی وجہ سے شیو جینتی کا جلوس چودہ سال تک قانوناً بند رہا۔ اگر مسلمانوں کے کچھ جذبات ہیں تو کیا ہمارے جذبات نہیں ہیں۔ کیا ہم انسان نہیں ہیں۔ ہم اپنے مذہب پر یا اپنی تاریخ پر بولیں تو مسلمانوں کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں مگر مسلمانوں نے جب پاکستان کے نام سے اپنا بٹوارہ کر لیا تو اس کے عین منطقی نتیجہ کے مطابق ہندستان ہندو ملک ہے۔ جو کوئی یہاں رہنا چاہے وہ بھائی بن کر یہاں رہ سکتا ہے۔ ہم کسی پر کوئی پابندی لگانا نہیں چاہتے۔ میں اپنے پیرؤوں سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اس فرقہ کو ماریں یا اس سے نفرت کریں۔ مگر مسلمانوں کا جو طریقہ ہے اس سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ فرقہ وارانہ فساد بند ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ مسلمان ہمارے خلاف حملہ کرنا چھوڑ دیں اور پھر ان کے خلاف کارروائی نہیں ہوگی۔ ہم حملہ نہیں کرتے ہم صرف بدلہ لیتے ہیں۔ مگر وہ حملہ کریں تو ہم ضرور بدلہ لیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ شیوسینا کے لیڈر مسٹر بال ٹھاکرے نے خود ہمارے رسول کی ایک حدیث یاد دلا کر ہم کو ہر قسم کے فساد پر فتح حاصل کرنے کا قیمتی راز بتایا تھا۔ مگر ذہنی بگاڑ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہم نے اس کو بھی اپنے خلاف ایک نیا شدید تر فساد پیدا کرنے کا ذریعہ بنالیا۔ کیسا عجیب ہے یہ طریقہ جس کے مطابق ہم دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔

فساد کی جڑ

مسلمان اس قسم کی نادانیاں کیوں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی فخر کی نفسیات ہے۔ مسلمانوں پر جب بھی زوال کا دور آتا ہے تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ان کے اندر فخر کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ امت کا زوال دراصل نام ہی اس بات کا ہے کہ دین ان کے یہاں ذمہ داری کی سطح پر نہ رہے بلکہ فخر کی سطح پر پہنچ جائے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدائے رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی اور عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے الجھتے ہیں تو وہ ان کو سلام کرکے الگ ہو جاتے ہیں۔ (الفرقان ۶۳) مگر امت پر جب گراوٹ کا دور آتا ہے تو اس کے اندر بالکل برعکس مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ اب اس کے افراد کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دین کی تعلیمات کا چرچا اپنی بڑائی جتانے کے لئے کرتے ہیں نہ کہ حقیقۃً عمل کرنے کے لئے۔

وہ سر اٹھا کر کہیں گے کہ صرف ہمارا دین ایک ایسا دین ہے جس میں خالص توحید پائی جاتی ہے۔ مگر عین اسی وقت اپنی زندہ اور مردہ شخصیتوں کی پرستش میں مبتلا ہوں گے۔ وہ اس بات پر فخر کریں گے کہ اسلام میں کامل مساوات پائی جاتی ہے مگر اپنے معاملات میں سراسر غیر مساوی سلوک جاری رکھیں گے۔ وہ جوش و خروش کے ساتھ یہ اعلان کریں گے کہ ہمارا دین حکم دیتا ہے کہ تم مفتاح للخیر، مغلاق للشر (بھلائی کا دروازہ کھولنے والے اور برائی کا دروازہ بند کرنے والے) بنو مگر جب خدا کا کوئی بندہ اس حکم کو خود ان کی ذات پر استعمال کرتے ہوئے ان کے کسی غلط رویہ پر تنقید کر دے تو وہ ہمیشہ کے لئے اس کے دشمن بن جائیں گے۔

وہ اپنے پیغمبر کے اعلیٰ کردار کو بیان کرتے ہوئے پر فخر طور پر کہیں گے کہ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہیں ہوئے مگر خود ہر خلاف مزاج بات پر بھڑک اٹھیں گے اور کہیں گے کہ جب اشتعال پیدا کیا جائے تو ہم کیسے نہ مشتعل ہوں۔ دوسرے ادیان کو کمتر ثابت کرنے کے وقت وہ زور و شور کے ساتھ کہیں گے کہ ہمارے رسول پر پیغمبری ختم ہو گئی۔ مگر اپنے پیغمبر کی تعلیمات کو دوسری قوموں تک پہنچانے سے وہ اس قدر غافل ہوں گے جیسے کہ اس کام کے لئے انھیں کسی نئے رسول کی آمد کا انتظار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی نفسیات ہر قسم کے فساد کی اصل جڑ ہے۔ جب دین فخر کا عنوان بن جائے تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر وہ مزاج پیدا ہوتا ہے جس کو جھوٹا احساس برتری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے آپ کو ہر حال میں صحیح سمجھنے لگتے ہیں اور دوسرے کو ہر حال میں غلط۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ ان کا رویہ سراسر غیر حقیقت پسندانہ رویہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ دوسروں کی غلطیوں کا خوب چرچا کریں گے مگر خود اپنی غلطی

مانے کے لئے کبھی تیار نہ ہوں گے۔ وہ اس طرح رہیں گے جیسے کہ انھیں سب کچھ کرنے کا حق ہے۔ اور ان کے سوا جو لوگ ہیں انھیں کچھ بھی کرنے کا حق نہیں۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ اس مزاج کے ساتھ دوسروں کے درمیان رہنا چاہیں وہ کبھی معتدل طور پر دوسروں کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ان کا وجود خدا کی زمین پر صرف فساد پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔ ان کے ذریعہ یہاں کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس مزاج کے ساتھ دنیا میں رہنا گویا خدا کی دنیا میں گندگی بکھیرنا ہے جب کہ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کہیں کوئی گندگی ہو جائے تو اس کو تحلیل (Decompose) کر کے دوبارہ اس کو پاکی میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس طرح رہنا خدا کی دنیا میں غیر خدائی طریقہ پر رہنا ہے۔ اور جو لوگ خدا کی دنیا میں غیر خدائی طریقہ پر رہنا چاہیں وہ آخر کامیاب ہوں گے تو کس طرح کامیاب ہوں گے۔

انگریزی الرسالہ

الرسالہ کا انگریزی اڈیشن پابندی سے ہر ماہ نکل رہا ہے۔ زبان و بیان ہر لحاظ سے بفضلہ تعالیٰ وہ ایک معیاری پرچہ ہے۔ ایک امریکی نومسلم جو انگریزی الرسالہ شروع سے پڑھ رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ الرسالہ مجھ کو بہت پسند ہے۔ وہ مسلم دنیا کا واحد انگریزی رسالہ ہے جو خالص دعوتی اور تعمیری انداز میں نکلتا ہے۔ میں الرسالہ کو بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔

الرسالہ خالص دعوتی مقصد سے نکالا گیا ہے اور دعوت پوری امت کی مشترک ذمہ داری ہے۔ اس اعتبار سے الرسالہ (انگریزی) کسی خاص ادارہ کا پرچہ نہیں وہ پوری امت کا پرچہ ہے۔ اس کا تعاون کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کے سلسلے میں آپ اپنی ذمہ داری کو اس طرح پورا کر سکتے ہیں کہ:

اس کے خریدار بنائیں اور ایجنسی قائم کریں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔

نوٹ: انگریزی الرسالہ کی خریداری اور ایجنسی کے شرائط وہی ہیں جو اردو الرسالہ کے ہیں۔

—— ادارہ الرسالہ

قرآنی حل

آج ہر مسلمان قرآن کے فضائل سے واقف ہے۔ مگر لوگ صرف فضائل تلاوت سے واقف ہیں۔ فضائل اتباع سے کوئی واقف نہیں۔ حالاں کہ قرآن کے سب سے زیادہ فضائل و کمالات وہ ہیں جو قرآن کے اتباع میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام مسائل کا حل قرآن میں موجود ہے۔ مگر یہ حل اسی کے لئے کار آمد ہے جو کسی تحفظ ذہنی کے بغیر اس کو اختیار کرنے پر راضی ہو۔

یہاں قرآن سے متعلق چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

عن عثمان بن عفان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ (رواہ البخاری)

حضرت عثمان بن عفان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن کو سیکھے اور اس کو سکھائے۔

عن عمر بن الخطاب ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ آخرین (رواہ مسلم)

حضرت عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اس کتاب (قرآن) کے ذریعہ کچھ لوگوں کو بلند کرے گا اور کچھ دوسرے لوگوں کو اس کے ذریعہ سے گرائے گا۔

عن عبد اللہ بن عمر قال، نزل جبریل علیہ السلام علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرہ انہا ستکون فتن۔ قال فما المخرج منہا یا جبریل۔ قال کتاب اللہ، فیہ نبأ ما قبلکم ونبأ ما ھو کائن بعدکم۔ وھو الشفاء النافع عصمۃ لمن تمسک بہ ونجاۃ لمن اتبعہ۔ (جامع الاصول فی احادیث الرسول الجزء الثامن، صفحہ ۴۶۴)

حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ حضرت جبریل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آئے۔ انھوں نے آپ کو بتایا کہ عنقریب فتنے اٹھیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اے جبریل پھر اس سے نکلنے کی صورت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی کتاب۔ اس میں پہلے کی خبریں ہیں اور جو بعد کو ہونے والا ہے اس کی بھی خبریں ہیں۔ وہ نفع بخش شفا ہے جو اس کو پکڑے اس کے لئے حفاظت ہے اور جو اس کی پیروی کرے اس کے لئے نجات ہے۔

اس قسم کی احادیث بتاتی ہیں کہ ہر مسئلہ جو مسلمانوں کے لئے کسی بھی زمانہ میں یا کسی بھی حالات میں پیدا ہو اس کا یقینی حل یہ ہے کہ قرآن کی پیروی کی جائے۔ قرآن کے حکم پر چلنے میں مسلمانوں کے لئے حفاظت کا سامان ہے اور ہر فتنہ سے ان کے لئے نجات کی ضمانت ہے۔

اس سلسلہ میں جب ہم قرآن پر غور کرتے ہیں تو اس میں ہم کو یہ اصولی اور بنیادی رہنمائی ملتی ہے کہ ـــــ بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جواب دینے کا وہ طریقہ اختیار کرو جو بہتر ہو۔ پھر یکایک تمہارا دشمن ایسا ہو جائے گا۔ جیسے کہ وہ تمہارا قریبی دوست ہو (حم سجدہ ۳۴)

اس آیت کی تشریح میں حضرت عبد اللہ بن عباس نے فرمایا:

امر الله المومنين بالصبر عند الغضب والحلم عند الجهل والعفو عند الاساءة۔ فاذا فعلوا ذالك عصمهم الله من الشيطان وخضع لهم عدوهم كانه ولى حميم (تفسير ابن كثير)	اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ غصہ کے وقت صبر کریں۔ وہ جہالت کے موقع پر برداشت کریں اور برائی کے موقع پر معاف کردیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان سے بچالے گا اور ان کے دشمن کو جھکا کر اس کو ان کے دوست کے مانند کر دے گا۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

ادفع بحلمك جهل من يجهل عليك (تفسير القرطبی)	جو شخص تمہارے ساتھ جہالت کرے، اس کی جہالت کا مقابلہ تم برداشت سے کرو۔

مذکورہ آیت میں زندگی کا جو اصول ملتا ہے وہی فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ کا حل بھی ہے۔ یعنی ردعمل کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے مثبت تدبیر والا طریقہ اختیار کرنا۔ یہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر نہیں جو اس مسئلہ کو ختم کر سکتی ہو۔ دوسری تدبیروں سے اگر وہ ختم ہونے والا ہوتا تو اب تک ختم ہو چکا ہوتا۔ کیوں کہ پچھلی طویل مدت میں وہ بہت بڑے پیمانہ پر آزمائی جا چکی ہیں اور سراسر ناکام رہی ہیں۔

فساد کے مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ ہم قومی طرز فکر کو چھوڑیں اور قرآنی طرز فکر کو اختیار کریں۔ مسلمان تلاوت قرآن کے فضائل سے خوب واقف ہیں مگر وہ اطاعت قرآن کے فضائل کو نہیں جانتے۔ قرآن کے احکام دراصل فطرت کے وہ قوانین ہیں جن پر خدا نے اپنی دنیا کا نظام قائم کیا ہے، انھیں قوانین کو اختیار کر کے کائنات کا نظام درست طور پر چل رہا ہے اور انھیں کو اختیار کرنے پر ہماری زندگی کا نظام بھی درست طور پر چل سکتا ہے۔ مذکورہ بنیادی حکم کی روشنی میں غور کیا جائے تو اس سلسلے میں قرآن سے چند خاص اصول اخذ ہوتے ہیں:

۱. خبر کی تحقیق

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تمھیں کوئی خبر ملے تو اس کی تحقیق کرو (ان جاءکم فاسق بنبأ

فتبینوا ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین) بھیونڈی اور بمبئی کے علاقہ کے مسلمانوں نے اگر قرآن کے اس حکم پر عمل کیا ہوتا تو یقیناً وہ اس فساد سے بچ جاتے جس میں کہا جاتا ہے کہ ان کا ایک ارب روپیہ کا نقصان ہوا ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی توہین کی خبر سننے کے بعد اگر وہ اس کی باقاعدہ تحقیق کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ یہ خبر سرے سے غلط ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں میں وہ اشتعال پیدا نہ ہوتا جس کے ردعمل میں مذکورہ فساد ہوا۔

۲ . لغویت سے اعراض

اسی طرح قرآن میں اہل ایمان کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں (والذین ھم عن اللغو معرضون) اس آیت کے مطابق مسلمانوں کو چاہئے کہ جب نادان لوگ کوئی جہالت کریں یا کوئی اشتعال انگیز بات کریں تو وہ اس پر برافروختہ نہ ہوں بلکہ اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔

مسلمان اگر اس قرآنی حکم (اعراض) کو اختیار کرلیں تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان میں تمام فسادات کی جڑ کٹ جائے ۔ کیوں کہ بیشتر فسادات کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ نادانوں کی خرافات پر اعراض نہیں کرپاتے ۔ وہ فوراً مشتعل ہو کر ان سے لڑنے لگتے ہیں ۔ مثال کے طور پر پچھلے رمضان (جون ۱۹۸۳) میں مالیگاؤں کا فساد یقینی طور پر نہ ہوتا اگر مسلمانوں نے اعراض کا طریقہ اختیار کیا ہوتا ۔ جیسا کہ معلوم ہے، اس فساد کا آغاز اس طرح ہوا کہ روزہ کے دنوں میں شام کو غیر مسلموں نے کسی وجہ سے پٹاخہ چھوڑا ۔ کچھ مسلمان جو قریب کی مسجد میں افطار کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے سمجھا کہ یہ افطار کے اعلان کا گولا ہے ۔ انھوں نے افطار کرلیا ۔ بعد کو جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ غیر مسلموں کا پٹاخہ تھا اور انھوں نے وقت سے پہلے افطار کرلیا تو وہ مسجد سے نکل کر غیر مسلموں سے لڑنے لگے ۔ اس کا نتیجہ مالیگاؤں میں ہولناک فساد تھا ۔ حالانکہ قرآن کی رو سے یہ قطعی طور پر ایسا واقعہ تھا جس سے انھیں اعراض کرنا چاہئے تھا۔

۳ . حمیت جاہلیہ نہیں

قرآن میں معاہدہ حدیبیہ کے واقعہ کے ضمن میں ارشاد ہوا ہے کہ اہل کفر نے جب حمیت جاہلیۃ کا مظاہرہ کیا تو اہل ایمان نے اس کے جواب میں حمیت جاہلیہ کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ وہ تقویٰ کی روش پر قائم رہے ۔ (الفتح ۲۶) اہل ایمان کی طرف سے جوابی حمیت کا طریقہ اختیار نہ کرنے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ حدیبیہ کا معاہدہ ہو سکا جس کو خدا نے فتح مبین فرمایا اور جس کے صرف دو سال بعد عرب فتح ہو گیا۔

مسلمان اگر اس آیت پر عمل کریں تو اچانک ان کی تاریخ بالکل دوسرا رخ اختیار کرلے ۔ نیز فسادات کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے ۔ فرقہ وارانہ فساد کی وجہ اکثر حالات میں یہی ہوتی ہے کہ فریق ثانی کی حمیت

جاہلیہ کے مقابلہ میں مسلمان بھی حمیت جاہلیہ پر اتر آتے ہیں۔ اس سے کش مکش بڑھتی ہے اور بالآخر فساد ظہور میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر مراد آباد کا فساد (۱۹۸۰) اس طرح شروع ہوا کہ غیر مسلم حضرات کی شادی کا جلوس گاتے بجاتے ایک سڑک سے گزر رہا تھا جس پر ایک مسجد واقع تھی۔ مسلمان مسجد سے نکل کر جلوس کی راہ میں مزاحم ہو گئے انھوں نے کہا کہ اس سے مسجد کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ اس لئے تم لوگ دوسرے راستے سے اپنا جلوس لے جاؤ۔ غیر مسلم حضرات اس پر تیار نہیں ہوئے۔ یہ ضد یہاں تک بڑھی کہ مار پیٹ کی نوبت آگئی اور بالآخر زبردست فساد پھوٹ پڑا۔

مسلمانوں کی یہ روش یقینی طور پر حمیت جاہلیہ کے مقابلہ میں جوابی حمیت جاہلیہ کا مظاہرہ تھا۔ اگر مسلمان قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلتے تو یقیناً وہ جوابی حمیت کا مظاہرہ نہ کرتے۔ اور اس کے بعد اس حادثہ کی نوبت ہی نہ آتی جس نے مراد آباد کو فساد کی آگ میں جلا ڈالا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو اچھائی سے مٹاتا ہے۔ ناپاک کبھی ناپاک کو نہیں مٹا سکتا (ان اللہ لا یمحوا السیئ بالسیئ ولکن یمحوا السیئ بالحسن ان الخبیث لا یمحوا الخبیث، احمد)

اس حدیث میں ایک خداوندی اصول بیان کیا گیا ہے۔ اسی اصول پر پوری دنیا کا نظام قائم ہے۔ یہاں ہر برائی کو بھلائی سے ختم کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ساری دنیا صرف چند روز میں گندگی کا عظیم کوڑا خانہ بن کر رہ جائے۔

مگر آج مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ برائی کو برائی سے مٹانے پر کمربستہ ہیں۔ وہ اشتعال کو جوابی اشتعال کے ذریعہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک نفرت کو دوسری نفرت سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رقابت کا توڑ رقابت کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ قومی عصبیت کا علاج قومی عصبیت کے ذریعے کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر یہ قانون خداوندی کے سراسر خلاف ہے۔ ایسا کوئی منصوبہ موجودہ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر مسلمانوں کو اپنی اس تدبیر پر اصرار ہے تو ان کو اپنی مرضی کے مطابق ایک اور دنیا بنانی پڑے گی۔ موجودہ دنیا میں وہ کبھی اس طرح کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

قول میں کچھ، عمل میں کچھ

ہندستان کے سیاسی لیڈر اور حکمراں ہمیشہ " دستور ہند " کا قصیدہ پڑھتے ہیں۔ مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو وہ اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ دستور کی تعریف کرنا ہو تو وہ اس کے حوالہ سے سماجی برابری کے خوبصورت الفاظ بولیں گے۔ مگر عملی معاملات میں وہ نابرابری کا سلوک کریں گے۔ دستور کے دفعات کی تشریح میں وہ شاندار طور پر اس کے سیکولر کردار کا تذکرہ کریں گے مگر عمل کے پہلے ہی موقع پر سیکولرازم کو چھوڑ کر قومی جانب داری کا رویہ اختیار کرلیں گے۔ گویا دستور ہند صرف فخر کرنے کے لئے ہے نہ کہ عمل کرنے کے لئے۔

ٹھیک یہی حال موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ مسلمان اپنی تقریروں اور تحریروں میں اسلامی تعلیمات کی عظمت کا قصیدہ پڑھتے ہیں مگر عمل کے وقت وہ جس چیز پر عمل کرتے ہیں وہ ان کا ذاتی مفاد یا ان کی قومی خواہشیں ہوتی ہیں نہ کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات۔ یہی حال آج اصاغر امت کا بھی ہے اور یہی حال اکابر امت کا بھی۔

مسلمان جب اسلام کے عقیدہ توحید پر بولیں گے تو شاندار الفاظ کا دریا بہا دیں گے۔ وہ بتائیں گے کہ اسلام میں ایک خدا کے سوا کسی اور کی پرستش کی گنجائش نہیں۔ مگر عملاً قوم کی قوم کا یہ حال ہے کہ وہ غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا ہے۔ کوئی کسی بزرگ کی پرستش کر رہا ہے اور کوئی کسی مفکر کی۔ کوئی کسی زندہ شخصیت کو مقدس سمجھے ہوئے ہے اور کوئی کسی مردہ شخصیت کو۔ انسانی عظمت کے تذکروں سے تمام مجلسیں گونج رہی ہیں مگر خدا کی عظمت کا تذکرہ کہیں سنائی نہیں دیتا۔ گویا " توحید " صرف اس لئے ہے کہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں پر اپنی نظریاتی برتری ظاہر کرکے فخر کیا جائے۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے تو مسلمانوں کی عملی حالت بھی تقریباً وہی ہے جو دوسری قوموں کی۔

اسی طرح ہمارے ادیب اور خطیب پرجوش طور پر بیان کریں گے کہ اسلام کے نزدیک خدا بھی ایک ہے اور کتاب بھی ایک اور انسان بھی ایک۔ آفاقی وحدت سے کم کوئی چیز ان کو اسلام کی عظمت گھٹانے کے ہم معنی معلوم ہوگی۔ وہ کہیں گے کہ ہم ایسی صاف اور واضح شریعت کے حامل ہیں جس کی راتیں بھی اس کے دنوں کے مانند روشن ہیں (لیلھا کنھارھا)

بذات خود یہ باتیں یقیناً صحیح ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لئے اب وہ صرف کہنے کی باتیں رہ گئی ہیں۔ ان کا عمل دیکھئے تو ہر ایک سراسر اس کے خلاف عمل کرتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان آج جتنا

زیادہ اختلاف اور انتشار میں مبتلا ہیں، دنیا کی کوئی قوم اتنے زیادہ اختلاف و انتشار میں مبتلا نہیں۔ مسلمانوں کی حالت دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان کے درمیان کوئی مشترک چیز موجود ہی نہیں۔ جیسے کوئی واحد بنیاد ہی نہیں جس پر ان کو متحد کیا جا سکے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کی وحدت کا لفظ آج مسلمان صرف دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنی برتری ظاہر کرنے کے لیے بولتے ہیں۔ اسلام اب ان کے لیے صرف فخر کرنے کی چیز ہے نہ کہ عمل کرنے کی چیز۔

یہی حال آج مسلمانوں کے تمام قومی اور اجتماعی معاملات کا ہے۔

اس کی ایک واضح مثال اسلام کی وہ تعلیم ہے جو معاہدہ حدیبیہ کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ تمام قائدین اور مفکرین کا یہ حال ہے کہ جب وہ رسول کی سیرت یا قرآن کی تعلیم پر بولتے ہیں تو وہ معاہدہ حدیبیہ کی صابرانہ پالیسی کو زور و شور کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ مکہ کی فتح صلح کے ذریعہ حاصل کی گئی نہ کہ جنگ کے ذریعہ۔ مگر دوسری اقوام سے موجودہ مسلمانوں کے جو جھگڑے ہیں ان میں وہ حدیبیہ کی روح کے سراسر خلاف عمل کرتے ہیں۔ ہر قائد معاہدہ حدیبیہ کی شاندار تفسیر بیان کرتا ہے۔ دوسری طرف ان قائدین اور مفکرین نے موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ جس اسلامی تعلیم کو نظر انداز کیا ہے وہ وہی ہے جس کو معاہدہ حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

بطور مثال یہاں ایک مشہور مسلم اخبار کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اس انگریزی اخبار نے اپنی ۱۴ جولائی ۱۹۸۴ کی اشاعت میں معاہدہ حدیبیہ پر ایک طویل مضمون شائع کیا ہے۔ اس مضمون میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ معاہدہ حدیبیہ کے ذریعہ عرب کی فتح کا دروازہ کھلا۔ مضمون کے مطابق، معاہدہ حدیبیہ کا خلاصہ یہ تھا کہ مخالف فریق کی ہر قسم کی اشتعال انگیزیوں کے باوجود یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو ردعمل سے بچا جائے، اور ٹکراؤ کو نظر انداز (Avoid) کرتے ہوئے اپنی مثبت تعمیر کے ذریعہ کامیابی حاصل کی جائے۔ یہاں اخبار کے مذکورہ مضمون کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ حدیبیہ کے واقعات بیان کرتے ہوئے مضمون نگار لکھتے ہیں:

During this period, while negotiations were on, the Quraish continued with their efforts in different ways to provoke Muslims to start a fight but the companions all through exercised great self-restraint as directed by their leader and refused to fall into any trap. Once a group of around fifty stealthily approached the camp of Muslims in the night and started pelting stones. Companions of the Prophet who had already been cautioned against reacting to such provocations, kept their cool and simply rounded up them all and produced them before the Prophet who simply let them go. (p. 19)

جب بات چیت ہو رہی تھی تو قریش مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے تاکہ دونوں کے درمیان لڑائی شروع ہو جائے۔ مگر اصحاب رسول نے شروع سے آخر تک زبردست صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا، جیسا کہ ان کے قائد نے انھیں ہدایت کی تھی۔ انھوں نے ان کی کسی بھی چال میں پھنسنے سے انکار کر دیا۔ ایک بار تقریباً ۵۰ آدمیوں کا ایک گروہ چپکے سے مسلمانوں کے پڑاؤ کے پاس رات کے وقت آگیا اور پتھر مارنا شروع کیا۔ رسول کے اصحاب جن کو پہلے سے ہی چوکنا کر دیا گیا تھا کہ وہ اس قسم کی اشتعال انگیز حملوں پر برانگیختہ نہ ہوں، وہ بالکل ٹھنڈے بنے رہے اور صرف یہ کیا کہ ان سب کو پکڑ کر رسول اللہ کے سامنے پیش کر دیا جنھوں نے سادہ طور پر بس ان کو رہا کر دیا (صفحہ ۱۹)

معاہدہ حدیبیہ کی اس اسپرٹ کا مذکورہ مضمون میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہونے کی یہی حکیمانہ پالیسی تھی جس کے ذریعے عرب میں بے مثال کامیابی حاصل کی گئی۔

مگر یہی اخبار ہے جو ملک میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مسائل کے ذیل میں اس کے بالکل برعکس ذہن کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ اشتعال انگیز واقعات پر مسلمانوں کے مشتعل ہو جانے کی حمایت کرتا ہے۔

مثال کے طور پر اخبار مذکور کی اشاعت ۹ جون ۱۹۸۴ میں بھیونڈی اور بمبئی کے علاقہ میں ہونے والے فساد پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں پر بمبئی کے اس واقعہ کا ذکر ہے کہ شیوسینا کے لیڈر مسٹر بال ٹھاکرے کے پیغمبر کی شان میں گستاخانہ الفاظ بولنے پر ایک مسلمان ایم ایل اے مسٹر اے آر خان نے غصہ میں بھرا ہوا جلوس نکالا اور مسلمانوں نے مسٹر بال ٹھاکرے کی مورت بنا کر اس کو پرانے چپلوں کا ہار پہنایا۔

اخبار مذکور یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ احتجاج کا نہایت نازیبا طریقہ تھا۔ مگر اگلے ہی فقرہ میں یہ کہہ کر اس کا جواز فراہم کر دیتا ہے کہ ـــــ مگر ایک شخص کو یہ کہنے سے باز نہیں رکھا جا سکتا کہ اس سلسلہ میں ابتدائی اشتعال شیوسینا کے لیڈر کی طرف سے فراہم کیا گیا تھا:

—the Muslims took out an angry procession on May 11 and a Muslim MLA, Mr. A.R. Khan, in his muddle headedness, garlanded an effigy of Mr. Bal Thackeray with wornout chappals. No level headed Muslim approves of the Congress-I legislator's indecent manner of protest. But one need not strain one's commonsense to conclude that the initial provocation had come from the Shiva Sena chief.

مذکورہ دونوں مضامین میں واضح طور پر تضاد ہے۔ اول الذکر بیان بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی سنت یہ تھی کہ فریق مخالف خواہ کتنی ہی اشتعال انگیزی کرے ہم اس پر برافروختہ نہ ہوں، بلکہ اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مثبت طرز عمل پر قائم رہیں۔ اس کے برعکس دوسرا بیان یہ کہتا ہے کہ جب اشتعال انگیزی ہوگی تو اس کا ردعمل بھی ضرور ہوگا۔ پیغمبر کی سنت تو یہ کہتی ہے کہ پتھر

کا جواب لفظ سے بھی مت دو، مگر اخبار مذکور کے مطابق مسلمان اگر لفظ کا جواب چپل سے دیں تب بھی وہ بالکل حق بجانب ہیں۔ کیوں کہ وہ اشتعال دلانے کے بعد مشتعل ہوئے ہیں!

یہ کسی ایک اخبار کی بات نہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام صحافت و قیادت اسی تضاد میں مبتلا ہے۔ اور یہی وہ تضاد ہے جس نے ہماری تمام کوششوں کو بے نتیجہ بنا دیا ہے۔ جب اسلام پر لکھنا یا بولنا ہو تو ہمارا ہر لیڈر اسلام کے حق میں شاندار قصیدہ پیش کرتا ہے مگر جب عملی انطباق کا وقت آتا ہے تو وہ فوراً وہی کرنے لگتا ہے جو قومی خواہشات کا تقاضا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اب مسلمانوں کا "دین" نہیں رہا ہے بلکہ وہ صرف ان کے قومی فخر کا عنوان ہے۔ عمل کے وقت ان کی رہنما ان کی خواہشیں ہوتی ہیں، البتہ جب اظہار فخر کا موقع ہو تو وہ اسلام کی شان میں قصیدہ پڑھ کر اپنی برتری کے جذبات کو تسکین دے لیتے ہیں۔

گویا یہاں مسلم لیڈروں کا کیس وہی ہے جو غیر مسلموں کی مثال میں نظر آتا ہے۔ غیر مسلم لیڈر دستور ہند کے شاندار الفاظ پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے پاس ایسا اور ایسا دستور ہے۔ مگر ان کا عمل اس کے سراسر خلاف ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی مسلم لیڈروں کا حال بھی ہے۔ وہ قرآن و سنت پر شاندار قصیدہ پڑھ کر اپنے جذبات فخر کو تسکین دیتے رہتے ہیں مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو اس وقت ان کا رہنما یا ان کا ذاتی مفاد ہوتا ہے یا ان کی قومی خواہشات۔

ہمارے قائدین بلاشبہ خود فساد نہیں کرتے۔ مگر جب ان کی قوم کے جاہل افراد کی نادانی سے کہیں فساد ہو جاتا ہے تو وہ ہمیشہ اس کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے لوگوں کو قصور وار نہیں ٹھہراتے جس کی ایک مثال مذکورہ انگریزی اقتباس ہے۔ قائدین کی یہ قومی روش خود انھیں بھی فسادیوں کی فہرست میں شامل کر رہی ہے خواہ بظاہر وہ اس سے الگ دکھائی دیتے ہوں۔

لوگ خدائی مذہب کا نام لیتے ہیں، حالانکہ انھیں قومی مذہب کے سوا کسی اور چیز کی خبر نہیں۔

ایک چھوڑی ہوئی سنّت

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں پرتگیزی ہندستان کے ساحل تک آ چکے تھے۔ اس زمانہ میں ایسے واقعات پیش آئے کہ ہندستانی مسلمان جو بادبانی کشتیوں کے ذریعہ حج کے لئے ہندستان سے حجاز جارہے تھے، ان کو پرتگیزیوں نے راستہ میں لوٹ لیا۔

اس طرح کے واقعات مشہور ہوئے تو اطراف لکھنؤ کے بعض علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ موجودہ حالات میں ہندستانی مسلمانوں کے لئے حج کی عبادت ضروری نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ قرآن میں ہے کہ من استطاع الیہ سبیلا (آل عمران ۹۷) اس آیت کے مطابق حج کی شرط یہ ہے کہ راستہ میں امن ہو۔ چونکہ حجاز اور ہندستان کے درمیان کا سمندری سفر غیر مامون ہوگیا ہے، اس لئے اس آیت کے مطابق اب ہندستانی مسلمانوں کے اوپر سے حج کی فرضیت ساقط ہوگئی ہے۔

یہ مسئلہ بڑھا اور مختلف علماء سے اس کے بارہ میں رائیں دریافت کی گئیں۔ مفتی فیض الدین صاحب (لکھنؤ) نے شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۸۲۳ - ۱۷۶۲) کو خط بھیجا اور اس کے متعلق ان کا فتویٰ پوچھا۔ انھوں نے اور دوسرے علماء نے فتویٰ دیا کہ حج کی فرضیت بدستور قائم ہے۔ سمندری خطرات کے باوجود صاحب استطاعت مسلمانوں کو حج کرنا چاہئے۔

اس کے بعد سید احمد شہید بریلوی (۱۸۳۱ - ۱۷۸۶) کے اندر جوش پیدا ہوا۔ انھوں نے حج کو زندہ کرنے کے لئے ایک فوری اقدام کیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہم حج کے لئے جارہے ہیں۔ جس کا جی چاہے وہ ہمارے ساتھ چلے۔ ہم ہر ایک کے اخراجات کے ذمہ دار ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مختلف علاقوں میں خطوط روانہ کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سات سو آدمی ان کے ساتھ جمع ہوگئے۔ اگرچہ اس وقت سید صاحب کے پاس صرف گیارہ روپئے موجود تھے مگر انھوں نے مجاہدانہ عزم کے ساتھ قافلہ کو لے کر سفر شروع کر دیا۔ رائے بریلی سے الٰہ آباد پہنچے۔ وہاں سے گنگا میں چلنے والی کشتیوں کے ذریعہ کلکتہ تک کا سفر کیا۔ اور کلکتہ سے بادبانی کشتیوں کے ذریعہ جدہ کے ساحل پر اترے اور پھر حج ادا کر کے سب کے ساتھ واپس آئے۔ پورے راستہ میں مسلم آبادیاں ان کا تعاون کرتی رہیں۔ اس طرح یہ سفر تکمیل تک پہنچا۔

سید احمد شہید کا یہ پرجوش اقدام قابل تعریف ہے۔ مگر یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا کہ سید صاحب کے اندر اس کا جوش تو پیدا ہوا کہ وہ حج کے فریضہ پر لوگوں کو عمل کرانے کے لئے فوری اقدام کریں۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ اس بات کی تحقیق کریں کہ یہ

"سمندری قزاق" کون ہیں۔ جنھوں نے ہمارے عبادتی سفر کو غیر محفوظ بنا دیا ہے۔ یہ دوسرا سوال بے حد اہم تھا۔ اور بے حد دور رس نتائج کا حامل تھا۔ مگر انھوں نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔

مزید یہ کہ یہ دوسرا مسئلہ بھی اسی طرح عین دینی عمل تھا جس طرح حج کرنا ایک دینی عمل ہے۔ پہلی چیز اگر فرض ہے تو دوسری چیز سنت۔ انھوں نے فرض پر توعمل کیا اور سنت کو چھوڑ دیا۔ موجودہ دور میں غیر مسلم اقوام کی طرف سے مسلمانوں کے لئے زبردست مسائل پیدا ہوئے مگر اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی مسلم وفد نے تحقیق حال کے لئے ان علاقوں کا سفر کیا ہو یا ان کی خبریں فراہم کرنے کے لئے کوئی ادارہ قائم کیا گیا ہو۔

سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت تتبع اخبار ہے۔ یعنی فریق مخالف کی سرگرمیوں اور منصوبوں کا خاموشی سے پتہ لگانا۔ یہ وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں جاسوسی نظام کہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کی حکومتیں اپنے جارحانہ عزائم کے لئے جاسوسی کرتی ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا جاسوسی نظام اس لئے تھا کہ تعمیر اسلام کی راہ میں جو لوگ رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں ان کی سرگرمیوں کا پیشگی اندازہ کیا جائے تاکہ بر وقت ان کا توڑ کیا جا سکے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مکہ کے حالات سے مجبور ہو کر ہجرت کے لئے نکلے تو قریش نے آپ کا پیچھا کیا۔ چنانچہ آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ چند میل کے فاصلہ پر جبل ثور کے ایک غار میں بیٹھ گئے اور وہاں تین دن تک چھپے رہے۔ ان دنوں کے بارہ میں جو واقعات سیرت کی کتابوں میں آتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ابوبکر کے صاحبزادے عبد اللہ بن ابی بکر جو نہایت ہوشیار اور سمجھدار نوجوان تھے، ان کے ذمہ یہ خدمت سپرد کی گئی کہ وہ دن بھر مکہ میں رہیں اور خاموشی کے ساتھ قریش کی باتوں کا پتہ کرتے رہیں۔ پھر رات کو غار ثور میں آکر آپ کو قریش کے ارادوں اور ان کے منصوبوں سے مطلع کریں۔ اس طرح کرکے وہ دوبارہ اندھیرے ہی میں مکہ واپس چلے جاتے اور صبح سویرے واپس پہنچ جاتے تاکہ وہ لوگ اس غلط فہمی میں رہیں کہ عبد اللہ بن ابی بکر نے رات مکہ ہی میں گزاری ہے۔ وہ تین دن تک برابر ایسا ہی کرتے رہے۔

اس سلسلہ میں ابن ہشام کے الفاظ یہ ہیں: امر عبد الله بن ابی بکر ان یتسمع لھما مایقول الناس فیھما (عبد اللہ بن ابی بکر کو یہ ہدایت کی کہ وہ ان دونوں کے لئے مکہ میں سنیں کہ لوگ ان دونوں کے بارہ میں کیا کہتے ہیں) طبرانی میں حضرت اسماء بنت ابی بکر کی ایک روایت میں

یہ الفاظ ہیں :

وعبد اللہ بن ابی بکر یظل بمکۃ یتطلب الاخبار ثم یاتیھما اذا اظلم اللیل فیخبرھما ثم یدلج من عندھما فیصبح بمکۃ

اور عبد اللہ بن ابی بکر (دن میں) مکہ میں رہ کر خبریں معلوم کرتے۔ پھر جب رات کی تاریکی چھا جاتی تو وہ ان کے پاس (غار ثور) میں آتے اور ان کو خبریں بتاتے۔ پھر اندھیرے میں ان کے پاس سے چلے جاتے اور مکہ میں صبح کرتے (تاکہ قریش کو خبر نہ ہو سکے)

(مزید تفصیل کے لئے: السیرۃ النبویہ لابن کثیر، جلد ۲، صفحہ ۲۴۶)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حفاظت کے ساتھ مدینہ پہنچ گئے۔ مگر چوں کہ آپ کے خلاف قریش کے عزائم ختم نہیں ہوئے تھے، آپ نے ان کی خبریں لینے کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔ ہجرت کے فوراً بعد جن سرایا کی روانگی کا ذکر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے وہ زیادہ تر جاسوسی دستے تھے جو مکہ کے اطراف میں قریش کی سرگرمیوں کا پتہ لگانے کے لئے بھیجے گئے۔ چنانچہ ان دستوں کی روانگی کے وقت آپ ان کو جو ہدایت دیتے تھے اس میں اس قسم کے الفاظ ہوتے تھے: فترصد بھا قریشا وتعلم لنا من اخبارھم (سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۲۲۹) یعنی قریش کی خبر گیری کے لئے بیٹھو اور ہم کو ان کی خبروں سے مطلع کرو۔

فریق مخالف کی تیاریوں اور اس کی سرگرمیوں کا پتہ لگانے کا یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت بتاتی ہے کہ ہمارے یہاں ایک مستقل شعبہ خبروں کی فراہمی کا ہونا چاہئے۔ اس قسم کا شعبہ عام غیر مسلم اقوام کے سلسلے میں بھی ضروری ہے اور ہندستان کے مخصوص حالات میں بھی ضروری ہے۔

ہندستان میں اس شعبہ کا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے احوال کی مستقل خبر گیری کرتا رہے وہ دونوں طرف کی صحیح اطلاع فراہم کرے۔ یہ شعبہ جدید ترین ذرائع کو استعمال کر کے مکمل طور پر باخبر رہے۔ وہ تمام اسلامی مراکز کو اطلاعات فراہم کرے۔ ایک فریق کے بارے میں کوئی غلط خبر پھیلے تو فوراً اس کا مکمل توڑ کیا جائے۔ جب بھی کہیں کوئی غیر ضروری اشتعال پیدا ہو تو فوراً مسلم قیادت حرکت میں آجائے اور اس کو آخری سنگینی تک پہنچنے سے پہلے ابتدائی مرحلہ میں دفن کر دیا جائے۔ جب

بھی ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف سازش کرتا ہوا ملے تو فوراً اس کی سازش کو بے نقاب کیا جائے اور ہر قسم کے پر امن ذرائع کو اختیار کرکے اسے ابتدائی مرحلہ ہی میں ناکام بنادیا جائے۔

اس سلسلے میں مرادآباد کے فساد کی مثال لیجئے۔ یہاں مسلمانوں نے غیر مسلموں کی ایک شادی پارٹی کو روکا اور کہا کہ مسجد کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستے سے اپنا جلوس لے جاؤ۔ غیر مسلم اس پر راضی نہیں ہوئے تکرار بڑھتی گئی یہاں تک کہ باقاعدہ لڑائی شروع ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے غیر مسلموں کو مارا اور انھیں بھگادیا۔

یہ واقعہ ۲۷ جولائی ۱۹۸۰ کو ہوا۔ اس کے بعد دو ہفتہ تک مکمل خاموشی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۳ اگست ۱۹۸۰ کو زبردست فساد ہوا جس میں مسلمانوں کی معاشیات تباہ کردی گئیں مسلمانوں کا کہنا ہے کہ ۱۳ اگست ان کی عید کا دن تھا۔ اس روز مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد عیدگاہ میں جمع تھی۔ چنانچہ پیشگی منصوبہ کے تحت عیدگاہ میں خنزیر داخل کیا گیا۔ یہاں پہلے سے غیر مسلم لڑکے مسلمانوں کے لباس میں عیدگاہ کے اندر بٹھا دئے گئے تھے۔ انھوں نے خنزیر کے داخل ہوتے ہی پتھراؤ شروع کردیا اور پولیس کے حفاظتی دستہ کو بھی مارا۔ اس طرح اشتعال پیدا ہوا اور فساد پھوٹ پڑا۔

مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا کہ ۲۷ جولائی سے لے کر ۱۳ اگست تک مسلمانوں کے خلاف تیاری کی گئی مگر شہر کے مسلمانوں کو آخر وقت تک اس کی اطلاع نہ ہوسکی۔ اسی بے خبری میں اس سوال کا جواب چھپا ہوا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ پچھلے پچاس سال سے مسلمان ایک ہی شکایت لئے بیٹھے ہیں۔ وہ آج تک اس کا علاج نہ کرسکے۔ وہ یہ کہ ان کے خلاف منصوبہ بند فساد کرائے جاتے ہیں۔ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دوسرے لوگ اگر منصوبہ بند فساد کے قصوروار ہیں تو مسلمان اس کے قصوروار ہیں کہ وہ اپنے خلاف منصوبوں سے اس وقت تک باخبر نہیں ہوتے جب تک وہ اپنے آخری انجام کو نہ پہنچ جائیں۔ فساد کے بعد تمام مسلم قائدین تیز رفتار سواریوں پر دوڑتے ہیں تاکہ وہ حکومت کے ذمہ داروں سے مل کر انھیں فسادیوں کی تخریب کاری کی اطلاع دے سکیں۔ اس قسم کی سرگرمیاں سراسر بے فائدہ ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ ہماری قیادت کو فسادیوں کے منصوبہ کی پیشگی طور پر مکمل اطلاع ہوجائے اور وہ حادثہ سے پہلے ذمہ داروں کو باخبر کرنے کے لئے سرگرم ہوجائیں۔ اور اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی تربیت کے لئے۔

فساد کی روک تھام کے لئے ہمیں جو کچھ کرنا ہے اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی فراہمی اخبار کی سنت کو زندہ کیا جائے محض شکایت اور احتجاج کرتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یہاں خبروں کی فراہمی کا شعبہ حقیقۃً جنگ کا شعبہ نہ تھا بلکہ وہ تمام تر امن کا شعبہ تھا۔ یعنی اس کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کے جارحانہ عزائم سے پیشگی طور پر باخبر ہو کر اس کو ناکام بنایا جاتا تاکہ اسلام کی دعوتی اور تعمیری سرگرمیوں کو خلل اندازی سے بچایا جاسکے۔

یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصول ہونا چاہئے۔ ان کے یہاں اعلیٰ پیمانہ پر خبروں کی فراہمی کا شعبہ ہو۔ مگر اس لئے نہیں کہ جب کسی فریق کی طرف سے تشدد کے سامان جمع کرنے کی خبر ملے تو ہم بھی تشدد کے سامان جمع کرنے میں لگ جائیں۔ موجودہ حالات میں اس قسم کی ہر کوشش صرف خودکشی کے ہم معنی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے یہاں خبروں کی فراہمی کے شعبہ کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ جب بھی کسی "سازش" کی خبر ملے تو اس کو حکمت سے دفع کیا جائے "آگ" کو "پانی" کے ذریعہ بجھانے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اور یہ یقینی طور پر ممکن ہے۔ اس سے زیادہ ممکن اور کوئی چیز خدا کی اس دنیا میں نہیں۔

سابق حاملین کتاب

یہود ماضی میں خدا کی کتاب کے حامل بنائے گئے تھے۔ یہود کے ماضی میں امت مسلمہ کے مستقبل کے لئے سبق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں کثرت سے یہود کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ حدیث میں خبر دی گئی ہے کہ بگاڑ کی جو صورتیں یہود کے ساتھ پیش آئیں وہ سب کی سب مسلمانوں کے ساتھ بھی پیش آئیں گی۔ لتتبعن سنن من کان قبلکم شبرا بشبر وذراعاً بذراع حتی لو دخلوا جحر ضب لتبعتموهم (بخاری ومسلم)

حقیقت یہ ہے کہ جو قومیں خدا کی کتاب کی حامل بنائی جاتی ہیں، ان کا کیس ہمیشہ یکساں ہوتا ہے۔ ان کی کامیابی کا بھی ایک ہی اصول ہے اور ان کی ناکامی کا بھی ایک ہی اصول۔ اس اعتبار سے یہود کی تاریخ ہر اس قوم کی تاریخ ہے جو خدا کی کتاب کی حامل بنائی جائے۔ اس میں مسلمانوں کے لئے بھی اتنا ہی سبق ہے جتنا خود یہود کے لئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل (یہود) پر خدا کے انعامات کا جو آغاز ہوا تھا، اس کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ انھیں خدا کی مدد سے یہ موقع ملا کہ انھوں نے فلسطین میں داخل ہو کر پورے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یہود کی تاریخ مسلسل اتار چڑھاؤ کی تاریخ ہے۔ نیک عملی پر انعام اور بدعملی پر سزا۔

سموئیل نبی کے زمانہ میں یہود کی خود مختار اور متحدہ سلطنت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سلطنت ان کے تینوں حکمرانوں (طالوت، داؤد، سلیمان) کے زمانہ تک رہی جن کا مشترک دور ۱۰۲۰ ق م سے لے کر ۹۲۶ ق م تک ہے۔

حضرت سلیمان کے بعد فلسطین کی سلطنت دو الگ الگ حصوں (اسرائیل اور یہودیہ) میں تقسیم ہو گئی۔ ان کا دینی بگاڑ اور سیاسی اختلاف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ نویں صدی قبل مسیح میں ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اشوری حکمرانوں نے فلسطین پر حملے شروع کئے اور بالآخر سلطنت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا۔

۶۰۴ ق م میں بابل (عراق) کا حکمراں بنوخذ نصر اٹھا اور شام پر قبضہ کر کے فلسطین کی سرحد تک پہنچ گیا۔ اس کے خوف سے یہودیہ (فلسطین) کا اسرائیلی بادشاہ یہویاکم اس کو خراج دینے پر مجبور ہو گیا۔ تاہم کچھ عرصہ بعد یہویاکم کے دماغ میں آیا کہ مصر کا ساتھ دینا اس کے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ چنانچہ اس نے شاہ بابل

سے بغاوت کردی اور اس کو خراج دینا بند کر دیا۔

اس کے نتیجہ میں شاہ بابل اسرائیل پر غضب ناک ہوگیا اور فلسطین پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس درمیان میں یہویاکم کا انتقال ہوگیا اور اس کا لڑکا یہویاکین تخت پر بیٹھا۔ بابل کی فوجوں نے فلسطین پر حملہ کرکے اس کو زیر کر لیا اور شاہ یہویاکین کو گرفتار کرکے بابل لے گیا۔ بابل کے حکمراں نے فلسطین کی یہودیہ سلطنت کا نیا انتظام اس طرح کیا کہ سابق شاہ کے چچا زدکیاہ کو اپنا ماتحت عامل مقرر کر دیا۔

اس وقت بنی اسرائیل میں یرمیاہ نبی اٹھے۔ انھوں نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم لوگ حقیقت سے نہ لڑو اور موجودہ سیاسی نظام کو تسلیم کرلو۔ اور حکومت سے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر دینی اور تعمیری انداز میں کام کرو۔ مگر بنی اسرائیل کے اندر جھوٹے لیڈر اٹھے۔ انھوں نے جذباتی تقریریں کیں اور رومانی اشعار سنائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل جھوٹی خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ نہ اختیار کر سکے۔ ان کا بادشاہ زدکیاہ بغاوت پر آمادہ ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابل کے حکمراں بنوکدنصر نے دوبارہ فلسطین پر حملہ کر دیا۔ کئی مہینے کے محاصرہ کے بعد اس نے یروشلم کو اور یہودیوں کے عبادت خانہ کو بالکل تباہ کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۵۸۷ ق م میں پیش آیا۔

شاہ زدکیاہ نے اس کے بعد بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر وہ پکڑا گیا اور دوسرے بہت سے اعیان و اکابر کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ بے شمار اسرائیلی پکڑ کر بابل لے جائے گئے تاکہ وہ بابلیوں کے لئے بیگار کا کام کر سکیں۔

یہودی (جو دور قدیم کے مسلمان تھے) ان کے ساتھ پچھلی تاریخ میں کثرت سے اس طرح کے شدید واقعات پیش آئے ہیں۔ وہ لوگ بطور خود ان واقعات کو ظالموں کے ظلم کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ مگر بائبل کے نزدیک ان واقعات کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ وہ ان تمام واقعات کو خود یہودیوں کے خانہ میں ڈالتی ہے۔ اس کے نزدیک یہ یہودیوں کے اپنے بگاڑ کے نتیجہ میں پیش آنے والی خدائی سزائیں ہیں نہ کہ حقیقۃً ظالم کا ظلم۔

اس سلسلہ میں یہود کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے دور زوال میں ان کے یہاں ایسا ہوا کہ کثرت سے خوش خیال قائدین کھڑے ہو گئے۔ ایسے لوگوں کو بائبل میں "جھوٹی نبوت کرنے والے" کہا گیا ہے۔ بائبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ یہود کی تاریخی عظمت بیان کرکے انھیں جھوٹے فخر کی شراب پلاتے۔ وہ مبالغہ آمیز انداز میں یہود کی حیثیت کو بڑھاتے اور ان کے دشمنوں کو گھٹاتے۔ وہ جذباتی الفاظ بول کر انھیں خیالی دنیا میں مگن رکھتے۔ اس کی وجہ سے یہ ہوا کہ

یہود حقیقت پسندی سے بہت دور ہو گئے۔ وہ حقیقی عمل کے بجائے جذباتی کارروائیوں سے نتیجہ کی امید کرنے لگے۔

عین اسی زمانہ میں خدا نے ایسے افراد اٹھائے جو بائبل کے الفاظ میں "پیغمبری کرنے والے" تھے۔ انھوں نے یہود کو حقیقت پسندی کا سبق دیا۔ ان کی اندرونی کمزوریوں سے ان کو باخبر کیا۔ ان کو بتایا کہ تم کو تمہارے جھوٹے فخر سے کچھ ملنے والا نہیں۔ خدا کی دنیا میں حقیقی عمل کی قیمت ہے نہ کہ جھوٹے فخر اور خوش خیالیوں کی۔ مگر یہود کو ان کی باتیں پسند نہ آئیں۔ وہ انھیں کے پیچھے چل پڑے جو ان کو جھوٹی امیدیں دلاتے تھے۔ اور ان کو خوش خیالیوں میں مبتلا رکھتے تھے۔ اس بنا پر وہ بار بار اپنے حریف کے خلاف ایسے اقدامات کرتے رہے جس کا نتیجہ صرف ان کی شکست اور مزید ذلت تھی۔

یہود کی تاریخ کی یہ تفصیلات بائبل کی کتاب یرمیاہ (باب ۲۷۔ ۳۰) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان تفصیلات کے مطالعہ سے واضح طور پر حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ دور زوال میں یہود پر بار بار جو تباہیاں آئیں ان کی مکمل ذمہ داری خود یہود پر ڈالی گئی ہے۔ ان صفحات میں دوسری قوموں کے ظلم اور سازشوں پر ان کو برا بھلا نہیں کہا گیا ہے۔ بلکہ خود یہود کو نصیحت کی گئی ہے کہ یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوا ہے کہ تم نے اپنے خدا کو ناراض کر لیا ہے۔ یہ خداوندی تنبیہ ہے نہ کہ انسانی فساد۔ تم سارا اہتمام اپنے خدا کو خوش کرنے کے لئے کرو اور پھر تمہارا کھویا ہوا مقام تمھیں دوبارہ حاصل ہو جائے گا۔ گویا موجودہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا راز خدائی قانون میں تلاش کرنا چاہیے نہ کہ انسانی سازشوں میں۔

۲۔ زوال کے زمانہ میں "مجاہدانہ اقدام" سے مراحۃً روکا گیا ہے۔ ان کو تاکید کی گئی ہے کہ غالب قوم سے موافقت کر کے رہو۔ دوسروں سے ٹکرانے کے بجائے صرف اپنی تعمیر میں لگ جاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض حالات میں داخلی تعمیر کا نام جہاد ہوتا ہے نہ کہ خارجی اقدام کرنے کا۔

۳۔ تنزل کے دور میں یہود کے اندر ایسے شاعر اور خطیب پیدا ہوئے جو انھیں قومی عظمت کے ترانے سناتے اور بڑی بڑی امیدیں دلا کر انھیں اقدام پر اکساتے۔ بائبل کے الفاظ میں یہ لوگ فتنہ انگیز ہیں۔ وہ بظاہر فلاح کی باتیں کرتے ہیں مگر حقیقۃً وہ ایسے راستہ کی طرف بلاتے ہیں جس کا نتیجہ صرف ہلاکت ہو۔ ایسے لوگوں کو غلط قرار دیتے ہوئے بائبل میں تلقین کی گئی ہے کہ تم لوگ حقیقت پسندی کا طریقہ [illegible] اقتدار وقت سے ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے اپنی تعمیر و استحکام میں لگ جاؤ۔ "ستر برس [illegible] تو خدا تمہارے دن کو تمہارے لئے لوٹا دے گا۔

اخلاقی کمزوریوں کی حالت میں بڑے بڑے اقدام کی للکار بلند کرنا ایک ایسی غیر سنجیدہ حرکت ہے جس کی مثال کسی پیغمبر کے یہاں موجود نہیں۔ یہ جھوٹے قائدین کا طریقہ ہے نہ کہ سچے قائدین کا طریقہ۔

۴. قوم کے اندر کمزوری پیدا ہونے کے بعد جب خدا اس پر تنبیہات بھیجے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر رجوع الی اللہ اور تضرع (الانعام ۴۲) کی کیفیت پیدا ہو۔ ایسی حالت میں جو قائدین "ظالموں" کو نشانہ بنا کر ان کے خلاف یک طرفہ شکایت اور احتجاج کا ہنگامہ کھڑا کریں۔ وہ گویا خدا کی اسکیم میں خلل اندازی کر رہے ہیں۔ وہ لوگوں کی توجہ کو صحیح رخ سے ہٹا کر غلط رخ کی طرف موڑ دینے کے مجرم ہیں۔

جس واقعہ سے احتساب خویش کا جذبہ ابھارنا مقصود تھا اس کو وہ اس کے برعکس احتساب غیر کا جذبہ ابھارنے کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ جس واقعہ کا فائدہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ لوگوں کی توجہ خدا کی طرف مائل ہو اس واقعہ کو انسان کی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ جو قائدین ایسا کریں وہ حقیقۃً جرم کر رہے ہیں نہ کہ قوم کی رہنمائی۔

آزمودہ حل

رابرٹ ملتھوف (Robert Multhoff) کا ایک بہت بامعنی قول ہے۔ اس نے کہا کہ جو شخص تعمیم کو پسند کرتا ہے وہ عموماً جھوٹ بولتا ہے:

He who likes to generalize generally lies.

ایک تنہا واقعہ کو اگر آپ عمومی انداز میں بیان کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ استثناء کو عموم کی حیثیت دے رہے ہیں۔ ایک حادثہ جو کسی اتفاقی سبب سے پیش آیا ہے اس کو سماج کی عام حالت قرار دے رہے ہیں۔ ایسا آدمی ہمیشہ جھوٹ کی فضا میں رہتا ہے۔ وہ نہ کبھی سچائی کو پاتا اور نہ معاملہ کے سچے حل کو۔

ہمارے بہت سے اخبارات ہیں جن میں آپ کو اس قسم کی سرخیاں پڑھنے کو ملیں گی —— ہندستان میں فرقہ وارانہ فساد، علی گڑھ میں فرقہ وارانہ فساد، حیدر آباد میں فرقہ وارانہ فساد۔ اس قسم کی خبریں صحیح ہونے کے باوجود ہمیشہ غلط ہوتی ہیں۔ وہ آدھی سچائی ہوتی ہیں نہ کہ پوری سچائی۔ کیوں کہ کوئی فساد کبھی پورے ملک یا پورے شہر میں نہیں ہوتا۔ مگر ہمارے لکھنے اور بولنے والے ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جس سے بظاہر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ پورا ملک یا پورا شہر فرقہ وارانہ فساد کی زد میں آ گیا ہے۔

جب بھی کہیں فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو وہ نہ سارے ہندستان میں ہوتا اور نہ کسی پورے شہر میں۔ مثلاً اس قسم کے فساد تقریباً سب کے سب ہندستان کے شمالی حصہ میں ہوتے ہیں۔ ہندستان کا جنوبی حصہ ہمیشہ اس سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح مثلاً علی گڑھ میں فساد ہوا تو وہ پرانے شہر میں ہوا۔ سول لائن کے علاقہ میں کوئی فساد نہیں ہوا۔ اسی طرح حیدر آباد کا فساد قدیم حیدر آباد کے علاقہ میں ہوا۔ نیا حیدر آباد اس سے بچا رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا قسم کی خبریں ہمیشہ "جھوٹ" ہوتی ہیں۔ اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ ہمارے قائدین آج تک اس مسئلہ کا سچا حل دریافت نہ کر سکے۔ چونکہ اپنے ذہن کے مطابق وہ "پورے" ملک یا "پورے" شہر میں فساد فرض کئے ہوئے ہیں اس لئے ان کو وہ غیر فساد زدہ حصہ نظر نہیں آتا جہاں فساد نہ ہونے کے اسباب کی تحقیق کر کے وہ اس کے مطابق فساد زدہ حصہ کو فساد سے بچانے کی تدبیر کر سکیں۔

ایک ہی شہر کے ایک حصہ میں فساد ہو اور اسی شہر کے دوسرے حصہ میں فساد نہ ہو تو یقیناً

یہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ فرق کیسے واقع ہوا۔ اس فرق کا راز دریافت کرکے ایسا کیا جا سکتا ہے کہ محفوظ حصہ کے تجربہ کو غیر محفوظ حصہ میں دہرایا جائے۔ جس طرح ایک حصہ فساد سے بچا ہے اسی طرح دوسرے حصہ کو بھی فساد سے بچایا جائے۔

ہمارے تمام قائدین تعمیم (Generalization) کے جھوٹ میں مبتلا ہیں۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ وہ اس نازک مسئلہ کا سچا حل دریافت نہ کر سکے۔

تعمیم سے بچ کر خالص حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندستان دو ہندستان کا نام ہے۔ اسی طرح علی گڑھ بھی دو علی گڑھ ہے اور حیدرآباد بھی دو حیدرآباد۔ ایک ملک دو ملک کیسے بنا اور ایک شہر دو شہر کیوں کر ہوگیا۔ اسی سوال کے جواب میں یہ راز چھپا ہوا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کیسے ہوتے ہیں اور کس طرح ان کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

ایک مقام کے ایک حصہ میں فساد ہو اور عین اسی زمانہ میں اس مقام کا دوسرا حصہ فساد سے بچا رہے تو ہم کو چاہئے کہ فساد کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے فساد نہ ہونے والے حصہ کا مطالعہ کریں اور وہاں فساد نہ ہونے کے اسباب کو جان کر اسی کو اس دوسرے حصہ میں رائج کریں جہاں فساد ہوا ہے۔ موجودہ حالات میں یہی فساد کے مسئلہ کے مطالعہ کا فطری طریقہ ہے اور یہی اس مسئلہ کے حل کی آسان ترین تدبیر بھی۔

شمالی ہندستان اور جنوبی ہندستان میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ "دو قومی" سیاست سب سے زیادہ شمالی ہندستان میں چلائی گئی۔ جب کہ جنوبی ہندستان کا علاقہ اس قسم کی تفریقی سیاست سے بڑی حد تک محفوظ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شمالی ہندستان میں فرقہ وارانہ کش مکش کی فضا پائی جاتی ہے۔ جب کہ جنوبی ہندستان میں اس قسم کی فضا تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح علی گڑھ کے شہری علاقہ اور سول لائن کے علاقہ میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ شہری علاقہ میں جاہلوں کی اکثریت ہے اور سول لائن میں تمام کے تمام پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ قدیم حیدرآباد اور جدید حیدرآباد میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ جدید حیدرآباد میں سب کے سب خوش حال لوگ بستے ہیں اور قدیم حیدرآباد میں کثرت سے غریب لوگ آباد ہیں۔

اس مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کس قسم کے حالات میں فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے اور کس قسم کے حالات میں وہ نہیں ہوتا۔ اب فسادات کو ختم کرنے کی آزمودہ تدبیر یہ ہے کہ شمالی ہند میں جنوبی ہند کے مانند حالات پیدا کئے جائیں۔ مسلمان اپنی طرف سے ان تمام اسباب کو ختم کر دیں جو دونوں فرقوں میں کش مکش اور تناؤ کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً حقوق کے مطالبے، احتجاجی سیاست اور مسجد اور مندر

کے جھگڑے کھڑے کرنا وغیرہ۔ اسی طرح یہ کیا جائے کہ "قدیم شہر" میں "جدید شہر" کے حالات پیدا کئے جائیں۔ یعنی اقلیتی فرقہ کے افراد کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ ان کی اقتصادیات کو بہتر بنانے کی کوششیں کی جائیں۔ انھیں چیزوں نے ملک کے ایک حصہ میں فساد کو روک رکھا ہے اور یہی چیزیں ملک کے دوسرے حصہ میں بھی فساد کو روک سکتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کو ختم کرنے کے لئے ہمیں کوئی نیا حل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اسی آزمودہ تدبیر کو فساد زدہ علاقہ میں بھی استعمال کریں جو غیر فساد زدہ علاقہ میں آج بھی فرقہ وارانہ فساد کے خلاف ڈاٹ بنی ہوئی ہے۔

ایک مثال

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ فساد کے مسئلہ کا مذکورہ حل ہر شخص کو معلوم ہے۔ حتی کہ ہر شخص اس وقت اسی طریقہ پر عمل کرتا ہے جب کہ اس کا اپنا مفاد خطرہ میں پڑ گیا ہو۔ مگر وہی شخص جب ملت کے اسٹیج پر آتا ہے تو اس طرح پرجوش تقریر شروع کر دیتا ہے جیسے کہ ٹکراؤ اور مقابلہ کے سوا مسائل کا کوئی حل ہی نہیں۔

اس تضاد کی سادہ سی وجہ سستی قیادت کی تلاش ہے۔ زوال یافتہ قوم میں عمل کی طاقت نہیں ہوتی۔ وہ بڑے بڑے الفاظ بول کر اس کے پردہ میں اپنی بے عملی کو چھپاتے ہیں۔ ایسی قوم کے اندر قیادت اور مقبولیت حاصل کرنے کا سب سے آسان راز یہ ہوتا ہے کہ شاندار الفاظ بولے جائیں۔ شاعری اور خطابت کا دریا بہایا جائے۔ چنانچہ ہمارے تمام قائدین اسی قسم کے نمائشی الفاظ بولنے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ صرف سطحیت ہے اور سطحی قیادت ہمیشہ قوم کے لئے بہت مہنگی پڑتی ہے۔ کسی نے بالکل درست کہا ہے:

The cheaper the politician, the more he costs his country.

یہاں میں ایک مثال دوں گا۔ ہندستان کا ایک بین اقوامی شہرت رکھنے والا اسلامی ادارہ ہے۔ اس ادارہ کے ذمہ داروں نے ہندستان کی سیاست میں بزعم خود ایک قائدانہ رول ادا کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کے مسئلہ کا یہ حل پیش کیا کہ وہ خطرہ مول لینے کی بہادری دکھائیں۔ اور اپنے حریف کو نقصان پہنچا کر اپنے لئے زندگی کا حق وصول کریں۔ انھوں نے کہا کہ قوموں کو کبھی یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ دوسروں کو سبق سکھانے کے لئے اپنی اہلیت ضرر کا ثبوت دیں۔ ہندستان کے مسلمانوں کو یہی کرنا ہے۔ مسلمان جب تک یہ نہ دکھائیں کہ وہ نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں اس وقت تک ملک میں ان کے لئے باعزت زندگی کا حق تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

اس نقصان رسانی کا طریقہ یہ بتایا گیا کہ ملک کے انتخابات (۱۹۶۷) میں اپوزیشن پارٹیوں کے

[illegible]
اور ۶۷-۶۶ ۱۹ میں مذکورہ اسلامی ادارہ ہندستان کی مسلم سیاست کا مرکز بن گیا۔

یہ مذکورہ اسلامی ادارہ کا وہ حل تھا جو اس نے ملت کے مسائل کے لیے پیش کیا تھا مگر اسی ادارہ میں اس کا اپنا مسئلہ پیدا ہوا تو اس کے لیے اس نے بالکل مختلف انداز اختیار کیا۔ ملت کے مسئلہ کا حل ضرر رسانی میں تھا اور اپنے مسئلہ کا حل تالیف قلب میں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ عظیم اسلامی ادارہ ہندستان کے جس شہر میں واقع ہے وہیں ایک بڑی یونی ورسٹی بھی قائم ہے۔ یہ یونیورسٹی ادارہ سے اس قدر قریب ہے کہ اس کا ایک ہوسٹل مذکورہ ادارے کی دیوار سے ملا ہوا ہے۔

یہ پڑوس اس اسلامی ادارہ کے لیے ایک مستقل مسئلہ تھا۔ یونی ورسٹی ہاسٹل کے لڑکے جو سب کے سب غیر مسلم تھے، مستقل طور پر اسلامی ادارہ کے لوگوں کو پریشان کرتے، وہ گالی دیتے، پتھر پھینکتے، مذاق اڑاتے اور طرح طرح کی دوسری حرکتیں کرتے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامی ادارہ کے لوگ مشتعل ہو کر جوابی کارروائی کریں تاکہ انھیں ادارہ کو جلانے اور پھونکنے کا موقع مل جائے۔

یہ صورت حال کئی سال تک باقی رہی۔ اس درمیان میں حکومت کے ذمہ داروں سے شکایات کی گئیں۔ پولیس بلائی گئی، مگر کسی طرح مسئلہ حل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد درس گاہ کے ذمہ داروں نے ایک حکیمانہ تدبیر اختیار کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسئلہ حل ہو گیا۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ادارہ کے ذمہ داروں نے پتہ لگایا کہ یونیورسٹی ہاسٹل کے لیڈر طلبہ کون ہیں۔ ان سے ملاقات کر کے انھیں اپنے یہاں چائے پر بلایا گیا۔ ان سے نرم باتیں کی گئیں۔ ان کو تحفے پیش کیے گئے اور پھر یہ تجویز رکھی گئی کہ یونیورسٹی کے طلبہ اور ادارہ کے نوجوانوں کے درمیان ہاکی میچ ہو۔ تجویز منظور ہو گئی۔

اب اسلامی ادارہ کے ذمہ داروں نے یہ کیا کہ ادارہ کے ہوشیار کھلاڑیوں کی ایک ٹیم بنائی۔ ان کو پیشگی طور پر یہ سمجھا دیا کہ تم کو یہ میچ جیتنے کے لیے نہیں کھیلنا ہے بلکہ اس لیے کھیلنا ہے کہ تم ہار جاؤ۔ منصوبہ یہ تھا کہ بالقصد یونی ورسٹی کے طلبہ کو کھیل میں جتایا جائے تاکہ انھیں ہیرو بنانے اور ان کی تالیف قلب کرنے کا پورا موقع ملے۔

مقررہ تاریخ کو دونوں کے درمیان میچ ہوا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اسلامی ادارہ کے نوجوان طلبہ کھیل کھیلے اور یونی ورسٹی ہاسٹل کے لڑکوں کو موقع دیا کہ وہ بہتر کھیل کھیل کر میچ جیتیں۔ چنانچہ

بھی ہوا اور یونیورسٹی کے طلبہ " شاندار طور پر " کامیاب ہو گئے۔ اب پیشگی منصوبہ کے مطابق ان کو خوب اچھالا گیا۔ مختلف طریقوں سے ان کی تالیف قلب کی گئی۔ ان کو دل کھول کر انعامات دئے گئے۔ ان کا پُر جوش استقبال کیا گیا۔ وغیرہ

یونیورسٹی ہاسٹل کے طلبہ اپنی برتری چاہتے تھے۔ اسلامی ادارہ کے لوگوں نے اپنے مذکورہ عمل سے ان کے جذبات برتری کو پوری طرح تسکین دے دی۔ اب مسئلہ اپنے آپ حل تھا۔ یونی ورسٹی کے طلبہ نے اس کے بعد کبھی اسلامی ادارہ کے لوگوں کو پریشان نہیں کیا۔

مذکورہ واقعہ اپنی نوعیت کی ایک شاندار مثال ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو لوگ اپنے ذاتی معاملہ میں تالیف قلب کے اصول پر مسئلہ کو حل کرتے ہیں وہ ملت کے معاملہ میں اس کے برعکس تقریریں کیوں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذاتی مسئلہ کو وہ حل کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور ملت کے مسئلہ کو قیادت کے نقطۂ نظر سے۔ ملت کے معاملہ میں اگر وہ اس اصول کی تلقین کریں تو ان کی قیادت اور مقبولیت اچانک ختم ہو جائے۔ ملت کے معاملہ میں اس تدبیر کو صرف قیادت کی قیمت پر پیش کیا جا سکتا ہے اور بدقسمتی سے ہمارے قائدین میں کوئی یہ حوصلہ دکھانے کے لئے تیار نہیں۔

تاہم یہ یقینی ہے کہ اس مسئلہ کا دوسرا کوئی حل نہیں۔ اپنے ذاتی معاملہ میں آپ جس حکیمانہ تدبیر پر عمل کرتے ہیں اسی کو ملت کے معاملہ میں بھی اختیار کیجئے۔ اور اس کے بعد ملک میں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوگا۔

حال میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک ایسے مقام سے آئے تھے جہاں ہولناک فساد ہوا تھا۔ اور تین دن کے اندر مسلمانوں کا کروروں روپیہ کا نقصان ہو گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں اس شہر میں پچھلے ۳۰ سال سے رہ رہا ہوں۔ مگر وہاں آج تک ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا جیسا اس بار تین دن کے اندر ہو گیا۔ اس کے بعد حسب معمول وہ ایک خاص فرقہ کو برا بھلا کہنے لگے۔

میں نے کہا کہ آپ کے شہر میں تین دن کے اندر جو فساد ہوا اس کے بارہ میں تو آپ بہت کچھ سوچتے ہیں مگر یہ بھی تو سوچئے کہ اس سے پہلے ۳۰ سال تک فساد نہیں ہوا تو کیوں نہیں ہوا۔ کیا تین دن کے واقعہ میں آپ کے لئے سبق ہے اور ۳۰ سال کے واقعہ میں آپ کے لئے کوئی سبق نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ یہ کسی خاص فرقہ کی بات نہیں بلکہ ہر شخص اور ہر فرقہ کی بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر ایک شیطان سویا ہوا ہے جس کا نام " غصہ " ہے۔ غصہ کے شیطان کو جب تک آپ سویا رہنے دیں آپ امن وامان کے ساتھ رہیں گے۔ مگر جب آپ کوئی نادانی کرکے اس شیطان کو جگا دیں تو پھر وہ اپنے

مقابل کو نقصان پہنچانے کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالنا چاہتا ہے جو اس کے بس میں ہے۔ یہ واقعہ آپ مسلم اور مسلم کے درمیان بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور مسلم اور غیر مسلم کے درمیان بھی۔

ایک لفظ میں یہی تمام فسادات کی جڑ ہے۔ فساد ہمیشہ غصہ اور انتقام کے جذبہ کے تحت پیدا ہوتا ہے کوئی بھی شخص خدا نے ایسا پیدا نہیں کیا جس کی عام حالت غصہ اور انتقام کی ہو۔ یعنی وہ ہر وقت بس غصہ اور انتقام سے بھرا رہتا ہو۔ غصہ اور انتقام وقتی کیفیات کا نتیجہ ہیں نہ کہ مستقل کیفیات کا نتیجہ۔ اگر یہی آدمی کی عام اور معمولی کیفیت ہوتی تو ہر وقت فساد ہوتا رہتا اور کبھی ایک دن کے لئے بھی امن و امان نظر نہ آتا۔ کجا کہ ۴۰ سال تک فساد نہ ہو۔

جاہلوں کی جہالت سے اعراض کرنے کا حکم جو اسلام میں دیا گیا ہے اس کی مصلحت یہی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر ایسے موقع کو ٹالا جائے۔ "اعراض" کا اسلامی اصول ہر قسم کے فساد سے بچنے کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔ مگر اس تدبیر کو اختیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنی سرکشی کو ختم کر کے اپنے آپ کو خدا کی مرضی کا پابند بنائے۔ ورنہ وہ اپنی سرکشی کے تحت دوسروں کے انا کو جگا کر فساد کروائے گا۔ اور جب فساد ہو چکا ہوگا تو خود معصوم بن کر دوسروں کو برا بھلا کہنا شروع کر دے گا۔

داعی اور مدعو

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں پر خدا کی طرف سے جو عذاب آتا ہے وہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک عذاب مستاصل۔ دوسرے عذاب تنبیہی۔ عذاب مستاصل یعنی قوموں کو بالکل برباد کر دینے والا عذاب زلزلہ اور طوفان کے ذریعہ آتا ہے (العنکبوت ۴۰) اور عذاب تنبیہی عام طور پر بندوں کے ذریعہ یعنی ایک قوم کو دوسری قوم پر چڑھا دینا اور اس طرح انسانوں کے ہاتھوں انہیں سزا دلانا (بنی اسرائیل ۵)

قدیم زمانہ میں یہود پر جو عذاب آتے ان کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ یہ سب کے سب اس طرح آئے تھے کہ کوئی سرکش قوم یا کوئی ظالم حکمراں یہود کے اوپر مسلط ہو گیا۔ اور وہ ان کی آبادیوں کو اور ان کے مقدس مقامات کو برباد کرتا رہا۔

تنبیہی سزا

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ جو صورت حال پیش آ رہی ہے وہ اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ یقینی طور پر تنبیہی عذاب ہے۔ مگر چوں کہ بظاہر وہ انسانوں کے ذریعہ ہوتا ہوا نظر آتا ہے، اس لئے مسلمان اس کو کسی قوم یا کسی حکمراں کی طرف منسوب کرکے اس کو انسانی ظلم کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ جو واقعہ خدا کی طرف سے پیش آ رہا ہے اس کو انسانی واقعہ ثابت کرنے میں مشغول ہیں۔

یہ طرز فکر نہ صرف غلط ہے بلکہ وہ مسئلہ کو حل کرنے میں مزید رکاوٹ ہے۔ اس کی وجہ سے تمام مسلم قائدین کی ساری توجہ "ظالموں" کے خلاف چیخ پکار میں لگی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ان کا سبب خدائی فریضہ سے غفلت میں ہے تو خدائی فریضہ کی ادائیگی ہی سے ان کا خاتمہ ہوگا نہ کہ مفروضہ ظالموں کے خلاف شور وغل کرنے سے۔

مسلمانوں کا مسئلہ اس وقت ساری دنیا میں صرف ایک ہے ——— ان کو ان کی مدعو اقوام کے ہاتھوں ستایا جا رہا ہے۔ گویا کہ وہ زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ تم ہماری آخرت کو برباد کر رہے ہو تو ہم تمہاری دنیا کو برباد کریں گے۔ یہ یقینی طور پر مسلمانوں کی دعوتی غفلت کے نتیجہ میں ہو رہا ہے۔ دوبارہ اس صورت حال کا خاتمہ صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمان اپنی دعوتی غفلت کو ختم کریں۔ وہ اقوام عالم کے سامنے خدا کے دین کے داعی بن کر کھڑے ہوں۔ جب تک وہ ایسا نہ کریں گے کوئی بھی دوسری

تدبیر ان کے مسائل کو حل کرنے والی ثابت نہیں ہو سکتی۔

دعوت سے حفاظت

خدا نے جو رسول بھیجے سب اس لئے بھیجے کہ وہ لوگوں کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے اچھی طرح آگاہ کر دیں۔ تاکہ قیامت میں کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ ہم کو اس کی خبر نہ تھی (النساء ۱۶۵) یہی دعوت الی اللہ یا شہادت حق پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کا مشن تھا۔ اور ختم نبوت کے بعد یہی وہ خاص مشن ہے جس کے لئے امت محمدی قیامت تک کے لئے مامور ہے (الحج ۷۸)

کسی بھی شخص یا گروہ کی جو اصل حیثیت ہو وہی وہ چیز ہے جس سے اس کی قسمت وابستہ ہوتی ہے۔ قرآن میں واضح لفظوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے (اور آپ کی تبعیت میں آپ کی امت سے) کہا گیا ہے کہ لوگوں کے مقابلہ میں تمہاری حفاظت کا سارا معاملہ اسی عمل دعوت کی ادائگی سے وابستہ ہے:

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته واللہ یعصمك من الناس (المائدۃ ۶۷)	اے رسول، جو تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اسے پہنچادو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔

حافظ ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: ای بلغ انت رسالتی وانا حافظك وناصرك ومویدك علی اعدائك ومظفرك علیھم فلا تخف ولا تحزن فلن یصل احد منھم الیك بسوء یؤذیك۔ (یعنی تم میرے پیغام کو پہنچاؤ اور میں تمہارا محافظ ہوں اور تمہارا مدد کرنے والا ہوں اور تمہارے دشمنوں کے مقابلہ میں تمہاری تائید کرنے والا ہوں اور ان پر فتح دلانے والا ہوں۔ تم نہ ڈرو اور نہ اندیشہ کرو۔ ان میں سے کوئی شخص تم تک نہیں پہنچ سکتا کہ وہ تم کو تکلیف دے۔

اس آیت کے مطابق اللہ کے نزدیک اہل ایمان کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ وہ دنیا کی قوموں تک خدا کا بے آمیز پیغام پہنچانے کا کام کر رہے ہوں۔ اگر وہ ایسا کریں تو اللہ کی طرف سے اہل ایمان کے لئے یہ وعدہ ہے کہ وہ ان کو مخالفین کے ظلم وستم کا شکار نہیں ہونے دے گا۔ تبلیغ ما انزل اللہ کا کام ان کے لئے عصمت من الناس کی ضمانت بن جائے گا۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دعوت حق کو چھوڑنے کے بعد وہ خدا کی نظر میں بے قیمت ہو جائیں گے اہل ایمان اگر کسی وقت دیگر اقوام کے ظلم وستم کا شکار ہونے لگیں تو اس کی براہ راست وجہ یہ ہوگی کہ خدا کی حفاظت ان سے اٹھ گئی ہے۔ اور حفاظت کے اٹھنے کا سبب یقینی طور پر یہ ہوگا کہ انھوں نے دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑ دیا ہے۔

یہ صورت حال آج نہ صرف ہندستان کے مسلمانوں پر بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں پر صادق آتی ہے۔ آج ساری دنیا کے مسلمان دوسری قوموں کے ظلم اور لوٹ کا نشانہ بن رہے ہیں۔ یہ واقعہ کہیں براہ راست ہورہا ہے اور کہیں بالواسطہ۔ کہیں ان کے دشمن ان کو خود اپنی طاقت کا مزہ چکھا رہے ہیں۔ اور کہیں انھوں نے مسلمانوں کو دو طبقوں میں بانٹ دیا ہے۔ اور پھر ایک کے مقابلہ میں دوسرے کو مدد دے کر دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر وہ وقت آگیا ہے جس کی پیشین گوئی ابو داؤد کی ایک روایت ان الفاظ میں کی گئی تھی؛

عن ثوبان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوشک الامم ان تداعی علیکم کما تداعی الاکلۃ الی قصعتھا۔ فقال قائل ومن قلۃ نحن یومئذ۔ قال انتم کثیر ولکنکم غثاء کغثاء السیل۔ ولینزعن اللہ من صدور عدوکم المھابۃ منکم و لیقذفن فی قلوبکم الوھن۔ قال قائل یا رسول اللہ وما الوھن قال حب الدنیا وکراھیۃ الموت،
(مشکوٰۃ المصابیح۔ باب تغیر الناس)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ وقت آنے والا ہے کہ قومیں تمہارے اوپر ٹوٹ پڑیں جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالہ پر ٹوٹتے ہیں۔ کسی نے کہا کیا اس وقت ہم تھوڑے ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ تم بہت زیادہ ہوگے مگر اس وقت تم سیلاب کے جھاگ کی مانند ہوگے۔ اللہ تمہارے دشمنوں کے سینہ سے تمہارا ڈر نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں وہن (کمزوری) ڈال دے گا۔ پوچھنے والے نے پوچھا کہ وہن کیا ہے۔ آپ نے فرمایا دنیا کی محبت اور موت کو ناپسند کرنا۔

دعوتی غفلت

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا دوسری قوموں کا تختۂ مشق بننا اتنا زیادہ ثابت شدہ ہے کہ اس کے بارے میں دو رائے ممکن نہیں۔ البتہ اس کے سبب کے بارہ میں مسلمانوں کی دو رائیں ہیں۔ ان کی بڑی تعداد ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ یہ سب کچھ صرف دوسری قوموں کا ظلم ہے۔ چنانچہ ان کے زبان وقلم ظالموں کے خلاف احتجاج اور شکایت میں مشغول ہیں۔ مگر اس قسم کی توجیہ قرآن کی تردید کے ہم معنی ہے۔ قرآن کے نظریۂ تاریخ کو رد کرنے کے بعد ہی ایسی توجیہ کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کو مانتے ہوئے اس کو قبول کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ صورت حال دیگر قوموں کا ظلم نہیں، وہ دیگر قوموں کے ہاتھوں خدا کی سزا ہے۔ یہ سزا (یا تنبیہ) اس وقت تک جاری رہے گی جب تک مسلمان اپنے اصل منصبی فریضہ (دعوت

الی اللہ کے لئے نہ اٹھیں۔

موجودہ زمانہ میں دعوت الی اللہ کے کام کو مسلمانوں نے بالکل چھوڑ رکھا ہے۔ حتی کہ آج شاید دنیا بھر میں چند آدمی بھی نہیں جن کو دعوت الی اللہ کی اہمیت کا واضح شعور حاصل ہو۔ ان کی بڑی تعداد کا یہ حال ہے کہ یا تو وہ دعوتی کام کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ یا وہ خود جس قومی یا تہذیبی احیار کے لئے سرگرم ہیں اسی کو انھوں نے اسلامی دعوت کا نام دے دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آج بھی بہت سے خدا کے بندے اپنے آپ کو اسلام کے سایہ رحمت میں داخل کر رہے ہیں۔ مگر اس میں مسلمانوں کی دعوتی کوشش کا کوئی دخل نہیں۔ یہ وہ سعید روحیں ہیں جن کو خدا کے فضل خاص سے قبول حق کی توفیق ملی۔ انھوں نے بطور خود صراط مستقیم کو پالیا نہ کہ مسلمانوں کی کوشش سے۔

اس دعوتی غفلت کے ساتھ دوسرا سنگین جرم یہ ہے کہ مسلمان ساری دنیا میں اپنی مدعو اقوام سے سیاسی اور مادی لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح انھوں نے مدعو کو حریف اور رقیب بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔ یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا ناقابل معافی جرم ہے۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ دوبارہ خدا کی رحمت ان کی طرف متوجہ ہو تو انھیں یک طرفہ طور پر وہ تمام جھگڑے ختم کرنے ہوں گے جنھوں نے مدعو اقوام کو حریف اقوام میں تبدیل کر دیا ہے۔ دوسری قوموں سے حریف اور رقیب کا رشتہ ختم کرکے اپنے اور ان کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال کرنا اس سلسلہ کا پہلا قدم ہے۔ اس کے بغیر امت مسلمہ کے لئے کسی حقیقی مستقبل کی تعمیر ممکن نہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے سب سے بڑی چیز جو کھوئی گئی ہے وہ دعوتی ذہن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اس کو بالکل بھول گئے ہیں کہ غیر مسلم اقوام ہماری مدعو ہیں اور ہم ان کے داعی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ بربادی کے جو واقعات پیش آرہے ہیں وہ سب اسی غفلت کی قیمت ہیں۔ یہ واقعات اس وقت تک جاری رہیں گے جب تک مسلمان اپنی اس کوتاہی کو جاری رکھیں۔ دعوتی کوتاہی اور ملی ترقی دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

نفسیاتی پہلو

فلیویس جوزفس کوک (Flavius Josephus Cook) کا قول ہے کہ خدا تجارت کو اپنا مبلغ بناتا ہے:

God is making commerce his missionary

یہ اس نفسیات کا نہایت صحیح اظہار ہے جو ایک داعی کے اندر اپنے مدعو کے لئے پیدا ہوتی

ہے۔ داعی کے اندر اپنے مدعو کے لئے وہی احساسات پیدا ہوتے ہیں جو ایک تاجر کے اندر اپنے خریدار کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تاجر کی نفسیات تجارتی مفاد کے لئے ہوتی ہے اور داعی کی نفسیات دعوتی مفاد کے لئے۔

داعی اگر واقعۃً داعی ہو، وہ قومی وکیل یا مذہبی مناظر نہ ہو تو بالکل فطری طور پر اس کے اندر اپنے مدعو کے لئے محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے اندر یہ مزاج پرورش پاتا ہے کہ وہ اس سے حکمت اور صبر کے ساتھ معاملہ کرے ویسے ہی جیسے ایک دانش مند تاجر اپنے گاہک سے معاملہ کرنے میں ضروری سمجھتا ہے کہ وہ کسی حال میں حکمت اور صبر کا طریقہ نہ چھوڑے۔ تاجر کا رویہ اپنے گاہک کے حق میں گاہک کے رویہ کے ردعمل کے طور پر نہیں بنتا۔ بلکہ خود اپنے سوچے سمجھے ہوئے فکر کے تحت بنتا ہے۔ وہ یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو حسن سلوک کا پابند بناتا ہے، خواہ گاہک اس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے یا نہ کرے۔ ٹھیک یہی طریقہ داعی کا بھی اپنے مدعو کے حق میں ہوتا ہے۔

مسلمان اگر دوسری قوموں کو اپنا مدعو سمجھیں تو اس کے بالکل لازمی نتیجہ کے طور پر یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو دوسری قوموں کے حق میں " ناصح اور امین " سمجھیں گے۔ ان کے دل میں دوسری قوموں کے لئے خیر خواہی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ وہ ان کی طرف سے پیش آنے والی تلخیوں کو بخوشی برداشت کریں گے۔ وہ یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھیں گے کہ ان کی اشتعال انگیز حرکات کو نظر انداز کریں تاکہ دعوت کی فضا برباد نہ ہونے پائے۔

دوسری اقوام کو اپنا مدعو سمجھنے کے بعد ان کی نسبت سے مسلمانوں کے اندر وہی نفسیات پیدا ہوگی جو ایک دانش مند تاجر کے اندر اپنے خریدار کے لئے پیدا ہوتی ہے۔ مسلمان ان کے حق میں دعائیں کریں گے۔ وہ ان کی تالیف قلب کے لئے کوشاں ہوں گے۔ وہ ان کی ہدایت کے حریص بن جائیں گے جس طرح پیغمبر اپنے مدعو کے ایمان کے لئے حریص تھا۔ ان کے اندر اشتعال کے بجائے برداشت کا مادہ پیدا ہوگا۔ اس نفسیات اور کردار کا ثبوت دینے کے بعد ان کے حق میں وہ شاندار نتیجہ برآمد ہوگا جس کی قرآن میں خوش خبری دی گئی ہے۔

دشمن دوست بن جاتا ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ (حم سجدہ) کی تین آیتیں اس معاملہ میں رہنما حیثیت رکھتی ہیں۔ ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں ہو سکتی۔ جواب وہ دو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر یکایک

تجھ میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے کوئی قریبی دوست۔ اور یہ بات انھیں کو ملتی ہے جو صبر والے ہیں اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جس کی بڑی قسمت ہے۔ اور اگر تجھ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آئے تو اللہ کی پناہ پکڑو۔ بے شک وہ سننے والا ، جاننے والا ہے (حم سجدہ ۳۶ - ۳۴)

ان آیات کی تشریح میں دو تفسیروں کا اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے :

(ولا تستوی الحسنة ولا السيئة) ای فرق عظيم بين هذه وهذه (ادفع بالتی هی احسن) ای من اساء اليك فادفعه عنك بالاحسان اليه كما قال عمر رضی الله عنه: ما عاقبت من عصی الله فيك بمثل ان تطيع الله فيه (فاذا الذی بينك وبينه عداوة كانه ولی حميم) وهو الصديق ای اذا احسنت الی من اساء اليك قادته الحسنة اليه الی مصافاتك ومحبتك والحنو عليك حتی يصير (كانه ولی حميم) ای قريب اليك من الشفقة عليك والاحسان اليك (وما يلقاها الا الذين صبروا) ای وما يقبل هذه الوصية ويعمل بها الا من صبر علی ذالك فانه يشق علی النفوس - وما يلقاها الا ذو حظ عظيم) ای ذو نصيب وافر من السعادة فی الدنيا والاخرة - قال ابن عباس فی تفسير هذه الآية: امر الله المؤمنين بالصبر عند الغضب والحلم عند الجهل والعفو عند الاساءة - فاذا فعلوا ذالك عصمهم الله من الشيطان وخضع لهم عدوهم كانه ولی حميم -

مختصر تفسیر ابن کثیر جلد ۳، صفحہ ۲۶۴

قال ابن عباس : ادفع بحلمك جهل من يجهل

اور حسنہ اور سیئہ برابر نہیں ہو سکتے، یعنی اس کے اور اُس کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ احسن طریقے دفع کرو، یعنی جو شخص تمہارے ساتھ برا سلوک کرے اس کے ساتھ اچھا سلوک کر کے تم اس کا جواب دو ، جیسا کہ حضرت عمر فاروق نے فرمایا : جو شخص تمہارے ساتھ خدا کی نافرمانی کرے اس کا سب سے اچھا بدلہ یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ اللہ کی اطاعت کرو۔ پھر تمہارے ساتھ جس کی عداوت ہے وہ قریبی دوست کی طرح ہو جائے گا، یعنی جب تم ایسا کرو گے کہ برا سلوک کرنے والے کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو گے تو تمہاری اچھائی اس کے اندر محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرے گی۔ یہاں تک کہ وہ تمہارا دوست اور تمہارا مہربان بن جائے گا۔ اور اس کو صرف نصیبہ والے پاتے ہیں، یعنی جو دنیا اور آخرت میں بڑے خوش قسمت ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ غصہ کے وقت صبر کریں، جہالت کے وقت برداشت کریں، اور برائی کے وقت معاف کر دیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان سے بچا لے گا اور ان کے دشمن کو پست کر کے ان کا دوست بنا دے گا۔

عبداللہ ابن عباس نے فرمایا کہ جو شخص تمہارے ساتھ

علیك (تفسیر القرطبی)

جہالت کرے اس کے جہل کا مقابلہ تم برداشت سے کرو۔

(واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ) ای وان وسوس الیك الشیطان بترك ما امرت بہ من الدفع بالتی ھی احسن واراد ان یحملك علی البطش والانتقام فاستعذ باللہ من کیدہ وشرہ (انہ ھوالسمیع العلیم) ای ھوالسمیع لاقوال العباد، العلیم بافعالھم واحوالھم

اورجب شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ سے پناہ مانگو، یعنی احسن طریقہ سے دفع کرنے کا حکم جو تمہیں دیا گیا ہے، اگر شیطان تمہیں اس کو چھوڑنے کے لئے ابھارے اور تم کو اکسائے کہ پکڑو اور انتقام لو تو شیطان کے دھوکے اور شر سے اللہ کی پناہ مانگو۔ اللہ یقیناً بندوں کے کلام کو سنتا ہے اور وہ ان کے اعمال سے باخبر ہے۔

صفوۃ التفاسیر، جلد ثالث، صفحہ ۱۲۳

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ دوسری قوموں کی طرف سے جو کچھ پیش آرہا ہے۔ اس کی وجہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ مسلمانوں نے برداشت کو کھو دیا ہے۔ یہ دراصل اپنی بے صبری کی قیمت ہے جس کو آج مسلمان بھگت رہے ہیں۔ صبر اور برداشت کھونے کا سبب یہ ہے کہ داعیانہ مقصد ان کے سامنے نہیں رہا۔ مسلمانوں کو اگر دوبارہ اٹھانا ہے تو ان کو اس کے لئے تیار کرنا ہوگا کہ وہ دعوت کو اپنا مقصد حیات بنائیں۔ اس کے بعد ہی ان کے اندر وہ محرک پیدا ہوگا جو آدمی کو بلند حوصلہ اور بلند کردار بناتا ہے۔ اور جو قوم بلند حوصلہ اور بلند کردار ہو اس کو کوئی بھی چیز شکست نہیں دے سکتی۔

مسلمانوں کو اگر داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھایا جائے تو ان کے اندر اپنے آپ حکمت اور صبر کی وہ صفات پیدا ہو جائیں گی جو گویا ہر قسم کے فساد کی قاتل ہیں۔ دعوت الی اللہ کے لئے اٹھنا اپنے آپ کو آخرت کی پکڑ سے بچانا ہے، اور اس کے ساتھ دنیا کی پکڑ سے بچانا بھی۔

'Introduction to Islam' Series

1. The Way to Find God
2. The Teachings of Islam
3. The Good Life
4. The Garden of Paradise
5. The Fire of Hell

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. The first pamphlet shows that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet is an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of Paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to Hell-fire.

Price per set: Rs 24.00

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi 110013

Regd. R.N. No. 28822/76 Issue No 94

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	[illegible]
پیغمبرِ انقلاب	25/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدیدِ دین	
اسلام دینِ فطرت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیاتِ اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحادِ ملت	3/-

سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
آخری سفر	3/-
حقیقتِ حج	2/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	3/-
نارِ جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

دوسروں سے نہ لڑنے کے لئے
اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے

اکتوبر ۱۹۸۴ء

شمارہ ۹۵

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان
اردو، انگریزی میں شائع ہوتا ہے

اکتوبر ۱۹۸۴ء ▫ شمارہ ۹۵

فہرست

کن نیکوں	۳
کیسا عجیب	۴
غلط فہمی	۵
عقیدۂ خدا	۶
تحقیق کیجئے	۷
توحید اور شرک	۸
فیصلہ خداوندی	۹
عقلمند کون	۱۰
دو سو سال	۱۱
روایتی ذہن	۱۲
دشمنی کے وقت بھی	۱۳
کینہ پن	۱۴
موقع ڈھونڈیے	۱۵
نظریۂ ارتقاء	۱۸
کردار کا معاملہ	۱۹
فہم قرآن	۲۱
علم اور تقویٰ	۲۲
صرف الفاظ	۲۳
فطرت کا اعتراف	۲۴
نفاذ شریعت	۲۶
حق کی دعوت	۲۸
قومی عظمت	۲۹
آرزوؤں کی دنیا	۳۱
محبت کا نذرانہ	۳۲
غلط ذہن	۳۳
ایک سفر	۳۴
خبر نامہ	۴۷

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے:	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی 'AL-RISALA MONTHLY' لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی ۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
فون نمبر ۶۱۱۱۲۸

خدا کا وجود

خدا کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت انسان کا خود اپنا وجود ہے۔ خدا جیسی ہستی کو ماننا جتنا مستبعد ہے اتنا ہی مستبعد یہ بھی ہے کہ انسان جیسی ہستی کو مانا جائے۔ اگر ہم ایک انسان کو مانتے ہیں تو ایک خدا کو ماننے میں بھی ہمارے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہونا چاہئے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی (الحجر ۲۹) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کی صفات کا ایک بشری نمونہ ہے۔ وجود، زندگی، علم، قدرت، ارادہ، اختیار اور دوسری صفات کمال جن کا حقیقی مظہر صرف خدا کی ذات ہے۔ ان کا ایک عکس (نہ کہ حصہ) انسان کو ودیعت کیا گیا ہے۔ انسان کسی بھی اعتبار سے خدا کا جزء نہیں مگر وہ اپنی ذات میں اس خدا کی محسوس دلیل ہے جس کو غیبی طور پر ماننے کا اس سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

انسان کے اندر وہ ساری خصوصیات شہود کے درجہ میں موجود ہیں جن خصوصیات کے ساتھ ایک خدا کو غیب کے درجہ میں ماننے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

انسان کا ایک مستقل وجود ہے۔ وہ دیکھنے اور سننے اور بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے اور منصوبہ بناتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی ارادہ کے تحت حرکت کرتا ہے۔ وہ مادہ کو تمدن میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ ریموٹ کنٹرول سسٹم کے ذریعہ خلائی مشین کو چلاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کا شعور رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ "میں ہوں" —— انھیں صفات کی کامل ہستی کا نام خدا ہے۔

انسان اور خدا میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ انسان کا وجود غیر حقیقی ہے اور خدا کا وجود حقیقی۔ یہ مخلوق ہے اور وہ خالق۔ یہ محدود ہے اور وہ لامحدود۔ یہ بے اختیار ہے اور وہ بااختیار۔ یہ فانی ہے اور وہ غیر فانی۔ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ عطیہ ہے جب کہ خدا کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کا ذاتی ہے، وہ کسی دوسرے کا دیا ہوا نہیں۔

انسان کو ماننا بلاتشبیہ "چھوٹے خدا" کو ماننا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے وہ "بڑے خدا" کو نہ مانے۔ ہر شخص جو خدا کو نہیں مانتا وہ یقیناً اپنا اقرار کرتا ہے۔ وہ انسانی وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ جو شخص انسان کو مان رہا ہو اس کے لئے خدا کو نہ ماننے کی کوئی دلیل نہیں۔ انسان کے وجود کا اقرار کرکے وہ خدا کے وجود کا بھی اقرار کر چکا ہے، خواہ وہ اپنی زبان سے اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا انکار خود اپنا انکار ہے۔ اور کون ہے جو خود اپنا انکار کر سکے۔

کن فیکون

آجکل جو موٹر کاریں سڑکوں پر دوڑتی ہیں وہ زیادہ تر اسی مشینی اصول پر بنائی گئی ہیں جو نکولاس آٹو (Nikolaus Otto) نے ۱۸۷۶ میں وضع کیا تھا۔ تاہم پچھلے برسوں میں کار کی دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا ہے۔ اب ایسی کاریں بن رہی ہیں جن کے انجن کے ساتھ ایک کمپیوٹر لگا ہوتا ہے اور وہ بہت سے کام خود بخود انجام دیتا ہے۔

مثلاً وہ بتاتا ہے کہ —— سیٹ بلٹ باندھ لیجئے، ایک دروازہ ٹھیک سے بند نہیں ہے، آپ کی ٹنکی میں ایندھن کم ہے وغیرہ۔

انھیں نئی چیزوں میں سے ایک یہ ہے کہ ڈرائیور اپنی کار کو زبانی ہدایات دے سکتا ہے۔ وہ ہاتھ سے کوئی پرزہ چھوئے بغیر زبان سے الفاظ بول کر اس کو کوئی حکم دے سکتا ہے۔ امریکی جرنل اسپین (Span) کی مئی ۱۹۸۴ کی اشاعت میں اس سلسلہ میں ایک رپورٹ شائع کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ درج کئے گئے ہیں:

---- and you can talk to the cars. The Ford Motor Company has developed a system in which voice commands turn on car lights, raise the antenna, start the windshield wipers, or activate other electrical systems.

اور آپ اپنی کار سے بات کر سکتے ہیں۔ فورڈ موٹر کمپنی نے ایک سسٹم تیار کیا ہے جس کے ذریعہ زبانی حکم سے کار کی لائٹ جل جاتی ہے، انٹینا اٹھ جاتا ہے، وائپرس چلنے لگتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے برقیاتی نظام متحرک ہو جاتے ہیں۔

یعنی ڈرائیور کو لائٹ جلانی ہے تو وہ اس کا بٹن نہیں دبائے گا بلکہ کہے گا "لائٹ جل جا" اور لائٹ جل جائے گی۔ ڈرائیور کو وائپر چلانا ہے تو وہ اس کے لئے کسی ٹمی پر اپنا ہاتھ نہیں لے جائے گا بلکہ کہے گا "وائپر چل جا" اور اس کے فوراً بعد وائپر چلنے لگے گا۔

اس مشینی واقعہ سے قرآن کی آیت کن فیکون (البقرہ ۱۱۷) آج کے انسان کے لئے قابل فہم ہوگئی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح منہ سے نکلی ہوئی آواز بھی کسی چیز کو وجود میں لاتی ہے اور ایک پورے نظام کو متحرک کر دیتی ہے۔ خدا کے کن فیکون کی اصل حقیقت کو انسان نہیں جان سکتا۔ تاہم موجودہ زمانہ کے مشینی واقعات نے اس کو سمجھنے والوں کے لئے سمجھنے کے قابل بنا دیا ہے۔

کیسا عجیب

میں شہر کی ایک پر رونق سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ تیز رفتار سواریاں مسلسل میرے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ وہ انسانوں کو لئے ہوئے ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی منزل کی طرف رواں ہوں۔ جیسے وہ کسی پہنچنے کی جگہ پر پہنچنا چاہتی ہوں۔

یہ دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ سواریاں نہیں ہیں بلکہ خدا کے فرشتے ہیں جو انسانوں کو لئے ہوئے تیزی سے بھاگ رہے ہیں تاکہ جلد از جلد تمام انسانوں کو اس کے خالق و مالک کے دربار میں پہنچا دیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ حالاں کہ وہ خدا کی منزل کی طرف لے جائے جا رہے ہیں نہ کہ اپنی کسی منزل کی طرف۔

زندگی کیا ہے، موجودہ دنیا میں امتحان کی مہلت۔ موت کیا ہے، آخرت کی دنیا میں بجبر داخلہ۔ موجودہ دنیا میں ہم ٹھیک ویسے ہی ہیں جیسے طالب علم امتحان ہال میں ہوتا ہے۔ کوئی طالب علم صرف گھنٹہ بجنے تک امتحان ہال میں رہ سکتا ہے۔ گھنٹہ بجتے ہی وہ اس میں قیام کا حق کھو دیتا ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں انسان صرف اس وقت تک ہے جب تک موت یا قیامت کا گھنٹہ نہ بجے۔ گھنٹہ بجنے کے بعد نہ دنیا اس کی رہ جاتی ہے اور نہ وہ دنیا کا۔

انسان سمجھتا ہے کہ میں اپنی دنیا میں ہوں۔ حالاں کہ وہ صرف خدا کی دنیا میں ہے۔ انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ خدا کے دئے سے ملا ہے۔ وہ عین اسی لمحہ چھن جائے گا جب کہ خدا ان کو چھیننے کا فیصلہ کرے۔ اس کے بعد انسان اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ اس کے پاس ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہ ہوگا جن کو آج وہ اپنا سمجھ رہا ہے۔

انسان پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ بھوکا ہوگا مگر اس کے پاس کھانے کو نہ ہوگا جس سے وہ اپنی بھوک مٹائے۔ وہ پیاسا ہوگا مگر اس کے پاس پانی نہ ہوگا جس سے وہ اپنے سینہ کی آگ ٹھنڈی کرے۔ اس پر سخت سردی کا موسم آئے گا مگر اس کے پاس گرم کپڑے نہ ہوں گے جن سے وہ اپنے بدن کو گرم کرے۔ اس کو سخت گرمی کا سامنا ہوگا مگر اس کو کوئی سایہ نہ ملے گا جس کے نیچے جا کر وہ ٹھنڈک حاصل کرے۔

آہ، کیسا عجیب دن انسان پر آنے والا ہے مگر وہ اس سے کتنا زیادہ غافل بنا ہوا ہے۔

غلط فہمی

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے جب فرعون مصر کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تو اس نے کہا کہ تم دونوں چاہتے ہو کہ زمین میں بڑائی تمہارے لئے ہو (یونس ۷۸)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی دعوتی تقریر میں تو صرف خدا کی بڑائی بیان کی تھی پھر فرعون نے اس کو اس معنی میں کیوں لے لیا کہ موسیٰ اور اس کے بھائی خود اپنی بڑائی چاہتے ہیں۔ اس نے خدا کی بڑائی کی بات کو خود متکلم کی بڑائی کے ہم معنی کیوں سمجھ لیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون خدا کی بڑائی سے واقف نہ تھا۔ وہ صرف انسان کی بڑائی کو جانتا تھا۔ اس کو بس اتنی ہی خبر تھی کہ انسان بڑے ہوا کرتے ہیں۔ اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ خدا سب سے بڑا ہے۔

ایسے لوگوں کی طرف سے دعوت حق کا ردعمل ہمیشہ اسی شکل میں ہوتا ہے۔ وہ خدا کی بڑائی سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لئے داعی جب خدا کی بڑائی بیان کرتا ہے تو وہ اس کو اس کے سوا کسی اور معنی میں نہیں لے پاتے کہ داعی خود اپنی بڑائی بیان کر رہا ہے۔

وہ بے آمیز سچائی کو نہیں جانتے۔ وہ صرف اس سچائی سے آشنا ہوتے ہیں جس کے اوپر ان کی محبوب شخصیتوں کی مہر لگی ہوئی ہو۔ اس لئے داعی جب ان کے سامنے بے آمیز سچائی بیان کرتا ہے جس کے اوپر خدا کی مہر لگی ہوئی ہو تو اس کو وہ پہچان نہیں پاتے۔ اس کو وہ داعی کے اپنے احساس برتری پر محمول کر کے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

وہ برتر صداقت سے آشنا نہیں ہوتے۔ وہ صرف اس صداقت کو جانتے ہیں جو ان کے قومی تقاضا کے ساتھ لپٹی ہوئی ہو۔ اس لئے داعی جب برتر صداقت کا اعلان کرتا ہے تو اس کو سن کر وہ متوحشہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی بھی کوئی صداقت ہو سکتی ہے جو ان کے قومی عزائم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہو۔

ایسے لوگ اپنی بے خبری کا الزام داعی کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔ وہ یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ کبر میں مبتلا ہے۔ وہ اپنا نام بلند کرنا چاہتا ہے۔ داعی خدا کی بڑائی کا اعلان کرتا ہے اور بے خبر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ داعی خود اپنی بڑائی کا اعلان کر رہا ہے۔ داعی خدا کی ذات کمال کی حمد بیان کرتا ہے مگر بے خبر لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنی خود ستائی میں مشغول ہے۔ داعی حق کی یکتائی پر زور دیتا ہے اور بے بصیرت لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنی انانیت کا اظہار کر رہا ہے۔

عقیدۂ خدا

شیر کو دیکھنے کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس کو مردہ عجائب خانہ میں دیکھیں۔ اور دوسرا شیر وہ ہے جو کھلے جنگل میں نظر آتا ہے۔ مردہ عجائب خانہ میں شیر کی کھال کے اندر بھس وغیرہ بھر کر اس کو کھڑا کر دیتے ہیں۔ بظاہر وہ شیر کی مانند ہوتا ہے۔ مگر وہ صرف شیر کی صورت ہوتی ہے، نہ کہ فی الواقع شیر۔ ایسے شیر کو لوگ صرف تفریح کے طور پر دیکھتے ہیں۔ کوئی بھی شخص اس سے ڈرنے یا بھاگنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

مگر جنگل کا شیر ایک زندہ شیر ہے۔ وہ ناقابل تسخیر قوت کا نشان ہے۔ وہ جب چلتا ہے تو سارا جنگل سہم اٹھتا ہے۔ وہ جب دھاڑتا ہے تو جانور دہشت زدہ ہو کر گر پڑتے ہیں۔ کوئی آدمی اگر جنگل میں زندہ شیر کو دیکھ لے تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے تمام ہوش وحواس گم ہو جاتے ہیں۔ وہ ویسا نہیں رہتا جیسا وہ اس کو دیکھنے سے پہلے تھا۔

اس مثال سے خدا کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ خدا پر عقیدہ کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے خدا پر تقلیدی عقیدہ۔ دوسرا ہے خدا پر زندہ عقیدہ۔

خدا پر تقلیدی عقیدہ ایک بے جان عقیدہ ہے۔ ایسا عقیدہ آدمی کی روح کو نہیں تڑپاتا۔ وہ اس کی رگوں میں بجلی بن کر نہیں دوڑتا۔ وہ آدمی کے اندر کوئی ہلچل پیدا نہیں کرتا۔ خدا کے تقلیدی عقیدہ میں خدا کو ماننا ہوتا ہے مگر خدا سے ڈرنا نہیں ہوتا۔

مگر خدا پر زندہ عقیدہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خدا پر زندہ عقیدہ خدا کو اس کی انتہاہ قوتوں کے ساتھ اس کو دیکھ لینے کا نام ہے۔ جو شخص اس طرح خدا کو پالے وہ پانے کے بعد ویسا نہیں رہ سکتا جیسا کہ وہ پانے سے پہلے تھا۔ خدا کو پانے کے بعد اس کے سارے وجود کے اندر بھونچال آجاتا ہے۔ خوف کی شدت سے اس کی روح سہم اٹھتی ہے۔ اس کے ذہن سے تمام دوسرے مسائل حذف ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف ایک ہی مسئلہ کو جانتا ہے اور وہ خدا کا مسئلہ ہے۔

خدا کا زندہ عقیدہ اور خدا کا خوف دونوں ناقابل تقسیم ہیں۔ آپ خدا کے زندہ عقیدہ سے خدا کے خوف کو الگ نہیں کر سکتے۔ جہاں یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوں وہاں سمجھ لیجئے کہ خدا کا زندہ عقیدہ نہیں بلکہ صرف تقلیدی عقیدہ ہے اور تقلیدی عقیدہ کی کوئی قیمت نہیں۔

تحقیق کیجئے

ایک ہندستانی حجاز گیا۔ ایک روز مدینہ میں اس کی ملاقات ایک عرب سے ہوئی۔ بظاہر وہ ایک بدو دکھائی دیتا تھا اور اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا۔ وہاں چونکہ چور کے ہاتھ کاٹ دئے جاتے ہیں، ہندستانی نے خیال کیا کہ یہ کوئی چور ہے۔ اس نے چوری کی تھی جس کی وجہ سے اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ ہندستانی کو اولاً اس سے ملنے میں کچھ کراہت محسوس ہوئی۔ پھر جبر کرکے اس کی طرف بڑھا اور اپنے عرب بھائی سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔

گفتگو چلی تو اس نے بتایا کہ وہ مدینہ کے قریب ایک بستی "یتمہ" کا رہنے والا ہے۔ اس کے پاس کافی زمینیں ہیں جہاں ۲۳ مکائن (ٹیوب ویل) لگے ہوئے ہیں۔ اس کے کھیتوں کی پیداوار بہت بڑی مقدار میں روزانہ مدینہ کے بازار میں آتی ہے۔

پھر اس کے ہاتھ کٹنے کا ذکر ہوا تو اس نے بتایا کہ ۱۹۴۸ میں فلسطین کے معاملہ میں عربوں اور یہودیوں میں جو لڑائی ہوئی وہ اس میں شریک تھا۔ اس کے بازو میں چھ گولیاں لگیں۔ اس کے بعد وہ عرصہ تک اسپتال میں رہا۔ وہاں ڈاکٹروں نے ناگزیر سمجھ کر اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا تاکہ پورے بازو کو متاثر ہونے سے بچایا جاسکے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناقص معلومات کی وجہ سے کس طرح ایک بات کسی کے ذہن میں کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ مذکورہ عرب کو ایک ہندستانی نے ناواقفیت کی بنا پر چور سمجھ لیا حالانکہ وہ ایک مجاہد اور ایک تاجر آدمی تھا۔ وہ دوسروں کو دینے والا تھا نہ کہ ان سے لینے والا، وہ سماج کا ایک کارآمد فرد تھا نہ کہ سماج کا رہزن۔

ہر آدمی کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے بارہ میں رائے قائم کرنے میں کبھی جلدی نہ کرے۔ جب بھی اس کے سامنے کوئی بات آئے تو وہ اس کی پوری تحقیق کرے، تحقیق سے پہلے ہرگز اس کے بارہ میں اپنی زبان نہ کھولے۔

اگر کسی شخص کے پاس تحقیق کرنے کا وقت یا سامان نہیں ہے تو اس کے لئے دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ مذکورہ معاملہ میں چپ رہے۔ نہ یہ کہ ناقص معلومات کے تحت اس کے بارہ میں بولنے لگے۔ اس وقت میں چپ رہنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا بولنا۔

توحید اور شرک

آدمی کو موجودہ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے ایک سہارا درکار ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی بڑائی میں جیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو خدا کی بڑائی میں جئے اور غیر مومن وہ ہے جو خدا کے سوا دوسری بڑائیوں میں جیتا ہو۔

قدیم زمانہ کا مشرک انسان چاند اور سورج کی بڑائی میں جیتا تھا۔ موجودہ زمانہ کا مادہ پرست انسان مادی قوتوں کی بڑائی میں جی رہا ہے۔ کچھ لوگ دولت کو بڑا بنا کر اس کو اپنی تلاش کا جواب بنائے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ انسانی اکابر کی بڑائی میں گم رہتے ہیں اور اس طرح اپنے اس فطری جذبہ کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔

یہ تمام کی تمام شرک کی صورتیں ہیں۔ یہ ایک حقیقی تلاش کا مصنوعی جواب ہے۔ مومن وہ ہے جو فطرت کی تلاش کے سچے جواب کو پالے۔ جو ظاہری چیزوں میں نہ اٹکے۔ بلکہ ظاہری اور نمائشی چیزوں سے گزر کر آخری حقیقت تک پہنچ جائے۔

مومن انسان جب ان چیزوں کو دیکھتا ہے تو وہ ان کی ظاہری چمک سے فریب نہیں کھاتا۔ یہ تمام چیزیں اس کو صرف مخلوق نظر آتی ہیں۔ وہ اس کو اسی مقام عجز پر دکھائی دیتی ہیں جہاں وہ خود کھڑا ہوا ہے۔ مومن ان چیزوں میں سے کسی چیز پر نہیں ٹھہرتا۔ اس کا سفر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ مخلوقات سے گزر کر خالق کو پالیتا ہے۔

مومن وہ ہے جو اپنی تمام چیزوں کو خدا کا عطیہ سمجھے۔ جو اپنے عجز کی تلافی خدا سے کرے۔ جس کو زمین کے حسن میں خدا کا حسن دکھائی دے۔ جس کو کائنات کی عظمت میں خدا کی عظمت نظر آئے۔ جو تمام بڑائیوں کو خدا کی بڑائی کا عکس سمجھتا ہو۔ جو خدا کے جلووں میں اس طرح گم ہو جائے کہ اس کی حمد خوانی اس کا لذیذ ترین مشغلہ بن جائے۔

ایمان کا مطلب در اصل حاضر میں غائب کو دیکھنا ہے۔ جو کچھ سامنے ہے اس میں اس چھپی ہوئی چیز کو دیکھ لینا ہے جو سامنے نہیں ہے۔ جس کو یہ نظر حاصل ہو جائے اس کو اپنے چاروں طرف صرف خدا کی بڑائی دکھائی دیتی ہے۔ وہ صرف خدا کو اپنا سب کچھ بنا لیتا ہے۔ وہ خدا کی بڑائی میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اس کو نہ اپنی بڑائی نظر آتی اور نہ دوسروں کی بڑائی۔

فیصلہ خداوندی

مفسرین قرآن کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے کہ ایک مجلس تھی جس میں یہودی تھے، عیسائی بھی اور مسلمان بھی۔ ان میں سے ہر گروہ کا یہ خیال تھا کہ وہ دوسروں سے پہلے جنت میں داخل ہوگا۔ یہود نے کہا کہ ہم موسیٰ کے پیرو ہیں جن کو خدا نے اپنی پیغمبری کے لئے چنا اور ان سے کلام کیا۔ عیسائیوں نے کہا کہ ہم عیسیٰ کے پیرو ہیں جو اللہ کی روح اور اس کی حکمت تھے۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم محمد خاتم الرسل کی امت ہیں اور ہم خیر امت ہیں جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے۔ قرآن نے اس کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے صاف طور پر کہا کہ — نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر، جو شخص بھی برا کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا۔ اور وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا حامی اور مددگار نہ پائے گا۔ اور جو کوئی بھی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ (النساء ۲۳-۱۲۳) ایک اثر میں ہے کہ ایمان نہ خوش خیالیوں کا نام ہے اور نہ ظاہری نمائشوں کا۔ بلکہ اس چیز کا نام ہے جو دل میں ہو اور عمل اس کی تصدیق کرے۔

كما ورد في الاثر (ليس الايمان بالتمني ولا بالتحلي ولكن ما وقر في القلب وصدقه العمل) .

روى جماعة من المفسرين للقران الكريم ان مجلسا ضم بعضاً من اليهود والنصارى والمسلمين ، فزعمت كل طائفة منهم انهم اولى الناس بدخول الجنة ـ اليهود قالوا نحن اتباع موسى الذي اصطفاه الله برسالاته وبكلامه ، والنصارى قالوا نحن اتباع عيسى روح الله وحكمته ـ والمسلمون قالوا نحن اتباع محمد خاتم النبيين وخير امة أخرجت للناس ، فحسم القرآن ذلك وخاطب المسلمين في صراحة ووضوح بقول الله تعالى : « ليس بامانيكم ولا اماني اهل الكتاب من يعمل سوءاً يجز به ولا يجد له من دون الله وليا ولا نصيرا . ومن يعمل من الصالحات من ذكر وانثى وهو مؤمن فاولئك يدخلون الجنة ولا يظلمون نقيرا » النساء ۱۲۳ و۱۲٤

ہر مذہب کے لوگوں میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو دوسرے تمام مذاہب سے افضل ثابت کرتے ہیں اور پھر یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ان کا مذہب چونکہ سب سے افضل مذہب ہے اس لئے ان کو خدا کے یہاں سب سے افضل مقام حاصل ہوگا۔

اس قسم کا عقیدہ سراسر بے بنیاد عقیدہ ہے۔ مذاہب کے درمیان جو تقسیم ہے وہ صرف محفوظ اور غیر محفوظ کی ہے نہ کہ افضل اور غیر افضل کی۔ خدا کے یہاں ہر آدمی اپنے ذاتی عمل کے اعتبار سے جانچا جائے گا اور جو شخص اپنے عمل کے اعتبار سے جس درجہ کا ہوگا وہی درجہ اس کو ملے گا۔ درجہ بندی کا کوئی دوسرا معیار خدا کے یہاں نہیں۔

[illegible]ندلون

انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے بہترین بناوٹ کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مگر بڑھاپا آتا ہے اور اس کی بہترین بناوٹ کو کھا جاتا ہے۔ انسان کو اعلیٰ ترین لذتوں کا احساس دیا گیا ہے۔ مگر ہزار کوشش کے بعد جب وہ ان لذتوں کو پالیتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی پیدائشی محدودیتوں (Limitations) کی وجہ سے وہ ان لذتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ انسان کو ایک ایسی زمین دی گئی ہے جو اپنی حسین فضاؤں اور قیمتی سازوسامان کے ساتھ ساری کائنات میں ایک انتہائی نادر استثناء ہے مگر آدمی اس دنیا کو استعمال نہیں کر پاتا کہ موت آتی ہے اور اس کو اس کی پسند کی دنیا سے جدا کر دیتی ہے۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا ہماری اصل دنیا نہیں۔ اصل دنیا وہ ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے۔ موجودہ دنیا اس آئندہ آنے والی دنیا کا ابتدائی تعارف ہے۔ یہ لذتوں کے اصل خزانہ کا لمحاتی تجربہ ہے۔ یہ ابدی بہشت کا صرف ایک وقتی مظاہرہ ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ آدمی حال کے آئینہ میں مستقبل کے عظیم امکانات کو دیکھے۔ وہ ناقص خلاح میں کامل فلاح کا راز پالے۔

عقلمند انسان وہ ہے جس کو دنیا کا یہ وقتی تجربہ اس کو ابدی دنیا کی یاد دلائے۔ وہ اپنے آپ کو زندگی کے آنے والے دور کے لئے تیار کرے۔ وہ اپنی عمر کے موجودہ مرحلہ کو اس طرح استعمال کرے کہ وہ اس کے لئے عمر کے اگلے مرحلہ میں کامیابی کا زینہ بن جائے۔

اس کے برعکس نادان وہ ہے جو وقتی اور فانی لذتوں میں گم ہو جائے۔ جو "آج" میں مشغول ہو کر "کل" کو بھول جائے۔ ایسا آدمی اس نادان مسافر کی طرح ہے جو ریلوے اسٹیشن کی بنچ خالی پا کر اس پر سو جائے۔ وہ اسی طرح بے خبر پڑا رہے۔ یہاں تک کہ اس کی ٹرین اپنے وقت پر آئے اور اس کو لئے بغیر آگے چلی جائے۔

موجودہ دنیا آخرت کے سفر کا راستہ ہے۔ جس طرح ایک عام مسافر اس وقت اپنی منزل پر نہیں پہنچتا جب کہ وہ راستہ کی چیزوں میں کھو گیا ہو۔ اسی طرح جو شخص دنیا کی دلفریبیوں میں گم ہو جائے وہ کبھی آخرت کے اعلیٰ مقامات تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ وہ دنیا میں بھٹک کر رہ جائے گا اور بالآخر اس کے حصہ میں حسرت کے سوا اور کچھ نہیں آئے گا۔

دوسو سال

۱۷۸۳ میں ایک انگریز اڈنبرا سے گلیسگو آیا۔ اس کے پاس دو سو پونڈ تھے اور ایک لکڑی کا پریس۔ اس نے اس کے ذریعہ ایک اخبار جاری کیا۔ ابتداءً اس کا نام تھا گلیسگو ایڈورٹائزر (Glasgow Advertiser) یہی وہ اخبار ہے جو اب (Glasgow Herald) کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس کی موجودہ اشاعت روزانہ چار لاکھ ہے۔ اس کے اجراء پر اب دو صدیاں گزر چکی ہیں۔

اس کا بانی جان مننز (John Mennons) ہر قسم کے ناموافق حالات سے دوچار تھا۔ البتہ ایک مبصر کے الفاظ میں ایک چیز اس کے پاس افراط کے ساتھ موجود تھی۔ وہ تھا اس کا اتھاہ جوش (Limitless enthusiasm) اتھاہ جوش اس کے لئے ہر کمی کا بدل بن گیا۔ اس نے ایک ایسے اخبار کی بنیاد رکھی جو دو سو سال سے مسلسل جاری ہے۔ درمیان میں شرکاء کے درمیان زبردست اختلافات بھی پیدا ہوئے مگر وہ حکمت اور صبر کے ساتھ طے کر لئے گئے۔

جو اخبار دو سو سال پہلے لکڑی کے پریس میں ہاتھ کے عمل سے چھاپا گیا تھا وہ آج تمام کا تمام آٹومیٹک مشینوں کے ذریعہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں حروف کمپوز نہیں کئے جاتے اور نہ ڈھالے جاتے۔ بلکہ وہ لیزر شعاعوں کے ذریعہ پلیٹ پر منعکس ہوتے ہیں۔ کاغذ اپنے آپ چھپ کر نکلتا ہے۔ وہ اپنے آپ مڑتا ہے۔ اس کے بعد اس کے بنڈل بنتے ہیں اور بنڈل کے اوپر پولی تھین لپیٹا جاتا ہے۔ اور پھر ڈسپیچ ڈیپارٹمنٹ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ سب کمپوٹر کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ جنوری ۱۹۸۲)

مذکورہ انگریزی اخبار چوں کہ برابر دو سو سال سے جاری ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہوا کہ اس دوران میں ہونے والی تمام طباعتی اور اشاعتی ترقیاں اس کی تاریخ کا جزء بن جائیں۔ وہ اس کی ترقی کے لئے زینہ بنتی چلی جائیں۔ اگر بالفرض وہ ابتدائی ۲۵ سال یا ۵۰ سال میں بند ہو گیا ہوتا تو دنیا میں ہر قسم کی ترقیاں ہوتیں مگر مذکورہ اخبار ان ترقیوں میں حصہ دار بننے کے لئے موجود نہ ہوتا۔

موجودہ دنیا میں کوئی کام "دو دن" میں انجام نہیں پاتا۔ اس کو کرنے کے لئے "دو سو سال" درکار ہوتے ہیں۔ مگر دو سو سالہ منصوبہ کی تکمیل کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ جوش عمل اور استقلال۔ ان دو چیزوں کے بغیر یہاں کوئی بڑی ترقی ممکن نہیں۔

رواجی ذہن

الیس ہووے (Elias Howe) امریکہ کے مشہور شہر ساچوسٹ کا ایک معمولی کاریگر تھا۔ وہ ۱۸۱۹ میں پیدا ہوا اور صرف ۴۸ سال کی عمر میں ۱۸۶۷ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ مگر اس نے دنیا کو ایک ایسی چیز دی جس نے کپڑے کی تیاری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ سلائی کی مشین تھی جو اس نے ۱۸۴۵ میں ایجاد کی۔

الیس ہووے نے جو مشین بنائی اس کی سوئی میں دھاگا ڈالنے کے لئے ابتداءً سوئی کی جڑ کی طرف چھید ہوتا تھا جیسا کہ عام طور پر ہاتھ کی سوئیوں میں ہوتا ہے۔ ہزاروں برس سے انسان سوئی کی جڑ میں چھید کرتا آرہا تھا۔ اس لئے الیس ہووے نے جب سلائی کی مشین تیار کی تو اس میں بھی عام رواج کے مطابق اس نے جڑ کی طرف چھید بنایا۔ اس کی وجہ سے اس کی مشین ٹھیک کام نہیں کرتی تھی۔ شروع میں وہ اپنی مشین سے صرف جوتا سی سکتا تھا۔ کپڑے کی سلائی اس مشین پر ممکن نہ تھی۔

الیس ہووے ایک عرصہ تک اسی ادھیڑ بن میں رہا مگر اس کی سمجھ میں اس کا کوئی حل نہیں آتا تھا۔ آخر کار اس نے ایک خواب دیکھا۔ اس خواب نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ کسی وحشی قبیلے کے آدمیوں نے اس کو پکڑ لیا ہے اور اس کو حکم دیا ہے کہ وہ ۲۴ گھنٹے کے اندر سلائی کی مشین بنا کر تیار کرے۔ ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ اس نے کوشش کی مگر مقررہ مدت میں وہ مشین تیار نہ کر سکا۔ جب وقت پورا ہو گیا تو قبیلے کے لوگ اس کو مارنے کے لئے دوڑ پڑے۔ ان کے ہاتھ میں برچھا تھا۔ ہووے نے غور سے دیکھا تو ہر برچھے کی نوک پر ایک سوراخ تھا۔ یہی دیکھتے ہوئے اس کی نیند کھل گئی۔

ہووے کو آغاز مل گیا۔ اس نے برچھے کی طرح اپنی سوئی میں بھی نوک کی طرف چھید بنایا اور اس میں دھاگا ڈالا۔ اب مسئلہ حل تھا۔ دھاگے کا چھید اوپر ہونے کی وجہ سے جو مشین کام نہیں کر رہی تھی وہ نیچے کی طرف چھید بنانے کے بعد بخوبی کام کرنے لگی۔

ہووے کی مشکل یہ تھی کہ وہ رواجی ذہن سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جو چیز ہزاروں سال سے چلی آرہی ہے وہی صحیح ہے۔ جب اس کے لاشعور نے اس کو تصویر کا دوسرا رخ دکھایا اس وقت وہ معاملہ کو سمجھا اور اس کو فوراً حل کر لیا۔ جب آدمی اپنے آپ کو ہمہ تن کسی کام میں لگا دے تو وہ اسی طرح اس کے رازوں کو پا لیتا ہے جس طرح مذکورہ شخص نے پالیا۔

دشمنی کے وقت بھی

روس اور امریکہ دونوں ایک دوسرے کے سخت ترین دشمن ہیں۔ مزید یہ کہ دونوں نے بے حساب مقدار میں خطرناک نیوکلیر ہتھیار تیار کر رکھے ہیں جو منٹوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک معمولی سی غلط فہمی دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان ایک ایسی جنگ چھیڑ سکتی ہے جو ان کے شاندار شہروں کو اچانک کھنڈر میں تبدیل کر دے۔

چنانچہ یہ ممالک ایک طرف ایک دوسرے کے خلاف ہر قسم کے انتہائی مہلک ہتھیار جمع کر رہے ہیں۔ دوسری طرف دونوں کے درمیان پچھلے ۲۰ سال سے ہنگامی مواصلات (Emergency communications) کا ایک نظام قائم ہے جس کے ذریعہ رات دن کے کسی بھی لمحہ میں دونوں ایک دوسرے سے ربط پیدا کر سکتے ہیں۔ اور نازک مواقع پر فوراً براہ راست گفتگو کر کے جنگ کے اتفاقی خطرہ کو ٹال سکتے ہیں۔ اس ہر وقت متحرک رہنے والے مواصلاتی نظام کو گرم لائن (Hot-line) کہا جاتا ہے۔ نیوکلیر ہتھیاروں کی مزید ترقی کے بعد محسوس کیا گیا کہ قدیم گرم لائن بہت "سست" ہے۔ وہ ہتھیاروں کے رفتار سفر میں جدید ترقیوں کی نسبت سے جنگ کے فوری اندیشہ کو ٹالنے کے لئے سراسر ناکافی ہے۔ چنانچہ پچھلے ایک سال سے ماسکو اور واشنگٹن کے ماہرین اس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ موجودہ گرم لائن کو ترقی دے کر اس کو وقت کے تقاضوں کے مطابق (Update) کیا جائے۔ بالآخر جولائی ۱۹۸۴ میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک نئے معاہدہ پر سمجھوتہ ہوگیا (ٹائمس آف انڈیا ۱۱ جولائی ۱۹۸۴)

اب تک جو ٹیلکس مشینیں ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان پیغام رسانی کے لئے استعمال ہو رہی تھیں وہ ایک منٹ میں ساٹھ الفاظ (ایک سکنڈ میں ایک لفظ) ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتی تھیں۔ نئے معاہدہ کے تحت جو سسٹم رائج کیا گیا ہے اس کے مطابق ایک تیار شدہ مضمون (Prepared text) کے پورے ایک صفحہ کا عکس صرف ایک سکنڈ میں واشنگٹن سے ماسکو یا ماسکو سے واشنگٹن پہنچ جائے گا۔ گویا تیز رفتاری کے اعتبار سے پہلے کے مقابلہ میں کئی سو گنا زیادہ۔ اس طرح روس اور امریکہ نے خطرہ سے بچاؤ کی تدبیر کو خطرہ کے مطابق کر لیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندہ لوگ دشمنی کی آخری سطح پر پہنچ کر بھی کس قدر باہوش بنے رہتے ہیں۔ دوسری طرف مردہ لوگ ہیں جن کو صرف یہ معلوم ہے کہ [illegible]
[illegible]

کمینہ پن

ایک اعلیٰ سرکاری افسر کو اپنے ماتحت ملازم سے ضد ہوگئی۔ ملازم کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ خوددار قسم کا آدمی تھا اور وہ افسر صاحب کی متکبرانہ نفسیات کو غذا نہیں فراہم کرتا تھا۔ وہ اس کو ملازمت سے تو نہیں نکال سکتے تھے۔ البتہ انھوں نے کوشش کی کہ اس کو کسی قسم کی ترقی نہ ملنے پائے۔ جہاں کہیں دیکھتے کہ اس کے لئے ترقی اور کامیابی کی کوئی صورت پیدا ہو رہی ہے وہ فوراً اس کے خلاف رکاوٹ بن کر کھڑے ہو جاتے۔ اس کو پروموشن کا موقع ملا جس سے اس کی تنخواہ میں تقریباً پانچ سو روپیہ مہینہ کا اضافہ ہو جاتا مگر انھوں نے زبردست سرگرمی دکھا کر اس کا پروموشن رکوادیا۔

اس ظلم کے باوجود افسر صاحب کی اپنی کوئی بات نہیں بگڑی۔ محکمہ کے بڑے بڑے لوگوں سے انھیں قدردانی ملتی رہی۔ ان کے عہدہ اور مرتبہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ عالمی کانفرنسوں میں وہ اپنے محکمہ کی نمائندگی کے لئے بھیجے جاتے رہے وغیرہ

"اگر میں غلطی پر ہوتا تو مجھے یہ کامیابیاں کیسے ملتیں" انھوں نے سوچا۔ ماتحت ملازم کے خلاف ظالمانہ کارروائیوں کے باوجود چوں کہ ان کی اپنی کوئی بات نہیں بگڑی تھی اس لئے وہ یہی سمجھتے رہے کہ میں صحیح ہوں میرے اوپر خدا کا فضل ہو رہا ہے۔

مگر اس کی وجہ خدا کا فضل نہیں بلکہ صرف ان کا تضاد تھا۔ وہ اپنے ماتحت کے لئے کچھ تھے اور اپنے افسر کے لئے کچھ۔ اپنے ماتحت ملازم سے انھیں چوں کہ کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا اس لئے اس کے مقابلہ میں تو وہ شیر بنے رہتے۔ مگر اوپر کے وہ لوگ جن سے خود ان کی قسمت وابستہ تھی ان کے آگے وہ اس طرح بچھ جاتے جیسے کہ وہ نرمی اور تواضع کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔

یہی وہ کردار ہے جس کا نام کمینہ پن ہے۔ اور کمینہ پن بے کرداری کی بدترین قسم ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں کہ اپنے نیچے والوں کے لئے شیر بنے رہتے ہیں اور اپنے اوپر والوں کے لئے گیدڑ، وہ ایسا کرکے صرف اپنی پستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کیوں کہ انسان کو کیا ملے اور کیا نہ ملے، اس کا فیصلہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور خدا کے اوپر کسی کو اختیار نہیں۔

مزید یہ کہ دوسرے کے خلاف کیا ہوا ہر عمل خود اپنے خلاف عمل ہے۔ اپنی بارگاہ میں دوسرے کو ڈسکریڈٹ کرنے والا آدمی خدا کی بارگاہ میں اپنے آپ کو ڈسکریڈٹ کر رہا ہوتا ہے۔ ایسا ہر سلوک خود اپنے ساتھ بدسلوکی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ خواہ اس کا ظہور موجودہ دنیا میں ہو یا بعد کو آنے والی دنیا میں۔

موقع نہ کھویئے

"زندگی میں کامیاب ہونے کا راز یہ ہے کہ آدمی ہر آنے والے موقع کے لئے تیار رہے"
ڈزرائیلی کا یہ قول موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز بتا رہا ہے۔ دنیا میں کامیابی حقیقۃً اس کا نام ہے کہ آدمی حالات کو سمجھے اور آنے والے موقع کو فوراً استعمال کرے۔ جو شخص کسی موقع کو وقت پر استعمال نہ کر سکے وہی وہ شخص ہے جو ناکام رہا اور زندگی کی دوڑ میں پچھڑ گیا۔

شہر کی ایک گلی میں ایک بار میں نے دیکھا کہ بجلی کا بلب سارے دن جل رہا ہے۔ مگر دن کے اجالے میں وہ بالکل گم تھا۔ غور سے دیکھنے کے بعد اس کی روشنی بس اتنی نظر آتی تھی کہ آدمی یہ جان لے کہ یہاں ایک بلب موجود ہے۔ مگر جب رات آئی اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تو وہی بلب نمایاں ہو گیا۔ اب وہ اپنے ماحول کو اس طرح روشن کر رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا سورج زمین پر اتر آیا ہو۔

میں نے یہ منظر دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ ـــــ چراغ کی روشنی دراصل تاریکی کے موقع سے فائدہ اٹھانے کا دوسرا نام ہے۔ چراغ اسی وقت چراغ ہے جب کہ وہ تاریکی میں ہو۔ سورج کی روشنی ظاہر ہونے کے بعد چراغ کا کوئی وجود نہیں۔

تاریکی عام معنوں میں صرف "تاریکی" نہیں وہ ایک "موقع" ہے۔ تاریکی کو دیکھ کر آدمی اکثر فریاد و ماتم کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ تاریکی کسی آدمی کے لئے بہترین موقع ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں تاریکی ہو وہاں کسی کے لئے اپنے آپ کو "روشن" کرنے کا ایک قیمتی موقع موجود ہوتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی اس راز کو جانے اور اس کو بھرپور طور پر استعمال کرے۔ ظاہر ہے کہ تاریکی کو وہی شخص اپنے لئے موقع بنا سکتا ہے جس کے پاس اپنی کوئی روشنی موجود ہو۔ جو شخص خود تاریک ہو اس کے لئے تاریکی مزید اندھیرا لانے کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے لئے تاریکی کبھی موقع نہیں بنتی۔

چامیلس نے کہا ہے کہ "موقع کو کھو دینا کامیابی کو کھو دینا ہے۔" اگر آپ مسافر ہوں اور ٹرین پکڑنے کے لئے ریلوے اسٹیشن جائیں تو آپ کو چوکنا رہنا پڑتا ہے کہ جب ٹرین آکر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو تو آپ فوراً اس کے اندر داخل ہو جائیں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو بیدار نہ رکھیں تو ممکن ہے کہ ٹرین آکر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو اور پھر سیٹی دے کر چلی جائے۔ اور آپ اس پر سوار نہ ہوسکے ہوں۔

ایسا ہی کچھ معاملہ زندگی کا ہے۔ آپ زندگی کے جس میدان میں بھی ہوں، ہمیشہ آپ اس امتحان

میں ہوتے ہیں کہ مواقع کو پہچانیں اور ان کو استعمال کر سکیں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو جاگتا ہوا نہ رکھیں تو مواقع آئیں گے اور آپ ان کو استعمال نہ کر سکیں گے۔ مواقع آپ کا انتظار کریں گے اور آپ کو ان کی خبر بھی نہ ہوگی اور پھر بعد کو بیٹھ کر زمانہ کی شکایت کریں گے کہ اس نے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔

دنیا میں مواقع آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ تاہم ایک موقع ایسا ہے جو ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ یہ امتیازی کارکردگی کا موقع ہے۔ حقیقت یہ کہ اس دنیا میں سب سے بڑا موقع وہ ہے جس کو امتیاز (Distinction) کہا جاتا ہے۔ کسی معاملہ میں امتیازی صلاحیت آدمی کو سب سے بڑا موقع فراہم کرتی ہے۔ دوسرے مواقع زندگی میں کبھی کبھی آتے ہیں۔ مگر "امتیاز" وہ موقع ہے جو ہمیشہ ہر آدمی کے لئے موجود رہتا ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی لئے ڈینیل ویبسٹر (Daniel Webster) نے کہا ہے کہ چوٹی کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے:

There is always room at the top.

اس دنیا میں سب سے بڑا موقع "امتیاز" ہے۔ دوسرے مواقع زندگی میں کبھی کبھی آتے ہیں۔ مگر امتیاز وہ موقع ہے جو ہمیشہ ہر مقام پر موجود رہتا ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

غصہ نہیں

کسی کا قول ہے کہ "غصہ آدمی کے چہرہ کو بگاڑ دیتا ہے"۔ اس قول کی سچائی دیکھنا ہو تو ایک کتے کو اس وقت دیکھئے جب کہ وہ دوسرے کتے سے بگڑ کر اس پر غرا رہا ہو۔ اس وقت کتا دنیا کا سب سے زیادہ بدشکل جانور دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس مثال پھول کی ہے۔ پھول کے سامنے کھڑے ہو کر آپ اس کو برا بھلا کہیں۔ اس کے باوجود اس کے حسن میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پھول آپ کے برا کہنے پر نہیں بگڑا۔ اس نے آپ کی کڑوی باتوں کا کوئی خراب اثر نہیں لیا۔

اسی بنا پر ایک مفکر نے کہا ہے کہ انسان سب سے زیادہ خوبصورت اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ ایک اشتعال انگیز بات پر غصہ نہ ہو۔ اور انسان سب سے زیادہ بدصورت اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اشتعال انگیز بات سنے اور پھر قابو سے باہر ہو جائے۔

ایک مثل ہے "غصہ ہمیشہ حماقت سے شروع ہوتا ہے۔ اور ندامت پر ختم ہوتا ہے"۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تصدیق غصہ کے ہر واقعہ سے کی جا سکتی ہے۔ جب بھی کسی آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ اس کے پاس غصہ کے علاوہ دوسرا جو طریقہ تھا وہ اس کو استعمال نہ کر سکا۔

ایک بار ایک لڑکے نے اپنے گھر میں کچھ نقصان کر دیا۔ اس کا جاہل باپ اس کو نظر انداز نہ کر سکا۔ وہ سخت غصہ میں آگیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو پکڑ کر زور سے دھکیلا تو اس کا سر جا کر دیوار سے ٹکرا گیا۔

اس کے سر کی کوئی رگ شدید طور پر متاثر ہوگئی۔ اس لڑکے نے ہمیشہ کے لئے اپنا حافظہ کھو دیا۔ وہ کسی کام کے قابل نہ رہا۔ بظاہر وہ دیکھنے میں پہلے کی طرح تھا مگر اب اس کو کوئی چیز یاد نہیں رہتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ بیکار ہو کر رہ گیا۔ باپ نے وقتی جذبہ سے مغلوب ہو کر ایک نادانی کی تھی مگر اپنے اس فعل پر بے پناہ شرمندگی اس کو ہمیشہ باقی رہی۔ اگر اس نے وقتی طور پر برداشت سے کام لیا ہوتا تو وہ مستقل شرمندگی سے بچ جاتا۔

داتا گنج بخش کا قول ہے کہ "غصہ عقل کو کھا جاتا ہے" گوسوامی تلسی داس نے کہا: جہاں غصہ ہے وہاں بربادی ہے۔ ان دونوں اقوال کا مطلب ایک ہے۔ غصہ آدمی کی عقل کے لئے بھی قاتل ہے اور اس کے جسم کے لئے بھی۔ وہ اس کی پوری شخصیت کو نگل جاتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو غصہ سے بچائے۔

ڈاکٹر آلپورٹ نے بتایا ہے کہ غصہ کرنے سے عضلات (پٹھوں) کا تناؤ بڑھ جاتا ہے۔ جسم کی قوت غیر معمولی طور پر استعمال ہو کر تکان کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر آدمی کے اندر عمل کی قوت گھٹ جاتی ہے۔

دوسرے ڈاکٹر جے اے شنڈلر کا کہنا ہے کہ غصہ کی حالت میں آنتوں میں اینٹھن آجاتی ہے۔ دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر غصہ شدید ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ دماغ کی رگ پھٹ جائے اور آدمی کی اچانک موت واقع ہو جائے۔

چیسٹر فیلڈ نے نہایت گہری بات کہی ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی شخص اگر اپنے غصہ پر قابو نہیں پا سکتا تو سمجھ لیجئے کہ وہ دنیا کا کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی چیز حاصل کرنے کے لئے دنیا پر قابو پانا پڑتا ہے۔ پھر جو شخص اپنے آپ پر قابو نہ پا سکے وہ دنیا پر قابو پانے میں کس طرح کامیاب ہوگا۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۸-۹ جولائی ۱۹۸۴ کو نشر کیا گیا۔

نظریۂ ارتقاء

چارلس ڈارون (۱۸۸۲۔۱۸۰۹) کے بعد عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اولاً موجودہ زمین ایک بے جان مادہ کی صورت میں وجود میں آئی۔ اس کے بہت عرصہ بعد تدریجی عمل کے نتیجہ میں زندگی کا ظہور ہوا۔ ارتقاء کے نظریہ کا یہی تقاضا تھا۔

کچھ لوگوں نے مزید آگے قدم بڑھایا اور ارتقائی مفروضات کی بنیاد پر قیاس کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی کہ زمین پر زندگی کا ظہور تقریباً ۷۰۰ ملین سال پہلے ہوا ہے۔ تاہم بعد کی تحقیقات نے ثابت کیا کہ یہ سائنسی مفروضہ بھی ویسا ہی بے بنیاد تھا جیسا کہ مسیحی علماء کا بائبل کی بنیاد پر حساب لگا کر یہ فرض کر لینا کہ آدم صرف چھ ہزار سال پہلے ظہور میں آئے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد اس نظریہ پر مسلسل تنقید ہوتی رہی ہے۔ متعدد ماہرین نے یہ دکھایا ہے کہ زندگی اگر محض ارتقائی عمل کے ذریعہ وجود میں آئی ہو تو اس کے لئے مذکورہ مدت (۷۰۰ ملین سال) سراسر ناکافی ہے۔ حتیٰ کہ زمین کی پوری عمر بھی اس کے لئے ناکافی ہے کہ یہاں ارتقاء کا عمل جاری ہو اور ڈارون کے سہ گانہ اصول کے مطابق بالآخر زندگی کی اعلیٰ قسمیں وجود میں آئیں۔

اس سلسلے میں تازہ خبر یہ ہے کہ سوویت روس کی ۲۷ ویں انٹرنیشنل جیولاجیکل کانگرس کے تحت ۹ اگست ۱۹۸۴ کو ماسکو میں ایک سمپوزیم ہوا۔ اس موقع پر روسی سائنسداں بورس سوکولوف (Boris Sokolov) نے ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ اس مقالہ میں خالص ریاضیاتی اور سائنسی دلائل سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ زمین پر زندگی زمین کی پیدائش کے وقت ۴۰۰۰ ملین سال پہلے ایک وقت شروع ہوئی۔ یعنی جب زمین وجود میں آئی عین اسی وقت زندگی بھی ظاہر ہوگئی (ہندستان ٹائمس ۱۱ اگست ۱۹۸۴)

اگر یہ مان لیا جائے کہ زمین اور زندگی دونوں ایک ساتھ ظہور میں آئے تو نظریہ ارتقاء کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ یہاں ارتقاء کے حامی ایک دوگونہ مشکل میں مبتلا ہیں۔ اگر وہ کہیں کہ زمین اور زندگی دونوں ایک ساتھ ظاہر ہوئے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر زندگی کے ارتقائی طور پر ظہور میں آنے کو کس طرح ثابت کریں۔ اور اگر یہ مانیں کہ پہلے زمین بنی اس کے بعد ارتقائی عمل کے ذریعے دھیرے دھیرے زندگی کی قسمیں وجود میں آئیں تو انہیں نہیں معلوم کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دیں کہ زمین کی پیدائش سے اب تک کی مدت ان کے مفروضہ ارتقائی عمل کے لئے سراسر ناکافی ہے۔

کردار کا معاملہ

انسان مادہ کو تمدن میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ سادہ چیزوں کو استعمال کر کے شاندار شہر وجود میں لاتا ہے۔ ایسا کیوں کر ہوتا ہے۔ اس کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے چیزوں کے اندر کچھ لازمی اوصاف کا ہونا۔ آدمی انھیں فطری خصوصیات کو دریافت کر کے انھیں کام میں لاتا ہے۔ یہ خصوصیات گویا چیزوں کا کیرکٹر (کردار) ہیں۔ ہر چیز کا ایک متعین کیرکٹر ہے جس کو وہ لازماً ادا کرتی ہے۔ یہی وہ کیرکٹر کی یقینیت ہے جس کی وجہ سے زندگی کی تمام سرگرمیاں اور ترقیاں ممکن ہوتی ہیں۔ اگر یہ یقینیت باقی نہ رہے تو اچانک پورا انسانی تمدن کھنڈر ہو کر رہ جائے گا۔

اگر ایسا ہو کہ ایک دریا کے اوپر لوہے کا پل کھڑا کیا جائے اور پھر معلوم ہو کہ وہ موم کی طرح نرم ہے۔ پتھر اور سمنٹ کے ذریعہ کئی منزلہ بلڈنگ بنائی جائے اور وہ ریت کا ڈھیر ثابت ہو۔ انجن میں پٹرول بھرا جائے مگر جب انجن کو چلایا جائے تو پٹرول توانائی میں تبدیل نہ ہو۔ مقناطیسی میدان (Magnetic Field) اور حرکت (Motion) کو یکجا کیا جائے مگر الکٹران متحرک ہو کر بجلی پیدا نہ کریں، وغیرہ وغیرہ۔

اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ چیزوں نے اپنا کیرکٹر کھو دیا ہے۔ اور اگر چیزیں اپنا متعین کیرکٹر کھو دیں تو تمدن کی تعمیر ناممکن ہو جائے۔ تمدن اسی وقت بنتا ہے جب کہ اس کے ضروری مادی اجزا اس کردار کو ادا کریں جس کی ان سے توقع کی گئی ہے۔ اگر برف کی فیکٹری میں پانی جمنے کے بجائے بھاپ بن کر اڑنے لگے تو آئس فیکٹری کا وجود بے معنی ہو جائے گا۔ اگر بھٹی میں لوہا ڈالا جائے اور وہ پگھلنے سے انکار کر دے تو سارا مشینی کاروبار درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

ٹھیک یہی معاملہ انسانی اجتماعیت کا بھی ہے۔ کسی اجتماعی نظام میں جو افراد منسلک ہوتے ہیں ان میں سے ہر فرد کو اپنے اپنے مقام پر کوئی کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ اسی کردار کی صحیح ادائگی پر اجتماعیت کے قیام کا انحصار ہے۔ جس طرح مادی چیزوں کی قیمت ان کے مخصوص کیرکٹر کی بنا پر ہے۔ اسی طرح انسان کی قیمت بھی اس میں ہے کہ وہ مختلف مواقع پر اس کیرکٹر کا ثبوت دے جس کی بحیثیت انسان اس سے امید کی جاتی ہے۔ وہ ہر موقع پر انسان ثابت ہو نہ کہ غیر انسان۔

ایک انسان کو جہاں وعدہ پورا کرنا چاہئے وہاں وہ وعدہ خلافی کرے۔ جہاں اس کو شہرافت کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے وہاں وہ کمینہ پن کا طریقہ اختیار کرے۔ جہاں اس کو فیاضی دکھانا چاہئے وہاں وہ تنگ ظرفی کا ثبوت دے۔ جہاں اس کو بڑا پن کا مظاہرہ کرنا چاہئے وہاں وہ چھوٹا پن دکھائے۔ جہاں اس

معاف کر دینا چاہئے وہاں وہ انتقام لینے لگے۔ جہاں اس کو اطاعت کرنا چاہئے وہاں وہ سرکشی کرنے لگے۔ جہاں اس کو اعتراف کرلینا چاہئے وہاں وہ ہٹ دھرمی دکھانے لگے۔ جہاں اس کو اپنے بھائی کی پردہ پوشی کرنا چاہئے وہاں وہ اس کی پردہ دری کرنے پر تل جائے۔ جہاں اس کو ایثار سے کام لینا چاہئے وہاں وہ خود غرضی سے کام لینے لگے۔

اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں نے اپنا انسانی کردار کھودیا ہے۔ وہ اس امید کو پورا نہیں کر رہے ہیں جو اجتماعی نظام کا ایک جزء ہونے کے اعتبار سے ان سے قائم کی گئی تھی۔ جس اجتماعی معاشرہ کا یہ حال ہو کہ اس کے افراد اپنا انسانی کردار کھودیں وہاں صرف انتشار کا راج ہوگا، وہاں کوئی مستحکم اجتماعی نظام نہیں بن سکتا۔

کوئی طاقتور نظام یا ایک اچھا معاشرہ اس وقت بنتا ہے جب کہ اس کے انسان حقیقی معنوں میں انسان ثابت ہوں۔ جہاں پختگی کی ضرورت ہے وہاں وہ لوہے کی طرح پختہ بن جائیں۔ جہاں نرمی کی ضرورت ہے وہاں وہ چشمہ کی طرح نرم ثابت ہوں۔ جہاں چپ رہنے کی ضرورت ہے وہاں وہ پتھر کی طرح خاموش ہو جائیں۔ جہاں ٹھہرنے کی ضرورت ہے وہاں وہ پہاڑ کی طرح جم کر کھڑے ہو جائیں۔ جہاں اقدام کی ضرورت ہے وہاں وہ سیلاب کی طرح رواں بن جائیں۔ وہ ہر موقع پر وہی بولیں جو انھیں بولنا چاہئے۔ اور ہر موقع پر وہی ثابت ہوں جو انھیں ثابت ہونا چاہئے۔

ایسے انسان اجتماعی زندگی کے لئے اسی طرح اہم ہیں جس طرح لوہا اور پٹرول تمدنی زندگی کے لئے۔ لوہا اور پٹرول کے بغیر کوئی تمدن نہیں۔ اسی طرح پختہ کردار آدمیوں کے بغیر کوئی اجتماعی زندگی نہیں۔

مشن میں شرکت

اگر آپ الرسالہ کے پیغام سے متفق ہیں اور پھر بھی آپ نے ابھی تک الرسالہ کی ایجنسی نہیں لی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ——— آپ نے اس مشن میں اپنے آپ کو شامل نہیں کیا۔ جو شخص بھی الرسالہ کے مشن سے اتفاق رکھتا ہو اس کے اتفاق کا کم سے کم تقاضا ہے کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی لے۔

ادارہ الرسالہ

فہم قرآن

فی صحیح البخاری من روایة ابی جحیفة وهب بن عبد الله السوائی - قال قلت لعلی بن ابی طالب رضی الله عنه - هل عندکم شئ من الوحی مما لیس فی القرآن - فقال لا والذی فلق الحبة وبرأ النسمة الا فهماً یعطیه الله رجلاً فی القرآن (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحه ۷۷)

وہب بن عبد اللہ تابعی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی ابن ابی طالب سے پوچھا۔ کیا آپ کے پاس وحی الٰہی میں سے کوئی ایسی چیز ہے جو قرآن میں نہیں ہے۔ انھوں نے جواب دیا اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو پھاڑا اور جاندار کو وجود بخشا، ہمارے پاس کوئی مزید چیز نہیں سوا اس فہم کے جو اللہ ایک شخص کو قرآن میں عطا کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں ظاہری الفاظ کے سوا بھی ایک چیز ہے اور وہ اس کی گہری معنویت کا ادراک ہے، گویا ایک الفاظ قرآن ہے اور دوسرا فہم قرآن۔ قرآن کا لفظی حصہ اس کے ظاہری مطالعہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے معنوی حصہ کو پانے کے لئے غور و فکر ضروری ہے۔ گہرے تدبر کے بغیر کوئی شخص قرآن کے گہرے معانی کو نہیں جان سکتا۔

قرآن کے ظاہری پہلو کو جاننے کے لئے عربی دانی کی ضرورت ہے اور قرآن کے معنوی پہلو کو جاننے کے لئے خدادانی کی۔ اگر آدمی کو عربی زبان سے واقفیت ہو تو وہ قرآن کو پڑھ کر اس کے ظاہری مفہوم کو سمجھ لے گا مگر قرآن کی معنوی گہرائیوں کو وہی شخص پا سکتا ہے جو خدا کی چھپی ہوئی تجلیات سے اپنی آنکھوں کو روشن کر چکا ہو۔

دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک قرآن وہ ہے جو آدمی کو لکھی ہوئی کتاب کی صورت میں مل جاتا ہے۔ اور دوسرا قرآن وہ ہے جس کو اسے خود دریافت کرنا ہے۔ ایک قرآن وہ ہے جو آیتوں کا ترجمہ جاننے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ دوسرا قرآن وہ ہے جس کو خود اپنی کوششوں سے پا[نا] پڑتا ہے۔

آدمی اگر صرف "پہلے قرآن" کو پائے تو قرآن سے اس کا تعلق اوپری انداز کا ہوگا۔ وہ بس [رسمی] طور پر اس کو مانتا رہے گا۔ مگر جو شخص "دوسرے قرآن" کو پالے اس کو قرآن سے زندہ تعلق ہو جا[تا] ہے۔ قرآن اس کے لئے حرکت اور یقین کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ قرآن اس کے لئے ایک ایسی چیز [بن] جاتا ہے جس میں وہ جئے، جس سے وہ اپنے لئے غذا حاصل کرے۔

علم اور تقویٰ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور وہ تم کو علم دے گا (واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ ، البقرۃ ۲۸۲) دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ اگر تم اللہ سے ڈروگے تو وہ تم کو پہچان دے گا (ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا) ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو... وہ تم کو روشنی عطا فرمائے گا جس میں تم چلوگے (... ویجعل لکم نوراً تمشون بہ ،

امام مالک نے امام شافعی سے ان کی جوانی کی عمر میں نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: اے لڑکے، میں دیکھتا ہوں کہ اللہ نے تمھارے دل کو روشنی سے بھر دیا ہے تو تم اس کو گناہ کی تاریکی سے نہ بجھاؤ (یا فتی انی اریٰ اللہ قد ملأ قلبك نوراً فلا تطفئہ بظلمۃ المعصیۃ)

امام شافعی نے اپنے استاد وکیع بن الجراح سے اپنی ایک گفتگو کا ذکر اس طرح اشعار میں کیا ہے :

شکوت الیٰ وکیع سوء حفظی   فارشدنی الی ترك المعاصی

واخبرنی بان العلم نور   ونور اللہ لا یھدی لعاصی

میں نے شیخ وکیع سے حافظہ کی خرابی کی شکایت کی تو انھوں نے مجھے نصیحت کی کہ گناہوں کو چھوڑ دو اور انھوں نے مجھے بتایا کہ علم روشنی ہے اور اللہ کی روشنی کسی گناہگار کو راستہ نہیں دکھاتی۔

یہاں علم سے مراد معلومات نہیں معرفت ہے۔ ایک حقیقی معرفت تک پہنچنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی کے پاس الفاظ اور معلومات کا ذخیرہ ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر صحت فکر ہو۔ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر یہی صحت فکر پیدا کرتا ہے۔

آدمی جتنا زیادہ سنجیدہ ہو اتنا ہی زیادہ اس کے اندر صحت فکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ سنجیدہ بناتا ہے، اس لئے اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ اس قابل بناتا ہے کہ وہ صحیح اور درست طریقہ پر سوچ سکے۔

اللہ کا ڈر آدمی کے الفاظ اور معلومات کے لئے ایسا ہی ہے جیسے سانچہ خام اشیاء کے لئے۔ سانچہ خام اشیاء کو بامعنی صورت میں تبدیل کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کا ڈر الفاظ اور معلومات کو معرفت میں ڈھال دیتا ہے۔

کچھ علوم انسانی مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں اور کچھ علوم خدا کے مدرسہ میں۔

صرف الفاظ

امریکہ میں اگلی میعاد کے لئے صدر کے انتخاب کی مہم چل رہی تھی۔ ڈیموکریٹک پارٹی نے ایک خاتون فیرارو (Geraldine Ferraro) کو صدارت کے لئے اپنا نمائندہ بنایا۔ ٹائم میگزین نے مذکورہ خاتون کی زبردست حمایت کی۔ ٹائم (۲۳ جولائی ۱۹۸۴) میں مذکورہ خاتون کی حمایت میں ایک مفصل مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا:

A Break with Tradition

ٹائم کی اس اشاعت میں کئی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں کچھ امریکی خواتین ایک بورڈ سر پر اٹھائے ہوئے کھڑی تھیں۔ بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ بہتر کل کے لئے فرارو کو ووٹ دو:

Ferraro, For A Better Tommorrow

اسی طرح نیوسنڈے ٹائمس (کوالالمپور) کی اشاعت ۲۹ جولائی ۱۹۸۴ میں ایک قصہ پڑھا کہ امریکہ کے میگزین پینٹ ہاؤس (Pent House) نے ایک سنسنی خیز واقعہ کیا۔ اس نے پہلی نیگرو مس امریکہ وینا ولیمس (Vanessa Williams) کو راضی کر کے اس کی بہت سی ننگی تصویریں لیں اور ان تصویروں کو چھاپ کر کروڑوں روپئے کمائے۔ مذکورہ امریکی اخبار نے ان تصاویر کے اوپر جو عنوان قائم کیا وہ یہ تھا کہ وینا بغیر لباس:

Vanessa The Undressa

فرارو کے حامیوں نے اپنے سیاسی مدعا کو نہایت موزوں الفاظ میں ڈھال لیا۔ اسی طرح وینا کی ننگی تصویروں کی تجارت کرنے والوں کو بھی اپنے موافق الفاظ مل گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ اس دنیا میں سب سے بڑا فتنہ ہیں۔ الفاظ میں اتنی گنجائش ہے کہ جو شخص بھی چاہے اپنے خیالات کے لئے دلفریب الفاظ پالیتا ہے۔

ہر آدمی اپنی بات کو خوب صورت الفاظ میں ڈھال کر سمجھتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ حالاں کہ کسی بات کا خوب صورت الفاظ میں ڈھل جانا اس بات کا کافی ثبوت نہیں کہ وہ فی الواقع بھی حقیقت ہے۔ آخر کار کامیابی صرف اس شخص کو ملے گی جس کے پاس حقیقت ہو نہ کہ اس شخص کو جس کے پاس صرف الفاظ ہوں مگر حقیقت اس کے پاس موجود نہ ہو۔

فطرت کا اعتراف

کارل لیویس امریکا کا ایک مشہور کھلاڑی ہے۔ لاس اینجلس میں دوڑ کا عالمی مقابلہ ہوا۔ اس میں ۲۲ جون ۱۹۸۴ کو کارل لیویس نے اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ اس کامیابی کے بعد کارل لیویس کی ایک تصویر اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس تصویر کا عکس ہم مقابل کے صفحہ پر نقل کر رہے ہیں۔

اس تصویر میں کارل لیویس بالکل سجدہ کی حالت میں دکھائی دے رہا ہے جس پٹری پر دوڑ کر اس نے یہ مقابلہ جیتا تھا، اس پٹری کے لئے اس کے دل میں عقیدت اور احسان مندی کا اتنا شدید جذبہ پیدا ہوا کہ پٹری پر اپنی پیشانی رکھ کر وہ سجدہ میں گر پڑا۔

یہ ایک تازہ مثال ہے جو بتاتی ہے کہ انسانی فطرت میں کس طرح یہ جذبہ چھپا ہوا ہے کہ وہ کسی کو اپنا محسن سمجھے اور اس کے آگے اپنے بڑھے ہوئے جذبات عقیدت کو پیش کر سکے۔

یہ جذبہ انسانی فطرت کا سب سے گہرا جذبہ ہے۔ کوئی بھی انسان اس سے خالی نہیں، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب۔ انسانی فطرت کا علمی مطالعہ کرنے والے ماہرین نے اعتراف کیا ہے کہ یہ جذبہ انسانی فطرت میں اس طرح پیوست (Interwoven) ہے کہ اس کو کسی بھی طرح انسان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ جذبہ دراصل خدا کی پرستش کا جذبہ ہے۔ اس جذبہ کا مرجع حقیقۃً وہ ہستی ہے جو انسان کی خالق ہے۔ یہ جذبہ اس لئے ہے کہ انسان اپنے خالق و مالک کو پہچانے۔ وہ اس کی عظمت کا اعتراف کرے۔ وہ اس کے آگے اپنے آپ کو ڈال دے۔

مگر انسان فطرت کے راستہ سے انحراف کرتا ہے۔ جو چیز خدا کو دینا چاہئے وہ اسے دوسروں کو دیتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام شرک ہے۔ آدمی اگر اپنے فطری جذبات کا مرجع ایک خدا کو بنائے تو یہ توحید ہے اور اگر وہ اس کا مرجع کسی دوسری زندہ یا مردہ چیز کو بنائے تو یہ شرک ہے۔ توحید انسانی فطرت کا صحیح استعمال ہے اور شرک انسانی فطرت کا غلط استعمال۔

انسان عین اپنی فطرت کے زور پر مجبور ہے کہ وہ کسی کو اپنا "خدا" بنائے۔ حقیقی خدا چوں کہ ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا اس لئے وہ دکھائی دینے والی چیزوں کو خدا سمجھ لیتا ہے۔ جو کچھ خدا کو دینا چاہئے وہ اسے غیر خدا کو دے دیتا ہے۔

Carl Lewis kisses the track after winning the 200 meters at the recent U.S. Track and Field trials. With victory Lewis assured himself of a crack at Jesse Owens' record of four gold medals at the Berlin Olympics in 1936. Lewis had earlier qualified for the 100 meters, the long jump and the 4 x 100 meters relay. AP.

نفاذ شریعت

اسلام کا شرعی قانون آج اگرچہ کہیں پوری طرح نافذ نہیں۔ تاہم اگر کہیں وہ جزئی طور پر بھی نافذ ہے تو اس کے نتائج بتاتے ہیں کہ وہ انسانی سماج کے لیے رحمت ہے۔ اس کی ایک مثال موجودہ زمانہ میں سودی عرب ہے جہاں اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق جرائم کی تعداد تمام دنیا میں سب سے کم ہے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہاں کی عدالتوں میں شرعی قانون نافذ ہے۔

تاہم مسلمانوں کا جدید طبقہ اس سلسلہ میں کچھ شبہات وارد کرتا ہے۔ یہ شبہات خاص طور پر دو قسم کے ہیں:

۱۔ شریعت میں اختلافات ہیں، پھر اس کو عملاً نافذ کرنے کی صورت کیا ہوگی

۲۔ زمانہ بدل گیا ہے، اس لیے شرعی قانون آج کے لیے مفید نہیں

مسلم رہنماؤں کی ایک عالمی کانفرنس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مسلم ممالک میں شریعت اسلامی کا نفاذ کیا جائے تو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا:

ای شریعۃ نطبق۔ هل نطبق مذهب الامام احمد او مذهب الشافعی او مذهب مالک او ابی حنیفۃ.	ہم کس شریعت کو نافذ کریں گے۔ کیا امام احمد کا مذہب یا امام شافعی کا مذہب یا امام ابو حنیفہ کا مذہب۔

الشرق الاوسط (الریاض) ۲۸ جنوری ۱۹۸۴

اس سوال میں ایک مغالطہ چھپا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ اس قسم کے لوگ "شریعت" اور "فقہ" دونوں کو ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فقہ کی جزئیات میں اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ خود شریعت میں اختلاف ہے۔ نیز وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مختلف فقہی مذاہب محض جزئی امور میں اختلاف کی بنا پر الگ الگ شمار ہوتے ہیں نہ کہ اصولی اور اساسی امور میں اختلاف کی بنا پر۔

فقہاء کے درمیان اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ تشریع کا ماخذ قرآن اور سنت ہے اور اس کے بعد اجماع اور قیاس۔ (اجماع حقیقۃً کوئی مستقل چیز نہیں، وہ قیاس ہی کی کامل اور متفق علیہ صورت ہے)۔

فقہ اسلامی میں احکام کی جو تدوین ہوئی ہے، ان کا ایک حصہ وہ ہے جو کتاب و سنت سے براہ راست طور پر (عبارت النص سے) اخذ ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس کی بنیاد قیاس ہے۔ یعنی کتاب و سنت میں مذکور احکام سے استنباطی طور پر مزید احکام کا استخراج۔

جہاں تک احکام کے حصہ اوّل کا تعلق ہے، ان میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ صرف دوسری قسم کے احکام میں ہے اور یہ دوسری قسم کے احکام وہ ہیں جو فروع یا تفصیلی جزئیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اختلاف عین وہی چیز ہے جو تمام دنیا کے قوانین میں پایا جاتا ہے، خواہ وہ مذہبی قانون ہو یا غیر مذہبی قانون۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ قانون کی تفصیلی جزئیات میں ججوں اور ماہرین قانون کے درمیان ہمیشہ رایوں کا اختلاف رہتا ہے۔

اس کے باوجود ان قوانین پر بڑی بڑی حکومتوں کا نظام چل رہا ہے۔ اسی طرح اسلامی شریعت کا نظام بھی یقینی طور پر کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے۔

مثال کے طور پر قرآن میں یہ حکم ہے کہ جو شخص چوری کرے اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ اس حکم کی تفصیلی صورت مقرر کرنے میں فقہاء کے درمیان اختلافات ہیں۔ مگر وہ صرف اس لئے ہیں کہ مختلف حالات میں حکم کی تطبیق میں فرق ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ حد مقرر کرنا کہ کتنی مالیت کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے۔ قحط کی حالت میں اور افراط کی حالت میں کیا نسبت رکھی جائے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں یہ اختلاف کہ ہاتھ کو روایتی طور پر عام چھری سے کاٹا جائے یا آپریشن کے اصول پر کاٹا جائے وغیرہ۔

اس قسم کے اختلافات سے اصل حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ اس سے شریعت میں توسع اور لچک ثابت ہوتا ہے جو انسانوں کے لئے رحمت ہے جیسا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا:

ما سرنی ان اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم لم یختلفوا۔ لانھم لو لم یختلفوا لم تکن رخصة	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اختلاف نہ کرتے تو میرے لئے اس میں خوشی نہیں تھی کیونکہ اگر وہ اختلاف نہ کرتے تو رخصت نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسرا اعتراض مذکورہ تعلیم یافتہ بزرگ کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

الشریعة انما تصلح لزمان سابق ولا تصلح لعصرنا ھذا۔	شریعت قدیم زمانہ کے لئے مفید تھی مگر وہ ہمارے موجودہ زمانہ کے لئے مفید نہیں۔

فقہاء کا اختلاف ظاہر کرتا ہے کہ شریعت کے تفصیلی امور میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔ فقہاء کا اختلاف دراصل اجتہاد کا اختلاف ہے۔ یہی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شریعت ہر زمانہ کے لئے قابل نفاذ ہے۔ شریعت کی تفصیلات میں اختلاف ہونا اس کے توسع کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ اس امکان کو بتاتا ہے کہ اس کے عملی انطباق میں ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو زمانہ کی تبدیلی کے بعد شریعت کے نفاذ کے لئے مطلوب ہے۔ پھر شریعت کا بدلے ہوئے زمانہ میں قابل نفاذ ہونا مشکوک کیوں۔

حق کی دعوت

آجکل ہر آدمی دعوت حق کا نام لیتا ہے مگر دعوت حق ابھی تک وجود میں نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ اس کی قیمت ادا کرنا نہیں چاہتے۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور دعوت حق کی بھی ایک قیمت ہے جب تک وہ قیمت ادا نہ کی جائے دعوت حق کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔

حق کی دعوت دینے کی لازمی شرط یہ ہے کہ غیر حق کو چھوڑ دیا جائے ــــــ خدا کی بڑائی بیان کرنے کے لئے اٹھنا اور انسانوں کی بڑائی میں گم رہنا، آخرت کا داعی بننا اور دنیا کے مفادات کے لئے قوموں سے کش مکش کرنا، ابدی مسائل کی بات کرنا اور اسی کے ساتھ وقتی مسائل میں الجھے رہنا، یہ سب تضاد کی باتیں ہیں اور جو لوگ اپنے اندر تضاد لئے ہوئے ہوں وہ کبھی حق کے داعی نہیں بن سکتے۔

اس قسم کا ہر واقعہ بتاتا ہے کہ لوگ "داعی حق" کا ٹائٹل لینے کے لئے تو دوڑ پڑے ہیں مگر وہ اس کی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

لوگوں کو اپنی مفروضہ شخصیتیں اتنی زیادہ محبوب ہیں کہ ان پر ادنی تنقید سننا بھی انھیں گوارا نہیں۔ لوگوں کو اپنے دنیا کے مفادات اور مصلحتوں سے اتنی دلچسپی ہے کہ وہ ان کو کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہتے۔ جو قومیں اسلام کے پیغام رحمت کی مخاطب ہیں ان سے وہ قومی اور مادی لڑائی چھیڑ کر انھیں اسلام سے بدکائے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی چیزوں کے ساتھ حق کی دعوت کا نام لینا صرف یہ ثابت کرتا ہے کہ آدمی حق کی دعوت کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں۔

حق کی دعوت ابدی صداقتوں کی دعوت ہے۔ حق کی پکار خدا اور آخرت کی پکار ہے۔ یہ ایک نہایت نازک کام ہے جس کے ساتھ کوئی دوسرا کام جمع نہیں ہو سکتا۔

حق کا داعی لوگوں کو موت اور قیامت کے بھیانک مسئلہ سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کو ہر واقعہ میں آخرت کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ وہ گرمی کی شدت دیکھتا ہے تو اس میں اس کو نار جہنم کی شدت دکھائی دیتی ہے۔ اس کو معاشی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے تو وہ بھی اس کو آخرت کی تکلیف یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو "ظلم" کے خلاف چیختے ہوئے دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ لوگو، اس دن کو یاد کرو جب تمھارے پاس زبان بھی نہ ہوگی کہ تم بولو اور پانی کا ایک گلاس بھی نہ ہوگا جس سے تم اپنے سینہ کی آگ ٹھنڈی کرو۔

قومی عظمت

رومی شہنشاہیت کا زوال (Decline and Fall of the Roman Empire) ایڈورڈ گبن کی مشہور کتاب ہے۔ انگریز مورخ کو یہ کتاب لکھنے کا خیال کیوں کر پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا خیال اس کو اس وقت آیا جب کہ اس نے روم کے کھنڈرات دیکھے۔ رومی شہنشاہیت کے کھنڈرات میں اس نے یورپ کی عظمتِ ماضی کا نشان دیکھا۔ اور اس کے برباد ہو جانے کا مشاہدہ کیا۔

اس مشاہدہ نے ایڈورڈ گبن کے دل میں تڑپ پیدا کی۔ وہ اس موضوع کی تحقیق میں لگ گیا۔ یہاں تک کہ اس نے وہ کتاب لکھی جو کہ نہ صرف رومی سلطنت کی اہم تاریخ ہے بلکہ خود تاریخ نویسی پر خالص فنی اعتبار سے ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اسی طرح تاریخ کے موضوع پر سر سید کی مشہور کتاب آثار الصنادید (۱۸۴۷) ہے۔ سرسید کو اس کتاب کے لکھنے کا خیال بھی عظمت ماضی کے "کھنڈرات" کو دیکھ کر ہوا۔ دہلی کی منصفی کے زمانہ میں سرسید نے دہلی کی تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ ان عمارتوں میں انھوں نے سنسان عظمت کا جو مشاہدہ کیا اس نے ان کے اندر ایک تڑپ پیدا کر دی۔ انھوں نے دہلی کی ایک ایک عمارت کی تحقیق شروع کر دی۔ چھٹیوں کو وہ اس طرح استعمال کرتے کہ دہلی کے اطراف کی عمارتوں کو دیکھنے نکل جاتے اور کئی کئی دن تک ان کی تحقیق میں مشغول رہتے۔

اس تحقیق میں انھوں نے غیر معمولی محنت کی۔ بہت سی قدیم عمارتیں اس قدر بوسیدہ تھیں کہ ان کے کتبے بھی بوسیدہ ہو چکے تھے۔ بہت سے کتبوں سے پوری معلومات حاصل نہیں ہوتی تھیں۔ کچھ کتبے ایسے خط میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ کتبوں پر جو نام درج تھے ان کی تاریخی کتابوں سے تحقیق کرنی پڑتی تھی۔ انھوں نے ان تمام مشکلات کو جھیلا۔ انھوں نے ہر عمارت کے طول و عرض کی پیمائش کی۔ اس کے حالات لکھے۔ کتبوں کے چربے اتارے۔ ہر عمارت کا نقشہ مصور سے بنوایا کیونکہ اس زمانہ میں کیمرہ موجود نہ تھا۔ اس طرح انھوں نے تقریباً سوا سو عمارتوں کی تفصیلات مرتب کیں۔

قطب مینار کی غیر معمولی بلندی قدیم زمانہ میں کسی محقق کے لئے زبردست مسئلہ تھی۔ سرسید نے قطب مینار کے اونچے کتبوں کو پڑھنے کے لئے دو بلیاں لگوا کر ان میں چھینکے لٹکواتے اور اس کے اندر بیٹھ کر اوپر گئے اور کتبوں کی نقل تیار کی۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ سرسید کی آئندہ ترقیات کی گویا پہلی سیڑھی تھی اور ان کی یہ حالت بالکل ابو تمام کے اس شعر کی مصداق تھی:

فيصعد حتی يظن الوریٰ بان لـه حاجة فی السماء

(وہ اس طرح اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کو آسمان میں کچھ ضرورت ہے)

عظمت ماضی کے کھنڈر کو دیکھ کر جس طرح گبن اور سرسید مورخ بن گئے۔ اسی طرح بہت سے لوگ ہیں جن کو عظمت ماضی کے کھنڈر نے لیڈر اور مفکر بنادیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوئے جب کہ مسلمانوں کو زوال آچکا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے دور عظمت کے کھنڈر دیکھے۔ ان کھنڈرات کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے۔ کھوئی ہوئی عظمت کے شکستہ مناظر کو دیکھ کر ان کا دل پارہ پارہ ہوگیا۔

قائدین کی بھیڑ میں کوئی نظر نہیں آتا جس نے جنت کے باغوں کو لہلہاتے ہوئے دیکھا ہو اور جہنم کے شعلوں کی لپٹ محسوس کرکے تڑپ اٹھا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں آخرت کی دعوت کی کوئی حقیقی تحریک نہ اٹھ سکی۔ البتہ قومی عظمت کو حاصل کرنے کی تحریکیں اتنی زیادہ ابھر آئیں کہ ان کے شور سے شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں کان بہرے نہ ہو جائیں۔

متفقین سے گزارش

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ ایک مشن ہے۔ جو لوگ اس مشن سے متفق ہیں ان سے ہماری درخواست ہے کہ حسب ذیل پروگرام میں شرکت کرکے ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں۔

۱۔ ماہنامہ الرسالہ کی ایجنسی قائم کریں (شرائط ایجنسی آخر میں ملاحظہ فرمائیں)

۲۔ الرسالہ کے ادارہ سے چھپی ہوئی کتابیں لوگوں کے درمیان پھیلائیں۔

۳۔ اجتماعات کے مواقع پر بک اسٹال لگائیں جس میں الرسالہ اور کتابیں رکھی جائیں۔

۴۔ متفقین کو جوڑ کر ہفتہ وار اجتماع کریں۔

۵۔ مساجد اور دوسرے اجتماعی مقامات پر تذکیر القرآن پڑھ کر سنائیں۔

۶۔ مختلف علاقائی زبانوں میں الرسالہ کی مطبوعات کے ترجمے شائع کریں۔

سکریٹری اسلامی مرکز

آرزوؤں کی دنیا

جنت کا انکار اپنے آپ کا انکار ہے۔ جو شخص جنت کو نہیں مانتا وہ خود اپنی نفی کر رہا ہے۔ جو شخص جنت کو مانتا ہے مگر اس کے لئے عمل نہیں کرتا وہ ایسا خریدار ہے جو ایک چیز خریدنا چاہتا ہے مگر س کی قیمت دینے کے لئے تیار نہیں۔

ہر انسان سب سے زیادہ کیا چاہتا ہے۔ ہر انسان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے خوابوں کی دنیا کو پا سکے ـــــ وہ ابدی طور پر جیتا رہے۔ وہ اپنی تمام آرزوؤں کی تکمیل کر سکے۔ وہ ایسی زندگی کا مالک بنے جو ہر قسم کی محدودیت (Limitations) اور ناخوشگواری (disadvantage) سے خالی ہو۔

یہ آدمی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ ہر آدمی اپنی اس تمنا کی تکمیل کے لئے دوڑ رہا ہے۔ مگر کوئی بھی آدمی اپنی اس تمنا کو پورا نہیں کر پاتا۔ آدمی اپنی صحت بناتا ہے مگر بہت جلد اس کی صحت کسی حادثہ یا بڑھاپے کا شکار ہو جاتی ہے۔ آدمی دولت جمع کرتا ہے مگر دولت اس کے قلب و دماغ کو سکون نہیں دیتی۔ وہ اقتدار پر قبضہ کرتا ہے مگر اقتدار صرف اس کے مسائل میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ وہ عیش و عشرت کے سامان اکٹھا کرتا ہے مگر جلد ہی وہ اکتاہٹ (Boredom) کا شکار ہو جاتا ہے۔

ہر آدمی اپنے لئے ایک جنت کی تعمیر میں لگا ہوا ہے۔ مگر وہ اپنی جنت بنا نہیں پاتا کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ وہ اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو لئے ہوئے موجودہ دنیا سے چلا جاتا ہے۔

آدمی موت کے بعد کہاں جاتا ہے۔ وہ وہاں جاتا ہے جہاں اس کے خوابوں کی جنت بنی ہوئی ہے۔ مگر یہ جنت اس شخص کو ملتی ہے جس نے موت سے پہلے والی زندگی میں اس کی قیمت ادا کی ہو۔ جو شخص موجودہ دنیا میں جنت کی قیمت ادا نہیں کرتا وہ گویا اسی چیز کی محرومی کا خطرہ مول لے رہا ہے جس کو وہ سب سے زیادہ پانا چاہتا ہے۔

جنت ہماری آرزوؤں کا محل ہے۔ مگر جنت صرف اس شخص کے حصہ میں آتی ہے جس نے اس کو آخرت میں تعمیر کیا ہو۔ جو شخص اپنی جنت موجودہ دنیا میں تعمیر کرے اس کے لئے ابدی محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔

کیسی عجیب ہے وہ محرومی جب کہ آدمی عین اسی چیز سے ابدی طور پر محروم ہو جائے جس کے لئے وہ ساری عمر سب سے زیادہ آرزومند بنا ہوا تھا۔

محبت کا نذرانہ

قرآن کی ایک آیت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: اور بعض انسان وہ ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے کرنا چاہئے۔ اور جو ایمان والے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ ساری قوت اللہ ہی کے لئے ہے، اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (البقرہ ۱۶۵)

آدمی اپنی فطرت اور اپنے حالات کے لحاظ سے ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ خارجی سہارا چاہتا ہے ایک ایسی ہستی جو اس کی کمیوں کی تلافی کرے۔ اور اس کے لئے اعتماد و یقین کی بنیاد ہو۔ کسی کو اس حیثیت سے اپنی زندگی میں شامل کرنا اس کو معبود بنانا ہے۔ جب آدمی کسی ہستی کو اپنا معبود بناتا ہے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی محبت اور عقیدت کے جذبات اس کے لئے خاص ہو جاتے ہیں۔ آدمی عین اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ وہ کسی سے حب شدید کرے اور جس سے کوئی شخص حبّ شدید کرے وہی اس کا معبود ہے۔

موجودہ دنیا میں چوں کہ خدا نظر نہیں آتا اس لئے ظاہر پرست انسان عام طور پر نظر آنے والی ہستیوں میں سے کسی ہستی کو وہ مقام دے دیتا ہے جو دراصل خدا کو دینا چاہئے۔ یہ ہستیاں اکثر وہ سردار یا پیشوا ہوتے ہیں جن کو آدمی "بڑا" سمجھ لیتا ہے اور پھر وہ دھیرے دھیرے لوگوں کی توجہات کا مرکز بن جاتے ہیں۔ لوگ اس طرح ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں جیسا گرویدہ انھیں صرف خدا کا ہونا چاہئے۔ آدمی کی فطرت کا خلا جو حقیقۃً اس لئے تھا کہ اس کو خدا سے پر کیا جائے وہاں کسی غیر خدا کو بٹھا لیا جاتا ہے۔

انسان کے پاس کسی کو دینے کے لئے جو سب سے بڑی چیز ہے وہ محبت ہے۔ ایسی حالت میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص خدا جیسی باکمال ہستی کو پائے اور اس کی خدمت میں محبت سے کم تر درجہ کی کوئی چیز پیش کرے۔ محبت سے کم کوئی چیز نہ تو خدا قبول کرتا اور نہ کسی انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ خدا کے حضور میں محبت سے کم کسی چیز کا نذرانہ پیش کرے۔ اپنی چیزوں میں سے کم تر چیز کا ہدیہ خدا کو پیش کرنا صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی نے خدا کو اس کے جلال و کمال کے ساتھ پایا ہی نہیں۔

غلط ذہن

دہلی کے ایک مسلم محلہ میں ایک اردو پوسٹر نظر سے گذرا۔ سرخی یہ تھی:

"آگ اور خون میں نہائے ہوئے ہندستانی مسلمان سوال کرتے ہیں"

یورپ کے سفر میں ایک مقام پر میں نے دیکھا کہ ایک پرجوش نوجوان عربی اور انگریزی میں چھپا ہوا ایک کتابچہ تقسیم کر رہے ہیں۔ اس کے صفحۂ اول پر یہ الفاظ درج تھے:

"ہندستان جو مسلمانوں کے لئے عظیم مذبح بن چکا ہے"

ہندستان میں جزئی طور پر ضرور ایسے بعض واقعات ہوئے ہیں جن پر مذکورہ بالا الفاظ صادق آتے ہیں مگر پورے ملک کے بارہ میں اس قسم کے الفاظ بولنا سراسر خلاف واقعہ ہے۔ اور جو لوگ خلاف واقعہ بات پر اپنی عمارت کھڑی کرنا چاہیں وہ یقینی طور پر خدا کی مدد نہیں پا سکتے۔

اس طرح سوچنے اور بولنے میں ایک نقصان یہ ہے کہ آدمی کبھی مسئلہ کے صحیح حل تک نہیں پہنچتا۔ "مسئلہ کا حل کیا ہے" اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی یہ جانے کہ "مسئلہ کی نوعیت کیا ہے"۔ مسئلہ کی نوعیت کو جانے بغیر مسئلہ کا حل متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مذکورہ طرز پر سوچنے والے اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ مسئلہ کی نوعیت دریافت نہ کر سکے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ وہ مسئلہ کا حل پا سکیں۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ یہ طرز کلام آدمی سے حقیقت پسندی چھین لیتا ہے۔ دنیا کا نظام اس کے پیدا کرنے والے نے کامل حقیقت پسندی کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ یہاں کوئی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے اصول فطرت سے کلی مطابقت ضروری ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ دوسروں پر جھوٹا الزام دینے کو اپنا طریق فکر بنائیں وہ یقینی طور پر حقیقت پسندی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا میں بے حقیقت ہو کر رہ جائیں۔

اس قسم کی باتیں کرنے والے اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ دو واقعات کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ ایسے لوگ جہاں بھی ہوں وہ ہمیشہ صرف فساد پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی ایک حکومت یا ان کا ایک بھائی اگر ۹ کام صحیح کرے اور اس سے ایک کمزوری ظاہر ہو جائے تو وہ اسی کمزوری کو لے کر ایسا ہنگامہ کریں گے گویا وہ اس کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔

ایک سفر

۱۱ مئی ۱۹۸۴ کی صبح کو مجھے رانچی (بہار) جانے کے لئے انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ نمبر ۴۰۹ پکڑنی تھی۔ صبح کو فجر کی نماز پڑھ کر روانہ ہوا۔ دہلی ایئرپورٹ پہنچا تو سورج کا روشن چہرہ افق سے اوپر آچکا تھا۔ ہوائی اڈہ کی روشنیاں اگرچہ ابھی بجھائی نہیں گئی تھیں مگر سورج کی روشنی کے آگے وہ اپنا وجود کھوتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ بجلی کے وہ قمقمے جو ہوائی اڈہ کو رات کے وقت "دن" بنائے رہتے ہیں، جب سورج نکلا تو ایسا معلوم ہوا گویا ان میں کوئی روشنی ہی نہ تھی۔

سورج کے ظاہر ہوتے ہی تمام چمک دار بلب ماند پڑ گئے۔ فلڈ لائٹ کے کھمبے بے نور نظر آنے لگے۔ سورج نے اگرچہ لفظوں کی صورت میں کوئی اعلان نہیں کیا، مگر اس کا نکلنا ہی مصنوعی روشنیوں کے بے حقیقت ہونے کا اعلان بن گیا۔

اس دنیوی واقعہ میں تھوڑی دیر کے لئے مجھے آخرت کی تصویر نظر آنے لگی۔ میں نے سوچا کہ ایسا ہی معاملہ آخرت میں ہونے والا ہے جب کہ خدا اپنے جلال و کمال کے ساتھ انسانوں کے سامنے آجائے گا۔ انسانی تاریخ ایک لمبی تاریخ ہے جو دنیا سے لے کر آخرت تک چلی جا رہی ہے۔ موجودہ دنیا گویا اس کا "رات" کا لمحہ ہے اور آخرت اس کا "دن" کا لمحہ۔ آج بہت سے انسان جھوٹی بڑائی کا مقام حاصل کئے ہوئے ہیں۔ بہت سے "بلب" بظاہر چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر انسانی تاریخ کے اگلے مرحلہ میں جب خدا اپنے روشن چہرہ کے ساتھ سامنے آئے گا تو تمام مصنوعی بلب اچانک اس طرح اپنی روشنی کھو دیں گے جیسے کہ وہ جھوٹے بلب تھے۔ ان کی چمک محض وقتی تاریکی سے فائدہ اٹھانے کا نام تھی نہ کہ کوئی حقیقی چمک۔

ہوائی جہاز جب فضا میں اڑ رہا ہو تو اکثر مسافر آپ کو خوش باشی کی چیزوں میں مشغول نظر آئیں گے مگر کسی باشعور انسان کے لئے یہ اپنے عجز کا غیر معمولی تجربہ ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کے اندر معمولی خرابی آدمی کو ایک لمحہ میں ہلاکت تک پہنچا سکتی ہے۔ چنانچہ دوران پرواز مجھے اپنے عجز اور بے بسی کا غیر معمولی احساس ہوا بے ساختہ میرا دل بھر آیا۔ اس وقت مجھے ایک صاحب کی بات یاد آئی جنھوں نے پچھلے دن مجھ سے کہا تھا کہ آپ کے بارہ میں عام خیال یہ ہے کہ آپ کے اندر کبر ہے۔ یہ سوچ کر بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"کیسا کبر اور کیسی انا" میری زبان سے نکلا۔ ایک انسان کے پاس ہے کیا جو وہ انانیت دکھائے۔

اور کبر میں مبتلا ہو۔ بخدا، اس آسمان کے نیچے اس سے زیادہ خلاف واقعہ بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا قصور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میں نے مصلحت کی زبان اختیار نہیں کی۔ جو چیز مجھے حق نظر آئی اس کو میں نے حق کہا اور جو چیز مجھے باطل دکھائی دی اس کو باطل کہا۔ خدایا تو گواہ رہ کہ میں اس قسم کے تمام الزامات سے بری ہوں۔ میں نے صرف تیری بڑائی کا اعلان کیا اور لوگوں نے اس کو میری بڑائی سمجھا۔ میں نے تیری ذات کمال کی حمد کی اور لوگوں نے اس کو میری خودستائی خیال کیا۔ میں نے صرف حق کی یکتائی پر زور دیا اور لوگوں نے اس کو میری انانیت قرار دیا۔

جہاز جب روانہ ہوا تو ایئر ہاسٹس نے اپنے اعلان میں حسب معمول یہ جملہ بھی کہا:

Captain Chowdhry is in command

میں نے سوچا کہ انسان کیسی بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ یہ دراصل خدا ہے جو جہاز کی کمانڈ میں ہے۔ مگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں کمانڈ میں ہوں۔ ہوائی جہاز کا اڑنا اس سے بڑا واقعہ ہے کہ کوئی انسان اس کو ظہور میں لا سکے۔ وہ بے شمار کائناتی اسباب جو ایک "مصنوعی چڑیا" کے اڑنے کو ممکن بناتے ہیں ان کو ذہن میں رکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں سب کچھ خدا کر رہا ہے، انسان تو بس مفت کا کریڈٹ پا رہا ہے۔

جہاز جب مسافروں کو لے کر فضا میں اڑتا ہے تو یہ قدرت کا حیرت ناک معجزہ ہوتا ہے۔ انسان نے المونیم اور پلاسٹک اور اسٹیل اور پٹرول جیسی کچھ چیزوں کو جوڑ کر ایک ڈھانچہ بنایا اور اس کو حرکت دی تو وہ مسافروں کو لے کر فضا میں اڑنے لگا اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچا دیا۔

اس واقعہ میں بیشتر حصہ خدا کا ہے۔ انسان کا حصہ بہت تھوڑا ہے۔ تاہم انسان جب تک اپنی جانب کا تھوڑا حصہ نہایت صحت کے ساتھ ادا نہ کرے کوئی جہاز کبھی فضا میں نہیں اڑ سکتا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ اسلامی انقلاب کا بھی ہے۔ اسلامی انقلاب تمام تر خدا کی قدرت سے وجود میں آتا ہے۔ انسان کو اس میں بہت تھوڑا حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہوائی جہاز کی دنیا میں انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ اپنی جانب کا حصہ واقعی طور پر ادا کئے بغیر وہ جہاز کو فضا میں نہیں اڑا سکتا۔ مگر اسلام کے علمبرداروں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی جانب کا تھوڑا حصہ بھی ادا نہیں کرتے اور جھوٹا جھنڈا لہرا کر اعلان کرتے ہیں کہ وہ اسلامی انقلاب کے ہیرو ہیں۔

۱۲ مارچ کو ۱۰ بجے میں رانچی پہنچا۔ یہاں میرا قیام ہوٹل ہمراٹ میں تھا۔ لوگ بڑی تعداد میں

ملنے کے لئے آتے رہے۔ ان سے دینی و ملی موضوعات پر گفتگو جاری رہی۔ ایک صاحب جو مختلف جماعتوں اور نظریات کا مطالعہ اور تجربہ کرتے رہے ہیں، ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کی آخری دریافت کیا ہے۔ انھوں نے لیظھرہ علی الدین کلہ کی آیت پڑھی اور کہا کہ میرے نزدیک یہی وہ آیت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اس دنیا میں کیا کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ اس آیت میں لیظھرہ کے فعل کا فاعل خدا ہے۔ پھر کیا آپ ایک خدائی واقعہ کو انسانی مشن قرار دینا چاہتے ہیں۔

رانچی کی آبادی تقریباً دس لاکھ ہے جس میں تقریباً دو لاکھ مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کی معاشی حالت عام طور پر اچھی ہے تاہم تعلیم میں وہ بہت پیچھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کا کوئی اخبار نہیں۔ آپس کے اختلافات کی بھی، حسب معمول، ان کے اندر کمی نہیں۔

رانچی ضلع میں اور دوسرے ملحق اضلاع میں قدیم قبائل بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں جن کو آدی باسی کہتے ہیں۔ یہ لوگ کوئی خاص مذہب نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی تعصب اور تکلف سے خالی ہوتی ہے۔ ان کے اندر کٹرپن نہیں پایا جاتا۔ ان کے اندر اسلام کی تبلیغ کے زبردست مواقع ہیں۔ مگر اس امکان کو ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ عیسائی مشنریاں ان میں بہت بڑے پیمانے پر کام کر رہی ہیں۔ اور بہت سے آدی باسی خاندانوں کو انھوں نے عیسائی بنایا ہے۔ تاہم اس کے باوجود اسلامی تبلیغ کے امکانات بدستور موجود ہیں۔ کیوں کہ عیسائی ہونے سے ان کی سماجی پوزیشن نہیں بدلی۔ وہ عیسائیوں کے اندر اچھوت کی مانند رہتے ہیں۔ اس بنا پر ان کی نئی نسل میں عیسائیت کے خلاف عدم اطمینان پایا جاتا ہے۔

انگریزی حکومت کے آخری دور میں عیسائی مشنریوں نے بہت بڑی تعداد میں یہاں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ یہاں اتنے بڑے بڑے عیسائی مشن قائم ہیں جن کا رقبہ کئی کئی میل کے دائرہ میں پھیلا ہوا ہے۔

مولانا قاضی شعیب احمد ایم اے (شعبۂ اردو رانچی یونی ورسٹی) نے اپنا ایک ذاتی واقعہ ان الفاظ میں بتایا: میں رانچی کے قریب ایک گاؤں اٹکی میں تھا، اٹکی میں مشن کا بڑا علاقہ ہے۔ یہ عیسائی مشن تعلیم و تربیت کے علاوہ تبلیغ کا کام بھی کرتا ہے۔ وہاں کے پادری سے ہمارے تعلقات تھے، کئی مسلمان ان کے ملنے والے تھے، یہ بات غالباً ۱۹۶۵ کی ہے۔ میں نے ایک دن پادری صاحب سے سوال کیا کہ آپ طویل مدت سے اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام کرتے آرہے ہیں، غیر مسلموں میں آپ کی تبلیغ کے اثرات تو مجھے معلوم ہیں یہ بتائیے کہ اب تک کتنے مسلمان ہیں جنھیں آپ نے اس علاقہ میں عیسائی بنایا ہے۔ میرے اس سوال کے جواب میں انھوں نے کہا:

مولوی صاحب! میری یادداشت کے مطابق رجسٹرڈ لوگوں میں ایک بھی نام نہیں، پھر انھوں

نے انہی کے مثل میاں جنھیں عرف عام میں بادشاہ نانا کہا جاتا تھا ایک واقعہ سنایا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ پادری صاحبان کی تبلیغ سے عیسائیت اختیار کرنے پر راضی ہو گئے مگر جب ان کے نام سے محمد کا لفظ نکال کر دوسرا نام رکھا گیا تو وہ بگڑ کر عیسائیت سے الگ ہو گئے اور اس کے بعد پہلے سے زیادہ متشدد مسلمان بن گئے۔

رانچی کے زمانہ قیام میں مولانا ابوالکلام آزاد کو اندازہ ہوا کہ اس علاقہ کے مسلمان عیسائی مشنریوں کی زد میں ہیں اور غیر معمولی تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے ہر طرح کی بربادی کا شکار ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ۱۵ اگست ۱۹۱۷ کو انجمن اسلامیہ رانچی کی بنیاد ڈالی۔ اس کام میں انھیں مقامی طور پر غیر معمولی تعاون ملا۔ مولوی ضیاء الحق جو جامع مسجد میں موذن تھے انھوں نے ایک زمین مدرسہ کی عمارت کے لئے وقف کر دی جس کی قیمت اس وقت آٹھ ہزار روپے سے زیادہ تھی۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی اس کی امداد میں حصہ لیا۔ مثلاً رائے بہادر ٹھاکر داس، منشی جگت پال سہائے وکیل وغیرہ۔ منشی ظہور علی رئیس ڈورنڈا نے خصوصی تعاون کیا۔ چنانچہ مذکورہ زمین پر مولانا آزاد نے خود اپنی نگرانی میں ایک بڑی عمارت تعمیر کرائی جو ابھی تک موجود ہے۔ مولانا آزاد نے البلاغ پریس کی پوری رقم بھی اس عمارت کی تعمیر میں دے دی تھی۔

مذکورہ مدرسہ ایک عرصہ تک آزاد تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۱۹۲۷ میں مالی پریشانیوں کی وجہ سے بہار مدرسہ اگزامینیشن بورڈ سے اس کا الحاق کر دیا گیا۔ تاکہ حکومت کی مدد کے ذریعہ اسے باقی رکھا جا سکے۔ اب اس میں مولوی، عالم، فاضل کے امتحانات کی تیاری کرائی جاتی ہے۔ اس وقت مدرسہ کے اسٹاف میں پندرہ اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ مدرسہ کے ان امتحانات کو حکومت نے آئی اے بی اے اور ایم اے کے برابر تسلیم کر لیا ہے۔ مدرسہ کے نئے منتظمین کا منصوبہ ہے کہ مولانا آزاد کی اس واحد یادگار کو مزید ترقی دے کر ایک بڑا ادارہ بنا دیا جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے قیام رانچی کے زمانہ میں یہاں کی جامع مسجد میں پابندی سے تقریر کرتے تھے اور قرآن کا درس دیتے تھے۔ اپنی تفسیر ترجمان القرآن کا بھی بڑا حصہ انھوں نے رانچی ہی میں تحریر کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد تقریباً چار سال (۱۹۱۶-۱۹۱۹) رانچی میں نظر بند کی حیثیت سے رہے نظر بندی کی اس مختصر سی مدت میں انھوں نے یہاں کے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے بہت سے دیرپا کام کئے۔ عربی مدرسہ، اسکول، اسپتال، قبرستان، رسوم کی اصلاح وغیرہ۔ یہ سب خالص تعمیری کام تھے جن کے اثرات اب تک رانچی میں موجود ہیں ـــــ عجیب بات ہے کہ ہمارے بڑے بڑے قائدین

کو تعمیری کام کرنے کا خیال صرف اس وقت آیا جب کہ انھیں کام کے میدان سے ہٹا دیا گیا تھا۔

رانچی میں میرے حسب ذیل پروگرام تھے :

۱۲ مئی ۱۹۸۴ شام کو نماز مغرب کے بعد آر۔ ٹی بلڈنگ میں "اسلامی دعوت" کے موضوع پر خطاب

۱۳ مئی ″ صبح ۹ بجے ہوٹل سمراٹ میں "مطالعہ قرآن کے اصول" کے موضوع پر ائمہ اور اساتذہ کے سامنے ایک گفتگو۔

۱۱ بجے شہر کے مسلم اسپتال اور تعلیمی اداروں کا معائنہ۔

۴ بجے شام مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی اور کارناموں پر سیمنار کی صدارت

شام کو نماز عشا کے بعد اجلاس عام کی صدارت اور تقریر

شام کے آخری اجلاس میں تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام کی کافی بڑی تعداد تھی۔ مختلف لوگوں کی تقریریں ہوئیں۔ آخر میں میں نے مفصل طور پر ایک تقریر کی جس کا موضوع تھا "ملت کی تعمیر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں"۔ پورا مجمع تقریر کے آخر تک نہایت سکون کے ساتھ بیٹھا رہا۔ جلسہ کے بعد ایک صاحب نے کہا۔ "رانچی کی تاریخ میں یہ پہلا اجتماع تھا کہ لوگ آخر تک بیٹھے تقریر سنتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اٹھنا ہی نہیں چاہتے۔

رانچی سے دہلی کے لئے واپسی ۱۴ مئی ۱۹۸۴ کو فلائٹ نمبر ۴۱۰ سے ہوئی۔ جہاز کے اندر انڈین ایئر لائنز کا ماہنامہ سواگت (مئی ۱۹۸۴) پڑھنے کا اتفاق ہوا اس میں ایک مضمون (Behind the Scenes) کے عنوان سے تھا۔ اس میں کامن ویلتھ ہیڈس آف گورنمنٹ میٹ CHOGM کے سفر کی روداد درج تھی جو نومبر ۱۹۸۳ میں نئی دہلی میں ہوئی تھی اور جس میں دولت مشترکہ کے سربراہان مملکت شریک ہوئے تھے۔

۲۵ نومبر ۱۹۸۳ کو انڈین ایئر لائنز کے چار خصوصی طیارے ان ۳۹ سربراہان کو دہلی سے گوا لے گئے جو دنیا کی آبادی کے ایک تہائی حصہ کے نمائندہ تھے۔ جیسے ہی گھڑی نے بارہ بجائے ایئر لائنز اپنی عظیم ذمہ داری (Great responsibility) کی ادائگی کے لئے متحرک ہو گئی۔ امپورٹڈ موٹروں کا قافلہ ٹھیک بارہ بج کر دو منٹ پر اہم ترین شخصیتوں (VVIP) کے ٹرمنل پر آکر کھڑا ہو گیا تاکہ اپنے ممتاز مسافروں کو ہوائی جہاز پر سوار کرائے۔ پورا عمل گھڑی کی سوئی کی سی صحت کے ساتھ بالکل متعین وقت پر انجام دیا گیا :

It was an operation that moved with clock work precision and smoothness, with exact "on time".

آدھ گھنٹہ کے اندر چاروں خصوصی جہاز گوا کے ہوائی اڈہ ڈابولم (Dabolin) پر اتر گئے

یہ پورا آپریشن نہایت صحت اور باقاعدگی کے ساتھ ہوا۔ اس کا راز تھا کئی مہینے کی مفصل منصوبہ بندی

(Careful planning) اس کے لئے ایک خصوصی جوکھم سل بنایا گیا۔ ہر چھوٹی تفصیل پر پوری توجہ کی گئی تاکہ اس معاملے کی مکمل کامیابی کی ضمانت ہو سکے۔

Attention was paid to each small detail to ensure the complete success of this challenging exercise.

یہ تیاریاں کئی محاذ پر جاری تھیں۔ انڈین ایئر لائنز کے کارکنوں کی فوج سے انتہائی تربیت یافتہ اور تجربہ کار مردوں اور عورتوں کا انتخاب کیا گیا۔ جو جہاز ان ممتاز مسافروں کی سواری کے لئے استعمال کئے جاتے والے تھے ان کو دوبارہ درست کیا گیا اور ان میں ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی پوری کوشش کی گئی منتخب عملہ کی از سر نو تربیت کی گئی۔ ان جہازوں کو اڑانے کے لئے وہ سنیئر ہوا باز چنے گئے جن کا فلائنگ تجربہ ۲۵ ہزار گھنٹے سے زیادہ تھا۔ بطور ریہرسل کے دہلی سے گوا اور گوا سے دہلی کے لئے دو پیشگی پروازیں کی گئی تاکہ ہر چیز کا پہلے سے کامل اندازہ کیا جا سکے۔ ۲۷ نومبر کو ان معزز مہمانوں کو دہلی واپس آکر ڈنر کھانا تھا۔ چنانچہ نہایت صحت وقت کے ساتھ انھیں دوبارہ واپس دہلی پہنچا دیا گیا۔

مذکورہ بالا قسم کی مختلف تفصیلات بیان کرنے کے بعد آخر میں مضمون نگار نے اپنے مضمون کو ان الفاظ پر ختم کیا تھا:

A test, you might say, the airline passed with flying colours.

یہ ایک آزمائش تھی جس میں انڈین ایئر لائنز شاندار طور پر کامیاب ہوئی۔

یہ الفاظ میں انڈین ایئر لائنز کے ایک ایسے جہاز میں پڑھ رہا تھا جو اپنے مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ لیٹ اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا۔ چوگم کانفرنس کے موقع پر اسی قسم کا اظہار دہلی کے محکمۂ ٹیلیفون نے بھی کیا تھا۔ اس نے پر فخر طور پر کہا تھا کہ سربراہان مملکت کے لئے ٹیلیفون کا اتنا اعلیٰ انتظام تھا کہ ان میں سے کوئی شخص اگر کسی بیرونی ملک سے بات کرنا چاہتا تو صرف تین منٹ کے اندر اس کا رابطہ مطلوبہ ملک سے قائم ہو جاتا تھا۔ حالاں کہ دہلی کے کسی عام باشندہ کے لئے اتفاقاً ہی کبھی یہ خوش قسمتی پیش آسکتی ہے کہ وہ صرف تین منٹ کے اندر ملک کے اندر یا ملک کے باہر ٹیلی فونی رابطہ قائم کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ جچے تلے پرچے حل کر کے امتحان پاس کرنا ہے۔ انڈین ایئر لائنز (یا محکمۂ ٹیلی فون) کی جانچ کا معیار اس کی روزمرہ کی کارکردگی میں ہے نہ کہ سربراہان مملکت کے لئے وقتی سہولتیں فراہم کرنے میں۔ وقتی حسن کارکردگی اسی وقت کوئی قیمت رکھتی ہے جب کہ وہ آدمی کی عام حسن کارکردگی بن جائے۔

تعمیر کے نام پر تخریب

۶۷-۱۹۶۶ کا زمانہ شمالی ہندستان کی مسلم سیاست میں بڑے جوش وخروش کا زمانہ تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس سیاست کے ہیرو تھے۔ ان پر اور ان کے ساتھیوں پر اچانک یہ راز منکشف ہوا کہ وہ اپوزیشن پارٹیوں کے انتخابی اتحاد میں شریک ہو کر حکمراں کانگرس کو اقتدار سے ہٹا سکتے ہیں اور اس طرح ملک میں اپنے باعزت زندگی کا حق وصول کر سکتے ہیں۔ نان کانگریسزم کی اس منفی سیاست پر مولانا موصوف کو اتنا یقین تھا کہ انھوں نے اپنی شخصیت کا پورا وزن اس کے خانہ میں ڈال دیا۔ انھوں نے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"گزشتہ دو ماہ میں ہم نے کیا حاصل کیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو پا لیا ہے۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے کہ کوئی کھوئی ہوئی امت اگر خود کو تلاش کر لے تو یہ کولمبس کے نئی دنیا کی تلاش کرنے کے کارنامہ سے بھی زیادہ عظیم ہے (ندائے ملت ۳۱ مارچ ۱۹۶۷)

جھوٹے فخر کی یہ غذا مسلمانوں کی نفسیات کے نہایت حسب حال تھی۔ چنانچہ بھیڑ کی بھیڑ اس نعرہ پر ٹوٹ پڑی جس میں سمندروں کو عبور کرنے کی مصیبت اٹھائے بغیر کولمبس سے زیادہ بڑی دریافت صرف دو ماہ میں حاصل ہو رہی تھی۔

تاہم اس سطحی سیاست پر میرا دل بہت دکھی تھا۔ میں نے اسی زمانہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے خط و کتابت کی۔ میں نے لکھا کہ میں آپ سے مل کر گفتگو کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم کروں کہ آپ کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہے کہ ـــــــ "ہم نے اپنے آپ کو پا لیا ہے" مگر مولانا موصوف نے ملاقات کا وقت نہیں دیا۔ انھوں نے لکھا کہ اس سلسلے میں ان کے قریبی رفقا مولانا محمد منظور نعمانی اور ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے گفتگو کروں۔

۵ اپریل ۱۹۶۷ کو میں نے لکھنؤ میں مولانا محمد منظور نعمانی سے ملاقات کی۔ میں نے دلائل کی روشنی میں بتایا کہ آپ حضرات کی موجودہ سیاست سراسر لایعنی سیاست ہے۔ اس کا کوئی فائدہ مسلمانوں کو ملنے والا نہیں۔ بلکہ تقریباً یقینی ہے کہ اس قسم کے اقدام کے بعد حالات اور زیادہ بگڑ جائیں۔ مگر کھلے کھلے دلائل کے باوجود وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور اپنے

سیاسی مسلک سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ بالآخر میں کچہری روڈ (لکھنو) کی مجلس سے اس طرح اٹھا کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا اور میری زبان پر عربی کا یہ شعر تھا:

اذا کان الغراب رئیس قوم سیھدیھم الی دار البوار

اس کے بعد ۱۷ اپریل ۱۹۶۷ کو ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (۱۹۷۴ - ۱۹۱۳) سے ان کی لکھنؤ کی قیام گاہ (حضرت گنج) میں ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ مل کر بالفرض آپ کانگرس کو اقتدار سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں تو اس سے مسلمانوں کی قسمت ہرگز بدلنے والی نہیں۔ کیوں کہ اس کے بعد جس کو اقتدار ملے گا وہ آپ نہیں ہوں گے بلکہ کانگرس ہی کی طرح کے دوسرے لوگ ہوں گے۔ یہ گفتگو پون گھنٹہ تک جاری رہی۔ جب وہ میرے دلائل کا جواب دینے سے عاجز ہو گئے تو انھوں نے یہ کہہ کر گفتگو ختم کر دی:

اسٹیٹس کو (حالت موجودہ) میں چینج (تغیر) تو ہوگا

۱۹۶۷ کے الکشن کے نتیجہ میں اسٹیٹس کو میں چینج ہوا مگر اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ کانگرسی عناصر کی جگہ جن سنگھی عناصر حکومت میں غالب آگئے۔ "نئی دنیا کی دریافت" نئی سیاسی خندق میں گرنے کے ہم معنی بن گئی۔ شاید نادانی کی یہی وہ قسم ہے جس کے بارہ میں انگریزی کہ یہ کہاوت بنی ہے کہ —— بیوقوف لوگ وہاں جاگھستے ہیں جہاں فرشتے قدم رکھنے سے گھبراتے ہیں:

Fools rush in where angels fear to tread

"اسٹیٹس کو میں چینج" کی اس منفی سیاست میں مسلمان پچھلے سو سال سے مبتلا ہیں۔ وہ پرشور سیاست چلا کر ایک برائی کو ہٹاتے ہیں اور اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ نئی شدید تر برائی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اس قسم کی سیاست اسلامی نقطۂ نظر سے سراسر باطل ہے۔ ایک فساد کو دوسرے فساد سے تبدیل کرنا شیطان کے کارندوں کا طریقہ ہے نہ کہ خدا کے پیغمبروں کا۔

پاکستان میں مخصوص اسباب کے تحت اس قسم کی تخریبی سیاست کے لئے خصوصی مواقع موجود تھے۔ چنانچہ پچھلے تقریباً ۴۰ سال سے یہ ملک اس قسم کی بے معنی سیاست کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ یہاں بار بار یہ واقعہ ہو رہا ہے کہ عہد ساز مفکرین اکھیڑ پچھاڑ کے ذریعہ ایک سیاسی تبدیلی لاتے ہیں، صرف اس لئے کہ بعد کو یہ اعلان کریں کہ نیا دور پچھلے دور سے بھی زیادہ برا ثابت ہوا ہے۔ مزید یہ کہ سطحیت کے اس دور نے لوگوں کو موقع دے دیا ہے کہ وہ عملاً مخرب اسلام کا کردار ادا کریں۔ اس کے باوجود اپنے معتقدین کے درمیان وہ معمار اسلام کے پرفخر لقب سے یاد کئے جاتے رہیں۔

پاکستان بننے کے بعد وہاں نواب زادہ لیاقت علی خاں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی نے کچھ ایسے "تغیر پسند عناصر" پالئے جن کے ساتھ مل کر وہ لیاقت علی خاں کی "غیر اسلامیت" کے خلاف ہنگامہ آرائی کر سکیں۔ یہ تحریک اس طرح ختم ہوئی کہ ۱۹۵۱ میں ایک شخص نے لیاقت علی خاں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد پاکستان میں اکھیڑ پچھاڑ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۸ میں جنرل محمد ایوب خاں برسر اقتدار آگئے۔

اب سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان پر منکشف ہوا کہ جنرل ایوب خاں کی حکومت پہلے سے بھی زیادہ بری ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ سماج میں ہمیشہ قائم شدہ نظام کے خلاف ناراضگی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی کو دوبارہ کچھ تغیر پسند عناصر مل گئے اور انھوں نے جنرل محمد ایوب خاں کے خلاف ہنگامہ آرائی کی سیاست شروع کر دی یہ سیاست مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی آخر کار اس منزل تک پہنچی کہ گیارہ سالہ اقتدار کے بعد جنرل ایوب کو تخت سے ہٹ جانا پڑا۔ اس کے بعد الکشن ہوا جس کے نتیجہ میں ۱۹۷۱ میں ذوالفقار علی بھٹو پاکستان میں برسر اقتدار آگئے۔

اب سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان پر دوبارہ اس سیاسی حقیقت کا انکشاف ہوا کہ بھٹو کا دور ایوب کے دور سے بھی زیادہ برا ہے۔ چنانچہ دوبارہ انھیں اپنے سیاسی جہاد کے لئے ساتھیوں کی تلاش ہوئی جو حسب معمول بہت جلد حاصل ہو گئے۔ مسٹر بھٹو کے خلاف یہ مہم بالآخر اس شکل میں کامیاب ہوئی کہ ۱۹۷۷ میں پاکستان میں جنرل محمد ضیاء الحق کا اقتدار اقتدار قائم ہو گیا۔ اور بھٹو کو پھانسی دے دی گئی

سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان نے ابتداءً اپنے سیاسی مقاصد کے تحت جنرل ضیاء الحق کا مکمل ساتھ دیا۔ مگر تازہ ترین خبروں کے مطابق ان علم برداران انقلاب پر دوبارہ یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ جنرل ضیاء کا دور حکومت بھٹو کے دور حکومت سے بھی زیادہ برا ہے۔

پاکستان کی جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اس سلسلے میں مفصل قراردادیں پاس کی ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان سے متعلق اس کی قرارداد کا ایک حصہ حسب ذیل ہے:

"(جنرل محمد ضیاء الحق کی) حکومت اور اس کی انتظامیہ نے تعلیمی اداروں کے سکون کو جس بے تدبیری اور بے دردی سے تہ و بالا کر دیا ہے اس نے پوری قوم کے ہر خیر خواہ کو سخت

ہراساں زدہ کردیا ہے۔ یونینوں کے انتخاب بخیر و خوبی انجام پائے ابھی دو ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بغیر کسی وجہ جواز یونینوں اور طلبہ تنظیموں پر پابندی لگا دی گئی اور اس اقدام کے خلاف تعلیمی اداروں کے اندر بھی احتجاج کے سارے دروازے طلبہ پر بند کر دئے گئے۔ اس کے بعد ظلم و زیادتی کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے جس نے بھٹو اور یحیٰی کے دور کو بھی مات کر دیا ہے۔ طلبہ کے منتخب نمائندوں کو کالج اور ہوسٹلوں سے اخراج پر طلبہ کا احتجاج بالکل فطری امر تھا۔ اس پر سولہ سترہ سال کے لڑکوں کو ننگا کرکے پیٹا گیا ہے۔ ان کو لاٹھیوں اور دوسرے اسلحہ سے زدوکوب ہی نہیں کیا گیا ہے، ان کے ہاتھوں سے ناخن نوچے گئے اور ان کے جسم کے نازک حصوں کو جلتی موم بتیوں اور سگریٹ لائٹرز سے جلایا گیا ہے۔ ان کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر کئی کئی دن اس طرح رکھا گیا ہے کہ وہ کروٹ بھی نہیں لے سکتے تھے۔ ان کو نماز تک پڑھنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اور نماز کی درخواست پر ان کی پٹائی کے علاوہ نہایت غلیظ گالیوں کی بوچھار کی گئی۔ صرف طلبہ ہی نہیں، ان کے بہن بھائی اور بوڑھے والدین تک کو گرفتار کر کے تھانوں میں محبوس رکھا گیا۔ اور ان کے باپوں ہی کو نہیں ماؤں کو بھی زدوکوب کیا اور غلیظ گالیوں سے نوازا گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کوڑوں کی سزائیں دی گئی ہیں اور حکومت کے ذمہ دارترین افراد کو توجہ دلانے اور ان حقائق سے آگاہ ہونے کے باوجود یہ سلسلہ جاری ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ حکومت ظلم و ستم کے ہر حربے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اور اپنے پیش رو جابر و ظالم حکمرانوں کے انجام سے کوئی سبق سیکھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔۔۔۔ اقتدار سے بڑھ کر ناپائدار کوئی شے نہیں ہے۔ یہ کرسی جس پر صدر (ضیاءالحق) صاحب کو اس قدر بھروسہ ہے، ان کے پیشرو کو بھی آخری لمحہ تک انتہائی مضبوط نظر آتی تھی۔ اس لئے ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ وہ کرسی پر تکیہ کرنے کے بجائے عدل و انصاف کا راستہ اختیار کریں۔" (زندگی، جون ۱۹۸۴)

مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن میں بھٹو پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور مخالف پارٹیوں کے ساتھ مل کر بھٹو حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کیا جو توڑ پھوڑ تک جا پہنچا۔ ان حالات نے فوجی افسروں کو موقع دے دیا۔ اور وہ بھٹو کو گرفتار کر کے جولائی ۱۹۷۷ میں حکومت پر قابض ہو گئے۔ اب اگر مذکورہ قرارداد کے مطابق پاکستان کی فوجی حکومت ظالم ہے تو اس سے بڑے ظالم وہ لوگ ہیں جن کی جھوٹی سیاست نے اس ظالم حکومت کو برسراقتدار آنے کا موقع دیا۔

جماعت اسلامی ہند کے سرکاری ترجمان ماہنامہ زندگی (جون ۱۹۸۴) نے جماعت اسلامی

پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کی مذکورہ قرارداد اپنے صفحات میں نقل کی ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے ایک نوٹ لکھا ہے جس میں یہ الفاظ درج ہیں:

"یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ وہ امت مسلمہ کو ان سربراہوں، لیڈروں اور حکمرانوں سے کب نجات بخشے گا جو عملی نفاق میں مبتلا ہیں۔"

ماہنامہ زندگی نے اس صورت حال کی ذمہ داری نہایت معصومانہ انداز میں "حکمرانوں" پر ڈالی ہے، حالاں کہ اس کی ذمہ داری خود سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پر عائد ہوتی ہے۔ یہ لوگ "اسٹیٹس کو میں چیلنج" کو کام سمجھتے رہے۔ حالاں کہ نتیجہ کے اعتبار سے وہ فساد اور تخریب کے سوا اور کچھ نہ تھا حقیقت یہ ہے کہ زیادہ قرین انصاف بات یہ تھی کہ ماہنامہ زندگی لکھتا کہ "یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ وہ امت مسلمہ کو جھوٹے اسلامی رہنماؤں سے کب نجات بخشے گا۔" اس کے برعکس اس نے یہ کیا کہ ساری ذمہ داری دوسروں کے اوپر ڈال دی۔

افسوس کہ لوگوں میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ وہ سیدھی طرح اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ وہ اپنی کھلی کھلی حماقتوں کا الزام بھی دوسروں کے سر پر ڈالنا چاہتے ہیں، صرف اس لئے کہ ان کا فخر ان سے نہ چھنے۔ اپنے جس قائد کو انھوں نے بطور خود عہد ساز مفکر کا لقب دے رکھا ہے وہ بدستور اپنی جگہ پر باقی رہے۔

آپ کانٹے دار درخت کو پھل دار درخت بتا کر اس کا بیج بوئیں اور جب اس سے کانٹوں کا درخت ظاہر ہو تو اس کی ساری ذمہ داری زمین پر ڈال دیں۔ تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اپنی نااہلی کا الزام خدا کو دینا ہے۔ اگرچہ یہ بے حد سخت بات ہے مگر اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں ہمارے لیڈر ساری دنیا میں یہی کام انجام دے رہے ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر ایک ہنگامہ اٹھاتے ہیں اور جب قانون قدرت کے تحت ان کی ہنگامہ آرائیوں کا الٹا نتیجہ سامنے آتا ہے تو فوراً اس کی تمام ذمہ داری دوسروں کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا کرکے وہ خدا کی سچائی کو مشتبہ کرنا چاہتے ہیں نہ کہ کسی انسان کی سچائی کو۔ کیوں کہ جو نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ براہ راست قدرت کے قانون کی بنا پر برآمد ہوا ہے نہ کہ حقیقۃً کسی انسان کی بنا پر۔

کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو خدا کی دنیا میں خود اپنی مرضی کی دنیا بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے ٹھنٹھ کو شاداب درخت کا نام دے رہے ہیں۔ وہ اپنے بے نور دئے پر روشن چراغ کا لیبل لگا کر خوش ہیں۔ وہ اپنی چھوٹی بڑائی کو ہر حال میں باقی رکھنا چاہتے ہیں خواہ اس کی وجہ سے خدا کی بڑائی مجروح ہو جائے۔

انگریزی الرسالہ

الرسالہ کا انگریزی اڈیشن پابندی سے ہر ماہ نکل رہا ہے۔ زبان و بیان ہر لحاظ سے بفضلہ تعالیٰ وہ ایک معیاری پرچہ ہے۔ ایک امریکی نومسلم جو انگریزی الرسالہ شروع سے پڑھ رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ الرسالہ مجھ کو بہت پسند ہے۔ وہ مسلم دنیا کا واحد انگریزی رسالہ ہے جو خالص دعوتی اور تعمیری انداز میں نکلتا ہے۔ میں الرسالہ کو بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔

الرسالہ خالص دعوتی مقصد سے نکالا گیا ہے اور دعوت پوری امت کی مشترک ذمہ داری ہے۔ اس اعتبار سے الرسالہ (انگریزی) کسی خاص ادارہ کا پرچہ نہیں وہ پوری امت کا پرچہ ہے۔ اس کا تعاون کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کے سلسلے میں آپ اپنی ذمہ داری کو اس طرح پورا کر سکتے ہیں کہ:

اس کے خریدار بنائیں اور ایجنسی قائم کریں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔

اس کے لئے مالی تعاون کریں تاکہ اس کا خسارہ پورا کیا جا سکے۔

نوٹ: انگریزی الرسالہ کی خریداری اور ایجنسی کے شرائط وہی ہیں جو اردو الرسالہ کے ہیں۔

ادارہ الرسالہ ———

علاقائی زبانوں میں کتابیں

سچا راستہ (تلگو) Rs. 3.50

دینی تعلیم (تلگو) Rs. 4.50

پتہ: اسلامک سنٹر، 3-6-373/A حمایت نگر۔ حیدرآباد 29

منزل کی طرف (مرہٹی) Rs. 3.50

پتہ: فٹ ویل سیٹ سنٹر 1050 ریوار پیٹھ پونہ 2

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکومتِ پاکستان

وزارتِ امورمذہبیہ

اسلام آباد

تاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ / ۱۸ دسمبر ۱۹۸۳ء

نمبر ۱(۱) وڈس/آر آر/83

سندِ امتیاز

نہایت مسرت سے تصدیق کی جاتی ہے کہ جناب مولانا وحید الدین خان صاحب کی تالیف کردہ کتاب پیغمبرِ انقلاب بزبان اردو کتب سیرت النبیؐ کے قومی مقابلہ برائے سال ۱۴۰۲-۰۳ھ میں اول انعام کی مستحق قرار پائی اور مؤلف موصوف کو مبلغ دس ہزار روپے حکومتِ پاکستان کی طرف سے بطورِ انعام دیئے گئے۔

عرفان احمد امتیازی

سیکریٹری

وزارتِ امورِ مذہبیہ حکومتِ پاکستان

اسلام آباد

خبرنامہ اسلامی مرکز

۱. اسلامی لکچر پروگرام کے تحت ۱۱ اپریل ۱۹۸۴ کو اسلامی مرکز کے ہال میں ایک اجتماع ہوا جس میں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات شریک ہوئے۔ مثلاً جناب حکیم عبد الحمید صاحب (ہمدرد دواخانہ) پروفیسر مشیر الحق صاحب (جامعہ ملیہ اسلامیہ) مولانا احمد علی صاحب (آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت) وغیرہ۔ تلاوت قرآن کے بعد مولانا محسن عثمانی ندوی نے اسلامی مرکز کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (لاہور) نے اسلام کے موضوع پر مفصل تقریر کی۔

۲. اسلامی مرکز میں ہر مہینہ کے آخری اتوار کی شام کو بعد نماز مغرب مولانا وحید الدین خاں (صدر اسلامی مرکز) کا درس قرآن ہوتا ہے۔ جولائی ۱۹۸۴ کے آخری اتوار (۲۹ جولائی) کو ایک پروگرام کے تحت مولانا موصوف کو کوالالمپور (ملیشیا) میں رہنا تھا۔ چنانچہ مولانا نے پیشگی طور پر ۴۵ منٹ کا ایک درس قرآن ٹیپ پر ریکارڈ کرا دیا۔ ۲۹ جولائی ۱۹۸۴ کو مولانا کی غیر موجودگی میں اجتماع ہوا اس میں یہی ٹیپ حاضرین کو سنایا گیا۔ لوگوں نے اس طریقہ کو بہت پسند کیا اور خواہش ظاہر کی کہ آئندہ بھی مولانا کے بیرونی اسفار کے موقع پر اسی طرح ٹیپ پر درس قرآن محفوظ کر لیا جائے اور اسی کو اجتماع میں سنایا جائے۔

۳. پاکستان میں سرکاری سطح پر ایک عالمی مقابلہ سیرت ہوا تھا۔ اس مقابلہ میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتاب (پیغمبر انقلاب) کو اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ۲۷ اگست ۱۹۸۴ کو سفارت خانہ پاکستان (نئی دہلی) میں ایک خصوصی تقریب ہوئی۔ اس موقع پر سفیر پاکستان جناب ہمایوں خاں صاحب نے مولانا موصوف کو حکومت پاکستان کی طرف سے "سند امتیاز" عطا کی جس کا عکس مقابل کے صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔ اس تقریب میں سفارت خانہ کے تمام ڈپلومیٹ اور اعلیٰ عہدیدار شریک تھے۔ سفیر پاکستان جناب ہمایوں خاں صاحب نے بعض عرب مہمانوں کی رعایت سے انگریزی میں تقریر کی جس میں مولانا موصوف کی علمی اور دینی خدمات کا اعتراف کیا۔ اس کے بعد مولانا وحید الدین خاں صاحب نے مختصر تقریر کی جس میں کتاب "پیغمبر انقلاب" کا خلاصہ بیان کیا اور موجودہ زمانہ میں سیرت کے مطالعہ کی اہمیت واضح کی۔

۴. اسلامی مرکز سے شائع ہونے والی تفسیر "تذکیر القرآن" میں اس وقت سورہ کہف کا حصہ زیر ترتیب ہے۔ سورہ بنی اسرائیل (نصف قرآن) تک مکمل ہو کر کتابت بھی انجام پا چکی ہے۔ انشاء اللہ عنقریب اس کا دوسرا حصہ شائع کیا جائے گا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور رہر ماہ صاحب ایجنسی اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. R N. No. 28822/76 Issue No. 95

AL-RISALA MONTHLY
C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل	50/-	سبق آموز واقعات	3/-
الاسلام	20/-	زلزلۂ قیامت	4/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-	حقیقت کی تلاش	3/-
ظہور اسلام	25/-	پیغمبر اسلام	3/-
احیاء اسلام	15/-	آخری سفر	3/-
پیغمبر انقلاب	25/-	حقیقتِ حج	2/-
دین کیا ہے	2/-	اسلامی دعوت	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-	خدا اور انسان	3/-
تجدید دین	3/-		
اسلام دینِ فطرت	3/-	**تعارفی سٹ**	
تعمیر ملت	3/-	سچا راستہ	2/-
تاریخ کا سبق	3/-	دینی تعلیم	3/-
مذہب اور سائنس	5/-	حیاتِ طیبہ	3/-
عقلیاتِ اسلام	3/-	باغِ جنت	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-	نارِ جہنم	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-		

English Publications

تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحادِ ملت	3/-

English Publications	
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے
جس طرح آگ لکڑی کو (حدیث)

شمارہ [illegible]
نومبر ۱۹۸۴ء

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ھدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان
اُردو، انگریزی میں شائع ہوتا ہے

نومبر ۱۹۸۴ □ شمارہ ۹۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیثی کردار	۲
کام کا طریقہ	۳
رفتار روک	۴
کیسا عجیب اسلام	۵
حق کو پانا	۶
محبت کا نذرانہ	۷
دل کا سکون	۸
کمپوٹر	۹
تین چیزیں	۱۰
نصیحت	۱۱
کب بولیں	۱۲
جھوٹی بڑائی	۱۳
زندگی کا انجام	۱۴
۳۱ دن کے لئے	۱۵
خودکشی کیوں	۱۶
چالیس سال بعد	۱۷
اپنی کوشش سے	۱۸
ناکامی کا سبب	۱۹
خود اعتمادی کا راز	۲۰
فکری انقلاب (مقالہ)	۲۱
تحقیق حال	۲۶
چپ رہنا جانئے	۲۷
ایک سفر	۲۹
عربی اشعار	۴۳
خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۴

زرِ تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے:	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے
ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی
'AL-RISALA MONTHLY' لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی - ۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
فون نمبر ۶۱۱۱۲۸

حدیدی کردار

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات و انزلنا معھم الکتاب و المیزان لیقوم الناس بالقسط و انزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس و لیعلم اللہ من ینصرہ و رسلہ بالغیب ان اللہ قوی عزیز (الحدید)

ہم نے اپنے رسول بھیجے نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا اس میں سخت طاقت ہے اور لوگوں کے لئے فائدہ ہے۔ اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اللہ اور رسول کی بن دیکھے۔ بے شک اللہ قوی اور زبردست ہے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مادی چیزیں انسانی اخلاقیات کے لئے تمثیل کا کام کرتی ہیں۔ اوپر کی آیت میں اس سلسلہ میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک میزان (ترازو) اور دوسرے حدید (لوہا)

ترازو کیا کام کرتا ہے: ترازو تولنے کا ذریعہ ہے۔ کسی چیز کے متعلق جاننا ہو کہ وہ وزن میں پوری ہے یا کم ہے تو اس کو ترازو میں رکھ کر تولتے ہیں۔ اس سے اس کی حالت پوری طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ خدا کی کتاب اسی طرح انسانی اخلاقیات کے لئے ترازو ہے۔ عام ترازو چیزوں کے وزن کو بتاتا ہے اور خدا کی کتاب اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کو۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا رویہ موجودہ دنیا میں درست رہے تاکہ وہ آخرت کی کامیابی حاصل کرے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ خدا کے ترازو سے اپنے قول و عمل کو تولتا رہے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اگلی دنیا میں ناکام و نامراد ہو کر رہ جائے گا۔

دوسری تمثیل حدید (لوہے) کی ہے۔ حدید کی معروف حیثیت کیا ہے۔ وہ قابل اعتماد شدت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس پل یا عمارت کو لوہے پر کھڑا کیا جائے اس کے بارہ میں پورا اعتماد رہتا ہے کہ وہ طوفانوں کے مقابلہ میں بھی پوری طرح قائم رہے گی۔ اسی قسم کے انسان خدا کے دین کی نصرت کے لئے درکار ہیں۔ خدا کے دین کی نصرت وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے اندر حدیدی کردار ہو۔ جن کے قول پر پورا اعتماد کیا جا سکے۔ جو مشکل حالات میں بھی کوئی کمزوری نہ دکھائیں، جو نفس اور شیطان کے دباؤ کے مقابلہ میں اسٹیل کی طرح بے لچک ثابت ہوں۔

کام کا طریقہ

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد شبلی نیشنل کالج (اعظم گڈھ) میں انگریزی کے استاد تھے۔ ۱۹۵۳ سے ۱۹۶۴ تک یہاں رہے۔ وہ کمیونسٹ تھے: ان کا معمول تھا کہ دن کو کالج میں انگریزی کی کلاس لیتے اور شام کے وقت شہر کے چوراہہ پر جاکر پارٹی کا اخبار بیچتے۔ وہ اخباروں کا بنڈل اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوجاتے اور لوگوں سے کہتے "اس پارٹی کی سچائی میں کون شک کرسکتا ہے جس میں ایک پروفیسر سڑک پر کھڑا ہوکر اخبار بیچے"

دوسری مثال شیخ محمد سلیمان القائدکی ہے۔ وہ افریقہ کے ایک ملک میں دعوتی کام کررہے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ وہاں بہت سے نوجوان ہیں جن کے اندر تبلیغ کا جذبہ ہے۔ مگر وہ غریب ہیں۔ انھوں نے ملک کے مختلف علاقوں سے کئی درجن نوجوان منتخب کئے۔ ان کے لئے ایک مختصر مشاہرہ مقرر کردیا اور ہر ایک کو ایک بائیسکل دے دی۔ یہ نوجوان بائیسکلوں پر گھوم گھوم کر تبلیغ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک میں پانچ سال (۸۴ - ۱۹۷۹) کی مدت میں تقریباً ۲۰ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کرلیا۔

قارئین الرسالہ سے ہم اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس کے تعمیری اور دعوتی مشن کو پھیلانے کے لئے اسی قسم کا تعاون فرمائیں۔ پہلی اور اعلیٰ صورت تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی ذات کو اس عظیم کام میں لگائیں۔ آپ الرسالہ کی ایجنسی لیں۔ آپ اس کی مطبوعات منگا کر لوگوں تک پہنچائیں۔ آپ ہر اجتماعی موقع پر بک اسٹال لگا کر لوگوں کو اس مشن سے متعارف کرائیں۔

لیکن اگر آپ کے پاس اپنی ذات کو اس مشن میں لگانے کے لئے وقت اور موقع نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ بے روزگار، یا کم آمدنی والے لوگوں میں سے کسی کو تیار کریں اس کو کچھ مشاہرہ دیں اور ایک بائیسکل دے کر اس سے کہیں کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم کتابوں کو پھیلاؤ اور الرسالہ کے خریدار بناؤ۔ وہ بستی بستی گھوم کر بس یہی کام کرتا رہے۔ یہ کام ایک فرد بھی کرسکتا ہے اور کئی لوگ مل کر بھی۔

اگر آپ الرسالہ کے مشن کو حق سمجھتے ہوں، اس کے باوجود اس کو پھیلانے میں آپ نہ براہ راست شرکت کریں اور نہ بالواسطہ، تو آپ کو سوچنا چاہئے کہ حقیقت کی نظر میں آپ اپنا نام کس خانہ میں لکھوا رہے ہیں۔

رفتار روک

گاڑی تیزی سے سڑک پر چل رہی تھی۔ اچانک ڈرائیور نے رفتار بہت کم کر دی۔ اس کے بعد ایک ہلکا سا جھٹکا ہوا اور پھر گاڑی اپنی رفتار سے چلنے لگی۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا تو سڑک کے کنارے ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا رفتار روک (Speed Breaker)

سڑک کے حادثے زیادہ تر گاڑی تیز دوڑانے سے ہوتے ہیں چنانچہ سڑکوں پر جگہ جگہ اونچا سامینڈ کی مانند بنادیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو رفتار گھٹانے پر مجبور کیا جا سکے۔ اسی بنا پر اس کو اسپیڈ بریکر (رفتار توڑنے والا) کہا جاتا ہے۔

یہ سڑک کے سفر کو محفوظ بنانے کا طریقہ ہے۔ اسی طرح ضرورت ہے کہ زندگی کے سفر کو محفوظ بنانے کے لئے بھی اسپیڈ بریکر ہوں۔ آدمی اپنے کو آزاد سمجھ کر بے لگام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے کو صاحب اختیار پاکر سرکشی کرنے لگتا ہے۔ وہ بظاہر دیکھتا ہے کہ اس کو کوئی روکنے والا نہیں اس لئے وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں جو چاہوں کروں اور جس طرح چاہوں رہوں۔ ایسی حالت میں اگر رکاوٹیں نہ ہوں تو آدمی بالکل بے قید ہو کر رہ جائے گا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آدمی کی زندگی میں اسپیڈ بریکر رکھے جائیں۔ زندگی کے سفر میں اس پر جگہ جگہ روک لگائی جائے۔

اسلام کے احکام ایک اعتبار سے گویا زندگی کے لئے اسپیڈ بریکر ہیں۔ وہ آدمی کو بار بار روکتے ہیں تاکہ وہ اپنے معاملات میں حد سے باہر نہ جانے پائے — آدمی دنیا کے کام میں مشغول ہے کہ اچانک مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ اپنا کام چھوڑ کر نماز کے لئے چلو۔ آدمی اپنے مال کو صرف اپنا سمجھ رہا ہوتا ہے کہ حکم آجاتا ہے کہ اس میں سے ایک حصہ دوسروں کے لئے نکالو۔ آدمی کھا رہا ہے اور پی رہا ہے کہ رمضان آتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ کھانا پینا چھوڑ دو۔ آدمی اپنے عزیز واقارب کے درمیان ہوتا ہے کہ حکم آتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر حج کے لئے چلے جاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب گویا زندگی کے لئے ایک قسم کے اسپیڈ بریکر ہیں۔ یہ انسان کی رفتار کو بار بار کم کرتے ہیں تاکہ وہ حد کے اندر رہے، تاکہ وہ انصاف اور اعتدال کے ساتھ زندگی گزارے۔ تاکہ وہ ہر مرحلہ میں اعتدال کی زندگی پر قائم رہے۔

کیسا عجیب اسلام

ایران میں "اسلامی انقلاب" کے بعد جو نئے مناظر دکھائی دیتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایران کی قومی اسمبلی اور دوسرے پبلک مقامات پر جو سیڑھیاں ہیں ان پر مختلف قسم کے جھنڈوں کی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ یہ جھنڈے امریکہ، روس اور اسرائیل کے ہیں۔ ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ جب کوئی آدمی ان عمارتوں میں داخل ہو تو وہ ان پر پاؤں رکھے بغیر داخل نہ ہو سکے۔

(کوثر، بنگلور، رمضان ۱۴۰۴ھ)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کون سا دین ہے جس کو موجودہ زمانہ کے علمبرداران اسلام نے دریافت کیا ہے۔ وہ نفرت کا دین ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مفروضہ دشمنان اسلام کو ذلیل کیا جائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا اسلام یہ تھا کہ انھوں نے لوگوں کی خیرخواہی میں ان کے لئے دعائیں کیں۔ وہ اس لئے تڑپے کہ لوگ ہدایت کو قبول کر کے جہنم کی آگ سے بچ سکیں۔ انھوں نے اپنے دشمنوں سے بھی محبت کا سلوک کیا تاکہ ان کا دل اسلام کے لئے نرم ہو۔ انھوں نے ظالموں کو بھی بے عزت کرنا پسند نہیں کیا تاکہ ان کے اندر حمیۃ جاہلیۃ کی آگ نہ بھڑکے۔ انھوں نے بگڑے ہوئے لوگوں کے ساتھ تالیف قلب کا معاملہ کیا تاکہ ان کی فطرت کو جگایا جا سکے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین نے ایک ایسا اسلام دریافت کر رکھا ہے جو انھیں اس کے بالکل برعکس سبق دیتا ہے۔

آج کی دنیا میں اسلام کے نام پر دوسروں سے نفرت کرنے والے بہت ہیں مگر اسلام کے نام پر دوسروں سے محبت کرنے والا کوئی نہیں۔ اسلام کے لئے جھنڈا اٹھانے والے بے شمار ہیں مگر کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں جو اسلام کے لئے اپنے جھنڈے کو نیچا کر لے۔ اسلام کے لئے دوسروں سے لڑنے والے ہر طرف دکھائی دیتے ہیں مگر اسلام کے لئے صلح کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ اسلام کے لئے بولنے والوں سے خدا کی زمین بھر گئی ہے مگر وہ انسان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا جو اسلام کی خاطر چپ ہو گیا ہو۔

اسلام کے نام پر لوگوں کو پیروں سے روندنے والے بہت ہیں مگر خدا کا وہ بندہ کہیں دکھائی نہیں دیتا جو اسلام کی خاطر لوگوں کو اپنے سینے سے لگا لے۔

حق کو پانا

انسان کا ذہن حق کا آئینہ ہے۔ آئینہ کے سامنے کوئی چیز لائی جائے تو وہ اس کی ہو بہو صورت اپنی سطح پر اتار لیتا ہے۔ وہ کبھی اس میں کوتاہی نہیں کرتا۔ ٹھیک یہی حال آدمی کے ذہن کا ہے۔ اس کے سامنے جب حق آتا ہے تو وہ فوراً اس کو پہچان لیتا ہے۔ وہ پوری طرح اسے پالیتا ہے۔ وہ نہ دیکھنے میں غلطی کرتا اور نہ پہچاننے میں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ آیات بینات (کھلے دلائل) کے ذریعہ حق سامنے آتا ہے، اس کے باوجود بے شمار لوگ اس کو قبول نہیں کرتے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ نفسیاتی اٹکاؤ ہے۔ ایسے افراد کا گہرا تجزیہ کیجئے تو ان کے انکار کی وجہ کوئی حقیقی دلیل نہیں ہوگی۔ بلکہ کوئی نہ کوئی دوسری غیر متعلق چیز ہوگی جس کے ساتھ آدمی اٹکا ہوا ہوگا۔

سچائی کو پانے کی ایک ہی لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ حق واضح ہونے کے بعد آدمی کسی بھی اور چیز کو اپنے لئے رکاوٹ نہ بننے دے۔ مگر آدمی اکثر حالات میں ایسا نہیں کر پاتا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کو اپنے لئے رکاوٹ بنا لیتا ہے۔

کوئی کسی شخصیت پر اٹک کر رہ جاتا ہے۔ کوئی کسی مفاد پر، کوئی کسی اور چیز پر۔ یہی وہ کمزوری ہے جس نے ہر دور میں بے شمار لوگوں کو سچائی اختیار کرنے سے محروم کر دیا۔ وہ پانے کے باوجود اس کو پانے میں ناکام رہے۔

ابوجہل کے لئے اس کا قیادتی مفاد قبول حق میں رکاوٹ بن گیا۔ طائف کے لوگوں نے حق کو اس لئے قبول نہیں کیا کہ اس کا اعلان ایک ایسے شخص کی زبان سے ہو رہا تھا جو بظاہر انھیں وقت کی بڑی بڑی شخصیتوں سے کم تر دکھائی دیتا تھا۔ یہود نے آپ کا انکار اس لئے کیا کہ آپ کو پیغمبر ماننے سے ان کا احساس برتری ٹوٹتا تھا۔ شہنشاہ ہرقل نے اس لئے اس کا اقرار نہیں کیا کہ اس نے محسوس کیا کہ اگر میں ایسا کروں تو میں اپنی قوم سے کٹ جاؤں گا۔ ہر ایک دلیل سے مفتوح ہو چکا تھا۔ مگر ہر ایک کسی نہ کسی چیز میں اٹک کر اس کو قبول کرنے سے باز رہا۔

اس دنیا میں حق صرف اس شخص کو ملتا ہے جو کسی اٹکنے والی چیز پر نہ اٹکے۔ سچائی کا دلیل سے واضح ہو جانا ہی اس کے لئے کافی ہو کہ وہ اس کو ہمہ تن قبول کر لے۔

محبت کا نذرانہ

آدمی اپنی فطرت اور اپنے حالات کے لحاظ سے ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ خارجی سہارا چاہتا ہے۔ ایک ایسی ہستی جو اس کی کمیوں کی تلافی کرے۔ اور جو اس کے لئے اعتماد و یقین کی بنیاد ہو۔ کسی کو اس حیثیت سے زندگی میں شامل کرنا اس کو اپنا معبود بنانا ہے۔ جب آدمی کسی ہستی کو اپنا معبود بناتا ہے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی محبت اور عقیدت کے جذبات اس کے لئے خاص ہو جاتے ہیں۔ آدمی عین اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے وہ کسی سے حب شدید کرے اور جس سے کوئی شخص حب شدید کرے وہی اس کا معبود ہے۔

موجودہ دنیا میں چونکہ خدا نظر نہیں آتا اس لئے ظاہر پرست انسان عام طور پر نظر آنے والی ہستیوں میں سے کسی ہستی کو وہ مقام دے دیتا ہے جو دراصل خدا کو دینا چاہئے۔ یہ ہستیاں اکثر وہ سردار یا پیشوا ہوتے ہیں جن کو آدمی "بڑا" سمجھ لیتا ہے۔ اور پھر وہ دھیرے دھیرے لوگوں کی توجہات کا مرکز بن جاتے ہیں۔ لوگ ان کے اس طرح گرویدہ ہو جاتے ہیں جیسا گرویدہ انھیں صرف خدا کا ہونا چاہئے۔ آدمی کی فطرت کا خلا جو حقیقۃً اس لئے تھا کہ اس کو خدا سے پر کیا جائے وہاں وہ کسی غیر خدا کو بٹھا لیتا ہے (البقرہ ۱۶۵)

مذہبی احساس جب اپنے اعلیٰ ترین اسٹیج کو پہنچتا ہے تو وہ محبت میں ڈھل جاتا ہے۔ خدا ہر قسم کی خوبیوں کا اعلیٰ ترین مجموعہ ہے۔ انسان جتنی بھی چیزوں کا مالک ہے وہ سب کی سب خدا کا عطیہ ہیں۔ کائنات کا گہرا مشاہدہ ایک ایسے خالق کا تعارف کراتا ہے جو حیرت ناک حد تک حسن و کمال کی خصوصیات رکھنے والا ہے۔

یہ ہے خدا اور کوئی آدمی جب ایسے خدا کو پا لیتا ہے تو وہ بالکل فطری طور پر اس کی عقیدت و محبت میں سرشار ہو جاتا ہے۔

انسان کے پاس کسی کو دینے کے لئے جو سب سے بڑی چیز ہے وہ محبت ہے۔ ایسی حالت میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص خدا جیسی باکمال ہستی کو پائے اور اس کی خدمت میں محبت سے کم تر درجہ کی کوئی چیز پیش کرے۔ محبت سے کم کوئی چیز نہ تو خدا قبول کرتا اور نہ کسی انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ خدا کے حضور میں محبت سے کم کسی چیز کا نذرانہ پیش کرے۔

دل کا سکون

آج کی دنیا ترقی یافتہ دنیا کہی جاتی ہے۔ مگر یہ تمام ترقیاں صرف "چیزوں" کی ہوئی ہیں۔ جہاں تک "انسان" کا تعلق ہے، وہ بدستور غیر ترقی یافتہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔ انسان پیچھے ہے اور چیزیں آگے۔

سب سے بڑی چیز جو انسان چاہتا ہے وہ سکون ہے۔ مگر آج کسی کو سکون حاصل نہیں۔ جدید مادی ترقیوں نے صرف یہ کیا ہے کہ انسان سے اس کا سکون چھین لیا ہے۔ یہ ترقیاں انسان کو سکون دینے میں سراسر ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

موجودہ دنیا میں ایک عجیب تضاد نظر آتا ہے۔ یہاں سامانِ سکون ہے مگر سکون نہیں۔ یہاں قہقہوں کا شور ہے مگر دل کا چین نہیں۔ یہاں خوشی کے اسباب کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ مگر حقیقی خوشی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ ہم روح جیسی برتر چیز کو مادہ جیسی کمتر چیز کے ذریعہ خوش کرنا چاہتے ہیں۔ اور ایسا ہونا کبھی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ جولین آف ناروچ (Julian of Norwich) نے صحیح کہا ہے کہ ہماری روح کبھی ان چیزوں میں سکون نہیں پا سکتی جو خود اس سے نیچی ہوں:

Our soul may never rest in things that are beneath itself

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ ہماری معلوم دنیا کی سب سے برتر مخلوق ہے۔ اس کائنات میں انسان کے اوپر صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ خود خالق ہے۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ انسان کے لئے سکون اور راحت کا واحد ذریعہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کو پالے۔ اس سے کمتر کوئی چیز اس کے لئے سکون اور راحت کا سبب نہیں بن سکتی۔

یہی حقیقت ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے:

الذین اٰمنوا وتطمئن قلوبھم بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد ۲۸)

جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان ملتا ہے۔ جان لو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

کمپوٹر

امریکہ اور جاپان آجکل کمپوٹر کی پانچویں نسل تیار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے
۔ یہ کمپوٹر دیکھے گا، بولے گا اور سوچے گا۔ امریکہ کے دفاعی محکمہ پنٹاگان نے فوری طور پر ۰۰ ملین
الر کا عطیہ ان کمپنیوں کو دیا ہے جو کمپوٹر تکنیک پر تحقیق کر رہی ہیں۔ جاپان کی حکومت نے بھی اسی
ہم کی امداد جاری کی ہے۔

اس وقت جدید ترین کمپوٹر ایک سکنڈ میں ۰۰ ۵ ملین آپریشن کو شمار کرتا ہے۔ انداز ہ ہے کہ
۱۹۸ اتک ایسے کمپوٹر بن جائیں گے جو ایک سکنڈ میں ایک بلین آپریشن کو شمار کر سکیں گے۔ تاہم
نٹاگان اس سے مطمئن نہیں ہے۔ اگلے دس سال کے اندر وہ ایسا سپر کمپوٹر تیار کرنا چاہتا ہے
جو ایک سکنڈ میں ایک ہزار بلین آپریشن کا شمار کر سکے۔

اس وقت انسانی شکل کے ایسے کمپوٹر (روبوٹ) بنائے جا چکے ہیں جو آپریٹر کے کہنے پر اپنا
ازو نیچے یا اوپر کرتے ہیں اور دائیں بائیں گھومتے ہیں۔ بشرطیکہ آپریٹر نے وہی "زبان"
ستعمال کی ہو جو کمپوٹر کو بتائی گئی ہے۔ اب ماہرین ایسے کمپوٹر بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں جن
کے اندر مشینی مشاہدہ کی صلاحیت ہو۔ یہ کمپوٹر نقشوں کا مطالعہ کر کے یہ جان سکیں گے کہ کون سا جہاز
دشمن قوم کا جہاز ہے اور کونسا دوست کا جہاز۔ جو جہاز دشمن کا جہاز ہوگا اس کو وہ
ا رگرائیں گے۔

کمپوٹر سائنس کی اس ترقی نے سائنس کی دنیا میں ایک نیا لفظ پیدا کیا ہے جس کو مصنوعی
ذہانت کہا جاتا ہے۔ اس لفظ سے عام لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسانی ذہانت (فطری
ذہانت) کو مصنوعی طور پر بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ سراسر فریب ہے۔ کمپوٹر کی مصنوعی ذہانت
ٹیپ ریکارڈر کے مصنوعی تکلم سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دونوں "تکرار" ہیں۔
فرق صرف یہ ہے کہ ایک سادہ تکرار ہے اور دوسری پیچیدہ تکرار۔ کمپوٹر سائنس کے ایک عالم نے لکھا ہے:

It is impossible to develop an artificial intelligence as it is understood literally. It is impossible in principle. The human brain is a very sophisticated system composed of tens of billions of inter-connected cells. Each cell is extremely complex in itself. A rather plausible hypothesis says that an individual cell processes the signals penetrating it like a computor. Therefore, even the most sophisticated machine we may imagine cannot even be compared to the brain.

The Times of India, November 9, 1983

تین چیزیں

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ، ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ثلاث منجیات وثلاث مھلکات: فالمنجیات، فتقوی اللہ فی السر والعلانیۃ والقول بالحق فی الرضا والغضب والقصد فی الفقر والغنی۔ واما المھلکات: فھوی متبع، وشح مطاع واعجاب المرء بنفسہ وھی اشدھن۔ (رواہ البیہقی)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی۔ نجات دینے والی چیزیں یہ ہیں۔ چھپے اور کھلے ہر حال میں اللہ سے ڈرنا۔ خوشی اور ناراضگی دونوں حالت میں حق بات کہنا۔ محتاجی اور دولت مندی دونوں میں اعتدال پر قائم رہنا۔ اور ہلاک کرنے والی تین چیزیں یہ ہیں۔ خواہش کے پیچھے چلنا۔ حرص کی پیروی۔ آدمی کا اپنے آپ کو اونچا سمجھنا اور یہ آخری چیز سب سے زیادہ سخت ہے۔

چھ چیزیں جو اس حدیث میں بتائی گئی ہیں یہ دراصل ایمان کی پہچان ہیں۔ جس آدمی کو خدا کی گہری معرفت حاصل ہو جائے اس کا حال یہ ہو جائے گا کہ اس کو ہر وقت یہ محسوس ہو گا کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

ایسے آدمی کے لئے کھلی اور چھپی دونوں حالتیں برابر ہو جاتی ہیں۔ وہ خوش ہو جب بھی ایک حد کے اندر رہتا ہے اور ناخوش ہو تب بھی اس کی زبان پر خوف خدا کی لگام لگی رہتی ہے۔ محتاجی اور دولت مندی دونوں اس کے لئے یکساں ہو جاتی ہیں۔ کیوں کہ خدا کی نسبت سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

ایسے آدمی کے اوپر یہ یقین چھا جاتا ہے کہ آخر کار اسے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ یہ احساس اس سے یہ آزادی چھین لیتا ہے کہ وہ خواہشات کے پیچھے دوڑے۔ وہ حرص کی بندگی میں مبتلا ہو۔ اپنے آپ کو اونچا سمجھنا اس کے لئے ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسے کوئی چیونٹی پہاڑ کے نیچے رینگ رہی ہو اور اپنی بڑائی کے فخر میں مبتلا ہو۔ خدا کو پانا دراصل اس حقیقت کو پانا ہے کہ خدا سب سے بڑا ہے۔ جو شخص خدا کو سب سے بڑے کی حیثیت سے پالے اس کے اندر اپنی بڑائی کا احساس کہاں سے پیدا ہو گا۔

نصیحت

امام عبدالرحمن اوزاعی (۱۵۷ - ۸۸ ھ) بہت بڑے عالم تھے۔ مگر وہ اکثر چپ رہتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ مومن کم بولتا ہے اور زیادہ عمل کرتا ہے اور منافق زیادہ بولتا ہے اور کم عمل کرتا ہے (ان المومن یقول قلیلا ویعمل کثیرا وان المنافق یقول کثیرا ویعمل قلیلا)

وہ ظواہر دین کے مقابلہ میں حقیقت دین پر زور دیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے کہا کہ عدل کی ایک ساعت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے (ساعة عدل خير من عبادة الف شهر)

امام اوزاعی کے ایک شاگرد ابوالفضل بن الولید بن مزید نے اپنے استاد کے بارہ میں اپنا تجربہ ان الفاظ میں بتایا ہے:

من نظر فی کتب الاوزاعی یظن انه کان صاحب کلام۔ وما رأيت قط رجلا اطول منه سکوتاً (الشیخ طه الولی، عبدالرحمن الاوزاعی، بیروت ۱۹۶۸، صفحہ ۶۷)

جو شخص امام اوزاعی کی کتابوں کو دیکھے گا وہ گمان کرے گا کہ وہ بڑے بولنے والے تھے۔ حالانکہ ان سے زیادہ دیر تک چپ رہنے والا میں نے کوئی دوسرا آدمی نہیں دیکھا۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے امام اوزاعی کو بلایا اور ان سے فرمائش کی کہ وہ خلیفہ کو نصیحت کریں۔ اس موقع پر امام اوزاعی نے نصیحت کے جو کلمات کہے ان میں سے ایک فقرہ یہ تھا:

یا امیرالمومنین، تدری ما جاء فی تاویل هذه الاية عن جدك (مال هذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها) قال الصغيرة التبسم والكبيرة الضحك۔ فكيف بما عملته الايدى وحصدته الالسن (صفحہ ۷۴)

اے امیرالمومنین کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس آیت کے بارہ میں آپ کے دادا عبداللہ ابن عباس نے کیا کہا ہے (کیسی عجیب ہے یہ کتاب جس نے چھوٹی بڑی ہر چیز لکھی ہے) انھوں نے کہا ہے کہ صغیرہ سے مراد مسکرانا ہے اور کبیرہ سے مراد ہنسنا ہے۔ پھر ان اعمال کا کیا ذکر جو ہاتھ کریں اور جو زبان سے صادر ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا مطلب یہ تھا کہ ہنسنا اور مسکرانا بھی کو تم بالکل معمولی چیز سمجھتے ہو وہ بھی تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جا رہا ہے پھر دوسرے زیادہ بڑے اعمال کا کیا ذکر۔

کب بولیں

حضرت ابوموسیٰ الاشعری ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو عدن کا والی مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان کو بصرہ کا والی مقرر کیا۔

حضرت ابوموسیٰ کے اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ قاضی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی معاملہ میں فیصلہ کرے یہاں تک کہ حق اس پر اس طرح واضح ہو جائے جس طرح اس پر رات کے مقابلہ میں دن واضح ہوتا ہے (لاینبغی للقاضی ان یقضی حتی یتبین له الحق کما یتبین له اللیل من النهار) حضرت عمر فاروق نے یہ قول سنا تو کہا کہ ابوموسیٰ الاشعری نے سچ کہا، قاضی کا طریقہ یہی ہونا چاہئے (صدق ابوموسیٰ الاشعری)

حضرت ابوموسیٰ الاشعری کے اس قول کا تعلق صرف قاضی یا حاکم سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تعلق ہر انسان سے ہے۔ جس طرح قاضی کے سامنے دوسروں کے معاملات آتے ہیں اور وہ ان کو سن کر ان کے بارہ میں کوئی ایک رائے ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کے سامنے دوسروں کے معاملات آتے ہیں اور وہ ان کے بارہ میں اپنی کوئی رائے ظاہر کرتا ہے۔ اس اظہار رائے کی حیثیت انفرادی سطح پر وہی ہے جو عدالتی سطح پر قاضی کے فیصلے کی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قاضی کا فیصلہ قانونی طور پر نافذ ہوتا ہے اور عام انسان کا قول دوسروں کے اوپر عملاً نافذ نہیں ہوتا۔

تاہم ہر آدمی کو اپنے قول کی جواب دہی آخرکار خدا کے سامنے کرنی ہے۔ اور اس اعتبار سے دونوں کی حیثیت بالکل ایک ہے۔ دونوں کی یکساں پکڑ ہونے والی ہے۔ ہر آدمی جو خدا کے سامنے حاضری کا عقیدہ رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ کسی معاملہ میں صرف اس وقت بولے جب کہ اس پر اس معاملہ کی حقیقت اس طرح کھل جائے جس طرح رات کے بعد دن اس کے اوپر واضح ہو جاتا ہے۔ جس معاملہ کی حقیقت اس طرح نمایاں طور پر واضح نہ ہو اس معاملہ میں اس کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ یہ کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔

خدا سے ڈرنے والا آدمی صرف واضح معاملہ میں بولتا ہے۔ اور جو معاملہ واضح نہ ہو اس کو وہ اپنے خدا کے حوالے کر دیتا ہے۔

جھوٹی بڑائی

حضرت عمر فاروق بحیثیت خلیفہ مدینہ میں تقریر کر رہے ہیں۔ ایک شخص اٹھ کر کہتا ہے کہ خدا کی قسم اگر ہم تمھارے اندر کوئی ٹیڑھ پائیں گے تو ہم اپنی تلوار سے اس کو سیدھا کر دیں گے (واللہ لو علمنا فیك اعوجاجا لقومناہ بسیوفنا) بظاہر یہ نہایت سخت تنقید ہے اور بڑی گستاخی کی بات ہے۔ مگر نہ عمر فاروق اس کو برا مانتے اور نہ سارے مجمع سے کوئی ایک شخص اٹھ کر یہ کہتا کہ تم نے ایسا کیوں کہا۔ اس طرح کے تنقیدی واقعات صحابہ کے درمیان روزانہ پیش آتے تھے۔ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں بھی یہ صورت حال باقی رہی۔ مگر کبھی کسی نے اس کو برا نہ مانا۔ اگر کہا تو صرف یہ کہا کہ جو بات کہو تحقیق کے ساتھ کہو۔ نہ کہ بے تحقیق باتوں پر ایک دوسرے کے خلاف رائے زنی کرنے لگو۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ انسانوں کی عظمت میں نہیں جیتے تھے بلکہ صرف ایک خدا کی عظمت میں جیتے تھے۔ ان کے دل پر اس سے چوٹ نہیں لگتی تھی کہ کوئی شخص کسی انسان پر کیوں تنقید کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ بڑائی کا سارا حق صرف خدا کو دئے ہوئے تھے اور انسانوں پر تنقید کرنے سے خدا کی بڑائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس کے برعکس موجودہ زمانہ میں اگر کسی شخصیت پر تنقید کر دیجئے تو خواہ وہ تنقید کتنا ہی علمی اور تحقیقی کیوں نہ ہو، اس کے معتقدین فوراً برہم ہو جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسانوں ہی کو اپنا بڑا بنائے ہوئے ہیں۔ پھر وہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ان کی بڑائی کا مینار گر جائے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ نماز اور اذان میں وہ اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کہتے ہیں مگر یہ صرف الفاظ ہیں جن کو لوگ زبان سے ادا کرتے ہیں۔ ورنہ حقیقۃً لوگ جس بڑائی میں جی رہے ہیں وہ انسان کی بڑائی ہے نہ کہ خدا کی بڑائی۔

لوگوں کو جاننا چاہئے کہ غیر اللہ کی بڑائی میں جینے کا موقع صرف اس وقت تک ہے جب تک امتحان و آزمائش کی مدت ختم نہ ہو۔ اس کے ختم ہوتے ہی اس کا موقع بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر جن لوگوں کی غذا انسان کی جھوٹی بڑائی ہو، وہ اس وقت کس چیز کو اپنی غذا بنائیں گے جبکہ تمام دوسری بڑائیاں ختم ہو جائیں گی اور خدا کی بڑائی کے سوا کوئی بڑائی نہ ہوگی جس کو آدمی اپنی غذا بنائے۔ اور جس کے بل پر وہ جی سکے۔

زندگی کا انجام

ماستی وینکا ٹیسا آئنگر (۹۴ سال) کنٹر زبان کے مشہور مصنف ہیں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ میسور سول سروس میں شامل ہوئے۔ اپنی اعلیٰ خدمات کی بنا پر انھیں ریاست میسور کا وزیر ہونا چاہئے تھا۔ مگر ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ چنانچہ وہ بددل ہوکر وقت سے پہلے ریٹائر ہو گئے۔

ملازمت سے الگ ہوکر انھوں نے کہانیاں اور ناول لکھنا شروع کیا۔ اس میدان میں انھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ آج وہ تقریباً ڈیڑھ سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتاب چکا دیرا راجیندر پر حکومت ہند نے ان کو گیان پیٹھ کا خطاب اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ بطور انعام دیا ہے۔

مسٹر وی سری دھر موصوف سے ملے اور ان سے ایک انٹرویو (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ اگست ۱۹۸۴) لیا۔ مسٹر ماستی اگرچہ اپنی تمام کتابوں کو ادبی شاہکار سمجھتے ہیں۔ مگر حکومت کے اعلیٰ انعام پر وہ خوش نہ ہو سکے۔ انھوں نے کہا:

I am too old to be happy

یعنی ۹۴ سال کی عمر کو پہنچ کر میں اتنا زیادہ بوڑھا ہو چکا ہوں کہ کوئی خوشی میرے لئے خوشی نہیں۔ مسٹر ماستی کی پہلی کہانی ۱۹۱۲ میں شائع ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے انھیں اپنے ادبی کمالات کے اعتراف کے لئے ۷۰ سال انتظار کرنا پڑا۔ مگر لمبی مدت کے بعد جب انھیں عزت اور انعام ملا تو وہ وقت تھا جب کہ بڑھاپے نے ان کے چہرے پر جھریوں کی مالا پہنا دی تھی۔

مسٹر ماستی کی کہانی موجودہ دنیا میں ہر شخص کی کہانی ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کا یہ قصہ ہے کہ وہ محنت کرتا ہے۔ اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے۔ بالآخر "ستر سال" کی محنت کے بعد وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اس کو دنیا میں عزت اور انعام ملے۔ مگر اس وقت وہ بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ کسی بھی صبح یا شام موت آ جاتی ہے اور اس کو مجبور کرتی ہے کہ اپنی عمر بھر کی کمائی کو چھوڑ کر ایسی دنیا کی طرف چلا جائے جس کے لئے اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔

۳۱ دن کے لئے

جنوری ۱۹۸۳ میں آندھرا پردیش میں تلگو دیشم پارٹی برسر اقتدار آئی۔ تاہم ۱۶ اگست ۱۹۸۴ کو گورنر مسٹر رام لال نے تلگو دیشم وزارت کو برخاست کر دیا اور مسٹر نریندر بھاسکر راؤ سے کہا کہ وہ کانگریس سے مل کر وزارت بنائیں۔ گورنر نے از روئے دستور یہ ہدایت کی کہ وہ ۳۰ دن کے اندر یہ ثابت کریں کہ ۲۹۴ رکنی اسمبلی میں ان کی اکثریت ہے۔

اس کے بعد ممبروں کو توڑنے کی کوشش شروع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ایک ممبر کی قیمت ۲۰ لاکھ روپے تک لگا دی گئی (ہندستان ٹائمس ۲۱ ستمبر ۱۹۸۴) مگر معزول وزیر اعلا مسٹر این ٹی راما راؤ نے وزارت کی برخاستگی کے بعد اپنی پارٹی کے ممبران اسمبلی کو اپنے راما کرشنا اسٹوڈیوز میں بند کر دیا۔ ۳۰ دن گزر گئے اور مسٹر بھاسکر راؤ اسمبلی میں اپنی اکثریت ثابت کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ ان کی وزارت غیر قانونی ہو گئی۔ چنانچہ نئے گورنر شنکر دیال شرما نے ۱۶ ستمبر ۱۹۸۴ کو نیا حکم جاری کیا جس کے مطابق مسٹر بھاسکر راؤ کو وزارت چھوڑ دینی پڑی اور مسٹر این ٹی راما راؤ دوبارہ حکومت کے ایوان میں داخل ہو گئے۔

اس سلسلے میں ٹائمس آف انڈیا (۱۹ ستمبر ۱۹۸۴) نے ایک خصوصی رپورٹ میں دکھایا ہے کہ مسٹر بھاسکر راؤ نے اپنی مختصر وزارت کے دوران کیا کیا۔ انھوں نے حکومت کا ایک سو کرور روپیہ سے زیادہ کا فنڈ ریلیز کر دیا۔ انھوں نے اسمبلی کے ممبروں کو کھلی پیشکش کر دی کہ پارٹی چھوڑ کر آؤ اور وزیر بن جاؤ:

Defect and be a minister

اس قسم کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے اخبار مذکور کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ مسٹر بھاسکر راؤ ۳۱ دن تک وزیر اعلا رہے۔ اس غیر یقینی مدت میں انھوں نے اس طرح عمل کیا گویا کہ وہ اس عہدہ پر ایک سو سال تک رہنے کے لئے آئے تھے:

During his 31-day uncertain career as chief minister, Mr Bhaskara Rao behaved and acted as if he had come to stay for a hundred year.

یہی ہر آدمی کا حال ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی صرف "۳۰ دن" کے لئے آیا ہے۔ مگر وہ اس طرح رہتا ہے جیسے کہ وہ "سو سال" سے پہلے یہاں سے جانے والا نہیں۔ کیسا عجیب ہے موجودہ دنیا میں انسان کا آنا اور کیسا عجیب ہے اس کا یہاں سے جانا۔

خودکشی

مسٹر آسنا دیوا انگاڈی (بنگلور) اس وقت کیمبرج میں زیر تعلیم تھے جب پنڈت جواہر لال نہرو وہاں تعلیم کے لئے گئے۔ ان کا اور نہرو کا بہت قریبی ساتھ تھا۔ چنانچہ ان کے بیٹے مسٹر ڈیرین انگاڈی کی پرورش اس طرح ہوئی کہ وہ بچپن سے نہرو کے تذکرے سنتے تھے اور نہرو کی نقل کرتے تھے۔ مسٹر ڈیرین انگاڈی بعد کو فلم ایکٹر بن گئے۔

لارڈ اٹن برو نے تقریباً ۲۵ کروڑ روپئے کے خرچ سے "گاندھی" نامی مشہور فلم بنائی ہے۔ ابتداءً جب اس فلم کے لئے کرداروں کی تلاش ہوئی تو جواہر لال نہرو کا رول ادا کرنے کے لئے مسٹر ڈیرین انگاڈی کو موزوں سمجھا گیا اور ان کو اس کام کے لئے منتخب کرلیا گیا۔ مگر چھ ماہ بعد انھیں اطلاع دی گئی کہ ان کا نام کرداروں کی فہرست سے خارج کردیا گیا ہے اور مسٹر روشن سیٹھ ان کے بجائے پنڈت نہرو کا رول ادا کریں گے:

> This was six months after Darien Angadi had been given the part, during which he had worked hard to perfect his role.

ڈیرین کو رول دینے کے چھ ماہ بعد ایسا ہوا جس کے دوران انھوں نے سخت محنت کی تھی تاکہ وہ فلم میں معیاری رول ادا کرسکیں (ہندستان ٹائمس ۱۶ ستمبر ۱۹۸۴) مسٹر ڈیرین کو اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ انھوں نے ۵ دسمبر ۱۹۸۱ کو خودکشی کرلی۔

مذکورہ شخص نے کیوں خودکشی کرلی۔ اس لئے کہ اس نے چھ مہینے تک محنت کرکے اپنے اندر جو صلاحیت پیدا کی تھی اس کو اس کا وہ استعمال نہیں ملا جو اس نے چاہا تھا۔ اس سے اس کے اندر مایوسی پیدا ہوئی اور اس نے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا۔

مگر انسان اپنی محنت سے اپنے اندر جو صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ وہ صلاحیت اپنی قیمت آپ ہے۔ اگر فوری طور پر اس کو اس کے استعمال کا موقع نہ ملے تب بھی وہ ایک محفوظ خزانہ ہے۔ اس کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کی محنت بے کار چلی گئی۔ اس کی محنت سے پیدا شدہ لیاقت بدستور اس کے پاس موجود رہتی ہے اور جلد ہی آدمی کوئی دوسرا موقع پالیتا ہے جہاں وہ اس کو استعمال کرکے اس کی پوری قیمت وصول کرسکے۔

چالیس سال بعد

۳۱ جولائی ۱۹۸۴ کو دہلی میں فیض روڈ کے پاس ایک لاش ملی۔ اس کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی اور اس کو بری طرح قتل کرکے ایک پارک میں ڈال دیا گیا تھا۔ پولس نے کافی کوشش کی اور اشتہارات دئے مگر مقتول کی شناخت ممکن نہ ہو سکی۔ مقتول کے جسم پر جو قمیص تھی اس پر "آزاد ٹیلرس" کا لیبل لگا ہوا تھا۔ مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس پر کوڈ نمبر ۲۰۵ بھی درج ہے۔ کافی تلاش وجستجو کے بعد آخر کار پولس ساون پارک کی ایک چھوٹی سی دکان تک پہنچی۔ اس دکان کے مالک صلاح الدین نے بڑی مشکل سے "پانڈے" نام کے ایک شخص کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد پولیس قریب کے "کمال کلاتھ ہاؤس" تک پہنچی جس نے بتایا کہ مذکورہ شخص کا پورا نام دیونرائن پانڈے تھا۔ اس کا وطن فیض آباد تھا اور کام کے لئے وہ دہلی میں رہتا تھا۔

دیونرائن پانڈے موزائک فرش کی پالش کا کام کرتا تھا۔ پولس کی تحقیق جاری رہی۔ بالآخر معلوم ہوا کہ مذکورہ شخص نے چالیس سال پہلے ایک شخص کو کسی ذاتی رنجش کی بنا پر مار ڈالا تھا۔ اس مقتول کا بھتیجا ہندر کمار چودھری (۲۳ سال) بچپن سے اپنے گھر میں سنتا آیا تھا کہ پانڈے نے اس کے چچا کو قتل کیا ہے۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے دیونرائن پانڈے سے دوستی کی اور ایک دن موقع پاکر اس کو قتل کر دیا۔ قاتل اب پولس کی حراست میں ہے اور اس نے جرم کا اقبال کر لیا ہے (ہندستان ٹائمس ۱۴ ستمبر ۱۹۸۴ء)

ہندر کمار چودھری کا خاندان چالیس سال بعد بھی اپنے قاتل کو نہ بھلا سکا۔ اس کے انتقام کی آگ اس وقت تک ٹھنڈی نہ ہوئی جب تک اس نے مارنے والے کو مار نہ ڈالا۔

ہر ماحول میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا حل بدلہ لینا نہیں بلکہ بھلا دینا ہے۔ شکایت کو بھلانا مسئلہ کو گھٹاتا ہے اور شکایت کا بدلہ لینا مسئلہ کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے۔

مگر یہ کوئی آسان معاملہ نہیں۔ آدمی ایک کھوئی ہوئی چیز کو اسی وقت بھلا سکتا ہے جب کہ وہ اس سے بڑی چیز اپنے لئے پالے۔ محرومی کو بھلانے کے لئے ہمیشہ کوئی بڑی چیز درکار ہوتی ہے۔ یہ "بڑی چیز" صرف آخرت ہے۔ آخرت کا عقیدہ آدمی کو وہ سب سے بڑی چیز دے دیتا ہے جس کے مقابلہ میں ہر چیز کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت کو پانے والا ہر دوسری چیز کا کھونا گوارا کر لیتا ہے۔

اپنی کوشش سے

نفسیات کے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر جن صلاحیتوں کا مالک ہے عام طور وہ ان کا صرف دس فی صد حصہ استعمال کرتا ہے۔ اس تحقیق کا ذکر کرتے ہوئے ہارورڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر ولیم جیمس نے کہا ——— "جو کچھ ہمیں بننا چاہئے وہ کچھ ہم بننے کے لئے تیار نہیں" ہم کو دوسروں سے شکایت ہے کہ وہ ہم کو ہمارا حصہ نہیں دیتے۔ مگر سب سے پہلے ہم کو خود اپنے آپ سے شکایت ہونی چاہئے کہ قدرت نے پیدائشی طور پر ہمارے لئے دنیا میں جو ترقیاں اور کامیابیاں مقدر کی تھیں، ہم اس کے مقابلہ میں ایک بہت کمتر زندگی پر قانع ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہر انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ دوسروں کی طرف دیکھنے کے بجائے خود اپنی طرف دیکھے۔ کیوں کہ انسان آپ ہی اپنا دوست بھی ہے اور آپ ہی اپنا دشمن بھی۔ آدمی کے باہر نہ اس کا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی اس کا دشمن۔ آدمی اپنی امکانیات کو استعمال کر کے کامیابی حاصل کرتا ہے اور جب وہ اپنی امکانیات کو استعمال نہ کرے تو اسی کا دوسرا نام ناکامی ہے۔

تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ کوششوں کا استعمال صحیح رخ پر ہو۔ غلط رخ پر کوشش کرنا اپنی قوتوں کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔

قدیم انسان کے نزدیک دولت مند بننے کی صورت صرف ایک تھی۔ وہ یہ کہ لوہے کو سونا بنایا جائے۔ وہ قیمتی چیز کے نام سے صرف سونے کو جانتا تھا۔ بے شمار لوگ ہزاروں سال تک لوہے کو سونا بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر ان کے حصہ میں بالآخر اس کے سوا اور کچھ نہ آیا کہ اپنے وقت اور پیسہ کو ضائع کریں اور پھر ایک دن حسرت کے ساتھ مر جائیں۔

مگر خدا کی دنیا میں ایک اور اس سے زیادہ بڑا امکان موجود تھا۔ اور وہ تھا لوہے کو مشین میں تبدیل کرنا۔ موجودہ زمانہ میں مغربی قوموں نے اس راز کو جانا اور اپنی محنتیں اس رخ پر لگا دیں۔ انھوں نے لوہے کو مشین میں تبدیل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سونے اور چاندی سے بھی زیادہ بڑی مقدار میں دولت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ناکامی کا سبب

لاس اینجلس میں ہونے والے اولمپک گیم (جولائی۔ اگست ۱۹۸۴) میں ہندستان سے حصہ لینے والوں کا جو دستہ گیا تھا اس میں کل ۶۲ افراد تھے۔ کھیل کے خاتمہ پر یہ لوگ واپس ہو کر ۱۴ اگست ۱۹۸۴ کو نئی دہلی پہنچے تو ہوائی اڈہ پر ان کا زیادہ پرجوش استقبال نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اولمپک میں کوئی میڈل نہ جیت سکے۔ نہ سونے کا نہ چاندی کا اور نہ کانسی کا۔

اس ناکامی کا سبب کیا تھا، ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹ (۱۷ اگست ۱۹۸۴) کے مطابق لوٹنے والے کھلاڑیوں میں سے ایک نے کہا کہ سائنسی اور منظم تربیت کا نہ ہونا ہندستان کے ناقص کھیل کی بنیادی وجہ تھی۔ ہم نے اپنی بہترین کوشش کی۔ مگر بدقسمتی سے وہ کافی نہ تھی۔ ہندستانی ٹیم کی تربیت کافی پہلے سے شروع ہونی چاہئے نہ کہ صرف تین ماہ پہلے سے۔ اس سلسلہ میں اخبار میں جو باتیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے ایک بات یہ ہے۔

> Lack of scientific and systematic training was the main reason for India's poor showing. We did our best but that, unfortunately, was not good enough. The training of Indian teams should start wel before an event and not just three months.

مذکورہ شخص نے جو بات اولمپک کے کھیل کے بارہ میں کہی وہی زندگی کے ہر "کھیل" کے لئے درست ہے۔

مقابلہ کی اس دنیا میں کامیابی کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے کہ آپ میدان میں اتریں تو پوری تیاری کر کے اتریں۔ اگر آپ کم تر تیاری کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہو گئے تو آپ کے لئے ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

آپ کی تیاری دو پہلوؤں کے اعتبار سے ہونا چاہئے۔ ایک یہ کہ وہ باقاعدہ ہو اور دوسرے یہ کہ وہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ اگر آپ کی تربیت باقاعدہ اور منظم نہیں تو آپ زندگی کے اسٹیج پر شاعر اور خطیب بن کر رہ جائیں گے۔ اور اگر آپ کی تربیت وقت کے تقاضوں کے مطابق نہیں تو آپ کو صرف تاریخ کے عجائب خانہ میں جگہ ملے گی۔ آپ خواہ اور جو کچھ ہو جائیں۔ مگر آپ وقت کے زندہ نقشوں میں اپنے لئے جگہ نہیں بنا سکتے۔

خود اعتمادی کا راز

حبیب بھائی (حیدر آباد) نے ۱۲ فروری ۱۹۸۴ کو اپنا ایک واقعہ بیان کیا۔ وہ چند سال پہلے یوروپ کے ایک سفر پر گئے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ لوزان (سوئزر لینڈ) بھی گئے وہاں انھوں نے ایک دکان سے ایک کیمرہ خریدا۔ یہ کیمرہ انھیں ہندستانی قیمت کے لحاظ سے پانچ ہزار روپئے میں ملا۔ انھوں نے کیمرہ لے لیا۔ مگر بعد کو انھیں احساس ہوا کہ انھوں نے غلطی کی ہے۔ ان کو یوروپ سے واپسی میں عمرہ کے لئے سعودی عرب بھی جانا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ سعودی عرب میں یہ کیمرہ تقریباً تین ہزار روپے میں مل جائے گا۔ پھر یہاں میں اس کو مہنگی قیمت میں کیوں خریدوں۔

اب انھوں نے چاہا کہ اس کیمرہ کو واپس کردیں۔ مگر فوراً خیال آیا کہ جب میں دکان پر جاکر واپسی کے لئے دکاندار سے کہوں گا تو وہ پوچھے گا کہ کیوں واپس کر رہے ہو۔ واپسی کو برحق ثابت کرنے کے لئے مجھے کیمرے میں کوئی نقص بتانا ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے ادھر ادھر دیکھ کر یہ چاہا کہ کیمرہ میں کوئی خرابی دریافت کریں تاکہ اس کا حوالہ دے کر اپنی واپسی کو درست ثابت کرسکیں۔ مگر تلاش کے باوجود کیمرہ میں کوئی نقص نہیں ملا۔

تاہم ان کی طبیعت اندر سے زور کر رہی تھی۔ چنانچہ وہ کیمرہ لے کر دوبارہ دکان پر گئے۔ وہاں کاونٹر پر ایک خاتون کھڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ کیمرہ میں نے آپ کے یہاں سے خریدا تھا۔ اب میں اس کو واپس کرنا چاہتا ہوں۔ جب انھوں نے یہ بات کہی تو ان کی توقع کے خلاف خاتون نے واپسی کی وجہ دریافت نہیں کی۔ اس نے صرف یہ پوچھا کہ آپ اپنی رقم ڈالر میں چاہتے ہیں یا ملکی سکہ میں۔ انھوں نے کہا کہ ڈالر میں۔ خاتون نے اسی وقت واپسی کا پرچہ بنا دیا۔ وہ اس کو لے کر دوسرے کاؤنٹر پر پہنچے۔ وہاں فوراً ان کو مذکورہ ڈالر واپس کردئے گئے۔ جیسے کہ رقم اور مال میں اس کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں۔

سوئزر لینڈ کے دکان دار نے کیوں ایسا کیا کہ کچھ کہے بغیر فوراً کیمرہ واپس لے لیا، اور پوری قیمت لوٹا دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو اپنے مال کی کوالٹی پر پورا بھروسہ تھا۔ اس کو یقین تھا کہ میرا مال چوں کہ معیاری ہے اس لئے ضرور کوئی نہ کوئی اسے خریدے گا۔ خواہ ایک شخص اسے خریدے یا دوسرا شخص۔

فکری انقلاب

المعہد العلی للفکر الاسلامی کا بین اقوامی سیمنار (کوالالمپور، جولائی ۱۹۸۴) مسلم نوجوانوں میں ایک نئے فکری دور کی علامت ہے۔ معہد کے فکر کا خلاصہ اس کے تعارفی پمفلٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں امت مسلمہ کی ناکامی کا سبب خود اس کے اندر ہے نہ کہ اس کے باہر۔ وہ سبب ہے —— ضروری بنیاد تیار کئے بغیر عملی اقدامات کرنا۔ معہد کے نزدیک پہلی ضروری چیز وہ ہے جس کو اسلامیۃ المعرفۃ (Islamization of knowledge) کے لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ امت کے موجودہ بحران کو حل کرنے کے سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ علم کو اسلامی بنایا جائے:

> The first step toward a genuine solution of the present crisis of the Ummah is the Islamization of knowledge.

تقریباً ۱۲ سال پہلے میں نے ایک مقالہ لکھا تھا۔ یہ مقالہ عربی زبان میں اگست ۱۹۷۲ میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا :

لابد من الثورة الفكرية قبل الثورة التشريعية

اس مقالہ میں تفصیل سے یہ دکھایا گیا تھا کہ سیاسی یا قانونی انقلاب سے پہلے فکری انقلاب ضروری ہے۔ امت کے عملی مسائل صرف اس وقت حل ہوں گے جب کہ ہم فکری انقلاب کے ذریعہ اس کے موافق فضا بنا چکے ہوں۔

یہاں میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ عین وہی بات ہے جو خود قرآن کی رو سے ہمارا اہم ترین اجتماعی فریضہ قرار پاتی ہے۔ قرآن میں دو مقام پر (البقرہ ۱۹۳، الانفال ۳۹) یہ حکم دیا گیا ہے کہ —— وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله:

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔

جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے، اس آیت میں فتنہ سے مراد شرک جارح ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس وقت اسلام تھوڑا تھا۔ چنانچہ جب کوئی شخص دین توحید کو اختیار کرتا تو اہل شرک اسے ستاتے۔ کسی کو وہ قتل کر دیتے، کسی کو زنجیروں میں باندھتے اور کسی کو عذاب دیتے۔ یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہو گئی اور یہ صورت حال باقی نہ رہی کہ عقیدہ توحید کی بنا پر کسی کو ستایا جائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں فتنہ سے وہی چیز مراد ہے جس کو ایذا رسانی (Persecution) کہا جاتا ہے۔ یعنی مختلف عقیدہ رکھنے کی بنا پر کسی کو ستانا۔ قدیم زمانہ میں شرک کو غلبہ حاصل تھا۔ چنانچہ اہل شرک ہزاروں سال تک یہ کرتے رہے کہ وہ توحید کا عقیدہ رکھنے والوں کو ستاتے (وما نقموا منهم الا ان يؤمنوا بالله العزيز الحميد)

پیغمبر آخرالزماں کا مشن یہ تھا جس کو آپ نے اپنی زندگی میں مکمل فرمایا کہ آپ اس مخالفانہ صورت حال کو ختم کر دیں۔ وہ شرک کے عمومی غلبہ کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیں۔ تاکہ خدا کے بندوں کے لئے توحید کا عقیدہ اختیار کرنے میں جو چیز رکاوٹ بن رہی ہے وہ رکاوٹ باقی نہ رہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارہ میں فرمایا: انا احمد وانا الماحی الذی یمحو اللہ بی الکفر (الحدیث ۴۰، صفحہ ۳۳۴)

موجودہ زمانہ میں شرک کی جارحانہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ مگر غور کیجئے تو اصل صورت حال دوبارہ ایک نئی شکل میں لوٹ آئی ہے۔ آج دوبارہ انسان کے لئے دین توحید اختیار کرنے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مگر آج دین سے روکنے والا عنصر اپنا کام فکری طاقت کے زور پر کر رہا ہے نہ کہ شمشیری طاقت کے زور پر۔

آج کا فتنہ جدید ملحدانہ افکار کا فتنہ ہے۔ جو کام قدیم زمانہ میں شرک کرتا تھا وہ آج ملحدانہ افکار انجام دے رہے ہیں۔ آج کی دنیا میں ایسے افکار غالب آ گئے ہیں جو خدا کے وجود کو مشتبہ قرار دیتے ہیں۔ جو وحی و الہام کو فرضی بتاتے ہیں، جو آخرت کو بے بنیاد ثابت کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ افکار دین توحید کو اختیار کرنے میں مانع بنے ہوئے ہیں۔ آج کا فتنہ یہ ہے کہ خود سوچنے کے انداز کو بنیادی طور پر بدل دیا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کا انسان یا تو منکر بن گیا ہے یا وہ کم از کم (متشکک) ہے۔

یہ ایک قسم کا فکری حملہ (Intellectual invasion) ہے۔ ہم کو اس حملہ کا مقابلہ کرنا ہے۔ اب ہمیں دوبارہ قاتلوهم حتى لا تكون فتنة پر عمل کرنا ہے۔ مگر یہ عمل شمشیر کے ذریعہ نہیں ہوگا، بلکہ افکار کی طاقت کے ذریعہ ہوگا۔ ملحدانہ افکار کا جواب ہمیں توحیدی افکار سے دینا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ اعلیٰ علمی استدلال سے جدید ملحدانہ افکار کو بے بنیاد ثابت کر دیا جائے۔ ہماری یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ نظریات اپنا غلبہ کھو نہ دیں اور توحید کا فکر وقت کا غالب فکر نہ بن جائے۔

غلبہ اور مغلوبیت کا یہ واقعہ اولاً فکری میدان میں ہوگا۔ یہ اسی قسم کا ایک واقعہ ہوگا جیسا کہ ہم موجودہ زمانہ میں مغربی افکار کی مثال میں دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم

نے روایتی علوم پر غلبہ پایا ہے۔ شہنشاہی نظریہ کے اوپر جمہوری نظریہ فائق ثابت ہوا ہے۔ تخلیقی طرز فکر پر ارتقائی طرز فکر کو بالاتری حاصل ہے۔ اجتماعی معیشت کے نظریہ کے مقابلہ میں انفرادی معیشت کا نظریہ دفاعی پوزیشن میں چلا گیا ہے۔ یہ سب کے سب فکری غلبہ کے واقعات ہیں۔ اسی نوعیت کا غلبہ ملحدانہ فکر پر موحدانہ فکر کے لئے مطلوب ہے۔ یہی غلبہ ملت کی اگلی تمام کامیابیوں کی تمہید ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں ملحدانہ افکار کا غلبہ ان کی کسی جوہری اہمیت کی وجہ سے نہیں ہوا ہے۔ یہ تمام تر صرف مغالطہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو نئے سائنسی حقائق دریافت ہوئے وہ حقیقۃً قدرت خداوندی کے بھیدوں کا اظہار تھے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ دین توحید کے حق میں فطرت کے دلائل تھے مگر مسلمان مختلف اسباب سے جدید سائنسی علوم میں پیچھے ہو گئے۔ وہ اس قابل نہ ہو سکے کہ ان علوم کو صحیح رخ دے سکیں۔ اور ان کو دین کی تائید میں استعمال کریں۔ ملحد علماء نے اس خلا سے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے جدید معلومات کو غلط تعبیر کے ذریعہ اپنے حق میں استعمال کیا۔ جن واقعات سے دین توحید کا اثبات نکل رہا تھا، ان کو دین الحاد کی دلیل بنا دیا۔

اس کی ایک واضح مثال ارتقاء کا نظریہ ہے، جس نے موجودہ زمانہ میں ملحدانہ فکر پیدا کرنے میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہے۔

زمینی طبقات کے مطالعہ کے دوران انسان کے علم میں یہ بات آئی کہ قدیم زمانہ کے حیوانات کے ڈھانچے مخصوص کیمیائی عمل کے نتیجہ میں پتھر کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ زمین کی کھدائی سے اس قسم کے بہت سے متحجر نمونے جمع کئے گئے۔ ان پر ریڈیو ایکٹیو ڈیٹنگ کا طریقہ استعمال کیا گیا تو تقریباً صحت کے ساتھ ان کی تاریخیں معلوم ہو گئیں۔ یہ تحقیقات سو سال سے بھی زیادہ لمبے عرصے تک جاری رہیں۔ یہاں تک کہ انسان اس پوزیشن میں ہو گیا کہ مختلف انواع حیات کے درمیان تاریخ کے اعتبار سے ترتیب قائم کر سکے۔

اس تاریخی ترتیب سے معلوم ہوا کہ وہ تمام مختلف انواع حیات جو آج زمین پر بظاہر بیک وقت نظر آ رہی ہیں وہ سب زمین پر بیک وقت موجود نہیں ہو گئیں، بلکہ زمین پر ان کے ظہور میں ایک تاریخی ترتیب ہے، وہ یہ کہ سادہ انواع حیات سب سے پہلے ظہور میں آئیں۔ اس کے بعد بتدریج زیادہ پیچیدہ انواع حیات ظہور میں آتی رہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر انسان ظاہر ہو گیا۔ اس طرح واحد الخلیہ جاندار (Single cellular animal) زمین پر پہلے وجود میں آئے۔

اور انسان اس حیاتیاتی ترتیب کے سب سے آخر میں ظاہر ہوا۔

نظریہ ارتقاء کی عمارت جن مشاہدات پر قائم کی گئی ہے ان میں سب سے اہم مشاہدہ یہی ہے۔ نظریہ ارتقاء کے حامیوں کا کہنا ہے کہ یہ ترتیب بتاتی ہے کہ زندگی کی مختلف قسمیں ارتقائی عمل کے ذریعہ ظہور میں آئیں، یعنی زندگی کا ہر اگلا فارم اپنے پچھلے فارم سے نکلتا رہا۔ یہ ترقی ہر اگلی نسل میں جمع ہوتی رہی یہاں تک کہ اس کے آخری مجموعہ نے وہ اعلیٰ صورت اختیار کر لی جس کو انسان کہا جاتا ہے۔

مگر یہ سراسر غلط تعبیر کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی حقیقی استدلال کا نتیجہ۔ خالص علمی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جو بات مشاہدہ میں آئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ زمین پر انواع حیات کی موجودگی میں ایک زمانی ترتیب پائی جاتی ہے نہ یہ کہ انواع حیات ایک دوسرے کے بطن سے بطریق تناسل پیدا ہوتی چلی گئی ہیں۔

اصل مشاہدہ صرف تخلیق کی زمانی ترتیب کو بتا رہا تھا مگر غلط تعبیر کے ذریعہ اس کو زندگی کے ارتقائی ظہور کے ہم معنی بنا دیا گیا۔ ارتقاء کے مشاہدات خالق (Creator) کی تردید نہیں کرتے، جیسا کہ خود چارلس ڈارون نے اپنی کتاب " اصل الانواع " میں تسلیم کیا ہے۔ بلکہ اگر یہ مشاہدات درست ہوں، تو وہ خالق کے تخلیقی عمل کی ترتیب کو بتاتے ہیں۔

یہ مختصر جائزہ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے احیاء کی راہ کا پہلا بنیادی کام اسلام کا فکری غلبہ ہے۔ مزید یہ کہ یہ فکری غلبہ بظاہر دشوار ہونے کے باوجود انتہائی آسان ہے۔ اسلام کی پچھلی تاریخ میں اس سے ملتی جلتی مثالیں اس کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب کے لوگ اسلام کے نہایت سخت دشمن کے روپ میں ظاہر ہوئے مگر صرف ربع صدی کی دعوتی جدوجہد نے بتایا کہ اس طاقت ور دشمن کے اندر طاقتور مددگار کی شخصیت چھپی ہوئی تھی۔ اسی طرح ساتویں صدی ہجری میں تاتاری قبائل اسلام کے خلاف ناقابل تسخیر قوت بن کر ابھرے۔ مگر ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں معلوم ہوا کہ یہ طاقت ور تلوار صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ بالآخر وہ اسلام کی طاقت ور خادم اور محافظ بن جائے۔

یہی موجودہ زمانہ کے " اسلام دشمن " علوم کا معاملہ ہے۔

ان علوم نے بظاہر آج اسلام کو مغلوب کر رکھا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی کوششوں کو صحیح رخ سے جاری کر سکیں تو نصف صدی بھی نہیں گذرے گی کہ یہ سارا علم اسلام قبول کر لے گا، وہ اسلام کے علم کلام کی صورت اختیار کر لے گا اور پھر دنیا دیکھے گی کہ جدید علمی قوت صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ وہ

خدا کے دین کی طاقت ور مددگار بن جائے۔

اسلام کے حق میں اس نتیجہ کو حاصل کرنے کی صرف ایک ہی ضروری شرط ہے۔ وہ یہ کہ ہم دوسرے میدانوں میں اپنی جو قوت ضائع کر رہے ہیں اس کو سمیٹ کر اسی ایک میدان، فکری انقلاب لانے کے میدان میں لگا دیں۔ جس دن یہ واقعہ ہوگا اسی دن اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ صحیح آغاز ہی دراصل صحیح اختتام کا دوسرا نام ہے۔

نوٹ: یہ مقالہ (انگریزی زبان میں) کوالالمپور کے انٹرنیشنل سمینار جولائی ۱۹۸۴ میں پیش کیا گیا۔

تحقیق حال

مولانا عبد الماجد دریا بادی نے جولائی ۱۹۶۵ کا ایک تجربہ ان الفاظ میں لکھا تھا ــــ" ایک دن دوپہر کی گاڑی سے کلیفورنیا یونی ورسٹی کے ایک استاد بے شان وگمان دریا باد پہنچے۔ اور دوڈھائی گھنٹے کے سوال وجواب کے بعد واپسی کی ٹرین سے واپس ہو گئے امریکہ کے صاف وشفاف بلوری سڑکوں کا عادی ہمارے قصبات کی ادھ کچی ادھ پکی کھانچوں اور گڑھوں سے بھری ہوئی سڑکوں کا تصور بھی نہ کرسکتا ہوگا۔ اور پھر موٹر نشیں امریکی کے ذہن میں کھڑکھڑے چرخ چوں ایکوں کی تصویریں بھی کیوں آنے لگیں تھیں۔ اور یہ تجربہ بالکل انوکھا نہیں۔ ایک اور امریکی پروفیسر خاک پھانکتے آج سے چند سال قبل بھی آچکے تھے۔ ایسے اعجوبہ سفر سے بڑھ کر اعجوبہ سفر بھی غرض وغایت نکلا۔ موضوع مطالعہ وتحقیق ہندستان میں تحریک خلافت کی تاریخ (تقریباً ۱۹۱۹ - ۱۹۲۹) اس ایک کام کے لئے امریکہ سے ہندستان، پاکستان کا سفر۔ اور مدراس، بنگلور، دہلی، حیدرآباد، کلکتہ، لکھنؤ، لاہور، کراچی وغیرہ کے علاوہ دریا باد تک کی پرمشقت مسافت۔ اور عین اسی زمانہ میں ایک دوسرے امریکی ریسرچ اسکالر اپنا موضوع لئے ہوئے ہندستانی مسلمانوں کی سیاسی تحریکات (۱۹۰۰ سے لیکر ۱۹۲۰ تک) ہندستان کی خاک چھان رہے ہیں۔ اور دریا باد آنے پر ہر وقت آمادہ۔ لکھنؤ میں بیٹھے ہوئے ہیں کے حقیر ذخیرۂ معلومات (کامریڈ وغیرہ کی جلدوں) سے کام لے رہے ہیں (صدق جدید ۱۲ اگست ۱۹۶۵)

یہ اس قسم کی بے شمار مثالوں میں سے ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی قومیں کس طرح ہر قسم کے احوال سے اپنے کو باخبر رکھتی ہیں۔ تاکہ ان کی پلاننگ صحیح ہو۔ قدیم زمانہ میں صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد سارے یوروپ میں نئے قسم کے اہل علم جاگ اٹھے جن کو مستشرق کہا جاتا ہے۔ انھوں نے مشرقی اقوام (بشمول مسلمان) کی اتنی کامل تحقیق کی کہ ان کے بارے میں خود مشرقی اقوام سے زیادہ واقف اور باخبر ہوگئے۔ اس واقفیت سے انھوں نے زبردست فائدہ اٹھایا جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

صلیبی جنگوں جیسا واقعہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ برعکس صورت میں پیش آیا۔ مگر موجودہ پورے دور میں مسلمانوں میں کوئی بھی مثال نہیں ملتی جب کہ مسلم اہل علم نے مغربی اقوام کی برتری کا راز سمجھنے کے لیے حقیقی معنوں میں کوئی سنجیدہ کوشش کی ہو۔

چپ رہنا چاہئے

غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانا مسلمانوں پر فرض ہے۔ مگر ساری مسلم دنیا میں کوئی ایک بھی خالص دعوتی انداز کا انگریزی جریدہ نہیں۔ انگریزی الرسالہ مسلم دنیا کا واحد ماہنامہ ہے جو خالص دعوتی اور تعمیری انداز میں نکالا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی الرسالہ پوری امت کی طرف سے ایک فرض کفایہ کی ادائگی ہے۔ وہ بلاشبہ اس کا مستحق ہے کہ آج کا ہر مسلمان اس کو اپنی کھوئی ہوئی متاع سمجھے اور اس کو غیر مسلم حضرات نیز انگریزی داں مسلمانوں تک پہنچا کر اپنی دعوتی ذمہ داری کو پورا کرے۔

مگر کچھ لوگ انتہائی نادانی کے ساتھ یہ کام کر رہے ہیں کہ وہ اردو داں لوگوں میں یہ خیال پھیلا رہے ہیں کہ انگریزی الرسالہ میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ تاکہ اردو داں طبقہ اس کے معیار کے بارہ میں مشتبہ ہو جائے اور وہ اس کو انگریزی داں طبقہ تک پہنچانے میں زیادہ پرجوش نہ رہے۔

جن صاحبان کے بارہ میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ایسا کہہ رہے ہیں، ہم نے فوراً ان سے تحریری یا زبانی درخواست کی کہ وہ متعین مثال کے ذریعہ بتائیں کہ انھوں نے انگریزی الرسالہ میں کون سی ادبی یا لسانی غلطی پائی ہے۔ مگر ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی اب تک تعین کے ساتھ ایسی کوئی مثال پیش نہیں کی۔ اور اگر کسی نے پیش کی تو وہ ایسی مثال تھی کہ ہم کو جواب میں اسے پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد سنانا پڑا کہ ــــــ من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا اولیصمت (جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ کہے تو بھلی بات کہے ورنہ چپ رہے)

۴ ستمبر ۱۹۸۴ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ہمارے دفتر میں آئے۔ وہ انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے الرسالہ کا جو انگریزی اڈیشن نکالا ہے اس میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں نے اسی وقت انگریزی الرسالہ کے تمام پرچے نکالے اور انھیں ان کے سامنے رکھ دیا۔ میں نے کہا کہ انگریزی الرسالہ کے اب تک آٹھ شمارے نکل چکے ہیں۔ اور یہ سب کے سب آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ان کے سوا اس کا اور کوئی شمارہ نہیں۔ آپ ان کو دیکھ کر متعین طور پر بتائیں کہ ان میں کہاں کہاں زبان کی غلطی پائی جاتی ہے۔

انھوں نے پرچوں کو لیا اور تقریباً ایک گھنٹہ تک ان کے مضامین پڑھتے رہے۔ ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی غلطی کی نشاندہی سے اپنے آپ کو عاجز پا رہے ہیں۔ آخر میں انھوں نے جولائی ۱۹۸۴ کا صفحہ ۱۳ میرے سامنے کھولا جس پر ایک مضمون حسب ذیل عنوان سے شائع ہوا ہے:

Sowing today, reaping tomorrow

یہ اس اردو مضمون کا ترجمہ ہے جو الرسالہ (جنوری ۱۹۸۴) میں صفحہ ۲۱ پر شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ایک جملہ ان الفاظ میں تھا:

"تاہم نوجوان برلا اس بیچ پر نہیں بیٹھے اور کام ہونے تک برابر کھڑے رہے"

الرسالہ انگریزی کے مذکورہ مضمون میں اس جملہ کے آخری حصہ کا ترجمہ حسب ذیل الفاظ میں چھپا ہے:

He stayed standing until his work was finished.

مذکورہ بزرگ نے فرمایا کہ اس جملہ میں Stay کے بجائے Remain اور Finish کی جگہ Complete کا لفظ استعمال ہونا چاہئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ جملہ کو اپنے خیال کے مطابق درست کرکے لکھئے۔ انھوں نے اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے:

He remained standing until his work was completed

ہر انگریزی داں جانتا ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں۔ یہ ایک لفظ کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا ہم معنی لفظ رکھ دینا ہے۔

کسی کے خلاف بولنے کے لئے اگر آپ کے پاس مذکورہ بالا قسم کی بات کے سوا کچھ اور نہ ہو تو آپ کو چاہئے کہ چپ رہیں، نہ یہ کہ غیر ضروری طور پر بولنے لگیں۔

مشن میں شرکت

اگر آپ الرسالہ کے پیغام سے متفق ہیں اور پھر بھی آپ نے ابھی تک الرسالہ کی ایجنسی نہیں لی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ——— آپ نے اس مشن میں اپنے آپ کو شامل نہیں کیا۔ جو شخص بھی الرسالہ کے مشن سے اتفاق رکھتا ہو اس کے اتفاق کا کم سے کم تقاضا ہے کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی لے۔

ایک سفر

۲۸ اپریل ۱۹۸۴ کی شام کو میں ایک پروگرام کے تحت دہلی سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوا۔ یہ سفر لکھنؤ میل کے ذریعہ ہوا۔ اسٹیشن پر پہنچا تو عام ڈبے اس قدر بھرے ہوئے تھے کہ مسافروں کے لئے کھڑا ہونا بھی مشکل تھا۔ مگر فرسٹ کلاس کیبن کی چار برتھ پر ہم صرف چار آدمی تھے۔ ہر آدمی کے لئے موقع تھا کہ جس طرح چاہے بیٹھے اور جس طرح چاہے سوئے۔ میں نے سوچا کہ زندگی کا معاملہ تعصب اور امتیاز کا معاملہ نہیں بلکہ قیمت کا معاملہ ہے۔ ٹرین میں عام ڈبے بھی ہیں اور فرسٹ کلاس کے ڈبے بھی۔ جو شخص جتنی قیمت ادا کرتا ہے اسی کے اعتبار سے ٹرین اس کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو زحمت میں پا رہا ہے تو شکایت اور احتجاج میں وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کو چاہئے کہ وہ اچھے ڈبہ کی قیمت ادا کرے اور ٹرین اس کے لئے اپنے بہترین ڈبہ کے دروازے کھول دے گی، خواہ وہ میرے جیسا مولوی ہو یا میرے بقیہ تین ساتھیوں کی طرح مسٹر۔

۲۹ اپریل کی صبح کو ۱۰ بجے لکھنؤ میں یہاں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ قارئین الرسالہ کا ایک اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع بٹلر پیلس کالونی میں جناب یمین الاسلام خاں صاحب کی رہائش گاہ پر تھا۔ لوگوں نے عام طور پر الرسالہ کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ کسی نے کوئی تنقید نہیں کی۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ کا یہ انداز ہم لوگوں کو بہت پسند ہے کہ اس میں چھوٹے چھوٹے مضامین ہوتے ہیں۔ کسی کے پاس کم وقت ہو تو وہ بھی چند منٹ میں اس کا ایک صفحہ پڑھ سکتا ہے اور اس سے کوئی سبق لے سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ طریقہ عین قرآنی طریقہ ہے۔ قرآن میں رکوع کی تقسیم اسی طرح کی گئی ہے۔ قرآن کے ہر رکوع میں ایک بات ہوتی ہے۔ آپ ایک رکوع پڑھ لیجئے اور آپ کو ایک بات مل جائے گی۔ یہی قرآنی انداز الرسالہ میں صفحہ صفحہ کے مضامین کی صورت میں اختیار کیا گیا ہے۔ الرسالہ سے کوئی بات لینے کے لئے آپ کو لمبا مقالہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ الرسالہ کا ہر صفحہ گویا ایک رکوع ہے۔ آپ اس کا ایک صفحہ پڑھ لیجئے اور آپ اپنے لئے سبق کی ایک بات پا جائیں گے۔

ایک صاحب نے ایران کے خمینی انقلاب کے بارہ میں راقم الحروف کی رائے پوچھی۔ میں نے کہا کہ اس طرح کے واقعات کو بتانے کے لئے اردو میں چونکہ صرف ایک لفظ (انقلاب) ہے اس لئے عام طور پر لوگ اس کو انقلاب کہہ دیتے ہیں۔ مگر یہ مغالطہ ہے۔ انگریزی میں اس کو واضح کرنا زیادہ آسان ہے۔

کیوں کہ انگریزی زبان میں اس طرح کے واقعات کے لئے دو الگ الگ لفظ ہیں۔ ایک کوپ Coup اور دوسرا ریولیوشن (Revolution) میرے نزدیک ایران میں جو ہوا وہ ریولیوشن نہیں بلکہ کوپ تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ عام کوپ فوج کے ذریعہ ہوتا ہے اور ایران میں یہ کوپ، مخصوص اسباب کے تحت، مذہبی طبقہ (کلرجی) کے ذریعہ پیش آیا۔ اب اگر آپ کوپ سے ریولیوشن کے نتیجہ کی امید کریں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے طفلانہ اچھل کود سے گہری منصوبہ بندی والے نتیجہ کی امید کرلی جائے۔

دوسری بات یہ کہ تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو خارجی تبدیلی کو نشانہ بناکر اٹھتی ہیں اور دوسری وہ جو داخلی تبدیلی کو نشانہ بناکر اٹھیں۔ غیر پیغمبرانہ تحریکیں اول الذکر انداز پر اٹھتی ہیں اور پیغمبرانہ تحریک ثانی الذکر انداز پر۔ میرے نزدیک موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام انقلابی تحریکیں (بشمول خمینی تحریک) پہلے انداز پر اٹھائی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سراسر بےنتیجہ رہیں۔ آئندہ بھی جب تک ہم پیغمبرانہ انداز پر کام نہیں کریں گے ہماری کوششیں اسی طرح حبط اعمال کا مصداق بنتی رہیں گی۔ کسی "شاہ" یا کسی "بھٹو" یا کسی "ناصر" کو ہلاک کرنے سے انقلاب نہیں آتا۔ انقلاب اپنے آپ کو ہلاک کرنے سے آتا ہے اور یہی وہ انقلاب ہے جس کے لئے اصاغر و اکابر میں سے کوئی بھی تیار نہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں شروع سے الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ میں اس سے پوری طرح متفق ہوں اب بتائیے کہ میں اس سے آگے کیا کروں۔ میں نے کہا کہ الرسالہ ایک مشن ہے۔ یہ مشن آدمی سے اس کی پوری زندگی اور اس کا سب کچھ مانگتا ہے۔ تاہم اس مشن میں اپنے کو شامل کرنے کی کم سے کم صورت یہ ہے کہ الرسالہ کی ایجنسی لی جائے۔ آپ الرسالہ کی ایجنسی لے کر اسے پھیلائیں۔

پھر میں نے کہا کہ ایجنسی کا طریقہ عین سنت کا طریقہ ہے۔ قرآن کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ وہ دفعۃً ایک کتاب کی صورت میں نہیں اترا بلکہ بار بار اترتا رہا۔ گویا کہ قرآن ایک قسم کا پیریڈکل (Periodical) تھا جو ۲۳ سال کے دوران وقفہ وقفہ سے نازل ہوتا رہا۔

سیرت کی کتابوں میں تبلیغ کے واقعات آتے ہیں تو اکثر اس طرح کے الفاظ ہوتے ہیں: فعرض علیھم الاسلام وتلا علیھم القرآن (ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن پڑھ کر سنایا) اس زمانہ میں عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ قرآن کا جو حصہ اترتا اس کو لوگ لکھ لیتے یا یاد کر لیتے اور پھر اس حصہ کو پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سناتے۔ آجکل کی زبان میں کہنا ہو تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن ایک آسمانی پیریڈیکل تھا اور ہر صحابی اس پیریڈیکل کی ایجنسی لئے ہوئے تھا" ایجنسی" دراصل اسی قدیم طریقہ کا جدید نام ہے۔ اور ہم نے موجودہ

زمانہ کے اعتبار سے اسی کو ماہنامہ الرسالہ کے لئے اختیار کیا ہے۔

اجتماع میں کچھ خواتین بھی شریک تھیں۔ یہ وہی خواتین تھیں جو الرسالہ کو برابر پڑھتی ہیں۔ ان کی طرف سے یہ بات کہی گئی کہ الرسالہ میں خواتین کے لئے کچھ مخصوص صفحات ہونے چاہئیں۔ میں نے کہا کہ کسی صفحہ پر "صفحۂ خواتین" کا لفظ لکھا جاسکتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مردوں کا اسلام اور ہے اور عورتوں کا اسلام اور۔ یہ مسئلہ حقیقی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔ چند خاص ضمنی مسائل میں عورت اور مرد کے درمیان فرق ہے۔ ورنہ دین کا جو اصل مطالبہ ہے اس میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ جو چیزیں مردوں پر فرض ہیں وہی عورتوں پر بھی فرض ہیں۔ جو چیزیں مردوں کے لئے حرام ہیں وہی عورتوں کے لئے بھی حرام ہیں۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ ——— فاستجاب لهم ربهم انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی بعضکم من بعض۔ اس آیت کو اس کے سیاق میں رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایک ہی "عمل" ہے جو دونوں صنفوں سے مطلوب ہے۔

کچھ لوگ اسلام کو ایک قسم کا تبرک سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کچھ خاص طرح کے پراسرار عملیات ہیں۔ ان کو ان کے خارجی آداب کے ساتھ دہرالو تو جنت مل جائے گی۔ کچھ اور لوگ ہیں جن کے نزدیک اسلام گویا لیڈری کا عنوان ہے۔ انھوں نے عوامی اشوز پر ہنگامہ کرنے کو اسلام سمجھ رکھا ہے۔ مگر یہ تمام چیزیں اسلام کی تصغیر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنے آپ کو ربانی انسان میں ڈھالنے کا دوسرا نام ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی چیز میں جیتا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ آدمی خدا میں جینے لگے۔

دنیا میں زندگی کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ نفس اور شیطان کی باتیں آدمی کی غذا ہوں۔ دوسرے یہ کہ خدا کی باتیں آدمی کی غذا بن جائیں۔

ایک انسان وہ ہے کہ کائنات کو دیکھے تو وہ اس کی عظمتوں میں گم ہو جائے۔ یہ وہ انسان ہے جس نے غیر خدا کو اپنی غذا بنایا۔ دوسرا انسان وہ ہے جو کائنات کو دیکھ کر اس کے خالق کو یاد کرنے لگے۔ وہ کائنات کی عظمتوں میں اس کے خالق کی عظمت کو پالے، یہ وہ انسان ہے جو خدا میں جیا۔ جس نے خدا کی یاد کو اپنی غذا بنایا۔

ایک انسان وہ ہے جس کو کامیابی والے حالات ملے تو اس کے اندر کبر کی نفسیات جاگ اٹھیں اور اگر وہ ناکامی کے حالات سے دوچار ہوا تو احساس کمتری میں مبتلا ہو کر رہ گیا۔ یہ وہ انسان ہے جو حالات میں جی رہا ہے۔ اس نے حالات کو اپنا سب کچھ بنا رکھا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے کہ اس کو

کامیابی ملی تو اس کو خدا کا انعام سمجھ کر اور متواضع ہو گیا اور اگر ناکامی کے حالات سے سابقہ پیش آیا تو اس کو خدا کی طرف سے تنبیہ سمجھ کر اپنے احتساب میں مشغول ہو گیا۔ یہ انسان وہ ہے جو خدا میں جیتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔

اسی طرح انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے طرح طرح کے معاملات پیش آتے ہیں۔ آدمی کے دل کو طرح طرح کے جھٹکے لگتے ہیں۔ اب ایک انسان وہ ہے جو ایسے مواقع پر ردعمل کی نفسیات کے تحت معاملہ کرے۔ وہ صرف اپنے نفع کو سامنے رکھے نہ کہ حق اور انصاف کو۔ جس کو اپنے سے بڑھتا ہوا دیکھے اس سے حسد کرنے لگے۔ کوئی دنیوی اعتبار سے اس سے کم ہو تو اس کو حقیر سمجھ لے۔ کسی سے شکایت ہو تو اس کے خلاف نفرت اور انتقام سے اس کا سینہ بھر جائے۔ یہ وہ انسان ہے جو اپنے نفس میں جینے والا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا انسان وہ ہے جو ردعمل سے اوپر اٹھ کر جیئے۔ جو معاملات میں ہمیشہ اپنے آپ کو خدا کے حکم کا پابند بنائے رہے۔ اس کا سینہ حسد اور نفرت اور انتقام سے پاک ہو۔ وہ جذبات کے ہر طوفان کو خدا کی طرف موڑ دے نہ کہ انسانوں کی طرف۔ یہ دوسرا انسان وہ ہے جو خدا میں جینے والا ہے۔ اور اسی دوسرے انسان کو وجود میں لانا اسلام کا اصل مقصود ہے۔

لکھنؤ کے اجتماع میں ابتداءً سوالات اور جوابات ہوئے۔ اس کے بعد میں نے مختصر خطاب میں بتایا کہ الرسالہ کی تحریک کا خاص نشانہ دو ہے۔ ایک زندہ عقیدہ پیدا کرنا۔ دوسرے، تعمیری انداز فکر۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے خطاب میں ان باتوں کی تفصیل بیان کی۔

لکھنؤ سے مجھ کو گونڈہ جانا تھا۔ لکھنؤ سے کرنل گنج تک ہم نے کار کے ذریعہ سفر کیا۔ یہاں سے دوبارہ ہم کو ٹرین پکڑنی تھی۔ مگر اسٹیشن پہنچنے میں چند منٹ کی دیر ہو گئی۔ ہم پلیٹ فارم میں داخل ہوئے تو ٹرین چل چکی تھی۔ میرے ساتھی جناب یمین الاسلام خاں صاحب دوڑ کر چڑھ گئے۔ مگر میں اپنی کمزوری کی وجہ سے چلتی ٹرین میں چڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ چنانچہ وہ بھی اتر آئے ——— میں نے سوچا کہ زندگی کی گاڑی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ کبھی یہ گاڑی اپنے مقام پر کھڑی ہوئی ملتی ہے کہ آپ آسانی سے اس پر سوار ہو جائیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چلتی ہوئی گاڑی میں کود کر آپ کو چڑھنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ زندگی کی گاڑی اس کو ہمیشہ کھڑی ہوئی ملے تو موجودہ عالم اسباب میں اس کی اس خواہش کا پورا ہونا ممکن نہیں۔ یہ دنیا سہل پسندی کا قبرستان نہیں بلکہ عالی ہمتی کی امتحان گاہ ہے۔ یہاں کامیابی صرف ان لوگوں کے لئے مقدر ہے جو عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کا ثبوت دیں۔

اب ہم نے ٹیکسی کی تلاش کی۔ مگر کوئی ٹیکسی نہیں ملی۔ دوسرا واحد بدل بس تھا۔ چنانچہ ہم نے کرنل گنج سے گونڈہ تک پچاس کلومیٹر کا سفر بس کے ذریعہ طے کیا۔ بس میں اگرچہ اتنے ہی آدمی تھے جتنی سیٹ تھی۔ تاہم یہ لوگ طرح طرح کے عوامی طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی دلچسپ باتیں سننے کو ملیں۔ بس عام انسانوں کے سفر کی سواری ہے۔ بس میں ملک کے عام انسان سے ملاقات ہوتی ہے۔ جو شخص صرف "فرسٹ کلاس" یا "ہوائی جہاز" سے سفر کرے اور کبھی اس سے نیچے نہ اترے وہ عام انسانوں سے باخبر نہیں ہو سکتا۔

مسافروں میں سے کوئی اکیلا تھا جو اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی دو یا تین تھے جن کا کوئی ساتھی پانی پینے کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ پہلی قسم کے مسافر ٹکٹ لے چکے تو انھوں نے کنڈکٹر سے کہنا شروع کیا کہ جلدی چلو، جلدی چلو۔ دوسری قسم کے مسافر چیخنے لگے "روک کر، روک کر" آجکل کی دنیا میں ہر آدمی صرف اپنی غرض کو جانتا ہے۔ کوئی "گاڑی" کو چلانے کا نعرہ لگا رہا ہے اور کوئی اس کو روکنے کا۔ یہ دونوں نعرے بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ جس کو جو نعرہ سودمند دکھائی دے رہا ہے اس کو اس نے اختیار کر لیا ہے۔ خواہ وہ ایک قسم کا نعرہ ہو یا دوسرے قسم کا۔

گونڈہ میں میری قیام گاہ سے ملی ہوئی سڑک پر ایک روز چند نوجوان جا رہے تھے۔ وہ آپس میں جوش کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ ایک نوجوان کی آواز کان میں آئی :

"میری تو یہی عادت ہے۔ میں کسی کا کہا نہیں مان سکتا۔ بالکل نہیں"

یہ بات جو نوجوان نے کہی یہی موجودہ زمانہ کا عام مزاج ہے۔ آج کوئی شخص کسی کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہر آدمی اپنی رائے کا بادشاہ بنا ہوا ہے۔ ہر آدمی بے تکان اپنی رائے کی حمایت میں تقریر کر رہا ہے۔ کسی سے بات کیجئے تو فوراً محسوس ہوگا کہ اس کو صرف اپنی بات سنانا ہے، آپ کی بات سننے کی اسے ضرورت نہیں۔

ایک حدیث میں قرب قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ان الفاظ میں بتائی گئی ہے: اور ہر رائے والے کا صرف اپنی رائے کو پسند کرنا (واعجاب کل ذی رأی برأیہ) آجکل کے لوگوں کا حال دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہی زمانہ آگیا ہے۔ آج کے دور کے مزاج کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ یہی ہوگا کہ ـــــ ہر آدمی کا صرف اپنی رائے کو رائے سمجھنا۔ یہی آج ہر ایک کا مزاج بن چکا ہے۔ خواہ وہ جاہل ہو یا عالم۔ امیر ہو یا غریب، مذہبی ہو یا غیر مذہبی۔ حتیٰ کہ اصلاح کا

ظلم پر دار ہو یا فساد کا علم بردار۔

لوگوں کا یہ مزاج اب اتنا بڑھ چکا ہے کہ اپنے سے باہر کوئی سچائی کسی کو نظر ہی نہیں آتی۔ حالانکہ سچائی کا انکار کسی انسان کا انکار نہیں بلکہ خود خدا کا انکار ہے۔ ہر بات کا ایک انسانی رخ ہوتا ہے اور ایک اس کا خدائی رخ۔ انسانی رخ یہ ہے کہ وہ ایک انسان کی زبان سے ادا ہو رہی ہے۔ اور خدائی رخ یہ ہے کہ وہ حق ہے، وہ خدا کی مطلوب بات ہے ——— غیر مومن کسی بات کے صرف انسانی رخ کو دیکھتا ہے اور اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو بات کے خدائی رخ کو دیکھ لے اور اس کے آگے ڈھ پڑے۔

اس خود ادائی کی نہایت زبردست قیمت آج کا ہر انسان ادا کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ وہ دوسروں کے تجربے سے فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔ ہر آدمی زندگی کا تجربہ خود کرتا ہے۔ جب وہ اپنی نصف زندگی تجربہ میں گزار چکا ہے اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے کہ کرنا کیا چاہئے تھا۔ اور میں کیا کرتا رہا۔ مگر اب وہ زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کا اس کے سوا کچھ انجام نہیں ہوتا کہ وہ حسرت کے ساتھ ایک ایسی دنیا سے چلا جائے جہاں دوبارہ آنا اس کے لئے مقدر نہیں۔ جانور اپنی ذاتی جبلت کے تحت عمل کرتے ہیں۔ انسان کو دوسروں کی نصیحت پر عمل کرنا ہے۔ آدمی جب نصیحت کا لحاظ کرنا چھوڑ دے تو وہ بدتر از حیوان کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔ جس کو قرآن میں اسفل سافلین کہا گیا ہے۔

گزشتہ میں اسی ماہ اپریل ۱۹۸۴ کا ایک واقعہ میرے علم میں آیا۔ ایک نوجوان اپنے ساتھی کو لے کر ایک بڑے تاجر کے یہاں پہنچا اور پچاس ہزار روپیہ کا مطالبہ کیا۔ تاجر نے عذر کیا۔ اتنے میں اس کا منشی آیا جس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ نوجوان نے سمجھا کہ اس میں روپئے بھرے ہوئے ہیں۔ اس نے فوراً بندوق اٹھائی اور منشی کے سینہ میں گولی پیوست کر دی۔ وہ وہیں مر گیا۔ اس کے بعد نوجوان نے بیگ کھولا تو اس کے اندر صرف کاغذات تھے۔

پولس نے اگلے دن نوجوانوں کو پکڑ لیا۔ یہ لوگ وہ تھے جو اس سے پہلے بہت سے کیس کر چکے تھے۔ اور پولس پہلے سے ان کے بارہ میں بھری بیٹھی تھی۔ چنانچہ پولس نے ان کی پٹائی شروع کی۔ کہنے والوں نے بتایا کہ اینٹ سے مار مار کر ان کے دونوں پاؤں توڑ ڈالے۔

جو لوگ اس طرح کا کام کرتے ہیں وہ نہایت بہادر لوگ ہوتے ہیں۔ مگر وہ اپنی بہادری کو داداگیری میں استعمال کرتے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ وہ یا تو جیل میں پڑے پڑے مر جائیں گے یا برسہا برس کے بعد اس حال میں نکلیں گے کہ وہ جسمانی اعتبار سے بالکل ناکارہ ہو چکے

ہوں گے اور دنیا میں کوئی کام کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔

یہ سب اسی خود رائی کی قیمت ہے۔ آجکل کے نوجوانوں کا حال یہ ہے کہ وہ جس رخ پر چل پڑتے ہیں بس اسی رخ پر بڑھتے رہتے ہیں۔ نہ کوئی مشورہ ان کی سمجھ میں آتا اور نہ کوئی نصیحت انھیں روکنے والی ثابت ہوتی یہاں تک کہ دوسروں کو گولی کا نشانہ بنانے والا خود گولی کا نشانہ بن جاتا ہے یا جیل کی سزاؤں سے از کار رفتہ ہوکر اس قابل نہیں رہتا کہ کوئی کام کر سکے۔

اس معاملہ میں بڑوں کی غلطی بھی کچھ کم نہیں۔ آجکل لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھیں کسی کے بھلے برے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کوئی نہ کسی کا خیرخواہ ہے اور نہ کوئی کسی کے کام آنے کے لئے تیار ہوتا ہے آپ کو ایسے لوگ بہت ملیں گے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام پر عالمی انقلاب کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہوں۔ مگر اپنے ماحول اور اپنی بستی کے کسی فرد کو منکر سے بچانا اور معروف پر لانا ان کی فہرست انقلاب سے خارج ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اصلاً ایک انفرادی عمل ہے مگر جھوٹے مجاہدین کے ہاتھ میں وہ ایک بے معنی سیاسی نعرہ بن کر رہ گیا ہے۔

جہاں تک والدین کا تعلق ہے ان کا معاملہ بھی عملاً اس سے مختلف نہیں۔ فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ جو کچھ بے تعلقی کی بنا پر کر رہے ہیں وہی والدین تعلق کی بنا پر کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہر باپ اپنی اولاد کے حق میں بیوقوف ہوتا ہے۔ اگرچہ دوسروں کے بارہ میں وہ بہت ہوشیار نظر آتا ہے۔

ایک صاحب نے مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی دادا گیری آجکل کون نہیں کرتا۔ مگر یہ لڑکے چونکہ اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے پولس نے ان کے اوپر اتنا زیادہ ظلم کیا۔

میں نے کہا کہ بالفرض اگر یہ واقعہ ہو کہ اکثریتی فرقہ کا نوجوان اس قسم کے واقعات پر پولس کی مار نہ کھاتا ہو اور اقلیتی فرقہ کا نوجوان انھیں واقعات پر پولس کی مار کھاتا ہو تب بھی سوچنے کا یہ طریقہ سراسر غلط ہے۔ کیوں کہ مسئلہ اپنے آپ کو بچانے کا ہے نہ کہ دوسروں کو ملزم ٹھہرانے کا۔

یہ کہنا بے فائدہ ہے کہ پولس صرف فلاں لوگوں کو کیوں مارتی ہے فلاں کو کیوں نہیں مارتی۔ اس کے بجائے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر یہ ہے کہ اس فعل سے بچا جائے جو پولس کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ آپ کو اپنے عتاب کا نشانہ بنائیں۔ ایسے لوگوں کو پولس کی زد میں آنے سے اپنے کو بچانا ہے نہ کہ پولس کی شکایت کے لئے ڈکشنری میں الفاظ تلاش کرنا۔

ایک صاحب نے بڑے جوش کے ساتھ کہا "اصلاحی وعظ سے کوئی فائدہ نہیں۔ اصل ضرورت انقلاب کی ہے" میں نے کہا کہ میں بھی انقلاب کا حامی ہوں۔ فرق یہ ہے کہ آپ لوگ دوسروں کے خلاف انقلاب کا جھنڈا اٹھاتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ خود اپنے اندر انقلاب پیدا کرو۔

میں ایک بار ایک صاحب کے مکان پر تھا۔ پڑوس کا بچہ پتنگ اڑانے کے شوق میں ان کی چھت پر آگیا۔ انھوں نے جب اس کو پتنگ اڑاتے دیکھا تو اس کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کا اپنا لڑکا باہر سے آیا۔ اس نے کمرہ کے اندر سے ایک پتنگ نکالی اور چھت پر آکر اڑانے لگا۔ وہی صاحب مکان جو دوسرے کے لڑکے کی پتنگ بازی پر غصہ ہو رہے تھے وہ اپنے لڑکے کی پتنگ کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

یہی حال آجکل ہر آدمی کا ہے خواہ وہ اصاغر میں سے ہو یا اکابر میں سے۔ شہر میں ایک بار میں نے عیدگاہ میں عید کی نماز پڑھی۔ عیدگاہ سے نکلا تو ایک قائد اسلام سے ملاقات ہو گئی۔ میں اخلاقاً ان کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ ایک قبرستان میں پہنچ گئے۔ پھر وہ اس کے اندر چلتے رہے، یہاں تک کہ ایک اونچی پختہ قبر پر کھڑے ہو گئے۔ فاتحہ پڑھ کر جب ہم لوگ واپس ہوئے تو انھوں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ یہ میری اہلیہ کی قبر ہے۔ جس زمانہ میں ان کا انتقال ہوا اس وقت میں ملک سے باہر تھا۔ بچوں نے قبر کو پختہ کرا دیا۔

یہ وہ قائد تھے جن کے نزدیک نجات کا دارومدار اس پر ہے کہ فاسد نظام کو اکھاڑ کر اس کی جگہ صالح نظام کو قائم کیا جائے۔ باہر کی دنیا میں تو اسلامی انقلاب لانے کے لئے ان کے نزدیک نظام باطل کو توڑنا ضروری تھا۔ نظام کو توڑنے سے کوئی چیز نہیں مانع کرنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ مگر اپنی بیوی کی پختہ قبر کے لئے وہ یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ بچوں نے اگر قبر کو پختہ کر کے ایک غلط کام کیا ہے تو وہ اس کو توڑ کر اس کی تصحیح کر دیں۔

ہر آدمی دوسرے کے بت کو توڑنے کے لئے مجاہد بنا ہوا ہے مگر خود اپنے بت کو توڑنے کے لئے کوئی مجاہد نہیں۔ حالانکہ اپنے بت کو توڑنا ہر آن آدمی کے بس میں ہے۔ جب کہ دوسرے کے بت کو توڑنے میں بے شمار رکاوٹیں حائل ہیں۔ جو کچھ ممکن ہے اس کو نظر انداز کرنا اور جو غیر ممکن ہے اس کے پیچھے دوڑنا غیر سنجیدگی کی علامت ہے۔ اور غیر سنجیدگی اور خدا کا خوف دونوں ایک قلب میں جمع نہیں ہو سکتے۔

ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑے جوش کے ساتھ مسلم سیاست کے گزرے ہوئے

واقعات سنائے۔ اس ضمن میں انھوں نے ظفر علی خاں کا ایک شعر سنایا جو انھوں نے ایک مشاعرہ میں پڑھا تھا اور مشاعرہ کے مسلم شرکار اس کو سن کر جھوم اٹھے تھے۔ شعر یہ تھا:

دنیا میں بلائیں دو ہی ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک کفر کا چلتا جھکڑ ہے اک ظلم کی چلتی آندھی ہے

جس شعر کو پڑھ کر مذکورہ بزرگ خوش ہو رہے تھے اس کو سن کر میرا دل غم کے بوجھ کے نیچے دب گیا۔

میں نے سوچا کہ اس قسم کے لیڈر جو دوسروں کے ظلم کا اعلان کرنے میں مشغول تھے وہ خود کتنے بڑے ظالم تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی ایک پوری نسل کو اس ذہن میں مبتلا کر دیا کہ سب سے بڑے ظالم "ساورکر" اور "گاندھی" ہیں۔ حالاں کہ قرآن کے مطابق، انسان کے لئے اصل ظالم دوسرے دو ہیں اور وہ نفس اور شیطان ہے۔ اس قسم کی تحریکیں چلانا قوم کو جھوٹ کے اوپر کھڑا کرنا ہے۔ اور جو قوم جھوٹ کے اوپر کھڑی کی جائے اس کا انجام دنیا میں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ماضی کے لیڈر اپنی قبروں میں لیٹ چکے ہیں مگر جو حال کے لیڈر ہیں وہ بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ آج بھی ہمارے لیڈروں کو کوئی نہ کوئی "ساورکر" یا "گاندھی" ملا ہوا ہے اور وہ ان کی نشاندہی کر کے سستی قیادت حاصل کرنے میں مشغول ہیں۔ ہمارے لیڈران جھوٹے نعروں پر قوم کی بھیڑ جمع کرتے ہیں اور "ساورکروں" اور "گاندھیوں" کو میدان سے ہٹا کر یوم فتح مناتے ہیں مگر اصل صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل دشمن تو نفس اور شیطان ہیں اور وہ بدستور پوری طاقت کے ساتھ زندہ اور کارفرما موجود ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی واقعی تبدیلی ہو تو کیوں کر ہو۔

۳۰ اپریل اور یکم اور ۲ مئی ۱۹۸۴ کے ایام میرے گونڈہ میں گزرے۔ گونڈہ میں میرا قیام جناب عبد المحیط خاں صاحب کے یہاں تھا جو گورنمنٹ پالی ٹکنیک میں پرنسپل ہیں۔ شہر کے باہر تقریباً ۹۵ ایکڑ کے رقبہ میں ایک الگ تھلگ دنیا ہے جو درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔

دہلی کے ہنگاموں سے نکل کر اچانک ۳۰ اپریل کی صبح کو میں نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جہاں قدرت کے سکون کو صرف چڑیوں کے چہچہے توڑتے تھے۔ جہاں انسانی مصنوعات سے زیادہ خدائی مصنوعات دکھائی دیتی تھیں۔ رات کو لان میں چارپائی کے اوپر لیٹا تو کھلے آسمان کا وہ منظر دکھائی دیا جس میں خدا کے سوا کسی اور کا جلوہ شامل نہیں تھا۔ کھلا ہوا آسمان جس میں تارے جگمگا رہے ہوں،

ایک ایسا منظر ہوتا ہے جو خدا کی عظمت کا زندہ اعلان بن جاتا ہے۔

میں آسمان کے مہیب منظر میں کھویا ہوا تھا کہ ایک روشن چیز ایک طرف سے دوسری طرف جاتی ہوئی نظر آئی۔ یہ بظاہر غیر متحرک ستاروں کے درمیان ایک متحرک ستارہ تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ انسانی ساخت کا سیارہ ہے جو سورج کی روشنی پڑنے سے چمک رہا ہے۔ آجکل مختلف ممالک نے سیکڑوں کی تعداد میں اپنے خلائی سیارے اوپر بھیج رکھے ہیں جو مسلسل زمین کے گرد گھومتے رہتے ہیں اور رات کے مختلف حصوں میں دیکھنے والوں کو نظر آتے ہیں۔ یہ مصنوعی سیارہ دیکھنے میں ایک روشن ستارہ تھا۔ دوسرے ستارے بظاہر ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ تیزی سے ایک طرف سے دوسری طرف کو چلا جا رہا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آسمان کے ستارے اس سے کہیں زیادہ روشن ہیں اور کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ گردش کر رہے ہیں۔

اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ ستارے ٹھہرے ہوئے نظر آتے ہیں اور مصنوعی سیارے متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ستارے بہت زیادہ دور ہیں اور مصنوعی سیارہ بہت زیادہ قریب۔ نیز یہ کہ ستاروں کی روشنی ان کی اپنی روشنی ہے اور مصنوعی سیارہ کی روشنی صرف سورج کی روشنی ــــــ اگر سوچنے والی عقل نہ ہو تو صرف دیکھنے والی آنکھ آدمی کو کتنی بڑی غلطی میں مبتلا کر سکتی ہے۔

کائنات خدا کی جلوہ گاہ ہے۔ آدمی اس کے اندر سفر کرتا ہے مگر اس کے سفر میں اور مصنوعی سیارہ کے سفر میں کوئی فرق نہیں۔ انسان خدا کی دنیا میں اپنے صبح و شام بتاتا ہے مگر خدا سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی۔ اس کی زندگی میں کوئی ایسا موڑ نہیں آتا جب کہ خدا سے اس کا سامنا ہو اور وہ اس سے باتیں کرے۔ خدا کی تجلیوں میں سے کسی تجلی سے اس کی نظر نہیں ٹکراتی جو اس کو تڑپا دے اور اس کو اشک بار کر دے۔

یکم مئی کا سورج طلوع ہوا اور ہرے بھرے درختوں پر اس کی سنہری کرنیں پڑیں تو درخت اس کی روشنی سے چمک اٹھے۔ چڑیاں پھدکنے اور چہچہانے لگیں۔ درختوں کی شاخیں ہوا میں ہلتی ہوئی دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا وہ ربانی نغمہ کو سن کر رقص کر رہی ہوں۔ سارا ماحول قدرتی حسن کے سیلاب میں ڈوب گیا۔ اچانک میری زبان پر قرآن کی یہ آیتیں آگئیں:

واشرقت الارض بنور ربها ووضع الکتاب وجائ بالنبیین والشهداء وقضی بینهم بالحق وهم لا یظلمون (الزمر ۶۹)

میں نے کہا : آج کی دنیا نورِ شمس سے روشن ہوتی ہے، آخرت کی دنیا براہ راست نورِ خداوندی سے روشن ہوگی۔ آج کائنات کی چیزیں خدا کے آلار (کرشموں) پر غیر ملفوظ حمد کہہ رہی ہیں، آخرت میں ساری کائنات ملفوظ طور پر الحمدللہ رب العلمین کہہ اٹھے گی۔ آج ہر آدمی اپنی مرضی چلانے کے لئے آزاد ہے، آخرت میں کتاب اور میزان عدل کی حکمرانی ہوگی۔ آج دھاندلی اور موقع پرستی میں زور ہے، آخرت میں صرف ان باتوں میں زور ہوگا جن کو لے کر انبیاء اور شہداء کھڑے ہوئے۔

خدا کے ظہور کے بعد دنیا کیسی عجیب وغریب دنیا ہوگی۔ اس کا ابتدائی اندازہ اسی فانی دنیا میں ہو رہا ہے۔ یہاں قدرت کی دنیا کو دیکھئے۔ سورج یہ مظاہرہ کر رہا ہے کہ تاریک مادہ کس طرح خدا کے حکم سے روشن ہو جاتا ہے۔ درخت یہ منظر پیش کر رہے ہیں کہ خدا کس طرح مادہ کو شاداب درخت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ زندگی کی انواع بتا رہی ہیں کہ خدا کا اشارہ پا کر کس طرح بے جان چیز جاندار کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ انسانی دماغ کا حیرت ناک واقعہ بتا رہا ہے کہ بے شعور جسم کس طرح شعور اور ارادہ کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔

خدا کی دنیا کیسی عجیب ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ہم یہ سوچیں کہ کیا تمام انسان مل کر ایسی دنیا بنا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام انسان مل کر ایک پتی بھی نہیں بنا سکتے اور کائنات کا یہی ایک پہلو اس کی حیرت ناکی کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

انسان کے لئے کوئی ایسا کارخانہ بنا ناممکن نہیں جس کے اندر مٹی ڈالی جائے اور وہ درخت بن کر نکلے۔ جس کے اندر گھاس ڈالی جائے اور وہ دودھ اور گوشت بن کر نکلے۔ جس کے اندر لکڑی اور پتھر ڈالا جائے اور وہ پھول اور پھل بن کر نکلے۔ مگر خدا کی دنیا میں ہر آن بے حساب مقدار میں یہ سارے واقعات ہو رہے ہیں۔

امریکی انسان جب خلائی جہاز کے ذریعہ چاند پر پہنچا تو میں اس روز رات کو ایک اردو اخبار کے دفتر میں گیا۔ اس وقت ٹیلی پرنٹر پر تفصیلات آ رہی تھیں اور وہ مسلسل ترجمہ کر کے کاتب صاحبان کو دی جا رہی تھیں۔ اڈیٹر صاحب نے گفتگو کے دوران کہا :

بڑی تھرلنگ نیوز آ رہی ہیں۔

میں نے سوچا، کیسی عجیب بات ہے کہ انسانی واقعات لوگوں کے اندر تھرل (Thrill) پیدا کر رہے ہیں۔ مگر خدائی واقعات ان کے اندر کوئی تھرل پیدا نہیں کرتے۔ لوگ مخلوقات کے کارناموں کو دیکھ کر جھوم اٹھتے ہیں مگر خالق کے کارناموں کو دیکھ کر جھومنے والا کوئی نہیں۔

گراموفون کا ریکارڈ بظاہر ایک کامل خاموش تختی ہے۔ لیکن اگر اس کے اوپر سوئی رکھ دیجئے تو اچانک وہ ایک انتہائی بولنے والی تختی بن جائے گی۔ یہی حال موجودہ کائنات کا ہے۔ کائنات بظاہر انتہائی خاموش ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ریکارڈ سے زیادہ آوازیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ خدا نے کمال درجہ قدرت کے ساتھ ایک انتہائی بولتی ہوئی کائنات کو ایک انتہائی خاموش کائنات میں تبدیل کر دیا ہے۔ تاکہ اس کے سریلے نغموں کو وہی لوگ سنیں جو اس کو سننے کا حق رکھتے ہیں۔ اور جو ناکارہ لوگ ہیں وہ اس کو سننے اور جاننے سے اندھے بہرے بنے رہیں۔

آج کی دنیا کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہی اندھاپن اور بہرا پن ہے۔ کائنات خدا کا انتہائی کھلا ہوا اظہار ہے۔ مگر یہی سب سے زیادہ کھلا ہوا اظہار آج سب سے زیادہ چھپا ہوا واقعہ بن گیا ہے۔ آج نہ کوئی آنکھ ہے جو اس کو دیکھے اور نہ کوئی زبان ہے جو اس کو بیان کرے۔

خدا کی دنیا خدا کی باتوں سے خالی ہو رہی ہے۔ آج انسانوں کی عظمت بیان کرنے والے بے شمار ہیں مگر خدا کی عظمت بیان کرنے والا کوئی نہیں۔ تاریخی نشانیوں کو دیکھ کر لوگ تڑپ رہے ہیں مگر خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر تڑپنے والا کوئی نہیں۔ مخلوقات کی شان میں گم ہونے والے بے شمار ہیں مگر خدا کی شان میں گم ہونے والا کوئی نہیں۔

آہ، کیسی عجیب ہے وہ دنیا جہاں ہر طرف دوڑ لگ رہی ہو مگر خدا کی طرف دوڑنے والا کوئی نہ ہو۔ جہاں انسانی تقریریں سننے کے لئے لوگوں کی بھیڑ جمع ہو مگر جہاں خدا کا بول نشر کیا جا رہا ہے وہاں سناٹے کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے۔

اپریل ۱۹۸۴ میں مسٹر راکیش شرما روسی راکٹ کے ذریعہ خلا میں گئے۔ اس درمیان میں مخصوص مشینوں کے ذریعہ ان کا ربط زمین سے قائم تھا۔ ان کی آواز بھی یہاں سنائی دیتی تھی اور ان کی تصویر بھی نظر آتی تھی۔ ایک انٹرویو کے دوران راکیش شرما سے پوچھا گیا کہ خلا سے آپ کو دنیا کیسی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے کہا:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

راکیش شرما کا یہ جواب ان کی فطرت کا جواب نہیں تھا بلکہ وطن پرستی کے مصنوعی ذہن سے نکلا ہوا جواب تھا۔ اگر وہ وطن پرستی کے مصنوعی خیالات سے آزاد ہوتے اور فطرت کی سطح پر مذکورہ سوالات کا جواب دیتے تو وہ کہہ اٹھتے:

سارے عالم سے اچھی ہماری زمیں۔

اگر کوئی شخص دور کائنات میں کھڑے ہو کر پوری کائنات کو دیکھ سکے تو وہ ایک حیرت انگیز منظر کو اپنی آنکھ سے دیکھے گا۔ وہ دیکھے گا کہ ایک اتھاہ کائنات ہے جس میں یا تو دہشت ناک خلا ہے۔ یا جلتے ہوئے ستارے یا پھر خشک دوڑتی ہوئی چٹانیں۔ اس ناقابل قیاس حد تک وسیع کائنات میں ایک ہی استثناء ہے اور وہ اس چھوٹے سے ذرے کا ہے جس کو زمین کہتے ہیں۔ معلوم کائنات میں صرف زمین ہی ایک ایسا کرہ ہے جہاں پانی کی روانی ہے۔ جہاں ہریالی کا رقص ہے۔ جہاں زندگی کی رعنائیاں ہیں۔ جہاں یہ حیرت ناک واقعات پائے جاتے ہیں کہ مادہ ہریالی میں تبدیل ہو۔ جہاں گھاس کھانے والے گھاس کھا کر اس کو دودھ اور گوشت میں کنورٹ کریں۔ جہاں وہ انسان ہو جو دیکھے اور سوچے اور نقشہ بنائے۔

ایسی استثنائی زمین پر انسان کو بسانا بتاتا ہے کہ خدا انسان کے اوپر ایک استثنائی انعام کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ کہ کائنات کے اندر ایک انوکھی دنیا بنائی جائے جس کا نام جنت ہو۔ جہاں ہر قسم کی لذتیں جمع ہوں۔ جو ہر قسم کے ناموافق حالات سے پاک ہو۔ جو خدا کی صفات کمال کا ابدی ظہور رہو۔

" یہ انوکھی جنت کس کو ملے گی " میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اور قدرت کی حسین دنیا میرے لئے اس سوال کا جواب بن گئی۔ موجودہ زمین گویا ایک قسم کا ابتدائی نمونہ ہے جو بتاتا ہے کہ خدا آئندہ اپنی پسند کی کون سی دنیا بنانا چاہتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ وہ اپنی پسند کی اس دنیا میں کس قسم کے لوگوں کو بسائے گا ـــــ جنت اس کو ملے گی جو خدا کی دنیا میں درخت کی طرح شادابی کا ثبوت دے۔ وہ اس کو ملے گی جو چڑیوں کی طرح خدا کی حمد کے نغمے گائے ۔ وہ اس کے حصہ میں آئے گی جس کی روح سورج اور چاند طرح خدا کے نور سے چمک اٹھی ہو۔

یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی دنیا میں خدا کے داعی بنتے ہیں۔ خدا کی دعوت خدا کے اس خاموش پیغام کی ترحیل (Relay) کا دوسرا نام ہے جو کائنات میں ہر آن نشر ہو رہا ہے۔ خدا کا داعی وہ ہے جو خدا کے فیضان کا آخذ (Recipient) بن جائے۔ وہ بولے تو اس کی آواز زمین و آسمان میں بلند ہونے والی گونج سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات انسانی الفاظ میں اس حمد کی ترجمانی بن جائیں۔ جو چڑیوں کی زبان سے فطرت کے لہجے میں سنائی جا رہی ہے۔ آخرت کا داعی بننے کے لئے دنیا سے بلند ہونا پڑتا ہے۔ لوگ دنیا میں گم ہیں پھر وہ آخرت کے داعی کیسے بن سکتے ہیں۔ داعی بھی اگر وہیں کھڑا ہوا ہو جہاں لوگ کھڑے ہوئے ہیں تو وہ کبھی لوگوں کے اوپر داعی نہیں بن سکتا۔

واپسی میں گونڈہ سے لکھنؤ تک کا سفر محکمۂ ٹیلی فون کی گاڑی سے کیا۔ یہ سفر کافی تکلیف دہ تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ مذکورہ گاڑی اگرچہ کار کی مانند تھی مگر اس میں غالباً شاک ابزاربر لگا ہوا نہیں تھا جو تمام جھٹکے کو پہیہ کے اوپر ڈالتا رہتا ہے۔ چنانچہ سارے سفر میں وہ اپنا جھٹکا ہماری طرف منتقل کرتی رہی۔ میں نے سوچا کہ یہی معاملہ ان انسانوں کا ہے جن کے سینہ میں جھٹکا سہنے والا مادہ نہ ہو۔ ایسے بے صبر اشخاص جن لوگوں کے درمیان رہتے ہیں وہ ان کو اپنے غصہ اور انتقام کا جھٹکا دیتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اوپر لگنے والے ہر جھٹکے کو دوسرے کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔

لکھنؤ سے دہلی تک کا سفر ہوائی جہاز سے طے ہوا۔ جاتے ہوئے بذریعہ ٹرین دہلی سے لکھنؤ پہنچنے میں ۱۲ گھنٹے لگے تھے۔ واپسی میں یہی مسافت صرف ۴۵ منٹ میں طے ہوگئی۔ کتنا فرق ہے ایک وسیلہ میں اور دوسرے وسیلہ میں۔

خدا نے اپنی دنیا میں ہر قسم کے وسائل رکھ دئے ہیں۔ ادنیٰ بھی اور اعلیٰ بھی۔ یہاں "بیل گاڑی" کا ذریعہ سفر بھی ہے اور "ہوائی جہاز" کا ذریعہ سفر بھی۔ یہ آدمی کے اپنے حوصلہ اور ہمت کا امتحان ہے کہ وہ کس وسیلہ کو اپنے لئے استعمال کرتا ہے۔ وہ کس منزل کو اپنی منزل بناتا ہے۔

جہاز کے اندر انڈین ایئرلائنز کا ماہنامہ سواگت (مئی ۱۹۸۴) پڑھنے کو ملا۔ اس میں ایک مضمون گول کنڈہ کے بارہ میں تھا۔ یہ ایک قلعہ نما شہر تھا جو پانچ سو سال پہلے ۱۵۱۶ء میں تعمیر ہوا۔ اس کو تعمیر کرنے والا سلطان قلی قطب تھا۔

مذکورہ ماہنامہ میں قدیم گول کنڈہ کے مختلف باقیات کی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا: فتح دروازہ۔ قدیم زمانہ میں جس عظیم عمارت کا نام "فتح دروازہ" تھا وہ آج ایک ٹوٹے ہوئے کھنڈر کی صورت میں صرف "کھنڈر دروازہ" کا منظر پیش کر رہی ہے ——— انسان ایک دن کے لئے فتح کا جشن مناکر خوش ہوتا ہے۔ حالاں کہ اس کے بعد ہزاروں سال تک وہ صرف شکست کی یادگار بن جانے والا ہے۔

مضمون میں ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ کے احوال لکھتے ہوئے یہ فقرہ درج تھا:

Muslim and Hindus lived together in perfect harmony

اس کے دور میں مسلمان اور ہندو دونوں کامل اتحاد اور ہم آہنگی کے ساتھ رہتے تھے (صفحہ ۵۷)

من امرئ لا بد یوما شیمته　　فان تخلق اخلاقا الی حین (ذو الاصبع العدوانی)

ہر آدمی ایک دن اپنی اصل عادت کی طرف لوٹ آتا ہے، خواہ ایک مدت تک وہ مصنوعی اخلاق اپنائے رہے۔

لا یصلح الناس فوضیٰ لا سراة لهم　　ولا سراة اذا جهالهم سادوا (افوہ اودی)

ایسے لوگوں کے معاملات سدھر نہیں سکتے جو بے سردار ہوں اور جب جاہل قسم کے لوگ سردار ہو جائیں تب بھی سمجھ کہ کوئی سردار نہیں۔

وکل امرئ یوما سیعلم غیبه　　اذا حصلت عند الاله الحصائل (لبید بن ربیعہ)

ہر شخص ایک دن اپنی چھپی ہوئی باتوں کو جان لے گا جب کہ خدا کے حضور اعمال کے نتائج جمع ہوں گے

فاقنع بما قسم الملیك فانما　　قسم الخلائق بیننا علامها (لبید بن ربیعہ)

خدا نے جو تقسیم کر دی ہے اس پر قانع رہو کیوں کہ ہمارے درمیان عادات و اخلاق کی یہ تقسیم بڑے دانا نے کی ہے

وعوراء قد اعرضت عنها فلم یضر　　وذی اود قومته فتقوما (حاتم طائی)

بہت سی نازیبا باتوں سے میں نے اعراض کیا تو میرا کچھ نہ بگڑا، بہت سے کج خلقوں کو میں نے سیدھا کرنے کی کوشش کی تو وہ سیدھے ہو گئے

وان امرأ یمسی ویصبح سالما　　من الناس الا ما جنی لسعید (حسان بن ثابت)

جو شخص صبح سے شام تک لوگوں کے ظلم سے بچا رہے اور صرف اپنے کئے کو بھگتے وہ یقیناً خوش قسمت ہے۔

واذا افتقرت الی الذخائر لم تجد　　ذخرا یکون کصالح الاعمال (اخطل)

جب تمہیں ذخیروں کی ضرورت ہوگی تو نیک اعمال سے زیادہ قابل قدر کوئی ذخیرہ نہ پاؤ گے

لا تصحب الکسلان فی حالاته　　کم صالح بفساد آخر یفسد (ابوبکر بن عباس خوارزمی)

کاہل کے ساتھ نہ رہو، کتنے ہی اچھے آدمی دوسروں کی خرابی سے بگڑ جاتے ہیں

اذا تم شیئ بدا نقصه　　توقع زوالا اذا قیل تم (خوارزمی)

جب کوئی چیز پوری ہو جاتی ہے تو پھر اس میں کمی ہونے لگتی ہے جب تم سے کہا جائے کہ فلاں چیز مکمل ہو گئی تو اس کے زوال کا انتظار کرو

اذا کنت فی کل الامور معاتبا　　صدیقك لم تلق الذی لا تعاتبه (بشار بن برد)

اگر تم ہر بات میں اپنے دوست پر عتاب کرتے رہو گے تو تمہیں کوئی بھی ایسا دوست نہیں ملے گا جس پر تم کو عتاب نہ کرنا پڑے

الصمت اجمل بالفتی　　من منطق فی غیر حینه (ابوالعتاہیہ)

انسان کے لئے بے وقت بولنے سے خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے

عدوك من صدیقك مستفاد　　فلا تستکثرن من الصحاب (ابن الرومی)

تمہارا دشمن تمہارے دوستوں ہی میں سے بنتا ہے، اس لئے اپنے دوست زیادہ نہ بناؤ

ترجوا النجاة ولم تسلك مسالکها　　ان السفینة لا تجری علی الیبس (ابوالعتاہیہ)۔

تو نجات کا امیدوار ہے مگر اس کے راستوں پر نہیں چلتا، کیا تجھے نہیں معلوم کہ کشتی کبھی خشکی پر نہیں چلتی

حب السلامة یثنی عزم صاحبه　　عن المعالی ویغری المرء بالکسل (ابو اسمٰعیل حسین بن علی طغرائی)

عافیت پسندی کی خواہش آدمی کے عزم و ہمت کو بلند مقاصد سے موڑ کر سہولت پسند بنا دیتی ہے

خبر نامہ اسلامی مرکز

۱. شیخ محمد سلیمان القائد (ڈائرکٹر اسلامک سنٹر، یگالی، افریقہ) ۲۳ اگست ۱۹۸۴ کو اسلامی مرکز دہلی میں آئے اور ۳۱ اگست تک یہاں مقیم رہے۔ اس دوران میں ان کے مختلف پروگرام جاری رہے۔ ۲۶ اگست ۱۹۸۴ کی شام کو اسلامی مرکز میں ان کی ایک تقریر ہوئی۔ انھوں نے عربی زبان میں تقریر کی جس کا فوری طور پر اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ شیخ محمد سلیمان القائد نے بتایا کہ افریقہ میں وہ پچھلے پانچ سال سے دعوتی کام کر رہے ہیں۔ اس مدت میں ۲۰ ہزار آدمی ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکے ہیں۔ افریقہ کی زمین اسلامی دعوت کے لئے نہایت زرخیز ہے۔ سوالات کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ میں دہلی صرف اس لئے آیا ہوں کہ مولانا وحید الدین خاں صاحب کی صحبت سے فائدہ اٹھاؤں۔ میں جو دعوتی کام افریقہ میں کر رہا ہوں اس کا فکری سرچشمہ مولانا وحید الدین خاں صاحب ہی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ ان کے اصل الفاظ میں مقابل کے صفحہ پر درج ہے۔

۲. دہلی میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (تغلق آباد) ایک عظیم ادارہ ہے۔ حال میں اس کے تحت تقابلی مذہب (Comparative religion) کا شعبہ قائم ہوا ہے۔ اس شعبہ کے زیر اہتمام مختلف مذاہب پر لکچروں کا پروگرام ہے۔ اس سلسلے میں پہلا لکچر مولانا وحید الدین خاں صاحب کا ہوا۔ مولانا موصوف نے ۴ ستمبر ۱۹۸۴ کو اسلامک اسٹڈیز کے ہال میں اسلام کے تعارف پر ایک لکچر دیا۔ ہال کی تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ سامعین میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے۔ اس لکچر کا ٹیپ موجود ہے۔ آئندہ کسی وقت انشاء اللہ اس کو شائع کیا جائے گا۔

۳. اسلامی مرکز کی مطبوعات اللہ کے فضل سے ملک کی دوسری زبانوں میں منتقل ہو رہی ہیں۔ فی الحال "منزل کی طرف" کا مراہٹی ترجمہ پونہ کے دار الاشاعت سے شائع کیا گیا ہے اور "سچا راستہ" اور "دینی تعلیم" کا تلگو ترجمہ دار الاشاعت حیدر آباد سے۔

۴. اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا کی تیسری کل ہند کانفرنس دہلی میں ۲۶ - ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۴ کو ہوئی۔ اس سلسلہ میں موومنٹ کے دو نمائندے ۴ اکتوبر کو اسلامی مرکز میں آئے۔ انھوں نے کانفرنس کے لئے مولانا وحید الدین خاں صاحب کا پیغام ٹیپ پر لیا۔ عام طور پر اس طرح کا پیغام تحریری شکل میں لیا جاتا ہے مگر یہ طریقہ قابل تقلید ہے کہ پیغام کو آواز اور الفاظ دونوں اعتبار سے حاصل کیا جائے

ولعلك تسئل بعد هذا لما ذا احببت وحيد الدين • الحقيقة ان اكتشاف الشيخ وحيد الدين اعظم اكتشاف في حياتي • فالفضل يرجع الى الله اولا ثم الى وحيد الدين خان في اكتشاف حقيقة الدعوة الى الله فهو اضاء لى الطريق الذى جعل به حياتى ذات معنى •

واكثر من هذا فانني احسب نفسى بكل تواضع انني مجرد تلميذ صغير جدا في مدرسة هذا العالم الرباني • والمسلمون حاليا لايعرفونه وهذه اعظم مأساة ، فالمسلمون يعيشون في وهم الشخصيات ذات البريق التاريخى والبهرجة الدنيوية فهم ينظرون الى كثرة الاتباع والشهرة وفخامة الموسسات ولكن هنيئا لكل امرئ عرفه وادرك قيمة رسالته •

وانها لرحمة ربانية نادرة جدا ان يكون فينا الان مثله في وقت نحن في اشد الحاجة الى من يبصرنا طريق النجاة فهو المجدد بحق لدين الله الذى انتظرناه منذ مئات السنين •

والله وحده يشهد على صدق ما أقول واني اعلن شهادتي هذه متحديا بها العصر الحاضر ومستقبل التاريخ الاسلامي والانساني باسره •

محمد سليمان القائد ، المركز الثقافي الاسلامي بديجالي ١٩٨٤/٨/٢١م

جلد اول

سورۃ فاتحہ - سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

سی - ۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

انگریزی الرسالہ

الرسالہ کا انگریزی اڈیشن پابندی سے ہر ماہ نکل رہا ہے۔ زبان و بیان ہر لحاظ سے بفضلہ تعالیٰ وہ ایک معیاری پرچہ ہے۔ ایک امریکی نومسلم جو انگریزی الرسالہ شروع سے پڑھ رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ الرسالہ مجھ کو بہت پسند ہے۔ وہ مسلم دنیا کا واحد انگریزی رسالہ ہے جو خالص دعوتی اور تعمیری انداز میں نکلتا ہے۔ میں الرسالہ کو بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔

الرسالہ خالص دعوتی مقصد سے نکالا گیا ہے اور دعوت پوری امت کی مشترک ذمہ داری ہے۔ اس اعتبار سے الرسالہ (انگریزی) کسی خاص ادارہ کا پرچہ نہیں وہ پوری امت کا پرچہ ہے۔ اس کا تعاون کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کے سلسلے میں آپ اپنی ذمہ داری کو اس طرح پورا کر سکتے ہیں کہ:

اس کے خریدار بنائیں اور ایجنسی قائم کریں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔

اس کے لئے مالی تعاون کریں تاکہ اس کا خسارہ پورا کیا جا سکے۔

نوٹ: انگریزی الرسالہ کی خریداری اور ایجنسی کے شرائط وہی ہیں جو اردو الرسالہ کے ہیں۔

—— ادارہ الرسالہ

علاقائی زبانوں میں کتابیں

سچا راستہ (تلگو)	Rs. 3.50
دینی تعلیم (تلگو)	Rs. 4.50

پتہ: اسلامک سنٹر، 3-6-373/A حمایت نگر۔ حیدرآباد 29

منزل کی طرف (مرہٹی)	Rs. 5

پتہ: فٹ ویل سیٹ سنٹر 1050 روی وار پیٹھ پونہ 2

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱. الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲. زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳. کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور ہر ماہ صاحب ایجنسی اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴. صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵. ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

‘Introduction to Islam’ Series

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. The first pamphlet shows that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet is an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur’anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur’an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of Paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to Hell-fire.

Price per set: Rs 24.00

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No 28822/7f

November 1984
Issue No. 96

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 61112'

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	15/-
پیغمبر انقلاب	25/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ [illegible]	4/-
[illegible] کی تلاش	3/-
[illegible] اسلام	3/-
[illegible] سفر	3/-
حقی[illegible]	2/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

کوئی بڑا کام صرف وہ شخص کرتا ہے جو
اپنے آپ کو چھوٹا کام کرنے پر راضی کرلے

شمارہ ۹۷

دسمبر ۱۹۸۴ء

جلد اول

سورۃ فاتحہ - سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

سی - ۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

اردو، انگریزی میں شائع ہوتا ہے

دسمبر ۱۹۸۴ء □ شمارہ ۹۷

زرِ تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی 'AL-RISALA MONTHLY' لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ

سی ۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گھاٹے والا کون	۲
کام کا طریقہ یہ ہے	۳
اژدہا بھی	۴
ناکامی زینہ بن گئی	۵
خواتین اسلام	۶
علم نبوت	۷
خلائی تہذیب	۸
کمینہ پن کیا ہے	۹
مومن کا قول	۱۰
خدا کو چھوڑ کر	۱۱
دولت کا فریب	۱۲
مجرم کے ساتھ بھی	۱۳
آج کا انسان	۱۴
دنیا کے تابع	۱۵
اسلامی بینک	۱۶
تعمیری مزاج	۱۷
پردہ ڈالنا	۱۸
ایک سفر (ملیشیا)	۱۹
خبر نامہ اسلامی مرکز	۴۶
ایجنسی کی شرائط	۴۸

گھاٹے والا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے ــــــ کہو، کیا میں بتاؤں کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں۔ وہ لوگ جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں۔ اور وہ اسی خیال میں رہے کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا۔ پس ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔ ہم قیامت کے دن ان کے اعمال کا کچھ وزن قائم نہ کریں گے (الکہف)

تمام محرومیوں میں سب سے زیادہ عجیب محرومی وہ ہے جب کہ آدمی کمائی کرے مگر اس کو اس کا حاصل نہ ملے۔ وہ مہینہ بھر محنت کرے مگر وہ کوئی تنخواہ نہ پائے۔ وہ تجارت میں اپنی ساری پونجی لگائے مگر اسے کچھ نفع حاصل نہ ہو۔ وہ ارمانوں کے ساتھ اپنا گھر بنائے مگر اس میں اس کو چین کے ساتھ رہنا نصیب نہ ہو۔

اگر کسی آدمی کے ساتھ ایسا حادثہ گزرے تو وہ بالکل بجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس کے اعضاء شل ہو جاتے ہیں۔ اپنی محنت کے آخری نتیجے کو اپنی آنکھوں کے سامنے برباد ہوتے دیکھنا اتنا بڑا حادثہ ہے جس کو کوئی بھی شخص برداشت نہیں کر سکتا۔

یہ دنیا میں اعمال کی بربادی کا حال ہے۔ پھر آخرت میں جب آدمی اپنے اعمال کو ابدی طور پر برباد ہوتے ہوئے دیکھے گا تو اس کا کیا حال ہوگا۔

جب وہ دیکھے گا کہ عمر بھر کی محنت سے بنایا ہوا اس کا ڈھانچہ اچانک ڈھ پڑا۔ اس کی خوش گمانیوں کا قلعہ ایک ہی جھٹکے میں ہمیشہ کے لئے مسمار ہو گیا۔

جب وہ دیکھے گا کہ دنیا میں محنت کے ساتھ حاصل کی ہوئی کمائی آخرت میں اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی دنیا میں کھڑا کیا جانے والا عظمتوں کا گنبد آخرت میں گرا ہوا پڑا ہے۔ دنیا میں جمع کی ہوئی نیک نامی آخرت میں بالکل بے قیمت ہو چکی ہے۔

جس آدمی نے اپنی دوڑ دھوپ کو صرف دنیا میں لگایا ہو اس کا آخرت میں یہی حال ہو گا کہ وہاں وہ بالکل مفلس بن کر کھڑا ہو گا۔ وہاں اس کی حیثیت صرف ایک لٹے پٹے انسان کی ہو گی۔ یہ منظر آدمی کیلئے ناقابل برداشت حد تک سخت ہو گا۔ کامیابیوں پر فخر کرنے والے ناکامی کے گڑھے میں گرے ہوئے ہوں گے۔ ترقیات پر ناز کرنے والے ایسے بدحال دکھائی دیں گے جیسے انہوں نے کبھی ترقی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

کام کا طریقہ

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد شبلی نیشنل کالج (اعظم گڈھ) میں انگریزی کے استاد تھے۔ ۱۹۵۴ سے ۱۹۶۴ تک یہاں رہے۔ وہ کمیونسٹ تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن کو کالج میں انگریزی کی کلاس لیتے اور شام کے وقت شہر کے چوراہے پر جاکر پارٹی کا اخبار بیچتے۔ وہ اخباروں کا بنڈل اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوجاتے اور لوگوں سے کہتے "اس پارٹی کی سچائی میں کون شک کرسکتا ہے جس میں ایک پروفیسر سڑک پر کھڑا ہوکر اخبار بیچے"

دوسری مثال شیخ محمد سلیمان القائد کی ہے۔ وہ افریقہ کے ایک ملک میں دعوتی کام کررہے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ وہاں بہت سے نوجوان ہیں جن کے اندر تبلیغ کا جذبہ ہے۔ مگر وہ غریب ہیں۔ انھوں نے ملک کے مختلف علاقوں سے کئی درجن نوجوان منتخب کئے۔ ان کے لئے ایک مختصر مشاہرہ مقرر کردیا اور ہر ایک کو ایک بائیسکل دے دی۔ یہ نوجوان بائیسکلوں پر گھوم گھوم کر تبلیغ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک میں پانچ سال (۸۴ - ۱۹۷۹) کی مدت میں تقریباً ۲۰ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کرلیا۔

قارئین الرسالہ سے ہم اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس کے تعمیری اور دعوتی مشن کو پھیلانے کے لئے اسی قسم کا تعاون فرمائیں۔ پہلی اور اعلیٰ صورت تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی ذات کو اس عظیم کام میں لگائیں۔ آپ الرسالہ کی ایجنسی لیں۔ آپ اس کی مطبوعات منگا کر لوگوں تک پہنچائیں۔ آپ ہر اجتماعی موقع پر بک اسٹال لگا کر لوگوں کو اس مشن سے متعارف کرائیں۔ وغیرہ

لیکن اگر آپ کے پاس اپنی ذات کو اس مشن میں لگانے کے لئے وقت اور موقع نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ بے روزگار، یا کم آمدنی والے لوگوں میں سے کسی کو تیار کریں۔ اس کو کچھ مشاہرہ دیں اور ایک بائیسکل دے کر اس سے کہیں کہ تمھارا کام یہ ہے کہ تم کتابوں کو پھیلاؤ اور الرسالہ کے خریدار بناؤ۔ وہ بستی بستی گھوم کر بس یہی کام کرتا رہے۔ یہ کام ایک فرد بھی کرسکتا ہے اور کئی لوگ مل کر بھی۔

اگر آپ الرسالہ کے مشن کو حق سمجھتے ہوں، اس کے باوجود اس کو پھیلانے میں آپ نہ براہ راست شرکت کریں اور نہ بالواسطہ، تو آپ کو سوچنا چاہئے کہ حقیقت کی نظر میں آپ اپنا نام کس خانہ میں لکھوا رہے ہیں۔

اژدہا بھی

اژدہا کا لفظ سنتے ہی ایک خطرناک جانور کا تصور سامنے آتا ہے۔ اژدہے کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ہندستان کے جنگلوں میں اس خوفناک سانپ کی جو قسم پائی جاتی ہے اس کو ماہرین حیوانات مالورس اژدہا (Python molurus) کہتے ہیں۔ اس کی لمبائی ۲۰ فٹ ہوتی ہے اور وزن ۲۰۰ پونڈ سے زیادہ جب کہ وہ پورا ہو جائے۔

تاہم دوسرے وحشی جانوروں کی طرح اژدہا بھی کوئی خطرناک جانور نہیں۔ وہ کسی انسان یا کسی جانور پر صرف دو حالتوں میں وار کرتا ہے ــــــ جب کہ وہ بہت بھوکا ہو، یا اس پر حملہ کیا جائے۔ عام حالات میں وہ بالکل بے ضرر جانور کی طرح پڑا رہتا ہے۔ ایک ماہر حیوانات نے اژدہے کے طویل مطالعہ کے بعد لکھا ہے:

اژدہا، خواہ کتنا ہی بڑا ہو، فطری طور پر وہ عصبی مزاج کا ہے۔ وہ دوسرے تمام سانپوں کی طرح کبھی بالقصد حملہ نہیں کرے گا۔ اور نہ کبھی وہ جارح بنے گا۔ الا یہ کہ اسے مشتعل کر دیا جائے۔ اگر جنگل میں اس کا سامنا پیش آجائے تو وہ آواز نکال کر ڈرائے گا یا غائب ہو جائے گا مگر وہ نہ تو اٹھے گا اور نہ لڑائی کرے گا، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے (ہندستان ٹائمس ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۴)

اژدہے کے اندر یہ خصوصیت محض اتفاقاً نہیں، وہ براہ راست خالق کائنات کا منصوبہ ہے۔ اژدہا فطرت کی ایک خاموش پکار ہے۔ وہ عمل کی زبان میں انسان سے کہہ رہا ہے کہ ــــــ اگر تم اژدہا ہو تب بھی کسی کو نہ کاٹو۔ اگر تم زور اور قوت میں دوسروں سے بڑھ جاؤ تب بھی دوسروں کو نہ ستاؤ۔

کیسا عجیب ہے وہ انسان جو ایک ایسی دنیا میں ظلم کرتا ہے جہاں شیر اور اژدہے تک کی سطح پر اس کو ظالم نہ بننے کا سبق دیا جا رہا ہے۔

ضروری گزارش

۱۔ خط و کتابت اور منی آڈر میں اپنا خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر ضرور لکھیں۔

۲۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں۔

ناکامی زینہ بن گئی

اسپنسرس مدراس شہر کی ایک بہت مشہور دکان ہے۔ ایک بار آگ نے اس دکان کو برباد کر دیا۔ مگر اس نے بہت جلد اپنی تجارت دوبارہ بحال کرلی۔ اس طرح کہ اس نے اپنی دکان کے سامنے ایک تختہ لگادیا جس پر لکھا ہوا تھا: یقین جانئے، ہماری دکان آج واحد دکان ہے جہاں صرف تازہ مال موجود ہے:

When a fire devastated Spencers, Madras city's most famous store, it quickly regained business by putting up a sign reading: "You bet ours is the only store today with nothing but fresh stocks."

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی بربادی سے دوچار ہونے کے بعد اگر اپنی عقل کو نہ کھوئے تو وہ نہ صرف دوبارہ کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ بلکہ اپنی ناکامی کو اپنے لئے کامیابی کا زینہ بنا سکتا ہے۔ مدراس کی مذکورہ دکان آگ سے جل کر تباہ ہوگئی تھی۔ بظاہر یہ بربادی کا واقعہ تھا۔ مگر اس واقعہ کو دکاندار نے زینہ کے طور پر استعمال کیا۔

دکان کے آگ میں جل جانے کے معنی یہ ہیں کہ پچھلا سامان جو دکان میں تھا سب ختم ہوچکا ہے۔ اب دکاندار نے فوراً نیا سامان لاکر دکان میں رکھ دیا اور پھر خریدار کی اس نفسیات کو استعمال کیا کہ وہ ہمیشہ تازہ بنا ہوا مال پسند کرتا ہے۔ اس نے جب مذکورہ اعلان کیا تو عوام نے فوراً اس کو صحیح سمجھ لیا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ دکان آگ میں جل کر تباہ ہو چکی ہے۔ انھوں نے یقین کرلیا کہ اس کا سب سامان بالکل نیا ہے۔ اور خریداری کے لئے ٹوٹ پڑے۔ گزرے ہوئے نقصان کو اس نے بہت جلد زیادہ بکری کے ذریعہ حاصل کرلیا۔

اس دنیا کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ یہاں کوئی ناکامی ایسی نہیں جو آدمی کو آخری طور پر ناکام کردے۔ یہاں ہر ناکامی میں ایک نئی کامیابی کا امکان چھپا ہوا ہے۔ تاہم یہ امکان چیختا ہوا نہیں آتا۔ اس کو اپنی عقل سے سوچ کر نکالنا پڑتا ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ کسی نقصان یا بربادی سے دوچار ہونے کے بعد وہ مایوسی یا شکایت میں نہ پڑے بلکہ اپنی عقل کو نئی راہ تلاش کرنے میں لگادے۔ وہ پائے گا کہ جہاں اس کے لئے ایک امکان ختم ہوا تھا وہیں دوسرا زیادہ بہتر امکان اس کا انتظار کر رہا ہے۔

خواتین اسلام

مشہور حدیث ہے کہ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم (علم کو حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)
بظاہر اس حدیث میں صرف مسلم کا لفظ ہے، مسلمہ کا لفظ نہیں ہے۔ مگر علم کا حصول مسلم خواتین پر بھی
فرض ہے۔ محدثین نے صراحت کی ہے کہ اس حدیث میں "مسلمہ" کا لفظ بھی تبعاً شامل ہے۔ (ابن ماجہ)

رجال اور طبقات کی کتابوں میں مردوں کی طرح عورتوں کی علمی خدمات کے تذکرے موجود ہیں۔
ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دور اول میں خواتین کے درمیان علم کا کافی رواج تھا۔ امام بخاری نے چودہ سال
کی عمر میں علم کے لئے سفر کیا تو وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ بڑے بڑے اساتذہ سے استفادہ کر سکیں۔ ان
کے اندر یہ استعداد ان کی والدہ اور ان کی بہن نے پیدا کی تھی۔ امام ابن جوزی کے متعلق کہا جاتا
ہے کہ ان کو ابتدائی تعلیم اپنی پھوپھی سے ملی۔ ابن ابی اصیبعہ کی بہن اور بیٹی علم طب کی ماہر تھیں اور
آجکل کی زبان میں "لیڈی ڈاکٹر" تھیں۔ امام ابن عساکر نے فن حدیث کی تعلیم جن اساتذہ سے حاصل
کی ان میں ایک سے زیادہ خواتین کے نام بھی آتے ہیں۔

دور اول میں علمی سرگرمی سب سے زیادہ احادیث اور آثار کی روایت کا نام ہوتی
تھی۔ اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کے ساتھ صحابیات اور تابعین کے ساتھ تابعات نے بھی کثرت سے
احادیث کو محفوظ کرنے اور بیان کرنے کا کام کیا ہے۔ حضرت عائشہ نے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم سے لئے ہوئے بہت سے علوم امت کو منتقل کئے اسی طرح اس زمانہ میں بہت سی خواتین
ہیں جنھوں نے اپنے والدین اور اپنے ان رشتہ داروں سے روایات بیان کی ہیں جنھوں نے رسول
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا یا آپ کے اصحاب سے علم دین کی کوئی بات پائی تھی۔ ان خواتین
نے اپنے رشتہ کے اہل علم سے اسلامی تعلیمات کو سیکھا اور ان کو دوسروں تک پہنچایا۔

کہاں سے کہاں

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو صبح سوا نو بجے کا وقت تھا۔ نئی دہلی میں وزیر اعظم ہند کی سرکاری رہائش گاہ میں حسب معمول پولیس اور اسٹاف کی سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں۔ پیشگی اپائنٹمنٹ کے مطابق وسیع اور شاندار لان میں پیٹر اسٹینوف اپنی پارٹی کے ساتھ آچکے تھے۔ وہ وزیر اعظم اندرا گاندھی (۱۹۱۷-۱۹۸۴) پر ایک فلم تیار کر رہے تھے۔ وزیر اعظم اپنے وقت پر اپنے کمرہ سے برآمد ہوئیں۔ وہ لان میں داخل ہونے ہی والی تھیں کہ گولیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ مسز اندرا گاندھی کی حفاظتی پولیس کے دو سکھ جوانوں نے اچانک ان پر حملہ کر دیا۔ ایک نے پستول سے فائر کئے، دوسرے نے اپنے اسٹین گن کی ۳۰ گولیاں ان کے اوپر خالی کر دیں۔ خون میں لت پت اندرا گاندھی کوئی آخری کلمہ نہ بول سکیں۔ وہ "بے ہوش" حالت میں اسپتال لے جائی گئیں، صرف اس لئے کہ ڈاکٹر ان کی طبی موت کا آخری اعلان کر سکیں۔ اس سلسلہ میں اخبارات میں جو رپورٹیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ عبرت انگیز مسٹر پیٹر اسٹینوف کا واقعہ تھا:

Peter Ustinov, world renowned actor, director and writer, was sitting in the lawn at Mrs Indira Gandhi's residence, waiting to interview her ("I wanted to ask her how as a single child she came to terms with her loneliness") when he heard the 'sound of death'.

مسٹر اسٹینوف جو عالمی شہرت رکھنے والے ایکٹر ہیں، ڈائرکٹر اور رائٹر ہیں، وہ مسز اندرا گاندھی کی رہائش گاہ کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان سے انٹرویو کے منتظر تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں ان سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ واحد اولاد ہونے کے اعتبار سے انھوں نے کس طرح اپنے اکیلے پن کے ساتھ نباہ کیا۔ عین اسی وقت اسٹینوف نے موت کی آواز سنی (ہندستان ٹائمس یکم نومبر ۱۹۸۴)

راقم الحروف نے جب یہ رپورٹ پڑھی تو معاً مجھ کو یہ خیال آیا کہ اگر الفاظ کے اندر تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے تو غالباً یہ اہم ترین سوال تھا جو اس نازک لمحہ میں مسز اندرا گاندھی سے پوچھا جا سکتا تھا۔ الفاظ میں معمولی تبدیلی کے بعد وہ سوال یہ تھا ——— اب تک آپ ۷۰۰ ملین انسانوں کے ملک کی محبوب وزیر اعظم تھیں۔ اگلے لمحہ آپ کا کیا حال ہوگا جب کہ آپ اپنے کو ایک ایسی دنیا میں پائیں گی جہاں آپ بالکل تنہا اور بے یار و مددگار ہوں گی۔

کیسا عجیب ہے وہ پانا جس کا انجام کھونے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

خلائی تہذیب

مغربی دنیا پچھلے ۳۰ سال سے ایک انوکھی تحقیق میں مشغول ہے۔ یہ ہے خلا میں زندہ مخلوقات کی آواز کو سننا :

Listening for life in space

بظاہر اس تلاش کا محرک جدید علماء کا وہ مفروضہ ہے جس کو ارتقاء کہا جاتا ہے۔ مغربی علماء نے زندگی کی جو ارتقائی توجیہہ کی ہے، اس کے مطابق لازم آتا ہے کہ وسیع خلا میں دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح زندگی کی انواع موجود ہوں جس طرح وہ ہماری زمین پر پائی جاتی ہیں۔ خلا میں سفر کا ایک خاص مقصد ان زندگیوں سے ملاقات ہے۔ اس مفروضہ پر ان کو اتنا یقین ہے کہ اس کا ایک خاص نام بھی دے دیا گیا ہے یعنی بالائے زمین تہذیب (Extra-terrestrial civilization)

اس کے علاوہ امریکہ میں اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں خاص طرح کے بہت بڑے بڑے انٹینا (Antenna) لگائے گئے ہیں جن کو عام زبان میں ریڈیائی کان (Radio ears) کہتے ہیں۔ ان مشینوں سے بالائے خلا میں سگنل بھیجے جاتے ہیں اور حساس قسم کے آلات ہر وقت تیار رہتے ہیں کہ اوپر سے آنے والے متوقع سگنل کو سن سکیں۔

ایک مبصر نے ان کوششوں پر تبصرہ (ٹائم میگزین ۲۱ مارچ ۱۹۸۳) کرتے ہوئے اس کی روح کو ان مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے، اگر تم واقعۃً وہاں ہو تو اپنے دوستوں سے بولو :

If your are really there, please call your friends.

زمین پر زندگی اور شعور کا وجود ساری معلوم کائنات میں ایک انتہائی نادر اور مستثنیٰ واقعہ ہے۔ چونکہ یہ شعور اپنا خالق آپ نہیں، اس لئے اس کا وجود لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ یہاں زندگی اور شعور کا ایک اور خزانہ زیادہ بڑی سطح پر موجود ہو جو زمین کی زندگی اور شعور کا سرچشمہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ زندہ انسان کی موجودگی زندہ خدا کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ جدید انسان اس امکان کو بالواسطہ انداز میں تسلیم کرتا ہے۔ البتہ وہ اس وجود کو خلائی زندگی قرار دے کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ وجود ہماری ہی طرح کا ایک وجود ہے نہ کہ ہم سے برتر کوئی وجود۔ وہ محض ایک تہذیب ہے نہ کہ کوئی خالق اور مالک خدا۔

کمینہ پن

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے قتل کیا جانا اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ منحوس واقعہ ہے۔ بلوائیوں نے آپ کے مکان کو گھیر رکھا تھا۔ یہ گھیراؤ لگ بھگ دو مہینے جاری رہا۔ اس دوران بلوائیوں نے ہر قسم کی رسد بند کر دی۔ حتی کہ پانی بھی حضرت عثمان کے گھر کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت علی کو معلوم ہوا تو وہ خود پانی کی تین مشکیں لے کر آئے۔ ان کو بھی بلوائیوں نے روکنے کی کوشش کی۔ تاہم کسی نہ کسی تدبیر سے آپ نے پانی اندر بھجوا دیا۔

اس موقع پر حضرت علی نے بلوائیوں سے کہا:

واللہ ان فارس والروم لا یفعلون کفعلکم ھذا بھذا الرجل واللہ انھم لیاسرون ویطعمون ویسقون فابوا ان یقبلوا منہ	خدا کی قسم فارس اور روم والے بھی وہ نہیں کرتے جو تم اس آدمی کے ساتھ کر رہے ہو۔ خدا کی قسم وہ قید کرتے، ہیں تو قیدی کو کھلاتے ہیں اور پلاتے ہیں مگر انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔

ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے اختلاف و شکایت ہو جائے تو اپنے مخالف سے معاملہ کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ کیا جائے شرافت اور انسانیت کے دائرہ میں رہ کر کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ اندھی دشمنی کا طریقہ اختیار کر لیا جائے۔ اسی دوسرے طریقہ کا نام کمینہ پن ہے۔

پہلی قسم کے لوگ اپنے دشمن کے خلاف بس اتنا ہی کرتے ہیں جتنا ان کے اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اپنے مفاد کو محفوظ کر لینے کے بعد انھیں دشمن سے کوئی نفرت نہیں ہوتی۔

مگر کمینہ فطرت لوگوں کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ اپنے مفروضہ دشمن کے آخری حد تک مخالف ہو جاتے ہیں۔ اس کو بے عزت کرنا، اس کی معاشیات کو اجاڑنا، اس کی پوری نسل کو اپنی قوت کا مزہ چکھانا۔ اس کے خلاف جھوٹی باتیں مشہور کرنا، اس کو کسی طرح چین نہ لینے دینا، غرض اسکے خلاف وہ ہر وہ کارروائی کر گزرتے ہیں جو ان کے بس میں ہو۔

غیر کمینہ آدمی مخالفت کے بعد ایک حد کے اندر رہتا ہے۔ مگر کمینہ آدمی کسی حد کو نہیں جانتا۔ مخالفت پیدا ہونے کے بعد وہ اپنے مخالف کے ساتھ ہر ظالمانہ کارروائی کو درست سمجھ لیتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی ظالمانہ ہو، خواہ وہ کتنی ہی غیر انسانی کیوں نہ ہو۔

مومن کا قول

وہ قول (یا کلمۂ ایمان) کیا ہے جو اللہ کی نظر میں حقیقۃً قول قرار پاتا ہے، اس کا جواب قرآن میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں اس سلسلہ میں چند حوالے درج کیے جاتے ہیں:

وہ قول جو آدمی کے داخل قلب سے نکلا ہو نہ کہ محض زبان اور حلق سے	الحجرات	۱۴
جو اتنی گہری معرفت حق کا نتیجہ ہو کہ آدمی کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑیں	المائدہ	۸۶-۸۸
جو ملاقات رب کی نفسیات سے ابلا ہوا کلام ہو	البقرہ	۲۴۹
جو ایسے دل سے ابلے جس کا ایمان برابر بڑھتا رہتا ہے۔	آل عمران	۱۷۳
جب کہ آدمی وہی کہے جو اس کے اندر کی ہستی کا واقعی فیصلہ ہو	الصف	۳
جو پائی ہوئی بات کا اظہار ہو نہ کہ محض اوپر سے سنی ہوئی بات کا	الانفال	۲۱
وہ احساس عبدیت سے نکلا ہوا قول ہو	آل عمران	۱۴۷
وہ ایک نمو پذیر قول ہو جو بڑھتے بڑھتے آدمی کے اندر خدا کا شاداب درخت بن جائے	ابراہیم	۲۴
وہ دل کی گہرائی سے نکلا ہو نہ کہ محض آدمی کے منہ سے	المائدہ	۴۴
وہ قول سدید ہو، یعنی بالکل مطابق واقعہ ہو، جو آدمی کے اندر ہو وہی اس کے باہر ہو	الاحزاب	۷۰
وہ قول طیب ہو، یعنی ایسا پاک قول ہو جس میں کوئی غیر فطری آمیزش شامل نہ ہو	الحج	۲۴
وہ قول اقوم ہو، یعنی سیدھا آدمی کے دل سے نکلا ہوا کلام ہو	المزمل	۶
وہ قول جو عہد کے ہم معنی ہو جس کو آدمی کسی حال میں نہ بدلے	الاحزاب	۲۳
وہ قول جو اتنا گہرا ہو کہ آدمی کو اختلاف سے بچا سکے	البقرہ	۲۵۳
وہ قول جو آدمی کے اندر توکل علی اللہ کی کیفیت پیدا کر دے	یونس	۱۴
وہ قول جو معرفت حق کے نتیجہ میں ظاہر ہوا ہو	البقرہ	۲۶
وہ قول جو آدمی کے اندر خدا کی شدید محبت کا نتیجہ ہو۔	البقرہ	۶۵
وہ قول جو آدمی کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لایا ہو	البقرہ	۵۷
وہ قول جو آدمی کو خدا اور رسول کی اطاعت پر مجبور کر دے	النساء	۹
وہی قول اللہ تک جاتا ہے جو پاک قول ہو اور جس کے ساتھ عمل شامل ہو۔	فاطر	

خدا کو چھوڑ کر

ایک صاحب نے پرجوش انداز میں فرمایا کہ اسلام نقوش سے نہیں بلکہ نفوس سے حاصل ہوتا ہے۔ نقوش (کتابیں) جامد چیزیں ہیں اور جمود سے حرکت پیدا نہیں ہو سکتی۔ نفوس (شخصیتیں) زندہ اور متحرک ہوتی ہیں اور حرکت اور زندگی ہمیشہ حرکت اور زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ بزرگ شخصیتوں سے وابستہ ہوں اور ان سے اسلام سیکھیں۔

بظاہر یہ بات بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہے مگر وہ سراسر بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین نقوش سے ملتا ہے اور نہ نفوس سے۔ وہ صرف خدا سے ملتا ہے۔ آدمی خدا کی کتاب پڑھے۔ وہ اس کے رسول کی سنت کا مطالعہ کرے۔ وہ اس کی کائنات میں اس کی پھیلی ہوئی نشانیوں پر غور کرے اور پھر بار بار دعا کرتا رہے تو یقیناً اس کو دین مل جائے گا۔ یقیناً خدا سے اس کا ربط قائم ہو جائے گا جو اصل مطلوب ہے۔

عجیب بات ہے کہ لوگوں کو فانی انسان دکھائی دیتے ہیں مگر خدا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ انسان جو کسی ایک جگہ ہے اس سے ان کی ملاقات ہو جاتی ہے مگر وہ خدا جو ہر جگہ ہے اس سے ان کی ملاقات کی نوبت نہیں آتی۔ وہ انسان جو کوئی ایک یا دو زبان بولتا ہے اس کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی ہے مگر وہ خدا جو ہر زبان بولتا ہے اس کی بات سمجھنے سے وہ قاصر رہتے ہیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ دور دور کے انسانوں کو "جانتے" ہیں مگر وہ خدا کو نہیں جانتے جو ان سب سے زیادہ قریب ہے۔ کوئی شخص کتابوں میں اٹکا ہوا ہے اور کوئی شخص انسانی شخصیتوں میں۔ سب سے بڑی حقیقت کے طور پر ہر شخص کے قریب ترین موجود ہے مگر وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے پیغمبر، جب میرے بندے میرے بارہ میں پوچھیں تو کہہ دو میں قریب ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں" (البقرہ) پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی تیسرے وسیلہ کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص براہ راست خدا کو پا سکتا ہے۔ ہر آدمی براہ راست خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر پیغمبر کے وارثین پیغمبر کے نام پر یہ تبلیغ کر رہے ہیں کہ خدا تک پہنچنا چاہتے ہو تو کسی شخصیت کے حلقہ بگوش ہو جاؤ۔ کسی بزرگ کا دامن تھام لو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تر خود ساختہ دین ہے اور خود ساختہ دین کبھی کسی کو خدا تک نہیں پہنچا سکتا۔

دولت کا فریب

کوالالمپور کے اخبار نیو اسٹریٹس ٹائمس (New Straits Times) کی اشاعت ۲۸ جولائی ۱۹۸۴ میں ایک خبر نظر سے گزری۔ ایک اطالوی نژاد امریکی کارپنٹر وینیرو پیگانو (Venero Pagano) جس کی عمر ۶۳ سال ہے اور وہ نیو یارک کے قریب رہتا ہے۔ وہ آٹھ سال سے بے روزگار تھا اور یونین کی پنشن سے اپنا کام چلا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ اپنے مکان سے متصل زمین پر حسب منشا ٹماٹر کی کاشت کر سکے۔

مذکورہ کارپنٹر نے لاٹری کا ایک ٹکٹ خریدا۔ ۲۷ جولائی ۱۹۸۴ کو اچانک اسے معلوم ہوا کہ اس کو اول انعام ملا ہے۔ یہ انعام ۲۰ ملین ڈالر تھا۔ یہ اب تک کے لاٹری انعاموں میں دنیا بھر میں سب سے بڑا انعام ہے۔

انعام کی خبر سب سے پہلے ٹیلی وژن پر آئی۔ اس کے فوراً بعد اس کے لئے پریس کانفرنس کی گئی۔ اس نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ خبر کو سن کر میں ششدر رہ گیا۔ میں بار بار اپنے نمبر کو اعلان شدہ نمبر سے ملا کر چیک کرتا رہا اور ابھی تک مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ انعام مجھ کو ملا ہے۔ خبر سن کر وہ بھاگ کر اندر کمرہ میں گیا اور اپنی بیوی کو جگا کر کہا کہ " میرا خیال ہے کہ ہم لوگ کروڑ پتی ہو گئے ہیں"۔ اس نے اخبار نویسوں سے کہا کہ مجھ کو جو ضرورت تھی وہ میں نے پالیا۔ میں نے اپنا مکان پالیا۔ میں نے اپنے ٹماٹر پالئے۔

I got whatever I need. I got my house. I got my tomatoes.

دنیا میں آدمی کے پاس دولت ہو تو اس کا ہر کام پورا ہو جاتا ہے۔ اس لئے آدمی سمجھتا ہے کہ دولت سب کچھ ہے۔ دولت مل جائے تو آدمی سمجھتا ہے کہ اس نے سب کچھ پالیا۔ حالاں کہ سب کچھ پانا یہ ہے کہ آدمی آخرت میں خدا کی رحمتوں کو پالے۔

موت سے پہلے کی زندگی میں آدمی جن مسائل سے دوچار ہے ان سے بالکل مختلف وہ مسائل ہوں گے جن سے آدمی موت کے بعد کی زندگی میں دوچار ہوگا۔ آج دولت کی اہمیت ہے، اس وقت ایمان اور عملِ صالح کی اہمیت ہوگی۔ آج چیزیں بازار سے حاصل ہوتی ہیں، اُس وقت تمام چیزیں خدا کی رحمت کے خزانے سے ملیں گی۔ آج مادی قوانین کے تحت آدمی کو مقام ملتا ہے، اس وقت اخلاقی قوانین یہ فیصلہ کریں گے کہ آدمی کو کیا ملے اور کیا نہ ملے۔

مجرم کے ساتھ بھی

يروى ابوداؤد عن ابي هريرة ان الرسول صلى الله عليه وسلم اتى برجل قد شرب فقال: اضربوه. قال ابو هريرة فمنا الضارب بيده والضارب بنعله والضارب بثوبه فلما انصرف قال بعض القوم: اخزاك الله فقال الرسول صلى الله عليه وسلم لا تقولوا هكذا ولا تعينوا عليه الشيطان۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی لایا گیا جس نے شراب پی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو مارو ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے کسی نے اپنے ہاتھ سے مارنا شروع کیا، کسی نے اپنے جوتے سے اور کسی نے اپنے کپڑے سے۔ جب مار چکے تو لوگوں میں سے کسی شخص نے کہا کہ خدا تجھے رسوا کرے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایسا مت کہو۔ اور اس کے اوپر شیطان کی مدد نہ کرو (ابوداؤد)

اسلام میں مجرم کو جو سزا دی جاتی ہے وہ نفرت کے جذبہ کے تحت نہیں دی جاتی بلکہ صرف حدود اللہ کی ادائیگی کے لئے دی جاتی ہے۔ سزا دینے والے کے اندر اگر مجرم کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کا احساس پیدا ہو جائے تو یہ بھی اس کے لئے ایک جرم ہوگا۔ کسی کو سزا دینے کا اختیار صرف اس شخص کو ہے جو نفرت کے جذبات سے بلند ہو کر اسے سزا دے۔

مجرم پر حد جاری کرنے کے بعد اسے برا بھلا کہنا خدا کی سزا پر انسانی سزا کا اضافہ ہے جس کا حق کسی کو بھی نہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ حد جاری کرتے ہوئے بھی آپ کو مجرم کے ساتھ بے پناہ ہمدردی تھی۔ آپ نے یہ نہیں چاہا کہ لوگوں کے برا بھلا کہنے سے مجرم کے اندر ردعمل پیدا ہو اور وہ ندامت اور اصلاح کی طرف رغبت کرنے کے بجائے سرکشی اور بغاوت کی طرف مائل ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو خدا کی طرف سے یہ اجازت نامہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ خدا کے بندوں کے اوپر دارو غہ بن کر کھڑے ہوں اور ان کے اوپر خدا کی مقرر کی ہوئی سزائیں نافذ کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی انسانوں سے محبت اتنی زیادہ بڑھی ہوئی ہو کہ وہ مجرم کے لئے بھی باقی رہے۔ وہ جرم کے ارتکاب کے باوجود ایک شخص سے نفرت نہ کر سکیں۔ وہ خیر خواہی کی حد تک ہر انسان سے دل چسپی رکھنے والے ہوں۔

آج کا انسان

دیکھنے میں ایک انسان دوسرے انسان سے الگ دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے سارے انسان یکساں ہیں۔ بولنے کے وقت لوگ الگ الگ الفاظ بولتے ہیں مگر کرنے کے وقت سارے لوگ ایک ہو جاتے ہیں۔

بظاہر کوئی اِس قوم سے تعلق رکھتا ہے اور کوئی اُس قوم سے۔ کوئی جزئی دین کا علمبردار ہے اور کوئی کلی دین کا۔ کوئی انسانیت کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے اور کوئی قومیت کا۔ کوئی انفرادی انقلاب پر تقریر کر رہا ہے اور کوئی اجتماعی انقلاب پر۔ کوئی توحید کا چیمپین بنا ہوا ہے اور کوئی قبر پرستی اور بزرگ پرستی کا۔ کوئی زمین کا احتساب کر رہا ہے اور کوئی آسمان کا۔

مگر یہ سارے فرق کہنے کے اعتبار سے ہیں۔ جب کرنے کا وقت آتا ہے تو سب کے سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اب ہر ایک کا دین وہی بن جاتا ہے جس کو دوسرا شخص اپنا دین بنائے ہوئے ہیں۔ قول کے اعتبار سے سب کا دین الگ الگ ہے مگر عمل کے اعتبار سے سب کا دین ایک ہے۔

جہاں ذاتی مفاد کا معاملہ ہو وہاں لوگوں کی تمام قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور جہاں ذاتی مفاد نہ ہو وہاں وہ بالکل بے حس بنے رہتے ہیں۔ کوئی اپنے سے بڑھتا ہوا نظر آئے تو سارے لوگ حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جو شخص اپنے سے کم نظر آئے اس کو وہ حقیر سمجھ لیتے ہیں۔ اپنا آدمی ہو تو اس کی ہر بات صحیح نظر آتی ہے اور اگر غیر آدمی ہو تو اس کی ہر بات غلط دکھائی دیتی ہے۔ تعریف کرنے والے کی ہر شخص کے نزدیک زبردست قیمت ہے۔ اور جو شخص تنقید کرے وہ ہر ایک کی نظر میں بے قیمت ہو جاتا ہے۔ اپنے موافق بات کو سمجھنے کے لئے ہر آدمی ہوشیار ہے اور اپنے مخالف بات کو سمجھنے کے لئے ہر آدمی بے وقوف۔ جس سے کسی قسم کا مفاد وابستہ ہو اس کے لئے ہر آدمی با اخلاق بن جاتا ہے۔ اور جس سے کوئی مفاد وابستہ نہ ہو اس کے لئے ہر آدمی بے اخلاق ہے۔ کسی سے شکایت ہو تو اس کے بارہ میں آدمی ہر الٹی خبر کو بلا تحقیق مان لیتا ہے۔ اور جس سے دوستی ہو اس کے خلاف کوئی یقینی خبر ملے تب بھی وہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔

تقریر کی سطح پر ہر آدمی الگ الگ تقریر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر جینے کی سطح پر دیکھئے تو ہر آدمی ایک ہی سطح پر نظر آئے گا اور کسی آدمی کا دین وہی ہے جہاں وہ جی رہا ہے نہ کہ وہ جہاں وہ الفاظ کی نمائش کر رہا ہے۔

دنیا کے تابع

سومناتھ مندر جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۶ جنوری ۱۰۲۶ کو محمود غزنوی نے اسے ڈھادیا تھا اور پھر وہ دوبارہ بنایا گیا، یہاں آجکل ایک عجیب نزاع برپا ہے۔ اس تاریخی مندر میں مختلف مذہبی امور کی ادائگی کے لئے ۱۲۵ آدمی مقرر ہیں۔ ان کو مندر کی طرف سے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ اس تنخواہ کی مقدار ۲۵۰ روپئے ماہوار سے لے کر ۴۰۰ روپے ماہوار تک ہے۔ یہ تنخواہ ان کارکنوں کو کم محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے تنخواہ میں اضافہ کے لئے لیبر کورٹ میں دعویٰ کر دیا۔

مندر ٹرسٹ جس کے صدر مسٹر مرارجی ڈیسائی ہیں، اس کا کہنا ہے کہ سومناتھ مندر ایک مذہبی وقف ہے اور اس کا معاملہ ریلیجس ٹرسٹ ایکٹ کے تحت آتا ہے۔ دوسری طرف کارکنوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک صنعت ہے اس کا معاملہ انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ کے تحت طے کیا جانا چاہئے۔ مندر کے کارکنوں کا فائدہ اس میں ہے کہ مندر کو ایک صنعت قرار دیا جائے اور اس کا معاملہ انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ کے تحت لیبر کورٹ میں طے کیا جائے۔ اس طرح ان کو صنعتی مزدوروں والی مراعات حاصل ہو جائیں گی جو ریلیجس ٹرسٹ ایکٹ کے تحت انھیں نہیں مل سکتیں (ٹائمس آف انڈیا یکم ستمبر ۱۹۸۴)

بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو آج تمام مذہب والوں کا یہی حال ہے، حتی کہ خود مسلمانوں کا بھی۔

مسلمان آج اسلامی تعلیمات کی تشریح عوامی خواہشات کی روشنی میں کرتے ہیں کیوں کہ اس طرح انھیں عوامی مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر وہ خالص حق کی روشنی میں اسلام کی تشریح کریں تو عوام کی بیشتر فوراً ان کا ساتھ چھوڑ دے۔ وہ اسلام کو زمانہ کے تابع کر کے پیش کرتے ہیں تاکہ ہر ایک کی موافقت انھیں حاصل رہے۔ اگر وہ زمانہ کو اسلام کے تابع بنا کر پیش کریں تو کوئی ان کو ساتھ دینے والا نہ ملے۔

دین اصلاً آخرت کی چیز ہے۔ مگر دین کو آخرت کی چیز کی حیثیت سے لینے میں زیادہ قیمت ملتی ہوئی نظر نہیں آتی، اس لئے ہر آدمی دین کو دنیا کی چیز بنا کر اختیار کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کر سکے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو سومناتھ کو ڈھانے والے بھی وہیں نظر آئیں گے جہاں سومناتھ کو آباد کرنے والے نظر آتے ہیں۔

اسلامی بینک

اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اسلامی بینک بنایا جائے تو اس میں لین دین کی بنیاد نفع میں شرکت ہوگی نہ کہ سود جس پر موجودہ زمانہ میں بینکنگ کا نظام چل رہا ہے۔

سودی نظام میں قرض دینا ایک تجارت ہے۔ کیوں کہ وہ ایک مقررہ شرح کے مطابق اضافہ ہو کر قرض دینے والے کو لوٹتا ہے۔ مگر اسلامی معاشرہ میں قرض دینا ایک انسانی عمل ہے نہ کہ کاروباری عمل۔ اسلامی معاشرہ میں ایک شخص دوسرے شخص کو قرض دیتا ہے تاکہ اس کی ضرورت پوری ہو۔ اور بعد کو وہ اس کی اصل رقم اسے لوٹا دے۔ اس کے برعکس سودی نظام میں قرض اس لئے دیا جاتا ہے کہ وہ یقینی نفع کے ساتھ قرض دینے والے کی طرف لوٹے۔

اسلامی شریعت میں تجارتی قرضہ کو مضاربت کہا جاتا ہے۔ یعنی نفع نقصان دونوں میں شرکت کی بنیاد پر قرض دینا۔ الف کی رقم پر جیم ایک کاروبار کرتا ہے۔ اگر اس میں اس کو نفع ہو تو حسب معاہدہ دونوں اس کے نفع کو تقسیم کرلیں گے۔ اور اگر نقصان ہو جائے تو جتنا نقصان ہوا ہے وہ قرض دینے والے کو برداشت کرنا پڑے گا۔

ایک انفرادی شخص اگر دوسرے انفرادی شخص کو قرض دے تو اس میں یقیناً نفع اور نقصان دونوں کا امکان ہے۔ لیکن اگر یہ کام اجتماعی بینکوں کے ذریعہ ہو تو عملاً نقصان صفر کے برابر ہو جاتا ہے۔ بینک کی صورت میں ہزاروں آدمیوں کا سرمایہ ایک ادارہ میں جمع ہوگا اور پھر سیکڑوں اور ہزاروں تاجروں کو بطور قرض دیا جائے گا۔ ایسی صورت میں اگر ان میں سے چند کو نقصان ہو جائے تو بینک کا مجموعی کاروبار پھر بھی نفع میں رہے گا۔ اس کا نقصان غیر مرئی ہو کر رہ جائے گا۔

اس کو انشورنس کمپنیوں کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ انشورنس کمپنیاں حادثات اور نقصانات کا بیمہ کرتی ہیں، اس کے باوجود ان کو نفع ہوتا ہے۔ حالاں کہ اگر ان کے تمام گاہکوں کو نقصان اور حادثہ پیش آنے لگے تو فائدہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عملی طور پر نقصان یا حادثہ چند ہی افراد کو پیش آتا ہے، بیشتر لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں۔ زندگی کے اس قانون کا فائدہ انشورنس کمپنی کو ملتا ہے اور چند افراد کے معاملہ میں نقصان اٹھانے کے باوجود آخری طور پر انہیں نفع حاصل ہوتا ہے۔ انفرادی مضاربت میں یقیناً گھاٹے کا بھی اندیشہ ہے مگر بینکوں کے ذریعہ اجتماعی مضاربت اسی طرح عملاً نفع بخش بن جاتی ہے جیسے موجودہ سودی بینکنگ۔

تعمیری مزاج

ڈاکٹر عبدالجلیل صاحب (نئی دہلی) ۱۹۷۰ میں جاپان گئے تھے اور وہاں چھ مہینے تک رہے۔ انہوں نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ کی ایک ملاقات میں بتایا کہ میں ٹوکیو میں مقیم تھا اور اپنے کام کے تحت ٹوکیو سے ایک مقام پر جایا کرتا تھا۔ یہ سفر ٹرین سے پندرہ منٹ میں طے ہو جاتا تھا۔

انھوں نے بتایا کہ ایک روز وہ ٹوکیو سے ٹرین پر سوار ہوئے۔ پندرہ منٹ گزر گئے مگر ان کا مطلوبہ اسٹیشن نہیں آیا۔ ایک اسٹیشن پر ٹرین رکی مگر انھوں نے بورڈ دیکھا تو یہ کوئی دوسرا اسٹیشن تھا۔ اب انھیں تشویش ہوئی۔ ان کو خیال ہوا کہ غالباً وہ کسی غلط ٹرین پر سوار ہو گئے ہیں ڈبہ میں ان کے قریب ایک جاپانی نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ مگر زبان کی مشکل تھی۔ کیوں کہ ڈاکٹر صاحب جاپانی زبان نہیں جانتے تھے اور وہ شخص انگریزی زبان سے ناواقف تھا۔ انھوں نے یہ کیا کہ ایک کاغذ پر اپنے مطلوبہ اسٹیشن کا نام لکھا اور جاپانی نوجوان کو اسے دکھایا۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اس درمیان میں ٹرین چل چکی تھی مگر ابھی اس نے پلیٹ فارم نہیں چھوڑا تھا۔ نوجوان نے ڈاکٹر صاحب کا کارڈ دیکھتے ہی فوراً زنجیر کھینچی۔ ٹرین رکی تو وہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر نیچے اترا۔ اب وہ ان کے ساتھ چلنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ان کو مخالف سمت سے آنے والی دوسری ٹرین پر بٹھایا اور خود بھی ان کے ساتھ بیٹھا۔ ٹرین دونوں کو لے کر روانہ ہوئی۔ چند منٹ میں ڈاکٹر صاحب کا مطلوبہ اسٹیشن آگیا۔ اب نوجوان ان کو لے کر اترا اور یہاں چھوڑ کر دوسری ٹرین پکڑ کر وہاں کے لئے روانہ ہو گیا جہاں اس کو جانا تھا۔ اس دوران دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب جاپانی زبان نہیں جانتے تھے اور جاپانی نوجوان انگریزی زبان سے ناواقف تھا۔

اسی طرح مثلاً انھوں نے بتایا کہ میں کسی سڑک پر تھا۔ میں نے دیکھا کہ دو جاپانیوں کی کار آمنے سامنے سے آتے ہوئے ٹکرا گئی، دونوں اپنی گاڑی سے اترے اور ایک دوسرے کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے: ایک نے کہا کہ غلطی میری ہے، مجھے معاف کردو ـــــ دوسرے نے کہا غلطی میری ہے مجھے معاف کردو۔

اسی کا نام تعمیری مزاج ہے، اور یہی تعمیری مزاج قوموں کی ترقی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اس کے برعکس جس قوم کے افراد کا یہ حال ہو کہ وہ صرف اپنے کو جانیں اور دوسرے کو نہ جانیں وہ کبھی کوئی بڑی ترقی حاصل نہیں کرسکتے۔

پردہ ڈالنا

سنگاپور سے انگریزی ناول کی ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے :

The Cry of the Halidon

اس کتاب کے آغاز میں کئی سطر کی ایک عبارت درج ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کے تمام حقوق محفوظ ہیں اور کسی بھی شکل سے اس کو دوبارہ استعمال نہیں کیا جاسکتا جب تک پبلشر کی پیشگی اجازت حاصل نہ کر لی جائے۔ اس عبارت کے الفاظ یہ ہیں :

All rights reserved. No part of this publication may be reproduced, stored in a retrieval system, or transmitted, in any from, or by any means electronic, mechanical, photocopying, recording, or otherwise, without the prior permission of the publishers.

کتاب پر بحیثیت مصنف کے رابرٹ لڈلم (Robert Ludlum) کا نام درج ہے۔ بظاہر مذکورہ عبارت سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ پبلشر نے مہنگی رائلٹی دے کر اس کے حقوق اشاعت حاصل کئے ہیں اور اب وہ چاہتا ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص اس میں شریک نہ ہو۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ پوری کتاب سرقہ ہے۔ کتاب کا اصل مصنف جناتھن رائڈر (Jonathan Ryder) ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۵ میں لندن سے چھپی تھی۔ عین اسی کتاب کو اسی نام کے ساتھ سنگاپور کے پبلشر نے چھاپ لیا ہے۔ اس کی واحد ترمیم یہ ہے کہ اس نے مصنف کا نام بدل دیا ہے (ہندستان ٹائمس ۲۱ ستمبر ۱۹۸۴)

بعض مرتبہ آدمی سچ صرف اس لئے بولتا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنے جھوٹ پر پردہ ڈال سکے۔ وہ حق کا اعلان صرف اس لئے کرتا ہے کہ اپنے باطل کو اس کی آڑ میں چھپا سکے۔ وہ خوب صورت الفاظ کا استعمال صرف اس لئے کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنی معنوی بدشکلی کو ڈھانک لے۔ وہ آگ بجھانے کے لئے اس لئے دوڑتا ہے کہ کوئی یہ نہ جانے کہ اسی نے آگ لگائی تھی۔

سنگاپور کے پبلشر نے خود تو سرقہ کیا ہے مگر وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی شخص سرقہ کا معاملہ نہ کرے۔ خود تو اس نے دوسرے کی چیز لے لی ہے مگر دوسرا کوئی اس سے اسے نہ لے۔ خود غرضی کی یہ قسم بھی کیسی عجیب ہے۔

ایک سفر

المعہد العالمی للفکر الاسلامی (International Institute of Islamic Thought)
مختلف ملکوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کا ایک ادارہ ہے جس کا مرکزی دفتر واشنگٹن میں ہے۔ اس ادارہ کے ٹرسٹیوں کا ایک بورڈ ہے جس میں حسب ذیل افراد شامل ہیں :

ڈاکٹر عبد الحمید سلیمان ،	صدر
ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی ،	ڈائرکٹر
ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی	ممبر
ڈاکٹر جمال البرزنجی	ممبر
ڈاکٹر انور ابراہیم (وزیر ملیشیا)	ممبر

اس ادارہ کا مقصد اس کے الفاظ میں اسلامیۃ المعرفۃ (Islamization of knowledge) ہے۔ اس کے تحت اس کا تیسرا انٹرنیشنل سمینار جولائی ۱۹۸۴ء میں کوالالمپور میں ہوا۔ اس سمینار کو منظم کرنے والا مذکورہ ادارہ تھا۔ اور اس کی میزبانی کے فرائض حکومت ملیشیا کی وزارت ثقافت نے انجام دئے۔ راقم الحروف کو اس سمینار میں مقالہ پڑھنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں کوالالمپور کا سفر ہوا۔ اس اجتماع میں ملیشیا کے علاوہ دوسرے مختلف ملکوں کے تقریباً پچاس افراد شریک ہوئے۔ یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اجتماع کی کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا کوئی بین اقوامی اجتماع ہو تو اس کے شرکا کی اکثریت کے لئے، کم از کم اب تک، سب سے زیادہ قابل فہم زبان انگریزی ہی ہوتی ہے۔

میرے سفر کا راستہ یہ تھا : دہلی۔ بینکاک، کوالالمپور۔ بینکاک۔ دہلی۔ ۱۳ جولائی ۱۹۸۴ کو واشنگٹن (امریکہ) میں ٹکٹ خریدا گیا۔ اور پورے سفر کا رزرویشن "اوکے" ہو کر ۱۷ جولائی کو تھائی ایرویز (نئی دہلی) کی معرفت مجھے اپنے دفتر میں وصول ہو گیا۔ اس کے بعد ۲۳ جولائی کو جب میں دہلی سے روانہ ہوا تو اسی دن دوپہر کے وقت میں کوالالمپور پہنچ چکا تھا۔

موجودہ زمانہ میں دور دراز ملکوں میں سفر کتنا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ خدا نے یہ آسانیاں اس لئے پیدا کی تھیں کہ پیغمبر آخر الزماں کے امتی ان کو استعمال کرکے خدا کے دین کی دعوت ساری دنیا میں پہنچا دیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے ان سہولیات کو اپنی بے نتیجہ سیاست

کے لئے تو خوب استعمال کیا مگر وہ اسے اللہ کے پیغام کو اہل عالم تک پہنچانے کے لئے استعمال نہ کر سکے۔

یہ عملی غفلت اب فکری غفلت تک جا پہنچی ہے۔ چنانچہ اب یہ حال ہے کہ اگر ان کو اس فریضہ کی طرف توجہ دلائی جائے تو کوئی کہے گا کہ تم مسلمانوں کو جہاد کے محاذ سے ہٹانا چاہتے ہو۔ کسی کا جواب یہ ہوگا کہ ابھی تو مسلمانوں کا اپنا وجود خطرہ میں ہے پھر وہ کوئی دوسرا کام کس طرح کر سکتے ہیں۔ کسی کو کہنے کے لئے یہ الفاظ مل جائیں گے کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کر لیجئے اس کے بعد دوسروں کی اصلاح کی فکر کیجئے۔

قدیم زمانہ میں مسلمانوں کے اندر دعوت کا جذبہ تھا۔ اس وقت ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچنے کے لئے مہینوں کا وقت درکار ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ سمندروں کو پار کر کے دور دراز ملکوں میں پہنچے اور مشرک ملکوں کو موحد ملک بنا دیا۔ آج چوں کہ مسلمانوں کے اندر سے دعوت کا جذبہ نکل گیا ہے اس لئے وہ طرح طرح کے عذر لنگ تراش کر کے اپنے آپ کو اس سے فارغ کئے ہوئے ہیں۔

الرسالہ پڑھنے والوں کو "ملیشیا" سے میری دلچسپی کا راز جاننا مشکل نہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ملیشیا کا علاقہ اسلام کی دعوتی قوت کی ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ اس علاقہ میں اسلام صرف اپنی دعوتی قوت کے ذریعہ پھیلا۔ یہاں کوئی بھی عسکری طاقت استعمال نہیں کی گئی۔ بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس علاقہ میں اسلام کی اشاعت مسلم تاجروں کے ذریعہ اس وقت ہوئی جب کہ اسلام کی عسکری قوت بالکل برباد ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر آرنلڈ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اگرچہ بعد کے سالوں میں اسلام کی عظیم سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور اس کی سیاسی طاقت ختم ہو گئی تاہم اس کی روحانی فتوحات کسی وقفہ کے بغیر جاری رہیں۔ جب منگول قبائل نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کر دیا اور عباسی مملکت کو خون میں ڈبو دیا۔ اور جب مسلمان ۱۲۳۶ء میں قرطبہ سے فرڈ نینڈ کے ہاتھوں نکال دئے گئے اور غرناطہ جو اسپین میں اسلام کا آخری مرکز تھا اس نے عیسائی بادشاہ کو خراج ادا کیا تو عین اس وقت اسلام سماترا میں داخل ہو چکا تھا اور جزائر ملایا میں اپنی فتوحات کا آغاز کر رہا تھا۔ اپنے سیاسی انحطاط کے زمانہ میں بھی اسلام نے شاندار روحانی ترقی حاصل کی ہے :

> Although in after years this great empire was split up and the political power of Islam diminished, still its spiritual conquests went on uninterruptedly. When the Mongol hordes sacked Baghdad (A.D. 1258) and drowned in blood the faded glory of the Abbasid dynasty — when the Muslims were expelled from Cordova by Ferdinand of Leon and Castile (A.D. 1236), and Granada, the last stronghold of Islam in Spain, paid tribute to the Christian king — Islam had just gained a footing in the island of Sumatra and was just about to commence its triumphant progress through the Island of the Malay Archipelago. In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests.
>
> T.W. Arnold, *The Preaching of Islam*, Lahore 1976 p. 2.

اگر آپ اسپین اور بغداد کا الگ الگ مطالعہ کریں اور ملیشیا کا الگ تو آپ کو اس میں کوئی سبق نہیں ملے گا۔ مگر جب دونوں کو ملا کر دیکھا جائے تو وہ عظیم سبق برآمد ہوتا ہے جس کی طرف اوپر کے اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے۔

جب میں ملیشیا کی طرف جا رہا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی ملک کی طرف نہیں جا رہا ہوں بلکہ اسلام کی تاریخ کی طرف جا رہا ہوں۔ ایک ایسی تاریخ جو اہل اسلام کو یہ سبق دیتی ہے کہ اگر تمہارے پاس مادی اور عسکری طاقت موجود نہ ہو تب بھی تمہارے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ تم اپنی فکری اور روحانی طاقت کو استعمال کرکے ازسرنو اپنے لئے ایک نئی دنیا بنا سکتے ہو۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۴ کو میں کوالالمپور کے لئے روانہ ہوا۔ روانگی کے وقت میرا جہاز رات کو ۲ بجے تھا۔ اسی طرح جب میں کوالالمپور سے واپس ہوا تو میں دوبارہ دہلی میں رات کے وقت اترا۔ جو لوگ باہر کی دنیا میں سفر کرتے رہتے ہیں انھیں اندازہ ہے کہ اس طرح غیر موزوں (Odd) اوقات میں سفر کرنے کا معاملہ زیادہ تر دہلی میں پیش آتا ہے۔ یہ دراصل ملک کی پس ماندگی کی قیمت ہے۔ دہلی کے ایک انگریزی اخبار نے پالم ہوائی اڈہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

> Palam airport's main problem is overcrowding during the night hours. There is a lull all day. This happens because many countries do not allow night landings in order to eliminate noise. India cannot afford to follow their example because it would lose much of the traffic it gets. There is, therefore, bunching of aircraft leading to congestion.

پالم ایرپورٹ کا بنیادی مسئلہ رات کے اوقات میں غیر معمولی بھیڑ ہے۔ یہاں سارے دن سکون رہتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اکثر ممالک شور کو ختم کرنے کے لئے رات کو اپنے یہاں جہاز اترنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ہندستان ایسی پابندی نہیں لگا سکتا۔ کیوں کہ اگر وہ ایسا کرے تو وہ اپنے اکثر مسافروں کو کھو دے گا۔ اس بنا پر یہاں رات کو جہازوں کی کثرت رہتی ہے جس کی وجہ سے یہاں رات کے اوقات میں بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔

اگر آپ قومی سطح پر پس ماندہ ہیں تو موجودہ مقابلہ کی دنیا میں بہر حال آپ کو اس کی قیمت دینی پڑے گی۔ اسباب کی اس دنیا میں اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۴ کی رات کو ۲ بجے میں تھائی ایرویز (فلائٹ ۳۰۴) کے ذریعہ دہلی سے روانہ ہوا۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لئے ہوائی کمپنیوں کا معاملہ اس قدر خصوصی ہوتا ہے کہ ان کے لئے بورڈنگ کارڈ بھی زیادہ شاندار کاغذ پر چھاپے جاتے ہیں۔ یہاں ہر چیز کا معیار اعلیٰ ہوتا ہے۔ ہر چیز

کا انداز عام اکانومی کلاس سے مختلف رکھا جاتا ہے۔ خصوصی تحفے بھی دئے جاتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ دنیا کا موجودہ نظام بھی انسان کو کس قدر دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔ دنیا میں یہ تمام فرق پیسہ کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ یہاں صرف پیسہ کی زیادتی اور کمی پر ایک شخص کو اونچا درجہ مل جاتا ہے اور دوسرے کو نیچا۔ اس سے انسان اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ پیسہ ہی اس دنیا میں سب کچھ ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی اور ساری طاقت صرف پیسہ کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے۔ وہ اسی میں مصروف رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اس وقت اچانک اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وسیع تر زندگی کے اعتبار سے یہاں پیسہ کی کوئی قیمت نہ تھی۔ یہ سوچ کر بے اختیار دل بھر آیا۔ میری زبان سے نکلا: کاش آج کے انسان کو بتایا جاسکے کہ زندگی کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ اور اس کو چھوڑ کر وہ کس چیز کو اپنا مسئلہ بنائے ہوئے ہے۔ یہی اصل دعوتی کام ہے۔ مگر یہی وہ کام ہے جس کو کرنے والا آج کوئی نہیں۔

ایک دنیا وہ ہے جس کا نام "دہلی" ہے۔ دوسری دنیا وہ ہے جس کا نام "کوالالمپور" ہے۔ دونوں ہمارے معلوم دائرہ کے مقامات ہیں۔ ایک آدمی دہلی سے کوالالمپور جا رہا ہو یا کوالالمپور سے دہلی آرہا ہو تو وہ جانتا ہے کہ وہ کہاں سے کہاں جا رہا ہے۔ اس کو اپنے آغاز اور اپنے انجام کا پورا یقین ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دنیا اور آخرت کا بھی ہے۔ ہر آدمی ایک مسافر ہے۔ ہر آدمی موجودہ دنیا سے آخرت کی دنیا کی طرف جا رہا ہے۔ وہ ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف سفر کر رہا ہے۔ مگر کوئی نہیں جس کو اس واقعہ کا سچا یقین ہو۔ جو دوسرے سفر کا بھی اسی طرح زندہ احساس رکھتا ہو جس طرح وہ اپنے پہلے سفر کا زندہ احساس رکھتا ہے۔

بینکاک سے کوالالمپور جانے کے لئے دوسرا جہاز پکڑنا تھا۔ بینکاک کا ہوائی اڈہ دلی کے ہوائی اڈے سے زیادہ باقاعدہ اور زیادہ منظم نظر آیا۔ میں کاؤنٹر پر گیا تاکہ تھائی ایرویز کی اگلی فلائٹ (۴۱۵) کے لئے بورڈنگ کارڈ حاصل کروں۔ کاؤنٹر پر کھڑی ہوئی خاتون نے میرا ٹکٹ لیا اور کمپیوٹر کی چند کنجیوں پر انگلی ماری اور اچانک میرے ٹکٹ اور رزرویشن کی پوری تفصیل اسکرین پر آگئی۔ موجودہ زمانہ میں کمپیوٹر نے جو انقلاب برپا کیا ہے یہ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ کمپیوٹر گویا ایک قسم کا مشینی "حافظہ" ہے۔ آپ اس کے حافظہ میں بے شمار معلومات ڈال سکتے ہیں اور پھر ضرورت کے وقت بٹن دبانے پر ایک لمحہ میں وہ ساری معلومات سکرین پر نمایاں ہو کر آپ کے سامنے آجائیں گی۔

دوران پرواز ایئر ہاسٹس ناشتہ کے لئے مختلف قسم کا سامان میز پر رکھ کر لے آئی۔ ان میں سے مجھے اپنے لئے انتخاب کرنا تھا۔ میں نے دیکھا تو اس میں زیادہ تر گوشت کی چیزیں تھیں یا مغربی طرز کے کھانے تھے۔

گوشت کے ساتھ حلال کا مسئلہ تھا اور مغربی طرز کے کھانے میرے ذوق کے مطابق نہیں۔ میز کے ایک طرف چاول نظر آیا۔ میں نے کہا یہ چاول دے دو۔ ائیر ہاسٹس نے فوراً کہا:

It is ham-rice sir, do you take ham?

میں نے کہا کہ نہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ ہیم (لحم خنزیر) کی اس دنیا میں اگر چاول بھی اس سے محفوظ نہیں تو آخر کیا چیز ہے جس کو یہاں کھایا جائے۔

چوں کہ بنکاک میں جہاز بدلتا ہے اس لئے جاتے اور آتے ہوئے کچھ اوقات بنکاک میں گزرے اس طرح تھائی لینڈ کو کسی قدر دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ تھائی لینڈ کی کل آبادی تقریباً ۴۵ ملین ہے۔ اس میں ۹۰ فی صد بدھسٹ ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد تقریباً دو ملین (۲۰ لاکھ) ہے۔ وہ زیادہ تر تھائی لینڈ کے جنوبی حصہ میں بستے ہیں۔ یعنی لمبائی میں پھیلے ہوئے ملک کا وہ حصہ جو ملیشیا سے ملا ہوا ہے۔ یہ لوگ تھائی اور ملائی زبان بولتے ہیں۔

بنکاک سے مسلمانوں کے دو ماہنامے نکلتے ہیں۔ ایک الجہاد، دوسرا رابطہ۔ دونوں تھائی زبان میں ہیں۔ "الجہاد" کے اڈیٹر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ دونوں ماہناموں کی تعداد اشاعت پانچ پانچ ہزار ہے۔ تھائی لینڈ میں تقریباً دو ہزار مسجدیں ہیں۔ یہاں کوئی بڑی اسلامی درس گاہ نہیں۔ البتہ چھوٹے چھوٹے مدرسے سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ جنوبی تھائی لینڈ کے مسلمان ملائی زبان بولتے ہیں۔ شمالی تھائی لینڈ کے مسلمانوں کی زبان تھائی ہے۔ مگر مسلمانوں کا رسالہ یا کتابیں صرف تھائی زبان میں چھپتے ہیں۔ کیوں کہ تھائی لینڈ کے قانون کے مطابق صرف تین زبانوں میں کوئی چیز چھاپی جاسکتی ہے۔ تھائی، انگریزی، چینی۔ تاہم ملیشیا سے ملائی زبان کی کتابیں اور رسالے آتے رہتے ہیں۔ تھائی زبان کا رسم الخط ناگری سے ملتا جلتا ہے۔

تھائی قوم کی اصل چینی ہے۔ وہ غالباً بارھویں صدی عیسوی میں جنوبی چین سے آکر یہاں آباد ہوئے۔ یہاں عام طور پر تھائی زبان بولی جاتی ہے۔ دوسرے نمبر پر انگریزی زبان رائج ہے۔ آبادی کا ۷۰ فی صد حصہ چاول کی کاشت کرتا ہے۔ تھائی لینڈ دیہاتوں اور قصبات کا ایک ملک ہے۔ اس کا واحد بڑا شہر بنکاک ہے جو بین اقوامی گزرگاہ ہونے کی بنا پر کافی مشہور ہے۔ یہاں کا پہلا بادشاہ مینگرائی اعظم تھا۔ مختصر حکومت کے بعد ۱۳۴۵ء میں اس کا خاتمہ سادہ طور پر اس طرح ہوا کہ اس کو گھڑیال نے نگل لیا۔

تھائی لینڈ کے لفظی معنی ہیں "آزادی کا ملک"۔ یہاں کی زندگی اور رسم و رواج پر سب

سے زیادہ بدھ ازم کا اثر ہے جو بنیادی طور پر ایک روادار مذہب ہے۔ مزید یہ کہ تھائی لینڈ جنوب مشرقی ایشیا کا واحد ملک ہے جو نو آبادیاتی نظام کی ماتحتی سے بچا رہا۔ اس بنا پر یہاں غیر ملکی تہذیب کے خلاف نفرت اور تعصب کی وہ فضا نہیں ہے جو دوسرے ملکوں میں پائی جاتی ہے۔

ان اسباب نے تھائی لینڈ میں دعوت و تبلیغ کا میدان بہت بڑے پیمانہ پر کھول دیا ہے۔ مگر اس سے صرف عیسائی مبلغین فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مسلمانوں نے ابھی تک یہاں دعوت و تبلیغ کے لئے کوئی قابل ذکر نظام نہیں بنایا۔

بینکاک سے کوالالمپور جاتے ہوئے راستہ میں انگریزی اخبار، بینکاک پوسٹ (۲۳ جولائی ۱۹۸۴) پڑھنے کو ملا۔ عجیب اتفاق کہ اس اخبار کے صفحہ اول کی پہلی سرخی جہاز کی تباہی (Plane crash) کی تھی۔ دو انجن کا یہ چارٹرڈ جہاز تھائی حکومت کے اعلیٰ افسروں کو لئے ہوئے اڑ رہا تھا۔ وہ ہوائی اڈہ سے صرف ۱۲ کیلو میٹر کے فاصلہ پر تھا کہ کنٹرول ٹاور کو اس کا پیغام ملا کہ ہمارے انجن میں خرابی آگئی ہے اور مجبوراً ہم دھان کے کھیت میں جہاز اتار رہے ہیں۔ اس کے بعد اچانک پیغام آنا بند ہوگیا۔ جہاز کھیت میں اتر رہا تھا کہ ٹکرا کر تباہ ہوگیا۔

ایک کسان جو اس منظر کو دیکھ رہا تھا اس نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ جہاز ڈگمگاتے ہوئے نیچے آرہا ہے۔ اس کے بعد یکایک زور دار دھماکہ (Loud explosion) ہوا اور جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ مرنے والوں میں تھائی لینڈ کے منرل رسورسز ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر بھی شامل تھے۔ کچھ لوگ شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچائے گئے اور وہاں جاکر مرگئے۔

یہ خبر میں نے ایسی حالت میں پڑھی کہ میں خود بھی ایک جہاز میں بیٹھا ہوا فضا میں اڑ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے حادثہ خود میرے ساتھ گزر رہا ہو۔ زندگی اور موت ایک دوسرے سے بالکل قریب نظر آئے۔

زمینی سواری میں کوئی خرابی آجائے تو اس کو ٹھہرا کر درست کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس طرح آپ ہوائی جہاز کو فضا میں نہیں ٹھہرا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاز میں کوئی خرابی آنے کا مطلب ہمیشہ حادثہ ہوتا ہے۔ جہاز اپنے مسافروں کے لئے گویا اڑتی ہوئی قبر ہے۔ کسی کی یہ قبر فضا میں بن جاتی ہے اور کسی کو جہاز اڑا کر تیزی سے وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں اس کو عام قبر میں دفن کیا جاسکے۔

انسان کتنا زیادہ موت سے قریب ہے مگر وہ کتنا زیادہ اپنے آپ کو موت سے دور سمجھتا

ہے۔

کوالالمپور میں میرا قیام پہلے دن ہالی ڈے ان (Hol iday Inn) میں کمرہ نمبر ۲۱۹ میں رہا۔ مجھے یہاں نماز پڑھنے کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت اتفاق سے کوئی قبلہ کا رخ بتانے والا نہ تھا۔ تردد ہوا کہ کس طرف رخ کرکے نماز پڑھی جائے۔ اچانک میری نظر چھت کی طرف گئی تو چھت پر تیر کی شکل کا ایک کاغذ یا پلاسٹک کا ٹکڑا چپکا یا ہوا تھا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا "قبلہ" یہ تیر بتا رہا تھا کہ قبلہ کی سمت کدھر ہے۔ چنانچہ اطمینان سے اس رخ پر نماز ادا کی۔ تیر نے موجودہ زمانہ میں ہتھیار کی حیثیت سے اپنی قیمت کھو دی ہے مگر رخ کے نشان کے لئے اب بھی ساری دنیا میں اس کا کوئی بدل نہیں۔

ہوائی اڈہ سے ہوٹل آتے ہوئے جب ہم لوگ بازار سے گذر رہے تو سڑک کے دونوں طرف کی بڑی بڑی دکانوں پر ایسے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر انگریزی کے ساتھ چینی زبان میں بھی دکان کا نام لکھا گیا تھا۔ میلوں تک یہی منظر تھا۔ میرے ساتھی (وزارت ثقافت کے سکریٹری) نے بتایا کہ جن جن بورڈوں پر چینی حروف میں لکھا ہوا ہے وہ چینیوں کی دکانیں ہیں۔ میں نے دیکھا تو اکثر بڑی دکانوں پر چینی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

ملیشیا چھوٹی چھوٹی مسلم سلطنتوں کا مجموعہ ہے۔ اب بھی یہ تمام سلطان موجود ہیں مگر عملاً پارلیمنٹ کے ہاتھ میں سارا اقتدار ہے ۱۹ویں صدی میں ملیشیا (ملایا) برطانی اقتدار کے ماتحت آگیا۔ برطانیہ نے اپنے دور اقتدار میں کثرت سے چینی اور ہندستانی مزدور ملیشیا میں درآمد کئے۔ یہ لوگ یہاں اس لئے لائے گئے تھے کہ ٹن کی کانوں اور ربر کے باغوں میں کام کرسکیں جن کے مالک انگریز تھے۔ ٹن اور ربر اب بھی ملیشیا کے بنیادی ذرائع آمدنی ہیں۔

چینی دھیرے دھیرے یہاں کی تجارتوں میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ ملیشیا کی اقتصادیات پر قابض ہوگئے۔ ملائی قوم زیادہ تر دیہاتوں میں آباد رہی۔ اور چینی شہروں پر چھاگئے۔ ملایا نے ۱۹۵۷ میں برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ اس درمیان میں سنگاپور میں چینیوں کی اکثریت ہوچکی تھی۔ ابتداءً سنگاپور فیڈریشن کے ماتحت ملیشیا سے وابستہ رہا۔ ۱۹۶۵ میں اس نے کامل آزادی حاصل کرلی۔

۲۴ جولائی کو دوپہر بعد ہمیں "انٹرنیشنل ہاؤس" میں لے جایا گیا۔ اور آئندہ یہیں پر کمرہ نمبر ۱۳۰۲ میں قیام رہا۔ انٹرنیشنل ہاؤس ایک بین اقوامی ترقیاتی مرکز

(Asia and Pacific Development Centre) کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ ہالی ڈے اِن اگرچہ یہاں کا بڑا ہوٹل ہے مگر وہ شہر کے اندر واقع ہے۔ اس کے برعکس انٹرنیشنل ہاؤس شہر کے باہر پہاڑی کے دامن میں قائم کیا گیا ہے۔ یہاں چاروں طرف قدرت کے مناظر ہیں۔ نیز یہاں ہوٹل کے ماحول کے بجائے "علمی" ماحول ہے۔ یہاں ایک بڑی لائبریری بھی ہے۔ یہ دوسری جگہ مجھ کو زیادہ پسند آئی۔

ہالی ڈے اِن کی ایک بجی ہوئی نشست گاہ کے دروازہ پر جلی حرفوں میں یہ الفاظ لکھے ہوئے نظر آئے (Rama Rama) اس سے مجھے شبہہ ہوا کہ یہ شاید کوئی ہندو ہوٹل ہے۔ بعد کو میں نے ایک ملیشیائی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے معنی ملائی زبان میں تتلی کے ہیں ـــــ تحقیق سے پہلے ایک چیز کچھ نظر آتی ہے اور تحقیق کے بعد کچھ بن جاتی ہے۔

سیمنار کی طرف سے ہم کو جو بیگ دیا گیا تھا، میں نے ایک ذمہ دار سے پوچھا کہ یہ ملیشیا کا بنا ہوا ہے یا باہر کے کسی ملک کا۔ انھوں نے بتایا کہ ملیشیا کا۔ میں نے دوبارہ پوچھا: مسلم کارخانہ کا یا چینی کارخانہ کا۔ انھوں نے مسکرا کر کہا "اگرچہ مجھے تعین کے ساتھ معلوم نہیں ہے۔ مگر یقین ہے کہ وہ چینی کارخانہ کا ہوگا۔ کیوں کہ میرے علم کے مطابق کوالالمپور میں مسلمانوں کا کوئی ایسا کارخانہ نہیں ہے جو ایسا بیگ سپلائی کر سکے"

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملیشیا کی موجودہ صورت حال کیا ہے۔ یہاں مسلمان ۵۰ فی صد ہیں۔ حکومت پر ان کا قبضہ ہے۔ مگر تجارتی اور اقتصادی سرگرمیوں کو زیادہ تر چینی کنٹرول کرتے ہیں۔

ہندستان میں مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اکثریت ان کا استغلال کر رہی ہے۔ پھر ملیشیا کے بارہ میں وہ کیا کہیں گے جہاں حکومت ان کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے باوجود یہاں کی دولت کا بہت بڑا حصہ چینی اقلیت کے قبضہ میں ہے۔ حتی کہ وہ اپنی اقتصادی قوت کی بنا پر براہ راست یا بالواسطہ طور پر دوسرے شعبوں پر بھی گہرے طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس دن میں کوالالمپور پہنچا ٹھیک اسی دن مسٹر یاسر عرفات بھی اپنے وفد کے ساتھ یہاں آئے۔ وہ اپنے مقرر پروگرام سے ۵ گھنٹے لیٹ کوالالمپور پہنچے۔ ۲۵ جولائی کا مقامی اخبار (New Straits Times) یاسر عرفات کی خبروں اور تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں کے

مشہور اسٹیڈیم نگارا (Stadium Negara) میں ان کی تقریر ہوئی تو وسیع اسٹیڈیم انسانوں سے آخری حد تک بھرا ہوا تھا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ اخبار کی اس سرخی میں تھا:

Our struggle will only end with victory

(ہماری جدوجہد صرف فتح پر ختم ہوگی) اخباری اطلاع کے مطابق انھوں نے عربی میں تقریر کی جس کا ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمہ کیا جارہا تھا۔

انھوں نے فلسطین کے موجودہ مسئلہ کی تمام تر ذمہ داری امریکہ اور اسرائیل پر ڈالی۔ مگر سوال یہ ہے کہ قرآن میں صریح وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل کفر کو اہل ایمان پر ہرگز غلبہ کا موقع نہیں دے گا۔ (لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا) پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ امریکہ اور اسرائیل تقریباً ۴۰ سال سے اس آیت کریمہ کی تردید کر رہے ہیں اور خدائی نصرت ظاہر نہیں ہوتی۔

جہاں تک راقم الحروف کا خیال ہے، فلسطین کا مسئلہ مسلمانوں کی دینی غفلت کا نتیجہ ہے۔ خاتم النبیین کے ظہور سے پہلے فلسطین بنی اسرائیل کیلئے خدائی علامت تھا۔ جب خدا ان سے خوش ہوتا تو ان کو فلسطین پر قبضہ دے دیتا اور جب خدا ان سے ناراض ہوتا تو فلسطین کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دیتا۔ یہی معاملہ اب مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ فلسطین ایک حسی علامت ہے جس سے مسلمان اپنی اسلامیت کو ناپ سکتے ہیں۔ خدا جب جب مسلمانوں سے راضی رہا تو اس نے فلسطین کو ان کے قبضہ میں دے دیا۔ اور جب وہ ان سے ناراض ہوا تو اس کو ان سے چھین کر ان کے دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ ماضی میں بھی ایسا ہو چکا ہے اور آج بھی ایسا ہو رہا ہے۔ اس لئے امریکہ اور اسرائیل کو برا بھلا کہنے کے بجائے ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہئے۔ اپنی کمزوریوں کو دور کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنانا چاہئے کہ خدا دوبارہ فلسطین کو ہمارے حوالے کر دے۔

انٹرنیشنل ہاؤس میں ایک وسیع اور صاف ستھری لائبریری ہے اس سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔ کراچی کے اخبار ڈان (۱۹ جولائی ۸۴ء) میں کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی وزارت کی منسوخی پر طویل نوٹ تھا۔ اس کو پولیٹیکل ڈراما قرار دیتے ہوئے اڈیٹر نے لکھا تھا:

> The manner in which Dr Farooq Abdullah's rival, Dr. G.M. Shah, has been inducted into the Chief Ministership in Srinagar does not point to any deep commitment to democratic norms and principles, on the part of the Indian leadership.

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے حریف ڈاکٹر جی ایم شاہ کو جس طرح سرینگر میں وزیر اعلیٰ بنایا گیا ہے اس سے ظاہر

نہیں ہوتا کہ ہندستان کی قیادت جمہوری اصولوں سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔

اس کو پڑھتے ہوئے میرے دل نے کہا" دوسرے پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر آدمی حد درجہ اصول پرست نظر آتا ہے۔ مگر جب خود اپنا معاملہ ہو تو وہ اصول پرستی کے بجائے مفاد پرستی کو اپنا دین بنا لیتا ہے۔ لوگوں کے اندر اتنی غیرت بھی نہیں کہ جس غلطی میں خود مبتلا ہیں اسی غلطی کے معاملہ میں دوسرے کے اوپر تنقید نہ کریں۔

یہاں ہوٹل میں صبح سویرے مقامی اخبار نیو اسٹریٹ ٹائمس (new Straits Times) کمرہ میں پہنچ جاتا تھا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۸۴ کے اخبار میں سنگاپور کے ڈپٹی پریمیئر مسٹر سناتھمی راجارتنم (Sinnathamby Rajarathnam) کی ایک تقریر پڑھنے کو ملی۔ انھوں نے سنگاپوری باشندوں کی مادیت پر سخت تنقید کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ سنگاپور کے آدمی نے دولت کو مذہب کا بدل بنالیا ہے:

Money is his substitute for religion

یہ بات صرف سنگاپوریوں کے لئے نہیں ہے بلکہ آج دنیا بھر کے انسانوں کا یہی حال ہو رہا ہے۔ دولت ایک ذریعہ ہے مگر اس کو بذات خود مقصد سمجھ لیا گیا ہے۔

اس خبر کو پڑھنے کے بعد ایسا ہوا کہ یہاں کی وزارت مالیات نے ہم سب لوگوں کو ایک عالیشان ہوٹل میں ڈنر دیا۔ یہاں قدرت کا حسین منظر، سازوسامان کی جگمگاہٹ، زرق برق کاروں کا ہجوم تھا۔ اس قسم کے مناظر کے درمیان بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں کو دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ دولت کو مذہب کا قائم مقام بنانے کا سبب کیا ہے۔ وہ ہے موجودہ زمانہ میں دولت کے استعمال کی بڑھی ہوئی مدات۔ قدیم زمانہ میں جب جدید تمدنی لوازم نہیں پیدا ہوئے تھے، انسان کے لئے دولت کا مصرف بہت محدود تھا۔ آج بے شمار نئی نئی چیزوں کے ظہور نے دولت کے استعمال کی مدوں کو لامتناہی طور پر بڑھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر ہر آدمی دولت کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔

لیکن اگر زندگی کی حقیقت کو سوچا جائے تو دولت بالکل بے قیمت نظر آئے گی۔ زندگی کی حقیقت موت ہے۔ اسی اخبار میں کئی موتوں کی خبر تھی۔ مثلاً تنگکو اندر اپترا (Tengku Inder Petra) جو ریاست کلنتن کے راجہ تھے وہ ۲۳ جولائی ۱۹۸۴ کو انتقال کر گئے جب کہ ان کی عمر ۶۲ سال تھی۔ جیسا کہ خبر میں بتایا گیا ہے، موصوف غیر معمولی صلاحیت کے آدمی تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ میں وہ بزنس میں داخل ہوئے اور کئی بڑی بڑی تجارتوں کے مالک بن گئے۔ وہ فیبر ولن گروپ کے وائس

پریسیڈنٹ تھے۔ ایرہیتم تھی اور مال پترا کے بورڈ آف ڈائرکٹرس میں شامل تھے۔ مگر وہ اپنی دولت کے درمیان ۲، سال سے زیادہ نہ رہ سکے۔

جو دولت اتنی کم مدت تک انسان کا ساتھ دے وہ کس قدر بے حقیقت ہے۔ مگر دنیا کی چمک دمک نے لوگوں کو اتنا خیرہ کر رکھا ہے کہ ہر آدمی اس پر ٹوٹ رہا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کو اپنے لیے حاصل کرلے۔

باہر جب کسی شخص کو بلایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے لیے ہر قسم کی سہولت کا اعلیٰ انتظام کیا جاتا ہے۔ مگر میرا یہ حال ہے کہ ہر سہولت جیسے مجھ کو کاٹتی ہے۔ جو لوگ مجھ کو جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ مجھ کو سادگی میں راحت ملتی ہے نہ کہ تکلف میں۔

یہی وجہ ہے کہ بظاہر خواہ کتنی ہی سہولیات ہوں مگر مجھے باہر کے سفروں میں کبھی سکون نہیں ملتا۔ کوالالمپور کے لئے جو ٹکٹ آیا تھا اس میں انھوں نے بطور خود واپسی کا رزرویشن ۲ اگست کو کیا تھا۔ جب کہ روانگی کا رزرویشن ۲۳ جولائی کے لئے تھا۔ مجھے گھبراہٹ تھی کہ اتنے دنوں تک میں کیسے مصنوعی ماحول میں رہوں گا۔ چنانچہ میں نے کوالالمپور پہنچ کر سابقہ رزرویشن منسوخ کرادیا اور دوبارہ ۳۰ جولائی کے لئے واپسی کا رزرویشن کرایا۔

سیمنار کے ذمہ داروں کو معلوم ہوا تو انھوں نے سخت اختلاف کیا۔ وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ چنانچہ مجھ کو دوبارہ اسے ۲ اگست کا کرانا پڑا۔ اس سارے معاملہ کا سبب وہ اکتاہٹ تھی جو مجھے ہر سفر میں ہوتی ہے۔ ٹکٹ جب دوبارہ تبدیل ہوکر میرے ہاتھ میں آیا تو دل کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا: انسان آج اکتاہٹ کو بھی برداشت نہیں کرپاتا پھر کل وہ عذاب کو کیسے برداشت کرے گا۔

لندن سے ایک اعلیٰ معیار کا ماہنامہ نکلتا ہے جس کا نام ساؤتھ (South) ہے۔ ناشرین کے الفاظ میں یہ تیسری دنیا کا میگزین (The Third World Magazine) ہے۔ اس میں افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک کا ماہانہ جائزہ ہوتا ہے۔ جولائی ۱۹۸۴ کے شمارہ میں ہندستان کے بارہ میں جو مضمون تھا اس کا خلاصہ میگزین کے اپنے الفاظ میں یہ تھا۔

With the fires of Hindu-Muslim riots barely damped down in Bombay, the Sikhs of the Punjab prepared to face the final assault on the Golden Temple in Amritsar.

بمبئی میں ہندو مسلم فساد کی آگ ابھی مشکل سے بجھی تھی کہ پنجاب کے سکھوں کو امرت سر کے سورن مندر

پر آخری حملہ کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہونا پڑا۔

گویا ہندستان میں اس مدت میں جو قابل ذکر واقعہ ہوا وہ صرف مذکورہ بالا واقعہ تھا۔ موجودہ زمانہ کی صحافت اپنے تجارتی مقصد کے تحت انھیں واقعات کو نمایاں کرتی ہے جو سنسنی خیز ہوتے ہیں۔ یہ ہر ملک کی صحافت کا حال ہے۔ حالاں کہ واقعات کی اصل فہرست اس سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جو شخص ملک کے اندر ان سنسنی خیز واقعات کو پڑھ رہا ہو وہ بھی اگرچہ اس سے گمراہ ہوتا ہے۔ مگر نسبتاً کم۔ کیوں خود واقعات کے درمیان ہونے کی بنا پر وہ دوسری قسم کے واقعات کا بھی تجربہ اور مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ مگر جو شخص باہر کے ملک میں ہو اور جس کا ذریعہ صرف مذکورہ بالا قسم کی صحافت ہو وہ کسی ملک کے بارہ میں عجیب وغریب قسم کی رائے قائم کر لیتا ہے۔ جو سراسر غیر حقیقی اور مغالطہ آمیز ہوتی ہے۔

باہر کے ملکوں میں اپنے ملک کی خبر پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اپنے ملک کے بارہ میں نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ کسی اجنبی ملک کے بارہ میں پڑھ رہے ہیں۔ حیدرآباد کے فساد (جولائی ۱۹۸۴) کے موقع پر میں کوالالمپور میں تھا۔ وہاں کے اخبار نیو سنڈے ٹائمس (۲۹ جولائی ۱۹۸۴) میں بیرونی خبر رساں ایجنسی کے حوالے سے حیدرآباد کے فرقہ وارانہ فساد کی خبر چھپی۔ یہ خبر بجائے خود بھی مبالغہ آمیز تھی۔ مگر خبر کے ساتھ یہ الفاظ انتہائی حیرت انگیز تھے:

> Hindus and Muslims have long had cultural and religous antagonisms. When the Muslims ruled India in the 10th and 18th centuries, they attempted to crush worship and culture, fuelling Hindu resentment.

(انڈیا کے) ہندو اور مسلم لمبے عرصہ سے ثقافتی اور مذہبی دشمنی میں مبتلا ہیں۔ جب ۱۰ ویں صدی اور اٹھارویں صدی کے درمیان ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی تو انھوں نے (ہندوؤں کے) مذہب اور ثقافت کو کچلنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ سے ہندوؤں میں ناراضگی کا جذبہ بھڑک اٹھا۔

جو لوگ اس قسم کی خبریں پڑھیں ان کا ذہن کس قدر غلط بنے گا۔ مگر اس کے لئے ہمیں خود اپنے آپ کو الزام دینا چاہئے نہ کہ دوسروں کو۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں قدیم ذہن کے ساتھ داخل ہوئے۔ وہ زندگی کے صرف انھیں شعبوں سے آشنا تھے جو ہزاروں برس سے چلے آرہے تھے۔ نئے شعبوں سے وہ بالکل بے خبر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم شعبوں (مثلاً خطابت اور شاعری) میں انھوں نے بہت نام پیدا کیا۔ مگر جدید شعبوں کی اہمیت سے وہ اس قدر بے خبر تھے کہ وہ اس میں داخل بھی نہیں ہوئے۔ انھیں میں ایک خبر رسانی کا ادارہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں

چھ خبر رساں ادارے ہیں جو دنیا کی خبروں کا ۸۰ فی صد حصہ فراہم کرتے ہیں اور وہ سب کے سب یہودیوں کے ہیں یا عیسائیوں کے۔

۲۶ جولائی کو انٹرنیشنل ہاؤس کے بڑے ہال میں کارروائی شروع ہوئی۔ سیمنار کا افتتاح ملیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر محمد (Dr Mahathir Bin Moham ad) نے کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی:

The future of Muslim societies is with Islam.
Without Islam, they have no future.

مسلم اقوام کا مستقبل اسلام کے ساتھ ہے۔ اسلام کے بغیر ان کا کوئی مستقبل نہیں۔

یہ گویا "دکاترہ" کا اجتماع تھا۔ تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کی اکثریت مغربی یونی ورسٹیوں کی تعلیم یافتہ تھی۔ طریق کار یہ تھا کہ مقالہ نگار اپنا مقالہ پڑھ کر سناتا یا اس کو سامنے رکھ کر اس کا خلاصہ بیان کرتا اور اس کے بعد حاضرین اس پر اظہار رائے کرتے۔ آخر میں وہ لوگوں کے تبصروں کا جواب دیتا۔ یہ سلسلہ ۲۶ جولائی کی شام سے ۳۱ جولائی کی صبح تک جاری رہا۔

آخر میں مختلف علمی شعبوں کے حلقے (ورک شاپ) قائم کئے گئے۔ ہر ایک گروہ نے الگ الگ کمرہ میں اپنے موضوع کو اسلامی بنانے کے بارہ میں بحث کی اور اپنی رپورٹ تیار کی۔ ورک شاپوں کی یہ رپورٹیں ۳۱ جولائی کی نشست میں پڑھی گئیں۔ پھر انسٹی ٹیوٹ کے صدر ڈاکٹر عبدالحمید ابو سلیمان کی اختتامی تقریر ہوئی۔ آخر میں ڈاکٹر احمد ذکی (امریکہ) کی دعا پر سیمنار کا خاتمہ ہوا۔

میں نے اس موقع پر جو مقالہ پیش کیا وہ انگریزی میں تھا۔ اس کا اردو خلاصہ انشاءاللہ الرسالہ کے آئندہ اڈیشن میں شائع کر دیا جائے گا۔

سیمنار کے سلسلے میں چند سبق آموز یادداشتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر اسماعیل فاروقی نے اپنی انگریزی تقریر میں کہا کہ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کا آخری نشانہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے لئے مکمل نصاب بنانا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ دنیا بھر کے مسلم اسکالروں سے رابطہ قائم کر رہے ہیں۔ جن کی تعداد جلد ہی تقریباً ۳۰ ہزار ہو جائے گی۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مدد سے وہ جو کام کرنا چاہتے ہیں اس کے تین دور ہیں:

۱۔ مغربی علوم کی کامل مہارت (Mastery of western tradition of learning)

۲۔ اسلامی علوم کی کامل مہارت (Mastery of Islamic tradition of learning)

۳. تنقیدی جائزہ (Criticism)

۴. دونوں کے امتزاج سے صحیح اسلامی نصاب کی تیاری (Synthesis)

انھوں نے بتایا کہ اس وقت مختلف ملکوں کے نصف ملین مسلمان مغربی یونی ورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مسئلہ کتنا اہم ہے۔ پوری جدید نسل کا ذہن بگاڑا جا رہا ہے۔ اس کو درست کرنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ جدید معیار کے مطابق اعلیٰ نصاب تیار کیا جائے۔

سیمنار کے حاضرین نے اس تخیل کو بے حد پسند کیا۔ ایک صاحب نے فرمایا:

Idea of producing textbooks is absolutely a wonderful idea

تاہم ذاتی طور پر میں اس معاملہ میں پرجوش نہ ہو سکا۔ میرے نزدیک اولاً تو اس قسم کا نصاب بنانا ہی مشکل ہے۔ اور بالفرض اگر وہ بن جائے تو موجودہ حالت میں وہ رائج نہیں ہو سکتا۔ آج کی تعلیم گاہوں میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے وہ درحقیقت وقت کے غالب افکار کا انعکاس ہے۔ جب تک عالمی سطح پر ان افکار کا غلبہ ختم نہ کیا جائے، کوئی دوسرا نصاب جدید تعلیم گاہوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اور بالفرض مسلمان خود اپنے تعلیمی ادارے بنا کر وہاں ان کتابوں کو پڑھائیں تو ایسی درس گاہوں کا وہی انجام ہوگا جو موجودہ زمانہ میں ان اسلامی مدرسوں کا نظر آتا ہے جن کے آگے ہم نے "جامعہ" کا بورڈ لگا رکھا ہے۔

بحث کے دوران ایک صاحب نے کہا کہ نصاب کے ساتھ ساتھ ہمیں اساتذہ بھی تیار کرنے ہوں گے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مثال دی کہ سوڈیم اور کلورین دونوں الگ الگ زہر ہیں۔ مگر جب ان کو ملایا جاتا ہے تو ان کا مرکب (سوڈیم کلورائڈ) سادہ نمک بن جاتا ہے۔ اسکول کا استاد جب طالب علم کو یہ بتاتا ہے تو طالب علم پوچھتا ہے کہ ایسا کیوں کر ہوتا ہے۔ استاد اس کے جواب میں "نیچر" کا لفظ بول دیتا ہے۔ وہ مقام جہاں طالب علم کے ذہن میں "خدا" کا تصور ڈالا جا سکتا تھا، وہاں غلط استاد اس کے ذہن میں "نیچر" کو ڈال دیتا ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ طالب علم سمجھ لیتا ہے کہ سب کچھ نیچر کر رہی ہے۔ تعلیمی طور پر اگر وہ خدا کو مانے تب بھی اس کا اصل ذہن غیر خدا والا بن جاتا ہے۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول نقل کیا: لن یسأل الجھال لم لم یتعلموا ولکن یسأل العلماء لم لم یعلموا (نہج البلاغۃ)

جاہلوں سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے سیکھا کیوں نہیں۔ بلکہ عالموں سے یہ پوچھا جائے گا کہ انھوں نے سکھایا کیوں نہیں۔

اس قسم کے اقوال کو عام طور پر لوگ مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کا مسئلہ بھی ہے۔ جو لوگ سچائی سے بے خبر ہیں ان سے زیادہ ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جو سچائی سے باخبر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی یہی غفلت ہے جس نے انھیں اللہ کی مدد سے محروم کر رکھا ہے۔ جب تک مسلمان بے خبروں کو باخبر کرنے کے لئے نہ اٹھیں گے وہ خدا کی مدد کے حق دار نہیں بن سکتے۔

۲۷ جولائی کو ڈاکٹر روزے گارودی کا مقالہ تھا۔ انھوں نے اپنا مقالہ فرانسیسی زبان میں لکھا تھا جو ان کی مادری زبان ہے۔ اس کا مقالہ ترجمہ کوالالمپور میں انگریزی میں کرایا گیا۔ یہی انگریزی مقالہ انھوں نے پڑھ کر سنایا۔ آج ہال سب سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر گارودی کے مقالہ کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام اور عقل میں کوئی حقیقی ٹکراؤ نہیں۔ یہ پہلے بھی مصنوعی تھا اور آج بھی مصنوعی ہے۔ لوگ بطور خود کچھ نظریات بنالیتے ہیں اور ان کو اسلامی کہہ کر پیش کرتے ہیں اس سے عقل اور اسلام کے درمیان مصنوعی ٹکراؤ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

It arises artificial conflict between reason and Islam

ڈاکٹر گارودی نے کہا کہ اسلام کو زندہ کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ قرطبہ یونی ورسٹی کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ اسپین میں دوبارہ اسلام پھیل رہا ہے۔ اسپینی نوجوان اسلام قبول کر رہے ہیں۔ وہاں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو "اسلام کو اسپینی تاریخ کا لاینفک جزء" قرار دیتے ہیں۔ ایک اسپینی نومسلم نے کہا "بہت جلد قرطبہ میں مسلمانوں کی تعداد خلافت کے زمانہ سے بھی زیادہ ہو جائے گی"

ڈاکٹر روزے گارودی (پیدائش ۱۹۱۳) فرانس کے کیمونسٹ لیڈروں میں سے تھے۔

Dr. Roger Garaudy
18-A, Av. du Boucht, 1209 Geneve, Switzerland

انھوں نے ۱۹۸۲ میں اسلام قبول کر لیا۔ ان سے سیمنار کے دوران ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے اسلام قبول کرنے کا سبب کیا تھا انھوں نے کہا کہ یہ میرے لئے کوئی اچانک فیصلہ نہیں تھا۔ میں نے اسلامی کلچر پر اپنی پہلی کتاب ۱۹۴۶ میں لکھی تھی۔ یہ کتاب اولاً فرانسیسی

میں اور اس کے بعد عربی میں شائع ہوئی۔ ان کے اپنے الفاظ میں، اسلام میرے لئے تبدیلی مذہب نہیں تھا بلکہ وہ میرے لئے تکمیل تھا،

I accepted Islam not as a rupture but as an accomplishment

میں نے مزید پوچھا کہ اسلام کے کس خاص پہلو نے آپ کو متاثر کیا۔ ان کا جواب تھا کہ اس کے ثقافتی پہلو (Cultural aspect) نے۔

لسانیات (Linguistics) کی بحث کے دوران ایک صاحب نے کہا کہ عرب آج قرآن کی زبان نہیں بولتے۔ اس کے جواب میں ایک عرب عالم نے بجا طور پر کہا کہ یہ صحیح ہے کہ عرب ممالک میں کئی لہجے رائج ہیں۔ مگر عوامی زبان میں دوسرے ملکوں میں بھی یہ فرق پایا جاتا ہے۔ جہاں تک علمی عربی کا تعلق ہے اس میں یہ فرق موجود نہیں۔ آج بھی عرب کے اجتماعات میں، ان کی ریڈیو اور ٹیلی وژن کی نشریات میں یا کتابوں میں وہی زبان ہوتی ہے جو قرآن کی زبان ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ کسی زبان کو جاننے کے لئے اس کے اسلوب کو جاننا ضروری ہے۔ مثلاً عربی گرامر کے ماہرین ہمیشہ یہ لکھتے ہیں کہ صیغۃ الامر (افعل) تفید الوجوب۔ امر کا صیغہ وجوب کا معنی رکھتا ہے۔ مگر اس کو مطلق معنی میں لینا درست نہیں۔ اگر اس کو مطلق وجوب کے معنی میں لے لیا جائے تو عجیب صورت پیدا ہوجائے گی۔ مثلاً قرآن میں ہے واذا حللتم فاصطادوا یہاں فاصطادو امر کا صیغہ ہے۔ اب اگر اس کو نحوی تعریف کے معنی میں لے لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ احرام کھولنے کے بعد ضرور شکار کرو۔ حالاں کہ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ یہاں امر کا صیغہ صرف اباحت کے معنی میں ہے۔ نہ کہ وجوب کے معنی میں۔ اسی طرح مثلاً اعملوا ما شئتم۔ وغیرہ۔

ایک صاحب نے بتایا کہ کسی زبان کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لئے اس کو مجموعی طور پر دیکھنا چاہئے نہ کہ کسی جزئی پہلو کی بنا پر رائے قائم کرلی جائے۔ مثلاً اسکیمو کی زبان میں برف کے لئے پچاس الفاظ ہیں۔ جب کہ کسی اور زبان میں برف کے لئے اتنے الفاظ موجود نہیں۔ مگر یہ معیار درست نہیں۔ اسکیموچوں کہ برفانی علاقوں میں رہتے ہیں اس لئے برف کے بارہ میں ان کے یہاں مختلف الفاظ ہیں۔ مگر دوسرے اعتبارات سے ان کی زبان انتہائی ابتدائی اور معمولی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ کوئی کام کرنے والی طاقت اصلاً انسان ہے نہ کہ کوئی نظام

انھوں نے مثال دی کہ عبرانی زبان سیکڑوں سال سے مردہ زبان تھی۔ اسرائیل بننے کے بعد ایک یہودی عالم اسرائیل آیا۔ وہ اور اس کا خاندان عبرانی زبان بولتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اسرائیل کی زبان عبرانی بناؤں گا۔ لوگوں نے اس کو ناقابل عمل سمجھا۔ بہتوں نے اس کو پاگل کہا۔ ایک یہودی عالم نے کہا کہ زبان کی مثال گلاس کی سی ہے۔ گلاس ٹوٹ جائے تو اس کو دوبارہ جوڑا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح زبان ایک بار ختم ہو جائے تو اس کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر مذکورہ یہودی نے مجنونانہ طور پر اپنی کوشش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ آج عبرانی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ وہ اسرائیل کی سرکاری زبان ہے۔ اس نے ٹوٹے ہوئے گلاس کو دوبارہ جوڑ دیا۔

ایک صاحب نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان پیدائشی طور پر بالکل بے علم اور بے خبر ہوتا ہے۔ اس کا سارا علم خارج سے حاصل شدہ علم ہوتا ہے۔ اس کی تائید میں انھوں نے قرآن کی یہ آیت پڑھی:

واللہ اخرجکم من بطون امہاتکم لا تعلمون شیئاً... النحل ۷۸

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آدمی کوئی نظریہ قائم کرے اور اس کی تائید میں ایک آیت پیش کر دے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی بات قرآن سے ثابت ہو گئی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں اگر مذکورہ بالا آیت ہے تو اسی کے ساتھ اس میں دوسری آیات بھی ہیں۔ مثلاً،

وعلّم آدم الاسماء کلّہا

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا

پہلی آیت کے ظاہری الفاظ سے اگر یہ نکلتا ہے کہ آدمی بے علم حالت میں پیدا ہوتا ہے تو دوسری آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کو علم اسماء دیا گیا ہے۔ اس کی فطرت میں کچھ باتوں کا علم پیدائشی طور پر پیوست کر دیا گیا ہے۔ قرآن کے نظریۂ علم کو سمجھنے کے لئے دونوں قسم کی آیتوں کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرنی پڑے گی۔

پاکستان کے ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ نہ اِدھر کے رہے اور نہ اُدھر کے رہے۔ پاکستان میں ہم کو دوسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

We are not the sons of soil, so we are treated as second class citizens

ان کے بیان کے مطابق سرکاری ملازمتوں وغیرہ میں مہاجرین کے ساتھ سخت امتیاز کیا جاتا ہے۔ اگر ان کا کہنا صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں بھی وہی صورت حال مختلف شکل میں موجود ہے جس کی ہندستان کے مسلمان اپنے بارہ میں شکایت کرتے ہیں۔ کیسی عجیب تھی "تقسیم" کی سیاست جس نے ایک ملک کے مسلمانوں کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور تینوں میں سے کسی کو کچھ نہیں دیا۔ البتہ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ چھین لیا۔

مگر اس سیاست کی ذمہ داری انگریزوں پر یا مسٹر جناح پر ڈالنا بدترین کیننگی ہے۔ یہ اپنے قصور کے لئے دوسرے کو ملزم ٹھہرانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر جناح یا انگریز نے مسلمانوں کو غلط رخ کی طرف پکارا تو مسلمان اس کی طرف دوڑ کیوں پڑے۔ چنانچہ آج بھی قوم کا حال یہی ہے۔ آج بھی اگر کوئی اللہ کا بندہ مسلمانوں کو حقیقت پسندی کی طرف بلائے تو وہ اس کی آواز کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور دوبارہ جناح جیسی آوازوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ آہ وہ لوگ جن کا حال اس آیت کا مصداق بن جائے:

وان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلا وان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلا

• ایک خاتون نے آرٹ کو اسلامی بنانے کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ مقالہ کافی معلوماتی اور دلچسپ تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اسلام موسیقی (Sound art) کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی مثال خود قرآن ہے:

Qur'an is a sound art par excellence

ہر مسلمان قرآن کو ساؤنڈ آرٹ کے ساتھ روزانہ صبح کو دہراتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن کی آواز میں ایک حسن ہے۔ مگر اس خصوصیت کو فن کی حیثیت دینا غالباً اس قیمت پر ہوگا کہ "تدبر" کا پہلو اوجھل ہو جائے جو کہ قرآن کی اصل حیثیت ہے۔ اس کی مثال موجودہ زمانہ میں تجوید کا وہ فن ہے جس نے قرآن کی تلاوت کو ایک قسم کا آرٹ بنا کر تدبر کے پہلو کو مجروح کر دیا ہے۔

جو "دکاترہ" اس انٹرنیشنل سیمینار میں شریک تھے ان میں بڑی تعداد ان افراد کی تھی جو اپنے ملک میں اپنی قومی حکومت کے ظلم کا شکار ہوئے۔ اس کے بعد اپنے ملک میں حالات نامساعد پاکر وہ مختلف بیرونی ملکوں میں چلے گئے۔ انھیں میں سے ایک تعداد یورپ یا امریکہ پہنچ گئی۔ ان لوگوں کے لئے چوں کہ ذاتی محنت کے سوا کوئی اور سہارا باقی نہ تھا انھوں نے محنت شروع کر دی۔

وہ تعلیم میں آگے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ تعلیم کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ اس طرح ان لوگوں کی زندگیاں یہ سبق دے رہی ہیں کہ محرومی میں بھی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہوتا ہے۔ مگر ان میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو امت کے مسائل پر بات کرتے ہوئے اس حقیقت کو امت کے وسیع تر مسائل میں بھی منطبق کرنے کا شعور رکھتے ہوں۔

ڈائننگ ہال میں جو لڑکے اور لڑکیاں کام کر رہی تھیں ان میں ایک لڑکا بہت مستعد اور فعال نظر آتا تھا۔ ایک روز میں نے اس کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ عیسائی ہے — دوسری قوموں کا یہ حال ہے کہ اگر ان کا کوئی فرد کہیں اقلیت میں ہو تو وہ زیادہ چوکنا رہتا ہے اور زیادہ محنت کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اپنی "کمی" کی تلافی زیادہ محنت ہی کے ذریعہ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس ہندستان کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہندستان میں ان کا اقلیت میں ہونا ان کو صرف ایک سبق دے رہا ہے۔ لامتناہی طور پر احتجاج اور شکایت میں مبتلا رہنا۔

مجھے کئی بار یہ تجربہ ہوا کہ جب میں گفتگو میں یا تقریر میں کہتا ہوں کہ "میرا خیال یہ ہے" تو اردو کے ماحول میں اس کو انا کے اظہار کے معنی میں لے لیا جاتا ہے۔ مگر انگریزی زبان میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ یہاں ہر آدمی جب کوئی رائے پیش کرتا ہے تو وہ کہتا ہے :

To my mind ....
It seems to me that ......

اس طرح کے الفاظ انگریزی میں بات کو گھٹا کر کہنے کے ہم معنی ہیں اور اردو میں بڑھا کر کہنے کے۔ ایک جگہ وہ تواضع کا مفہوم رکھتے ہیں اور دوسری جگہ انانیت کا۔ کیسا عجیب فرق ہے ایک زبان میں اور دوسری زبان میں۔

۲۷ جولائی کو جمعہ کا دن تھا۔ ذمہ داروں نے پروگرام بنایا کہ میں کوالالمپور کی جامع مسجد میں نماز پڑھاؤں اور خطبہ دوں۔ میں نے اس سے انکار کیا۔ البتہ اسی مسجد میں جمعہ پڑھا جو یہاں کی قدیم ترین مسجد ہے۔

ہم مسجد میں پہنچے تو گیٹ پر ایک بورڈ پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ اوپر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" عربی میں تھا اور نیچے انگریزی عبارت دکھائی دیتی تھی۔ میں قریب گیا تو معلوم ہوا کہ انگریزی رسم الخط میں ملائی زبان ہے۔ ۱۹۵۰ کے سرکاری فیصلہ کے مطابق ملائی زبان کو رومن رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ مثلاً عید الفطر کو یہ لوگ اپنی زبان میں (Aidilfi tri) لکھتے ہیں۔ خوش آمدید کو (Selamat Datang) سرکاری

کام اور دوسرا زیادہ تر کام رومن رسم الخط میں انجام دیا جاتا ہے۔ تاہم ایک طبقہ ابھی تک ایسا موجود ہے جو قدیم رسم الخط کو استعمال کرتا ہے جو عربی سے ملتا جلتا ہے۔ اب دوبارہ تحریک چل رہی ہے کہ رومن رسم الخط کو ترک کرکے سابق رسم الخط کو ازسرنو اختیار کرلیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا ایک سبب یہی ہے۔ وہ کسی معاملہ میں ایسا فیصلہ نہیں کرپاتے جو ان کے درمیان نسل در نسل چلے۔ ایک حکمراں ہنگامہ خیز عمل سے گزر کر ایک دستور بناتا ہے۔ اور اگلا حکمراں اس کو بدل دیتا ہے۔ ایک قائد مسلمانوں کو ایک رخ پر دوڑاتا ہے۔ اگلا قائد آکر دوبارہ دوسرے رخ پر دوڑانا شروع کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمان ابھی تک درمیانی راستہ میں ہیں۔ وہ منزل تک نہیں پہنچ سکے۔

جامع مسجد کا طرز تعمیر ہندستان کی مساجد سے بالکل مختلف تھا۔ مسجد نہایت صاف ستھری دکھائی دی۔ اس مسجد کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی۔ ہندستان کی اکثر مسجدوں میں یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ جمعہ کے دن لوگ صفوں میں ہیں۔ کوئی سنت پڑھ رہا ہے۔ کوئی ذکر کررہا ہے اور دو آدمی ان کے درمیان کپڑا پھیلائے ہوئے ادھر سے ادھر سے گزر رہے ہیں اور مسجد کا چندہ مانگ رہے ہیں۔ یہ منظر نمازیوں کے لئے بہت ناخوش گوار ہوتا ہے اور نماز کا احترام بھی اس کی وجہ سے مجروح ہوتا ہے عرب ملکوں میں چونکہ حکومت کا محکمہ اوقاف مساجد کی تمام ضرورتوں کا کفیل ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں اس کا مسئلہ نہیں۔

مسجد جامع کوالالمپور میں مجھے اس کا بہترین حل نظر آیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ انچی کے بقدر ایک چھوٹا سا خوبصورت بکس ہے۔ جس میں اندرونی تالا بند ہے۔ اور اوپر ایک سوراخ بنا ہوا ہے اس بکس کے نیچے جدید قسم کا عمدہ پہیہ لگا ہوا ہے۔ یہ بکس صفوں کے درمیان ایک کے بعد ایک گھومتا رہتا ہے۔ تقریباً ہر آدمی اس میں کچھ نہ کچھ ڈالتا ہے۔ ایک آدمی جب اپنی رقم ڈال چکتا ہے تو وہ بکس کو آگے دھکیل دیتا ہے۔ دوسرا آدمی اپنی رقم ڈال کر دوبارہ بکس کو آگے کردیتا ہے۔ اس طرح بکس ایک کے بعد ایک تمام صفوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پوری مسجد کا چکر لگا لیتا ہے۔

انٹرنیشنل ہاؤس کی چودہ منزلہ بلڈنگ میں تیسری منزل پر ایک بڑے کمرہ میں نماز باجماعت کا انتظام تھا۔ فجر کے وقت میں وہاں پہنچا تو ایک صاحب کھڑے ہوئے اذان دے رہے تھے۔ ان کا دایاں ہاتھ کان پر تھا اور بایاں ہاتھ لٹک رہا تھا۔ حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح پر انھوں نے دائیں یا بائیں رخ نہیں کیا۔ بلکہ سامنے کی طرف رخ کئے ہوئے پوری اذان دیتے رہے

اگلے دن ایک اور صاحب نے اذان دی اور وہ اپنا دونوں ہاتھ لٹکائے رہے۔ انھوں نے ایک حی علے الصلوۃ پر دائیں طرف چہرہ کیا اور دوسری حی علے الصلوۃ پر بائیں طرف۔ اسی طرح حی علے الفلاح پر بھی۔ اسی طرح نماز کی ادائگی میں بھی مختلف قسم کے فرق نظر آتے ہیں۔ یہ فقہی مسالک کا فرق ہے۔ ہندستان میں ان معاملات میں اس قدر شدت ہے کہ مذکورہ بالا طرز پر کسی کو اذان دیتے دیکھیں تو اس کو مسجد سے نکال دیں۔ مگر یہاں ان معاملات میں کوئی شدت نہیں۔

میں نے اپنی کتاب (تجدید دین) میں اس کی حمایت کی تھی کہ فقہی مسائل میں شدت کے بجائے توسع کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہاں ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ لوگوں نے عجیب عجیب خود ساختہ مطلب نکال کر اس کتاب کو بدنام کیا۔ حالاں کہ یہی لوگ جب باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں تو اس قسم کے فروق کو خندہ پیشانی کیساتھ برداشت کرتے ہیں۔ وہاں ماحول کے دباؤ سے ہر آدمی وہی بات مان لیتا ہے جس کو دلیل کی بنیاد پر وہ اپنے ملک میں ماننے کے لئے تیار نہیں۔

ڈاکٹر مہدی گلشنی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایران سے آئے تھے ان سے کافی باتیں ہوئیں وہ تہران یونی ورسٹی کے شعبہ سائنس میں پروفیسر ہیں۔ اور تعلیم کے تحت ساڑھے دس برس امریکہ میں رہ چکے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ امریکہ میں آپ نے جو کچھ دیکھا اس میں کیا اچھی چیز تھی اور کیا بری چیز تھی۔ اچھی چیز ان کے الفاظ میں یہ تھی کہ وہ لوگ ہمیشہ بنیادی چیزوں (Basic things) پر متوجہ رہتے ہیں ہے اور معمولی چیزوں (Minor things) کو ہمیشہ نظر انداز کرتے ہیں۔ مسلم قوموں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ زیادہ تر معمولی چیزوں میں الجھے رہتے ہیں۔ اور بڑی بڑی چیزیں اکثر ان کی توجہ کا مرکز نہیں بن پاتیں۔

مغرب کی بری چیز کے سلسلے میں انھوں نے میٹریلزم (مادیت) کا نام لیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی سوچ اور ان کی دوڑ دھوپ کا مرکز ومحور صرف مادی چیزیں ہوتی ہیں۔ اس سے اوپر اٹھ کر وہ سوچ نہیں پاتے۔

ڈاکٹر مہدی گلشنی نے ایران کے حالات کے ذیل میں بتایا کہ شاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے ۱۹۷۸ میں ایک امریکی مجلہ (ورلڈ میگزین) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا

With an army of 700,00 nobody can overthrow me.

یعنی میرے پاس سات لاکھ فوج ہے۔ کوئی مجھے ایران کے تخت سے بے دخل نہیں کر سکتا۔ اس انٹرویو کے ایک سال بعد فروری ۱۹۷۹ میں شاہ ایران کو نہایت بے دردی کے ساتھ

تخت سے بے دخل کردیا گیا۔ جب کہ فوج آخر وقت تک شاہ کی وفادار بنی ہوئی تھی۔

ایک گفتگو کے موقع پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ جدید معلومات کی روشنی میں قرآن کی نئی تفسیر کرنا جائز ہے یا نہیں۔ کیوں کہ صحابہ و تابعین کو سارے قرآن کا علم تھا۔ اس لئے وہ جو کچھ تفسیر کر گئے ہیں وہی کافی ہونا چاہئے۔ ایک سعودی عالم نے اس کے جواب میں کہا کہ جدید تفسیر کے لئے خود صحابی کا اجازت نامہ حاصل ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس جو حبرالامۃ کہے جاتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ: القرآن یُفسّرہ الزمان۔ یعنی زمانہ قرآن کی مزید تفسیر کرتا رہے گا۔ گویا قرآن کی تفسیر ختم نہیں ہوگئی۔ بلکہ علم کی ترقی کے ساتھ برابر جاری رہے گی۔

ایک مصری ڈیلی گیٹ نے اپنا ذاتی مشاہدہ بتایا کہ جمال عبدالناصر کو جب مصر میں اقتدار ملا تو شروع میں لوگوں نے ان کی زبان سے خوب اسلامی باتیں سنیں۔ حتی کہ انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک تقریر میں جمال عبدالناصر کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں:

ایھاالناس لا تکونوا ابناء الدنیا وتکونوا ابناء الآخرۃ

یہ واقعہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کوئی سیاست داں اگر اسلامی باتیں کرے تو اس کو بہت زیادہ سنجیدہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیوں کہ اس کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے عوام کو ساتھ لینا ہوتا ہے۔ اور عوام کو ساتھ لینے کی سب سے آسان تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے دینی باتیں کی جائیں۔ یہ ظاہر کیا جائے کہ اس کی حکومت اسلام لانا چاہتی ہے۔ گویا مسلم ملک کے ڈکٹیٹر ٹھیک اسی طرح اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے اسلام کا نعرہ لگاتے ہیں جس طرح غیر مسلم ملک کے ڈکٹیٹر اسی مقصد کے لئے سوشلزم اور قومی اتحاد کے نعرے استعمال کرتے ہیں۔

کوالالمپور میں روزانہ شام کو کسی نہ کسی منسٹری کی طرف سے کسی عالی شان ہوٹل میں کھانا ہوتا تھا جو میرے لئے سخت وحشت ناک تھا۔ میرے نزدیک اس قسم کی دعوتیں صرف پیسہ اور وقت کا ضیاع ہیں۔ تاہم نظم کی پابندی میں ان میں شرکت کرنی پڑتی تھی۔ البتہ اس میں ۳۰ جولائی کے کھانے کا استثناء تھا۔

۳۰ جولائی کی شام کا کھانا وزیراعظم کی سرکاری رہائش گاہ پر تھا۔ یہ سادہ قسم کی رہائش گاہ ابھی حال میں بنائی گئی ہے۔ تمام لوگ مغرب سے پہلے وہاں پہنچا دئے گئے۔ ایک بڑے ہال کو مکمل طور پر خالی کر کے مسجد کی مانند بنا دیا گیا تھا۔ ایک عرب (ڈاکٹر احمد ذکی) نے امامت کی۔ تقریباً ۷

مقتدیوں میں وزیر اعظم بھی شریک تھے۔ امام نے پہلی رکعت میں یہ آیت پڑھی:

یاداؤد انا جعلناك خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ... النحل ۲۶

اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے " مذہب " امامت کے مقام پر ہے اور وقت کا " حکمراں " اس کے پیچھے کھڑا ہوا احکام خداوندی کو سن رہا ہے۔ یہ واقعہ تھوڑی دیر کے لئے میری نظر میں مستقبل کی تمثیل بن گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں آئندہ آنے والے اس دور کی تصویر دیکھ رہا ہوں جس کی پیشین گوئی احادیث میں وارد ہوئی ہے۔

نماز کے بعد حاضرین کی طرف سے چند تقریریں ہوئیں۔ آخر میں وزیر اعظم ڈاکٹر محمد (Dr Mahathir Mohammad) نے مختصر تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ دوسروں کے ہاتھوں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ نقصان ہے جو خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو پہنچ رہا ہے۔ انھوں اپنی تقریر میں کہا کہ ہم اپنے مسائل کے لئے دوسروں کو الزام نہیں دے سکتے۔ ہمیں خود اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرانا ہوگا:

We cannot blame others. We have ourselves to blame.

یہاں کھانا بھی سادہ تھا۔ کھانا شروع ہوا تو وزیر زراعت ڈاکٹر انور ابراہیم میری میز پر میری کرسی سے ملی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کھانے کے دوران گفتگو ہوتی رہی۔ انھوں نے بتایا کہ ملایا میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً پچاس فی صد ہے۔ مگر حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان متحد ہیں جب کہ دوسرے فرقے متحد نہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہاں تبلیغی کام ہو رہا ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت کم۔ البتہ دوسرے میدانوں میں کافی ترقیاتی کام ہو رہے ہیں۔

اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ ملیشیا میں برطانیہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد زیادہ تر مسلمانوں نے کی۔ چوں کہ انھوں نے نو آبادیاتی دور میں جدوجہد آزادی کی قیادت کی تھی اس لئے دور آزادی میں انھیں غالب سیاسی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ہندستان میں بھی مسلمانوں کو اپنی سیاسی تاریخ کی وجہ سے یہ فائدہ مل سکتا تھا۔ مگر تقسیم کی تحریک چلا کر یہاں مسلمانوں نے خود اپنے آپ کو اپنی تاریخ سے کاٹ لیا۔

کوالالمپور کے انٹرنیشنل ہاؤس میں ایک بڑا ہال نماز باجماعت کے لئے خاص کیا گیا تھا۔ یکم اگست کو میں وہاں پہنچا تو میں اکیلا تھا۔ ہال کی لمبی دیواریں پوری کی پوری شیشہ کی تھیں اس لئے باہر کی دنیا بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اندر ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس کے اندر مکمل سناٹا

باہر کی دنیا میں بھی چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف درخت اور پہاڑ اور بادل اور
ٰ دکھائی دے رہے تھے۔

اس طرح کی ایک دنیا میں میں اکیلے ایک انسان کی حیثیت سے کھڑا ہوا تھا۔ اچانک مجھے
آیا کہ میرا وجود خدا کے وجود کا ثبوت بن رہا ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ اسی لئے نہیں مانتے
ن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مادی کائنات میں کہیں کوئی زندہ اور باشعور ہستی بھی ہے جو ہم
لگ اپنا وجود رکھتی ہے۔ انہیں لوگوں کو اس وقت کوئی تعجب نہیں ہوتا جب کائنات کے کسی بعید مقام پر
نیا ستارہ دریافت ہو۔ وہ فوراً اس کو مان لیتے ہیں مگر ان کو یہ یقین نہیں آتا کہ یہاں خدا جیسا کوئی
رہ وجود بھی ہے جو کائنات میں کہیں ممکن ہے۔

مگر مذکورہ ہال میں جب میں ایک زندہ وجود کی حیثیت سے تھا اور چیزوں کو دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔
چانک مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے وجود کی صورت میں خدا کے وجود کو دیکھ رہا ہوں "جیسے میں
ں ہوں اسی طرح خدا بھی تو ہوگا" میں نے سوچا اگر یہاں ایک زندہ شخص موجود ہے تو کسی دوسرے
م پر دوسری زندہ اور باشعور ہستی کیوں موجود نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا
ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ ایک ماننے اور دوسرے ماننے میں صرف درجہ کا فرق ہے، ان
نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔

سیمنار کی کارروائی ۱۳ جولائی کی دوپہر کو ختم ہوگئی۔ اس کے بعد شہر میں ایک تقریر کا پروگرام تھا
لالمپور میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈ منسٹریشن۔
ں ادارہ کا مقصد مختلف شعبوں میں کام کرنے والے سرکاری افسران کی تربیت کرنا ہے ۱۲ جولائی
سہ پہر میں یہاں میرا ایک پروگرام تھا۔ طلبہ اور اساتذہ کے سامنے ایک تقریر ہوئی جس میں
کے سامنے اسلام کا عمومی تعارف کیا گیا۔ یہ تقریر انشاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع
ردی جائے گی۔

کوالالمپور میں اسلامی ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے،

Regional Islamic Da'awah Council of Southeast Asia and the Pacific

ں ادارہ کے صدر سابق وزیر اعظم تنکو عبد الرحمن ہیں۔ اور اس کے ڈائرکٹر ایک امریکی نومسلم
ں جن کا نام حاجی فضل اللہ ولموٹ ہے۔ یہ نہایت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ ولموٹ
احب کے پاس انگریزی الرسالہ آتا ہے۔ ان سے کوالالمپور میں وزیر اعظم کی رہائش گاہ

پر ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ " آپ کا انگریزی الرسالہ ہم کو برابر مل رہا ہے اور بہت پسند ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ مسلم دنیا میں غالباً اتنا اچھا کوئی دوسرا انگریزی رسالہ موجود نہیں "

الرسالہ کے انگلش اڈیشن کے بارہ میں اس طرح کے تاثرات مختلف مقامات سے مل رہے ہیں۔ مثلاً سعودی عرب کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نے لکھا ہے "انگریزی الرسالہ کا ترجمہ بہت شاندار ہوتا ہے۔ مضامین کا انتخاب بھی بے حد موزوں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس دعوتی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرے "

ایک روز ایک عرب عالم نے ایک شخص سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا انھوں نے ایک کتاب (الاسلام یتحدیٰ) لکھی ہے جس کو ہماری نسل کے ہر نوجوان نے پڑھا ہے۔ (قرأہ کل شاب فی جیلنا) یہاں سیمنار میں بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ عرب آئے تھے۔ وہ سب کے سب میری مذکورہ کتاب پڑھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ان کو معلوم ہوتا کہ الاسلام یتحدیٰ کا مصنف یہاں موجود ہے، وہ بڑے جوش اور محبت کے ساتھ ملتے۔ مگر سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ ان کو " الاسلام یتحدیٰ " کے بعد میری سرگرمیوں کے بارہ میں صرف یہ معلوم تھا کہ میں ایک بدنام حکمراں سے وابستہ ہوں۔ اس کے سوا انھیں میری سرگرمیوں کے بارہ میں بہت کم واقفیت تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ میں ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۴ تک الجمعیۃ ویکلی کے ذریعہ مسلمانوں کی ذہنی تعمیر کا کام کرتا رہا۔ ۱۹۷۶ سے اردو الرسالہ برابر جاری ہے اور ادارہ الرسالہ کے تحت میری کئی درجن اردو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ " بدنام حکمراں " سے وابستگی کی داستان کا تعلق بھی میری اردو تحریروں سے ہے اور مذکورہ تعمیری اور دعوتی کام بھی اردو میں ہوا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ عرب علماء کو اردو کے ایک جزء کا علم مغالطہ آمیز اضافوں کے ساتھ ہے اور دوسرے بڑے جزء کا انھیں کوئی علم نہیں۔

اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس خدمت کو انجام دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عرب اردو زبان سے واقف نہیں۔ اس لئے ان کو واقف کرانے والے ہمارے اردو داں دوست ہیں۔ جو مختلف اسباب کے تحت آجکل تمام عرب دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی حضرات اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں ہونے والے ۹۹ فی صد کام سے ان کو باخبر نہیں کیا۔ اور اردو کے ایک فی صد جزء کو تحریف اور تغیر کے ساتھ بڑھا

چڑھا کر بتایا۔

وہ لوگ جن کو دوسرے کے اعتراف کے لئے سچے الفاظ نہ ملیں، البتہ اس کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹے الفاظ مل جائیں، وہ اپنے عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ وہ اسلام کے اس آخری معیار پر بھی قائم نہیں کہ: من کان یومن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلیقل خیرا اولیصمت۔

۲ اگست ۱۹۸۴ کو میں نے کوالالمپور چھوڑا۔ اور تھائی ایرویز کی فلائٹ نمبر ۴۱۶ سے واپس روانہ ہوا۔ بنکاک سے دہلی کا سفر ایئر فرانس کی فلائٹ نمبر ۱۷۵ سے ہوا۔

۲ اگست کی صبح کو جب میں کوالالمپور کے انٹرنیشنل ہاؤس سے نکلا تو میری زبان پر یہ فقرہ تھا: خدایا، جب تک آپ نے چاہا مجھ کو یہاں رکھا اور جب آپ نے چاہا مجھ کو یہاں سے لے جا رہے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں جب تک آپ چاہیں گے رکھیں گے اور جب چاہیں گے یہاں سے اٹھالیں گے۔ خدایا، مجھ کو دنیا میں بھی اپنی رحمتوں کے سایہ میں رکھئے اور آخرت میں بھی اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دیجئے۔

کس قدر مشابہت ہے دنیا میں اور آخرت میں، حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی کا احساس زندہ ہو تو دنیا کا ہر واقعہ اس کے لئے آخرت کی یاد دلانے والا بن جائے گا۔

ایئر فرانس کے جہاز میں ضروری ہدایات عربی زبان میں بھی لکھی ہوئی نظر آئیں۔ یہ تیل کی قوت کا ایک اعتراف تھا۔ مثلاً بچاؤ سے متعلق ہدایات کے کارڈ پر لکھا ہوا تھا ——— تعلیمات الطواری۔ یعنی حفاظتی ہدایات۔ اسی طرح ایک لفافہ اور ایک ورق فراہم کیا گیا تھا تاکہ مسافر حضرات اس پر اپنے تاثرات لکھیں۔ اس پر عربی زبان میں یہ عبارت درج تھی:

الرجاء تزويدنا بملاحظاتكم على خدمتنا على الارض واثناء السفر وان تدونوا كذلك مقترحاتكم على هذه البطاقة ثم ارسالها بالبريد او تسليمها الى طاقم الطائرة. شكرا.
الخطوط الجوية الفرنسيـــــة.

یعنی آپ سے درخواست ہے کہ زمین پر اور سفر کے دوران ہماری خدمات کے بارہ میں اپنے خیالات اور تجویزیں اس کارڈ پر لکھیں اور پھر اس کو یا تو ڈاک سے ہمیں روانہ کریں یا جہاز کے عملہ کو دستی طور پر دے دیں۔ ایئر فرانس کی طرف سے شکریہ۔

انسان صرف اپنے ماحول میں مطمئن رہتا ہے۔ اگر اس کو اس کے ماحول سے الگ کر دیا جائے تو وہ بے چین ہو کر رہ جائے گا۔ کوالالمپور کے دس روزہ قیام میں اگرچہ بظاہر ہر قسم کی سہولتیں تکلفات کے درجہ میں حاصل تھیں۔ مگر اپنے ماحول سے دوری کی بنا پر ایک ایک دن گزارنا مشکل معلوم

ہوتا تھا۔

۲ اگست ۱۹۸۴ کی شام کو جب میں سفر سے واپس ہوکر دہلی پہنچا تو میرا حال اس جانور کا سا ہوا جو پنجرہ میں بند ہوا اور پھر اس کو پنجرہ سے نکال کر دوبارہ اس کے طبعی ماحول (Habitat) میں پہنچا دیا جائے۔ میں نے سوچا ـــــ کوالالمپور سے دہلی واپس آنے کے لئے میرے پاس ریٹرن ٹکٹ موجود تھا، اس لئے بآسانی میں اپنے وطن واپس آگیا۔ مگر موت کے بعد آدمی کا کیا حال ہوگا۔ کیوں کہ موت کا سفر ایک ایسا سفر ہے جس میں آدمی کے پاس واپسی کا ٹکٹ نہیں ہوتا۔

آہ، کیسا عجیب دن انسان کے اوپر آنے والا ہے مگر اس کے باوجود وہ کتنا زیادہ اس سے غافل پڑا ہوا ہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز

۱۔ جولائی ۱۹۸۴ میں کوالالمپور (ملیشیا) میں اسلامائزیشن آف نالج کے عنوان پر ایک انٹرنیشنل سیمنار ہوا۔ مارچ ۱۹۸۴ میں مولانا وحید الدین خاں صاحب ایک سفر کے دوران ریاض میں تھے وہاں مذکورہ سیمنار کے منتظمہ دار (دکتور احمد توتونجی اور دکتور جابر العلوانی) مولانا موصوف سے ملے اور کوالالمپور کے سیمنار میں شرکت کی خصوصی دعوت دی۔ اس کے بعد اس کے واشنگٹن کے دفتر سے باقاعدہ دعوت نامہ موصول ہوا۔ اس کے بعد مولانا موصوف مذکورہ سیمنار میں شریک ہوئے۔ اس سفر کی مفصل روداد علیحدہ مضمون میں شائع کی جا رہی ہے۔ اس موقع پر مولانا موصوف نے ایک مقالہ (انگریزی زبان میں) پیش کیا۔ یہ مقالہ (اردو میں) الرسالہ نومبر ۱۹۸۴ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس سیمنار کی میزبانی کے فرائض حکومت ملیشیا نے انجام دئے۔ اس سلسلہ میں حکومت ملیشیا کی طرف سے مولانا موصوف کے نام جو خط موصول ہوا ہے اس کی نقل مقابل کے صفحہ پر دی جا رہی ہے۔ اس سیمنار کی خاص اہمیت یہ ہے کہ یہ "سیاست سے واپسی" کی ایک علامت ہے۔ مسلم ملکوں کے نوجوان جو اس سے پہلے سیاسی ٹکراؤ کو دینی کام سمجھتے تھے اب وہ سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچنے لگے ہیں کہ سب سے پہلا ضروری کام فکری انقلاب ہے۔ اس کے بعد ہی کسی دوسرے انقلاب کی طرف سفر شروع کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اسلامی مرکز کے حلقہ سے وابستہ افراد نے بعض مقام پر ایک خاص دعوتی پروگرام شروع کیا ہے۔ اس کو وہ "لاؤڈ اسپیکر پروگرام" کہتے ہیں۔ یہ پروگرام وہ زیادہ تر مسجد میں کرتے ہیں۔ الرسالہ یا کسی کتاب سے مناسب مضمون کا انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ اور اس کو لاؤڈ اسپیکر پر پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ یہ کام خاص طور پر آغاز سحر کے وقت کیا جاتا ہے جب کہ ہر طرف سناٹا ہوتا ہے اور پڑھنے والے کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ یہ پروگرام خدا کے فضل سے مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اس کو دوسرے مقامات پر بھی حسب حالات شروع کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ کو اسلامی مرکز میں نکاح کی ایک تقریب ہوئی۔ یہ ثانی اثنین خاں (منیجر الرسالہ) کے نکاح کی تقریب تھی۔ تقریب بالکل سادہ طور پر انجام پائی۔ کسی بھی قسم کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ فوری طور پر کچھ قریبی لوگوں کو بلا کر بس نکاح پڑھا دیا گیا۔ لوگ اس اسلامی سادگی کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ حاضرین میں سے بعض لوگ اسی وقت الرسالہ کے خریدار بن گئے، جو اس سے پہلے اس کے خریدار نہیں تھے۔
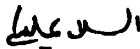
MINISTER OF AGRICULTURE MALAYSIA.

MP: 1407 (8)/87

12 th September, 1984

16 Zulhijjah 1404

Prof. Wahiduddin Khan,
C-29, Nizamuddin West,
New Delhi, 110013,
INDIA.

Prof. Wahiduddin, السلام عليكم

THIRD INTERNATIONAL SEMINAR ON ISLAMIC THOUGHT HELD ON 26 - 31ST JULY, 1984 IN KUALA LUMPUR
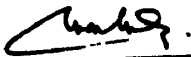
I take this opportunity to convey my appreciation for your kind presence and participation at the above-mentioned seminar.

It is very rare that we have such a gathering of eminent Islamic scholars from various parts of the world discussing the many issues facing the ummah today.

The papers were very well presented and ably discussed. The proceedings of the seminar have been recorded and would serve as an invaluable source of reference for all concerned.

Praise be to Allah that Malaysia was given the opportunity to host such an auspicious seminar.

I sincerely hope that the excellent cooperation and contribution given by you would continue and be strengthened further.

جزاك الله خيرا
والسلام عليكم ورحمة الله

(Anwar Ibrahim)

WISMA TANI, JALAN MAHAMERU, KUALA LUMPUR.
Telefon · 982011, 986679.
Telex . TANIAN MA 33045

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر و پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

‘Introduction to Islam’ Series

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. The first pamphlet shows that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet is an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of Paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to Hell-fire.

Price per set: Rs 24.00

Regd. R.N. No. 28822/76 Issue No 97

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 611 2

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	50/-	سبق آموز واقعات	3/-
الاسلام	20/-	زلزلۂ قیامت	4/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-	حقیقت کی تلاش	3/-
ظہورِ اسلام	25/-	پیغمبرِ اسلام	3/-
احیاءِ اسلام	15/-	آخری سفر	3/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-	حقیقتِ حج	2/-
دین کیا ہے	2/-	اسلامی دعوت	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-	خدا اور انسان	3/-
تجدیدِ دین	3/-		
اسلام دینِ فطرت	3/-		
تعمیرِ ملت	3/-		
تاریخ کا سبق	3/-		
مذہب اور سائنس	5/-		
عقلیاتِ اسلام	3/-		
فسادات کا مسئلہ	2/-		
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-		
تعارف اسلام	3/-		
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-		
راہیں بند نہیں	3/-		
ایمانی طاقت	3/-		
اتحادِ ملت	3/-		

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	3/-
نارِ جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳